ہندوستان پر مسلمانوں گیارہ سالہ دورِ حکومت کی مکمل تاریخ
ہندوستان پر اسلامی حکومت
از
مفتی شوکت علی فہمی
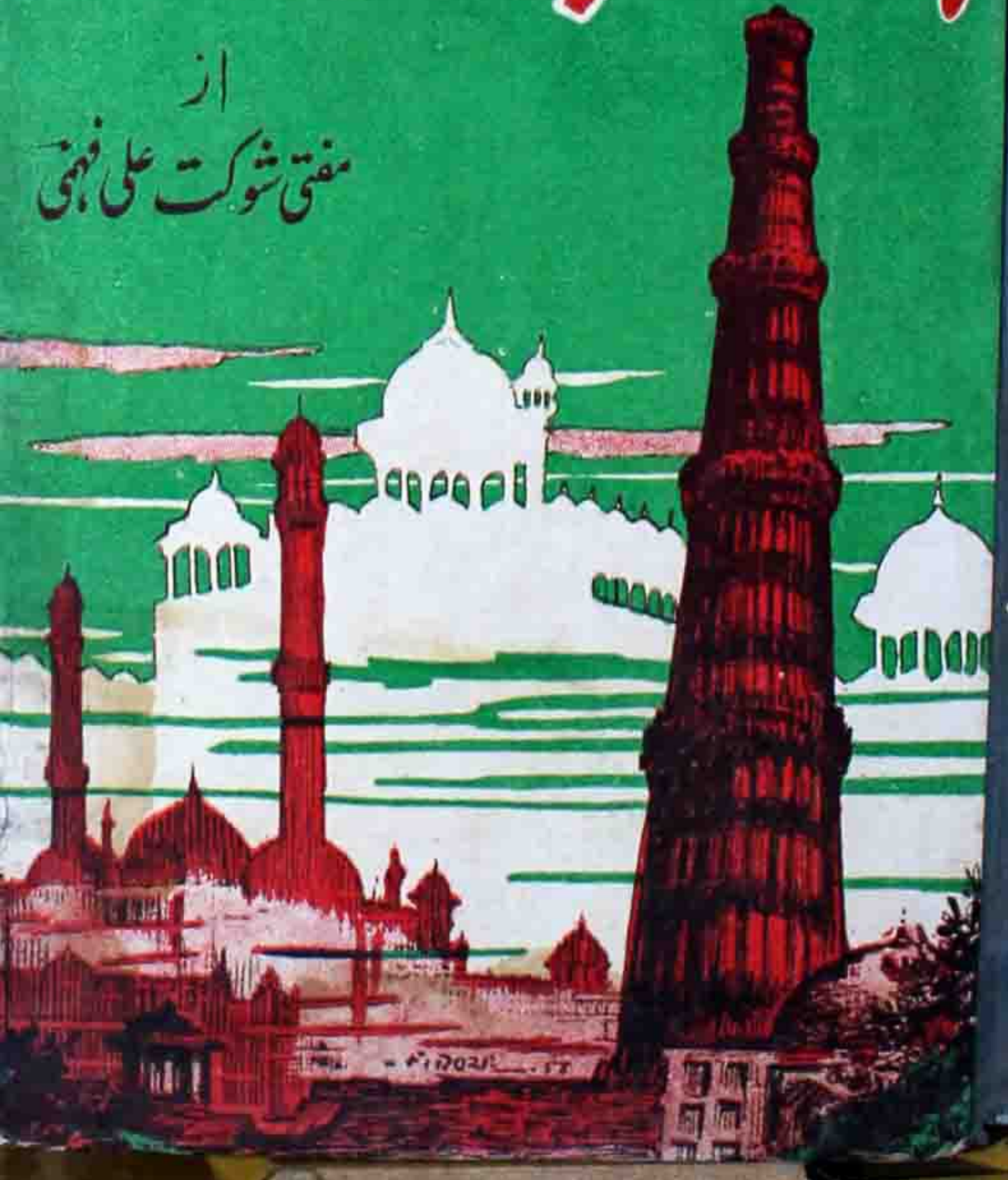
مسلمانوں کے گیارہ سو سالہ دورِ حکومت کی مکمل تاریخ

ہندوستان پر اسلامی حکومت

مسلمانوں کی آمد سے لیکر مغلیہ حکومت کے خاتمہ تک

جس کے ساتھ

زمانۂ قدیم کی ہندوستانی تاریخ بھی شامل ہے

اس تاریخ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لیکر محمد بن قاسم کے دورِ حکومت تک اور محمود غزنوی اور محمد غوری کی فاتحانہ سرگرمیوں سے لیکر مغلیہ حکومت کے خاتمہ تک کے وہ تمام تاریخی واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے سیکڑوں مسلمان بادشاہوں نے گیارہ سو برس تک اس برصغیر پر کیسی شان اور دبدبے اور رواداری کے ساتھ حکومت کی ہے۔ اس تاریخ کے شروع میں ہزاروں برس پہلے کی پرانی اور قدیم ہندوستانی تاریخ بھی شامل ہے اور آخر میں بنگال، جونپور، مالوہ، گجرات، خاندیش، کشمیر اور دکن کی خود مختار اسلامی حکومتوں کی مختصر تاریخیں بھی شامل کر دی گئی ہیں

از

مفتی شوکت علی فہمی

شائع کردہ:- دین دنیا پبلشنگ کمپنی۔ جامع مسجد۔ دہلی

جدید اڈیشن

ترمیم اور نئے اضافوں کے بعد

۱۹۵۷ء میں

شائع کیا گیا

قیمت

فی جلد مجلد

چھ روپے بارہ آنے

۶/۱۲/-

شائع کردہ

دین دنیا پبلشنگ کمپنی۔ جامع مسجد۔ دہلی

(مطبوعہ خواجہ برقی پریس دہلی)

ابواب

فہرستِ مضامین

پہلا باب

ہزاروں برس پہلے کا ہندوستان

دوسرا باب

ممتاز ہندو اور بدھ حکمراں

تیسرا باب

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

چوتھا باب

ہندوستان پر محمد بن قاسم کی فوج کشی

پانچواں باب

سلطان محمود غزنوی کی حکومت

چھٹا باب

سلطان شہاب الدین غوری کی حکومت

ساتواں باب

خاندانِ غلامان کی حکومت

آٹھواں باب

شاہانِ خلجی کی حکومت

نواں باب

شاہانِ تغلق کی حکومت

دسواں باب

ہندوستان پر سیدوں کی حکومت

گیارھواں باب

شاہانِ لودھی کی حکومت

بارھواں باب

مغلیہ حکومت کا پہلا دور

تیرھواں باب

ہندوستان پر دوبارہ پٹھانوں کی حکومت

چودھواں باب

ہندوستان کی خود مختار اسلامی حکومتیں

پندرھواں باب

دکن کی خود مختار اسلامی حکومتیں

سولھواں باب

حکومتِ مغلیہ کے دورِ ثانی پر ایک نظر

بر صغیر ہندوستان کے مختلف فرقوں میں مذہب کے نام پر گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر نفرت و حقارت کے جذبات پھیلانے کی جو ناپاک کوششیں ہوتی رہی ہیں، اُن سے کون واقف نہیں۔ اس کوشش کے بانی مبانی مغرب کے وہ سفید فام حکمران ہیں جنہوں نے "آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ایسے زہریلے لٹریچر کی اشاعت کی ہے جس کے ذریعہ اس برصغیر کے مختلف مذاہب اور فرقوں میں شدید سے شدید تر افتراق پیدا ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ ان کے پیدا کردہ افتراق کی بدولت ہم گذشتہ ڈیڑھ سو برس تک ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے ہیں۔ اور اسی افتراق کا یہ نتیجہ ہے کہ اب جبکہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تب بھی یہ پرانا زہر بدستور اپنا کام کر رہا ہے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بجائے اس کے کہ برصغیر کی یہ دونوں مملکتیں یکجہتی کے لئے کوشاں ہوتیں۔ بُری طرح سے آپس کی رسّہ کشی میں مبتلا ہیں۔ گویا انگریز گذشتہ ڈیڑھ سو برس تک جس افتراق کی آبیاری کرتا رہا ہے۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ خطرناک صورت میں ہمارے لئے مضر ثابت ہو رہا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اس برِصغیر میں فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے میں مغربی اہلِ قلم نے سب سے زیادہ تاریخی حربے سے کام لیا ہے یعنی انھوں نے اپنی شرارت بھری تحریروں اور نام نہاد تاریخی کتابوں کے ذریعہ اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان تمام مسلمان بادشاہوں کو ہندوؤں کا دشمن ثابت کر دیا جائے جو انگریزوں سے قبل گیارہ سو سال تک ہندوستان پر حکومت کر چکے ہیں۔ تاکہ اس طرح ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں شدید نفرت پیدا ہو جائے۔ اور انگریز اس نفرت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکیں چنانچہ اسکول اور کالجوں کی درسی کتابوں سے لیکر بڑی بڑی انگریزی تاریخوں تک میں دیدہ دانستہ مسلمان بادشاہوں کے خلاف ایسے بے بنیاد واقعات ٹھونس دئیے گئے ہیں۔ جن کا تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مغرب کے شرارت پسند مورخوں کی اس زہریلی روش کا سب سے مضر پہلو یہ ہے کہ اُن کے لغو پروپگنڈے اور جھوٹ سے بھری ہوئی تاریخوں نے ہندوستان میں بھی متعصب مورخوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا۔ جس نے کہ مغرب کی نام نہاد تاریخوں کو مستند خیال کرتے ہوئے اس فرقہ پرستی کی آگ کو اچھی طرح ہوا دینی شروع کر دی جو انگریز نے محض ذاتی غرض کے لئے بھڑکائی تھی۔ اور اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس برِصغیر کے غیر مسلم باشندے جن کے پاس خود اپنی کوئی مستند تاریخ نہیں ہے۔ انگریزوں کی نام نہاد تاریخوں پر اعتبار کرتے ہوئے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے متعلق نہایت خراب رائے قائم کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔

مغربی مورخوں کی ان شرارت بھری تحریروں کی بنا پر عام طور سے یہ سمجھا جانے لگا کہ مسلمان بادشاہوں نے اس برِصغیر میں گذشتہ گیارہ سو برس کے اندر اسکے سوا کچھ نہیں کیا کہ وہ غیر مسلموں کو بالجبر مسلمان بناتے رہے اور اُن کے عبادتخانوں کو توڑتے رہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طویل مدت میں جتنے بھی مسلمان بادشاہوں

نے اس برِ صغیر پر فرمانروائی کی ہے۔ اُن میں سے کسی ایک بادشاہ کی بھی یہ اسٹیٹ پالیسی نہیں رہی کہ وہ اِس ملک کے غیر مسلموں کو بالجبر مسلمان بنائے یا اُن کے عبادتخانوں کو مسمار کرے۔ اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ملک کی اکثریت یعنی ہندو بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور اُن کے لئے حکومت چلانا ناممکن ہو جاتا۔ تاہم ہم کو اس چیز سے انکار نہیں کہ بعض مسلمان بادشاہوں سے لغزشیں ہوئی ہیں لیکن چند بادشاہوں کی ذاتی لغزشوں کو تمام مسلمان بادشاہوں کی مسلمہ "ہندو کش" پالیسی قرار دینا انتہا درجہ کی تاریخی بد دیانتی ہے۔

یورپین اور متعصب مورخوں کا پھیلایا ہوا یہ زہر ہرگز کارگر نہ ہوتا اگر ملک میں ایسی مستند مادری زبان کی تاریخیں موجود ہوتیں جن سے کہ اس ملک کے عوام فائدہ اُٹھا سکتے لیکن ہماری بدقسمتی سے جتنی بھی ہندوستان سے متعلق مستند تاریخیں ہیں وہ زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں اور وہ سب کی سب اس قدر ضخیم ہیں کہ اُن کا مُطالعہ کرنا عوام کی بس کی بات نہیں اور اس پر مزید مصیبت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر تاریخیں تقریباً نایاب ہیں۔ لیکن یہ تاریخیں اگر کسی طرح حاصل بھی ہو سکتیں تو کتنے ایسے آدمی ہیں جو ان غیر زبان کی فارسی تاریخوں سے فائدہ اُٹھا سکتے۔ ضرورت اس کی تھی کہ ہماری مادری زبان میں ایسی زیادہ سے زیادہ مستند تاریخیں لکھی جائیں جو عوام کو صحیح حالات و واقعات سے آگاہ کرتیں اور اُس زہر کو دُور کر سکتیں جو یورپین اور متعصب مورخوں نے اپنی غلط بیانیوں سے ملک میں پھیلا رکھا ہے۔

اچھی اور مستند تاریخی کتب کی کمی محسوس کرتے ہوئے میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایک ایسی مختصر مگر جامع تاریخ سپرد قلم کی جائے جو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی سچی تصویر ملک کے سامنے پیش کر سکے اور جسے صرف مستند تاریخی کتب کی مدد سے مُرتب کیا جائے۔ چنانچہ اس تاریخ میں جتنے بھی واقعات

درج ہیں وہ تمام کے تمام ہندوستان کی اُن قابل اعتبار پُرانی تاریخوں سے اخذ کئے گئے ہیں جو ہندوستان کے تقریباً ہر طبقہ میں مستند خیال کی جاتی ہیں۔ ان تاریخوں کی فہرست چونکہ طویل ہے۔ اس لئے اس کتاب کے آخر میں ان کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔

اس تاریخ کی ترتیب میں میرے لئے سب سے بڑی دُشواری یہ تھی کہ گیارہ سو سال کے تاریخی واقعات کا ایک بے پایاں سمندر میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ میں اس سمندر کو کوزہ میں بند کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کیونکہ میری کوشش یہ تھی کہ یہ تاریخ کسی طرح بھی اتنی ضخیم نہ ہونے پائے کہ پڑھنے والے اسے پڑھتے پڑھتے اُکتا جائیں اس لئے اکثر مواقع پر مجھے اختصار سے کام لینا پڑا ہے مجھ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ کتاب کی ضخامت گھٹانے کی جدوجہد میں بہت سے واقعات میرے نقطۂ نظر سے تشنہ رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی میں نے اِس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ہندوستان کا ہر اہم واقعہ اس تاریخ میں ضرور آجائے۔ تاکہ اس تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کو دوسری بڑی بڑی تاریخوں کا سہارا نہ ڈھونڈھنا پڑے۔

اس اہم مقصد کے پیشِ نظر میں نے کم سے کم اوراق اور الفاظ میں گیارہ سو برس کی تاریخ کو مکمل صورت میں پیش کرنے کی ہر امکانی کوشش کی ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ناظرین کا کام ہے کہ میں اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں میں نے اس تاریخ کی تالیف میں اس بات کا بھی پورا لحاظ رکھا ہے کہ اچھے اور بُرے تمام واقعات جانبداری کے بغیر پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کردئے جائیں چنانچہ جو اچھے بادشاہ ہوئے ہیں اُن کو اچھا دکھایا گیا ہے۔ جن بادشاہوں میں کمزوریاں تھیں اُنکی کمزوریاں بے کم وکاست پیش کردی گئی ہیں اور جن میں اچھائیاں اور بُرائیاں دونوں تھیں اُنکے اچھے اور بُرے کردار کے دونوں پہلو نمایاں کردئے گئے

ہیں۔ غرضکہ میں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی نہایت سچی اور سادہ تصویر الفاظ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کردی جائے۔

اس تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو تاریخ پڑھتے وقت یہ نہیں فراموش کرنا چاہیئے کہ جن بادشاہوں اور حکمرانوں کے حالات وہ پڑھ رہے ہیں وہ نہ اولیاءاللہ تھے اور نہ مذہبی رہنما بلکہ وہ ہمارے اور آپ کی طرح صرف دُنیا دار انسان تھے اور اُن سے اُن تمام لغزشوں کا امکان ہے جو عام انسانوں سے ہوسکتی ہیں۔ ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو بادشاہوں کی ذاتی لغزشوں کو خواہ مخواہ مذہبی رنگ دے کر عوام کو بھڑکاتا رہتا ہے حالانکہ بادشاہ یا راجہ خواہ کسی مذہب و ملت سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں ان کا عوام کے مقابلہ میں مذہب سے بہت کم واسطہ ہوتا ہے۔ اور بعض حالات میں تو ان کا کیرکٹر عام انسانوں سے بھی پست ہوتا ہے۔ اسلیئے انکے ذاتی افعال پر خواہ مخواہ مذہبی رنگ چڑھانا اور انکو مذہبی رہنما بنا کر پیش کرنا کھلی ہوئی سیاسی بددیانتی ہے۔ لہٰذا اس تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ بادشاہوں کو محض بادشاہ سمجھ کر اُنکے حالات کا مطالعہ کریں اُنکو مذہبی رہنما یا ولی سمجھتے ہوئے نہیں بلکہ عام دُنیا دار انسان خیال کرتے ہوئے اُنکی بھلائیوں اور بُرائیوں دونوں کا موازنہ کریں۔ اس کے بعد اُن کو خود ہی اندازہ ہو جائیگا کہ ان بادشاہوں میں سے اکثر بادشاہوں کا کردار بادشاہ اور دُنیادار انسان ہونیکے باوجود دوسرے حکمرانوں کے مقابلہ میں کس قدر بلند ہے۔

اس تاریخ کے مطالعہ کے وقت یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ آج کے واقعات نہیں ہیں بلکہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کے اس زمانہ کے واقعات ہیں جبکہ ساری دُنیا میں مذہبی اور نسلی تنگ نظری بُری طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اور یہ تنگ نظری اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ روم کے پوپ نے کیتھولک عقائد کے منکرین کو واجب القتل قرار

دیدیا تھا۔ یورپ کے حکمراں ہزاروں علما کو محض اس لئے جلتی آگ میں ڈال رہے تھے کیونکہ وہ عوام کو علم اور عقل کی باتیں بتاتے تھے۔ اندلس میں محض اس جرم میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جارہا تھا۔ کیونکہ وہ عیسائی نہ تھے میکیکو کے باشندوں کو حکومت کے اشارہ پر کتوں سے اسلئے پھڑوایا جارہا تھا کیونکہ وہ یورپین نہ تھے۔ یہ سب کچھ یورپ کے مہذب ممالک میں ہورہا تھا۔ اسکے برخلاف ہندوستان میں محمد بن قاسم ہندوؤں کیلئے مندر بنوارہا تھا سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں تراجم ہو رہے تھے۔ ہندوؤں اور بودھوں کو پوری مذہبی آزادی دی جارہی تھی اور ہندوؤں کو ہندوستان کی اسلامی حکومت میں بڑے بڑے عہدے پیش کئے جارہے تھے حقیقت یہ ہے کہ اس مذہبی اور نسلی تنفر اور تنگ نظری کے دور میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے جس وسیع نظری کے ساتھ حکومت کی ہے اسکی مثال اُس زمانہ کے دوسرے ملکوں کی تاریخوں میں مفقود ہے۔

ہم کو تعجب ہے کہ اُن مسلمان بادشاہوں اور فرمانرواؤں پر بالجبر اسلام پھیلانے اور غیر مسلموں کے عبادت خانوں کے ڈھانے کا الزام کیونکر لگایا جاسکتا ہے جنکی حالت یہ تھی کہ جب محمد بن قاسم کراچی فتح کرلیتا ہے تو اُس کا پہلا گورنر ایک ہندو پنڈت مقرر کیا جاتا ہے اور جب سارا سندھ فتح کرلیتا ہے تو راجہ داہر کے سابق ہندو وزیر سی ساگر کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ دیتا ہے۔ اسکے علاوہ کاکا۔ موکا۔ کاسا جیسے ہندو سرداروں کو فوج میں بڑے بڑے عہدے دئے جاتے ہیں۔ اور صاف الفاظ میں مذہبی آزادی کا اعلان کردیا جاتا ہے۔

محمد بن قاسم کے علاوہ محمود غزنوی کی حالت یہ تھی کہ وہ راجپال۔ انندپال اور ہندو راجاؤں کی پے درپے بدعہدیوں کے باوجود بار بار اُن کے قصور معاف کردیتا ہے اور اپنی فوج میں ہزاروں ہندو سپاہی اور سپہ سالار مقرر کرنے میں ایک مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح محمد غوری اپنے سب سے بڑے دشمن پرتھوی راج کے دونوں

بیٹوں کی دل کھول کر سرپرستی کرتا ہے۔ اِنکے علاوہ شاہانِ غلامان۔ شاہانِ خلجی شاہان تغلق۔ شاہانِ لودھی اور مغل بادشاہوں نے قدم قدم پر ہندوؤں کی سرپرستی کی ہے اور ہندو راجاؤں اور ہندو اُمراء پر ہمیشہ مسلمانوں سے زیادہ اعتماد اور بھروسہ کیا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ جن مسلمان بادشاہوں کے ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ ایسے گہرے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہوں وہ کیونکر انھیں بالجبر مسلمان ہونے پر مجبور کر سکتے ہیں یا ان کے عبادت خانوں کو مسمار کر سکتے ہیں۔

فرقہ پرست اور متعصب مورخوں کی جانب سے فاتحانِ اسلام پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ ہندوستان پر اُن کے حملوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ تلوار کے زور سے ہندوستان کے غیر مسلموں کو مسلمان بنائیں اور ہندوستان آکر ان کے عبادت خانوں کو مسمار کریں لیکن اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر فاتحانِ اسلام کے تمام حملوں کا مقصد محض غیر مسلموں کا قتلِ عام اور بُت خانوں کا توڑنا تھا تو اسلامی ممالک پر آئے دن یہ فرمانروا جو حملے کرتے رہتے تھے۔ اِن کا آخر کیا منشا تھا؟ کون نہیں جانتا کہ اگر محمود غزنوی نے ہندوستان کی ہندو حکومتوں پر حملے کئے تھے تو اس نے ہرات سیستان۔ آذربائجان۔ بخارا، سمرقند، بلخ اور دوسری بے شمار اسلامی حکومتوں پر بھی بار بار فوج کشی کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حملوں کا مقصد وسعتِ سلطنت کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

تاریخ کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائیگا تو پتہ چلیگا کہ مسلمان بادشاہوں نے جہاں ہندوستان کے ہندو راجاؤں پر فوجی یورشیں کی ہیں وہاں مسلمان حکومتوں کو بھی نہیں بخشا۔ چنانچہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر تو صرف بارہ سترہ حملے کئے تھے لیکن اسلامی ممالک پر اُس نے چونتیس یا پینتیس بار یورش کی تھی۔ اسی طرح محمد غوری اور اس کے بھائی نے ہندو راجاؤں کے خلاف تو صرف چند مرتبہ فوج کشی کی تھی لیکن اسلامی حکومتوں کے خلاف انھوں نے بے شمار حملے کئے تھے۔

ہندوستان پر بھی محمد غوری کا سب سے اہم حملہ ہندوؤں کے خلاف نہیں تھا بلکہ غزنی خاندان کے آخری بادشاہ سلطان خسرو کے خلاف تھا چنانچہ محمد غوری نے پنجاب میں شکست دے کر اور گرفتار کر کے غزنیں لے گیا تھا۔ اسی طرح غیاث الدین تغلق نے بنگال کی اسلامی حکومت پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ محمد تغلق نے مسلمان فرمانرواؤں کے کچلنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے بنگال اور گجرات کے مسلمان حکمرانوں پر سخت ترین یورش کی۔ بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ ہندوؤں کے خلاف نہیں تھا۔ بلکہ لودھی پٹھانوں کی مسلم حکومت کے خلاف تھا مسلمانوں کے خلاف مسلمان بادشاہوں کی یہ جنگ آزمائیاں اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اُنکی تہہ میں محض ملک گیری کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اور مذہب یا تعصب کو ان جنگی سرگرمیوں میں ذرہ برابر بھی دخل نہ تھا۔

ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد ہندو راجاؤں کے ساتھ فاتحان اسلام کی رواداراَنہ اور دوستانہ روش خود اس بات کا کھُلا ثبوت ہے کہ اِن مسلمان بادشاہو کی جن ہندو سرداروں نے جدید فتوحات میں امداد کی یہ بلا امتیاز مذہب وملت اُن کے دوست بن گئے اور جنہوں نے اِن کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کیں اُن کو تہہ تیغ کر دیا خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ پٹھان جنہوں نے مغلیہ حکومت کے خلاف شورشیں برپا کی تھیں اُن کو فنا کر کے رکھ دیا گیا۔ اِس کے برخلاف اچھوت جو مغلیہ حکومت کے لئے پشت پناہ بن گئے تھے اُن کو صرف نوازا ہی نہیں گیا۔ بلکہ اُن سے رشتہ داریاں بھی پیدا کر لی گئیں۔ اس سب کے باوجود بھی اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان بادشاہ ہندوستان میں گیارہ سو برس تک صرف غیر مسلموں کی گردنیں کاٹتے رہے ہیں اور مندروں کو ڈھاتے رہے ہیں تو یہ کھلا ہوا جھوٹ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

تعصب اور فرقہ پرستی سے بلند رہتے ہوئے ہندوستان میں اسلامی حکومت

کی گیارہ سو سالہ تاریخ کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے خواہ "اسلام" کے لئے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن انھوں نے اس ملک کی اکثریت کے دلوں کو ہاتھوں میں رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور بعض بادشاہ تو اس کوشش میں دائرہ اسلام سے بھی باہر چلے گئے ہیں چنانچہ ملک کی اکثریت کی دلداری ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ انگریز جیسی جدید آلات حرب سے مسلح قوم تو مشکل سے ہندوستان پر صرف ڈیڑھ سو برس حکومت کر سکی لیکن مسلمان مسلسل گیارہ سو سال تک یہاں حکومت کا ڈنکا بجاتے رہے۔

دیباچہ میں جو کچھ میں نے کہا ہے مجھے اُمید ہے کہ اُس کی تصدیق اُن واقعات سے خود بخود ہو جائے گی جو اس تاریخ میں درج ہیں اور ان واقعات سے پوری طرح ناظرین اندازہ لگالیں گے کہ مسلمانوں نے گیارہ سو برس تک اس برعظیم پر کس طرح حکومت کی ہے۔ اس لئے میں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ اس بات کا فیصلہ خود ناظرین کی رائے پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود ہی تمام واقعات پر گہری نظر ڈال کر یہ نتیجہ نکال لیں کہ ہندوستان میں مسلم فرمانرواؤں کا دورِ حکومت اچھا تھا یا برا تھا۔ مجھ کو یقین ہے کہ اس مختصر مگر جامع تاریخ کی تالیف میں میں نے جو محنت کی ہے وہ ملک اور وطن کے لئے مفید ثابت ہوگی اور اس تاریخ کے ذریعہ بڑی حد تک اُن غلط فہمیوں کا تدارک ہو جائے گا جو مغربی مؤرخین محض ذاتی اغراض کے لئے اس ملک میں پھیلاتے رہے ہیں۔

اس تاریخ کی اشاعت سے جہاں میرا منشا اور مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں کے صحیح اور سچے حالات سے ملک کے عام باشندوں کو واقف کیا جائے وہاں میرا مقصد یہ بھی ہے کہ ہند اور پاکستان کی دونوں حکومتوں کے زعما اپنے ہی ملک کی اس تاریخ سے سبق لیں کہ ان کے پیش رو فرمانرواؤں نے جن کے

وہ جائز جانشین ہیں غیر حکمران اقوام اور مذاہب کے ساتھ کیسی رواداری وسیع نظری اور محبت کا سلوک کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آج سے سیکڑوں برس قبل محمد بن قاسم کے دورِ حکومت سے لیکر مغلیہ حکومت کے زوال تک ہندوستان میں تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے بغیر آرام اور چین کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے تھے۔ تو اب جبکہ ہم بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں اپنی حکومتوں میں یہی خصوصیات کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز اس ملک میں فرقہ پرستی کا جو زہر چھوڑ گیا ہے اُس نے ہمیں گمراہ کر رکھا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ انگریز کی طرح اُس کے پیدا کردہ زہر کو بھی ختم کر دیا جائے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جبکہ ہند اور پاکستان کی آزاد مملکتوں کے زعما اس بات کا تہیہ کرلیں کہ وہ ہر قیمت پر رواداری کی اُس بیش بہا پالیسی کو برقرار رکھیں گے جو اُن کے پیش رو حکمرانوں نے آج سے سیکڑوں برس قبل بڑی سوجھ بوجھ کے بعد مرتب کی تھی۔

میری اور اس برِ صغیر کے ہر محبِ وطن باشندے کی یہ دلی خواہش اور تمنا ہے کہ یہ دونوں آزاد مملکتیں دُنیا میں سربلند ہوں۔ اور ان کے باشندوں کو مادی اور رُوحانی سکون پوری طرح حاصل ہو لیکن اس بلند و بالا مقصد کے لئے ملک کے لیڈروں کو ان تمام فرقہ پرست عناصر کو کچل دینا ہوگا جو انگریز کی پیداوار ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر ان دونوں مملکتوں کے لیڈروں نے زہریلے عناصر کو کچل دیا اور اپنے پیش رو فرمانرواؤں کی روادارانہ پالیسی کی تقلید کرتے ہوئے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تو ان دونوں آزاد مملکتوں میں اور اُن کے باشندوں میں نہ صرف غیر متزلزل رشتۂ محبت قائم ہو جائیگا۔ بلکہ یہ دونوں مملکتیں رشکِ ارم بن جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس تاریخ کو نہایت ہی بلند اور بالا مقاصد کے

ماتحت پیش کیا ہے۔ مجھ کو خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ میرے نیک مقاصد سے ملک اور ملک کے باشندوں کو ضرور فائدہ پہنچے گا۔ اس موقعہ پر میں یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تاریخ کی تیاری کے لئے مجھ کو کس قدر کاوش اور محنت سے کام لینا پڑا ہے۔ اس تاریخ کی تیاری کا اہتمام کوئی معمولی کام نہ تھا۔ میں گذشتہ بیس سال سے اس تاریخ کی تیاری کے لئے برابر مواد جمع کر رہا تھا۔ اور اس کوشش میں تھا کہ جلد سے جلد اس کی تحریر کا کام شروع کر دوں لیکن میری صحافتی اور دیگر مصروفیات اس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ میں ۱۹۴۵ء سے قبل اس تاریخ کی تحریر کا کام شروع نہیں کر سکا۔

۱۹۴۵ء میں جب میں نے اس تاریخ کی تحریر کا کام شروع کیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ میں سمجھتا تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ مجھے مستند تاریخی کتب کی تلاش میں بڑی کاوش اُٹھانی پڑی۔ چنانچہ اکثر نایاب کتابیں مجھے اپنے دوستوں سے مستعار لیکر یا اُن کے اقتباسات حاصل کر کے کام چلانا پڑا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی دشواری یہ بھی تھی کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کی تصدیق کے لئے مجھ کو درجنوں کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی تھی۔ جس میں میرا بیشتر وقت صرف ہو جاتا تھا۔ غرضکہ ۱۹۴۵ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک مسلسل پانچ سال تک مجھ کو روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات مجھ کو رات کے دو دو بجے تک جاگنا پڑا ہے۔ اس سخت کاوش اور محنت کے بعد خدا کا شکر ہے کہ ۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو یہ تاریخ اور اس کے سلسلہ کی دوسری تاریخیں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں۔

اس تاریخ کی تحریر کا وہ زمانہ جو ۱۹۴۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۹ء پر ختم ہوتا ہے ہندوستان کی تاریخ میں نہایت ہی اہم اور تاریخی زمانہ ہے کیونکہ دوسری

جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ملک کے گوشہ گوشہ میں سیاسی ہیجان پھیل گیا تھا۔ اور سارے ہندوستان میں مشرق سے لیکر مغرب تک اور شمال سے لیکر جنوب تک ایک بے چینی اور اضطراب رُونما ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس تاریخ کی تحریر کے زمانہ ہی میں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا اور اس کے بعد اس برصغیر میں بربریت اور درندگی کا ایک ایسا نیا دور شروع ہو گیا جو بے حد تکلیف دہ اور شرمناک ہے۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں فرقہ وارانہ اضطراب برپا تھا اور دہلی کی حالت سارے ہندوستان سے بدتر تھی۔ لیکن اس اضطراب اور بے چینی کے باوجود اور ناساز گار حالات کے ہوتے ہوئے بھی میں نے اس تاریخ کی تحریر کا کام بدستور جاری رکھا۔ دہلی اور ہندوستان میں نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہا لیکن میں حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر برابر اس اہم کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچاتا رہا۔

اس تاریخ کی تیاری ہی کے دوران میں چونکہ خود میری زندگی میں اہم ترین حادثات رُونما ہوئے تھے اس لئے مجھ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ شاید میں اس اہم کام کو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکوں۔ چنانچہ ۹؍ جون ۱۹۴۷ء کو میری والدۂ محترمہ کا انتقال میرے لئے بہت بڑا حادثہ تھا۔ اور اس کے فوراً ہی بعد جب ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میری شریک حیات کی اچانک موت واقع ہوئی تو میرا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ مجھ پر اس حادثہ کا اس قدر اثر ہوا کہ میں نے اپنا تمام کاروبار بند کر دیا اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ اس پر مزید یہ کہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں میری بہن کی خطرناک اور جان لیوا علالت نے مجھے زندگی تک سے بیزار کر دیا لیکن ان سخت ترین صدمات اور حادثات کے باوجود ایک مخفی طاقت برابر مجھ سے تاریخ کی تکمیل کا کام لیتی رہی۔ یہاں تک کہ ۹؍ مارچ ۱۹۴۹ء کو یہ تاریخ مکمل ہو گئی۔ بہرحال مجھ کو خوشی ہے کہ نازک ترین حالات کے پیش آجانے کے باوجود میں ملک کے سامنے ایک

ایسی سچی تاریخ پیش کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں جو اگرچہ مختصر ہے لیکن پھر بھی ملک کی ضرورتوں کو کسی نہ کسی حد تک پورا ضرور کر دیتی ہے۔

یہ چیز میرے لئے باعث فخر اور اطمینان ہے کہ میری اس حقیر کوشش کو ملک کے ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور میری اُمید اور توقع سے زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ اب میں اس تاریخ کا جدید اڈیشن نئے اضافوں کے بعد پیش کر رہا ہوں۔ اس جدید اڈیشن میں میں نے بہت سی اُن خامیوں کو دُور کر دیا ہے جو پہلے اڈیشن میں باقی رہ گئی تھیں۔ مجھ کو اُمید ہے کہ اس جدید اڈیشن کو ملک کے ہر طبقہ میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ اور اسے سابقہ اڈیشن سے بھی زیادہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوگی۔

نیازمند

شوکت علی فہمی

دین دنیا پبلشنگ کمپنی جامع مسجد دہلی

پہلا باب

ہزاروں برس پہلے کا ہندوستان

زمانہ قدیم سے لیکر ۳۲۳ قبل مسیح تک

ہزاروں برس پہلے کا ہندوستان

ہندوستان دُنیا کا قدیم ترین ملک ہے۔ اس ملک کو وہی قدامت حاصل ہے جو دُنیا کے کسی پُرانے سے پُرانے ملک کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کے بارے میں مورخوں کی رائے ہے کہ اس ملک کی تہذیب اور تمدن یونان سے بھی قدیم ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل اگرچہ ہندوستان کے بارے میں کوئی مستند تاریخ موجود نہیں ہے لیکن پھر بھی جو لٹریچر مل سکا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مشرق کے اس برِ عظیم پر ہزاروں برس تک سیکڑوں راجہ بڑی قابلیت کے ساتھ حکومت کرتے رہے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کی تاریخ سپردِ قلم کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم قدیم ہندوستان کی تاریخ پر ایک ہلکی سی روشنی ڈال دیں تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ مسلمانوں کی آمد سے ہزاروں اور سیکڑوں سال قبل ہندوستان کی کیا حالت تھی۔ اور ہندوستان میں بے شمار حکومتیں کس طرح بن بن کر بگڑتی رہی ہیں ہم کو اس چیز کا اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھا جائیگا اگرچہ اسے تاریخی حیثیت نہیں دی جا سکتی لیکن پھر بھی ان غیر تاریخی واقعات سے قدیم زمانہ کے ہندوستان کا ایک ہلکا سا خاکہ ضرور ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ

ہندوستان ابتدا ہی سے ایک نہایت ہی زرخیز ملک ہے۔ لیکن اس کی زرخیزی اس ملک کے باشندوں کے لئے ہمیشہ ایک مصیبت بنی رہی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے گردوپیش جب بھی کسی قوم کو ذرا بھی اقتدار حاصل ہوا۔ وہ ہندوستان پر چڑھ دوڑی تاکہ ہندوستان کی زرخیزی سے مالامال ہو سکے۔

اب سے ہزاروں سال قبل آرین قوم نے اسی مقصد کے لئے اس ملک پر حملہ کیا اور آرین اس ملک کے قدیم باشندوں یعنی دڑاوڑوں اور گونڈوں کو نکال کر پنجاب صوبہ اودھ۔ راجپوتانہ۔ گجرات اور بنگال پر چھا گئے۔ آریوں کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ وسط ایشیا سے مسلسل کئی صدی تک ہندوستان میں داخل ہوتے رہے یہاں تک کہ یہ ہندوستان کے تمام زرخیز علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں نے اگرچہ اس سیلاب کو روکنے کی پوری کوشش کی لیکن طاقتور اور جنگجو آرین برابر ہندوستان پر چھاتے چلے گئے۔

آرین قوم کی طرح شاک قوم بھی ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد سارے شمالی ہندوستان پر پھیل گئی۔ شاک قوم کی شکل وصورت اور ڈیل ڈول ترکوں سے ملتا جلتا تھا۔ اس قوم نے بھی پنجاب۔ مغربی اودھ۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کو اپنا مسکن بنا لیا۔

شاک قوم کی نظر عنایت کے بعد کُشان قوم نے جو وسط ایشیا کی ایک نہایت ہی مضبوط اور سفید رنگ قوم تھی۔ پنجاب کشمیر اور افغانستان میں ایک نہایت ہی وسیع حکومت قائم کر لی۔ اسی طرح کچھ مدت کے بعد ہون قوم کے نام سے ایک نئی قوم وسط ایشیا سے ہندوستان میں وارد ہو گئی۔ جس نے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد بری طرح قتل عام کا بازار گرم کیا ان کے علاوہ یونانی۔ ایرانی۔ عرب۔ افغانی مغل۔ پرتگالی۔ ولندیزی۔ فرانسیسی۔ انگریز غرضکہ سب ہی ہندوستان پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کرم فرماتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کی یورش کے اعتبار سے یہ دُنیا کا سب سے بدنصیب ملک ہے جس کے باشندوں کو بیرونی حملہ آوروں نے کبھی بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔

شمالی ہند میں آریوں کی حکومتیں

آریوں نے ہندوستان کے قدیم باشندوں یعنی دڑاوڑوں کو شمالی ہند کے زرخیز علاقوں سے نکالنے کے بعد کون کون سی حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بارے میں کوئی مستند تاریخی ثبوت تو نہیں مل سکا لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ آرین قوم جو مضبوط ہونے کے علاوہ فن سپہ گری سے بھی خوب واقف تھی۔ اُس نے وادی گنگ میں کئی حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ چنانچہ۔ ہستنا پور کی حکومت جس پر کورہ راج کرتے تھے دریائے گنگا کے کنارے دہلی کے شمال و مغرب کے علاقہ میں قائم تھی ہستنا پور کی حکومت کے قریب ہی دوسری حکومت پنچالوں کی تھی جس کا دارالسلطنت قنوج تھا۔ تیسری مشہور حکومت بنارس میں تھی جس پر کاشی حکمرانی کررہے تھے۔ چنانچہ کاشیوں کی حکومت کی بنا پر بنارس کا دوسرا نام کاشی پڑ گیا۔ اسی طرح بنگال اور بہار کے اکثر علاقوں پر ودیہا لوگوں کا راج تھا۔ یہ چوتھی حکومت تھی اور ہستنا پور اور بہار کی حکومتوں کے درمیان اودھ کے علاقہ میں کوشل ذات کے لوگ حکمرانی کررہے تھے۔ جن کا دارالسلطنت اجودھیا تھا۔ غرضکہ شمالی ہند میں آریوں کی پانچ ممتاز حکومتیں قائم ہوچکی تھیں۔

رام چندرجی کا عہدِ حکومت

کوشل قوم کے حکمرانوں کی حکومت آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل اودھ میں قائم تھی جس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا۔ رام چندرجی اسی قوم کے ایک لائق راجہ ہوئے ہیں جن کے ایثار اور قربانی کے واقعات سے بالمیک جی کی رامائن بھری پڑی ہے۔ رام چندجی اجودھیا کے مشہور راجہ دشرتھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ جن کو محض اس لئے ابتدا میں تخت وتاج سے کنارہ کرنا پڑا چونکہ انکی سوتیلی ماں کیکئی یہ چاہتی تھی کہ اس کا لڑکا بھرت گدی پر بیٹھے۔ چنانچہ رانی کیکئی کی خواہش پر منحصر

رام چندر جی کو حکومت سے محروم کر دیا گیا بلکہ ان کو چودہ برس کے لئے جنگلوں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے جلاوطن بھی کر دیا گیا۔

رام چندر جی کا ملک میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ اگر چاہتے تو آن واحد میں حکومت پر قابض ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے ایک طرف ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے اور دوسری طرف باپ کی اطاعت کی ایک غیر فانی مثال قائم کرنے کی غرض سے جلاوطنی کے ناروا حکم کے سامنے گردن جھکا دی اور چودہ برس کے لئے اپنی بیوی سیتا اور بھائی لچھمن کے ہمراہ جنگلوں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نکل گئے۔

رام چندر جی کو اس جلاوطنی کے زمانہ میں کس قدر شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ لنکا کا راجہ راون جو رامچندر جی سے عناد رکھتا تھا۔ زبردستی ان کی اہلیہ سیتا جی کو اُٹھا کر لے گیا۔ اور زمانۂ دراز تک سیتا جی کو نظر بند رکھا۔ آخر رام چندر جی نے پہاڑی اقوام کی ایک فوج بنائی۔ اور پہاڑی سردار ہنومان کی مدد سے راون کے ملک لنکا کو برباد کر ڈالا۔ غرضکہ سیتا جی کو بڑی دشواری کے بعد رہائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد آپ کے بھائی بھرت نے خود ہی آپ کی خدمت میں اجودھیا کی حکومت پیش کر دی جس پر رامچندر جی زمانۂ دراز تک بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

آپ کی حکومت کا زمانہ ہندو نقطۂ نظر سے بہترین زمانہ شمار کیا جاتا ہے رامچندر جی کے بعد یہ خاندان کتنی مدت تک حکومت کرتا رہا۔ اور رامچندر جی کے بعد کون کون سے راجہ ہوئے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

مہابھارت کی جنگ

رامائن کی طرح زمانہ قدیم کی ایک مذہبی کتاب مہابھارت بھی ہے۔ جس میں کوروں اور پانڈوؤں کی جنگ کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ مہابھارت کی یہ تاریخی

جنگ آج سے پانچ ہزار برس قبل ہستناپور کے تخت کے دو دعویداروں میں ہوئی تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ ہستناپور کے راجہ پانڈو کے مرنے کے بعد پانڈو کا بھائی دہرتراشٹر تخت پر بیٹھ گیا۔

دہرتراشٹر کے ایک سو بیٹے تھے جو کوروں کے نام سے مشہور تھے اور پانڈو کے پانچ لڑکے تھے جو پانڈو کہلائے جاتے تھے۔ کوروں کی رہنمائی کے فرائض راجہ دہرتراشٹر کا بڑا بیٹا دریودھن انجام دے رہا تھا۔ اور پانڈو خاندان میں یدھشٹر بھیم اور ارجن کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ پانڈوں کا خیال تھا کہ وہ ہستناپور کے تخت کے جائز وارث ہیں لیکن کوروں کی رائے تھی کہ راجہ پانڈو کی موت اور دہرتراشٹر کے تخت نشین ہونے کے بعد اب ہستناپور کے تخت پر پانڈوؤں کا کوئی حق باقی نہیں رہا چنانچہ کوروں کے لیڈر دریودھن نے پانڈوؤں کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ ہستناپور چھوڑ کر پڑوسی حکومت پنچال میں چلے گئے جہاں کے راجہ درویدنے ارجن کے ساتھ اپنی بیٹی دروپدی کی شادی کردی۔

اس شادی کے بعد چونکہ پانڈوں کی طاقت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے ہستناپور کے راجہ دہرراشٹر نے جنگ سے بچنے کے لئے آدھی سلطنت پانڈوؤں کو دیدی لیکن پانڈوؤں کی بدقسمتی کہ وہ دریودھن کی عیاری کے پھر ایک بار شکار ہوگئے یعنی انھوں نے جوئے میں نہ صرف اپنی حکومت ہار دی بلکہ دروپدی کو بھی ہار بیٹھے۔ اور ان کو پھر ایک بار ہستناپور سے جلاوطن ہونا پڑا۔ اور انھوں نے راجہ مت سیا کی ملازمت کرلی لیکن چند سال کے بعد پانڈوؤں نے پھر اپنی حکومت کی واپسی کا مطالبہ کیا جسے ٹھکرادیا گیا۔ اس پر کوروؤں اور پانڈوؤں میں جنگ چھڑ گئی۔

اس جنگ میں پانڈوؤں کے ساتھ مت سیا۔ یداما۔ پنچال۔ مگدھا۔ چیدی اور بنارس کے راجہ تھے۔ اور کوروں کی حمایت میں کوشل (اودھ) ودا ہار (بہار) انگا

(بھاگلپور) بنگا (بنگال) کالنگا (اُڑیسہ) سندھو۔ گندہرا۔ اور بالکا کے راجہ تھے۔ گویا تقریباً سارے ہی ہندوستان کے راجہ اس جنگ میں کود پڑے تھے۔ یہ جنگِ عظیم دہلی کے قریب کورکشتر کے میدان میں اٹھارہ دن تک لڑی گئی۔ جسمیں بے شمار بہادر کام آئے کوروؤں کا سارا خاندان کٹ گیا۔ اور اس خوفناک لڑائی کے بعد ہستناپور کی حکومت کا تاج پانڈوؤں کے سردار یدہشٹر کے سر پر رکھ دیا گیا۔

مہابھارت کے بعد کا زمانہ | مہابھارت کی جنگ سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل۔ ہندوستان کے کونے کونے میں آریہ نسل کے حکمرانوں کی متعدد حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ مہابھارت کی جنگ میں پانڈوؤں کی طرف سے پانچ اور کوروؤں کی حمایت میں نو راجاؤں نے حصہ لیا تھا۔ گویا۔ چودہ پندرہ راجاؤں کی یہ جنگ تھی۔ اور یہ راجہ ہندوستان کے کسی ایک حصہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک طرف تو سارے شمالی ہند کے راجہ جنگ میں کود پڑے تھے اور دوسری جانب مشرقی ہندوستان یعنی بنگال اور اُڑیسہ تک کے راجہ اس جنگ میں حصہ لے رہے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس زمانہ میں آریہ قوم کے راجاؤں نے پوری طرح سارے ہندوستان پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن جنگ مہابھارت کے بعد کا تقریباً دو ہزار سال کا زمانہ ایسا گزرا ہے جس کے بارے میں تاریخی ثبوت تو در کنار غیر تاریخی مواد بھی نہیں ملتا۔ لیکن یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب پانچ ہزار سال قبل ہندوستان کے مختلف علاقوں میں باقاعدہ طریقہ پر متعدد آریہ حکومتیں قائم تھیں تو اس کے بعد کے زمانہ میں بھی ان حکومتوں نے کافی ترقی کی ہوگی اور ان کا نظامِ حکومت یقینی طور پر پیش رو حکمرانوں سے بہتر ہوگا۔

اس زمانہ کی سیاسی اور تمدنی حالت | جنگ مہابھارت اور مہابھارت

کے زمانہ کے بعد کی سیاسی اور تمدنی حالت کے بارے میں جو مواد فراہم ہو سکا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کی حکومتیں زیادہ تر شخصی ہوتی تھیں۔ بادشاہ کا ہر حکم قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ بادشاہ کے بعد وزیر اور سپہ سالار کا درجہ شمار کیا جاتا تھا۔ فوج کے سپاہیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے شہر بھی آباد ہونے شروع ہو گئے تھے۔ عوام کی سہولت کے لئے سڑکیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ اور کنوئیں بھی کھدوائے جاتے تھے۔ تعلیم کا رواج بہت کم تھا۔ لکھنے کے فن سے لوگ عموماً ناآشنا تھے۔ تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی تھی اور تعلیم کے فرائض برہمن انجام دیتے تھے۔

اُس زمانہ کے مذاہب

اُس زمانہ میں ویدک دہرم یعنی ہندو مذہب کو سب سے زیادہ عروج حاصل تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ویدک دہرم ہی اس زمانہ کے ہندوستان کا واحد مذہب تھا۔ لیکن یہ مذہب صرف برہمنوں ہی تک محدود تھا۔ برہمنوں کے علاوہ دوسرے لوگ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے نااہل شمار کئے جاتے تھے۔ برہمنوں نے چونکہ دہرم اور کرم کے کاموں کو صرف اپنی ذات تک محدود کر لیا تھا۔ اس لئے برہمنوں کے خلاف باغیانہ خیالات اُبھرنے لگے تھے۔ چنانچہ حضرت مسیح کی پیدائش سے تقریباً چھ سو سال قبل دو نئے مذہبی رہنما ہندوستان میں پیدا ہو گئے۔

ان میں سے ایک جین مذہب کے بانی مہاویر جی تھے۔ اور دوسرے گوتم بدھ تھے۔ مہاویر جی لچھوی خاندان کے راجہ سدھارتھ کے فرزند تھے۔ انھوں نے تیس برس کی عمر میں دُنیا کو چھوڑ دیا اور اپنی بقیہ ساری زندگی "جین دہرم" کی تبلیغ اور اشاعت پر صرف کر دی۔ ان کا انتقال ۵۲۷ قبل مسیح ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے چودہ ہزار شاگرد چھوڑے تھے جو اپنے گرو کے نقش قدم پر چلتے رہے۔

گوتم جو بعد کو گوتم بدھ کہلائے کپل وستو کے راجہ شدھودن کے بیٹے تھے۔ یہ نیپال کی سرحد کے قریب کسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی دنیا کو چھوڑ دیا تھا اور گیان سمادھی لگاکر ایک پیپل کے درخت کے نیچے سالہا سال تک عبادت کرتے رہے آخران کو گیان یعنی روحانی فیضان حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے بدھ مذہب کی تبلیغ اور اشاعت عام کردی۔ چنانچہ یہ مذہب اس قدر مقبول ہوا کہ ہندوستان کی سرحدوں سے گذر کر چین اور ایشیا کے دوسرے ممالک تک میں پھیل گیا۔ بدھ مذہب کی اس غیر معمولی مقبولیت کی بنا پر ویدک دھرم اور بدھ مذہب میں ایک رقابت سی شروع ہو گئی لیکن بدھ مذہب اتنا بڑھا کہ ملک میں برہمنوں یعنی ویدک دھرم کے محافظوں کے اثرات بڑی حد تک گھٹ گئے۔

نئی نئی حکومتوں کا قیام

جنگ مہابھارت سے لیکر دو ڈھائی ہزار سال بعد تک کا زمانہ بالکل تاریکی میں ہے۔ اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں کون کون سی حکومتیں بنتی رہیں اور بگڑتی رہیں لیکن حضرت مسیح کی پیدائش سے چھ سو برس قبل کے کچھ غیر مستند واقعات ضرور فراہم ہوسکے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں متعدد قابلِ ذکر حکومتیں قائم تھیں۔

ان میں سے ایک حکومت "گندھار" تھی جس کا دارالسلطنت ٹیکسلا پشاور کے قریب تھا۔ دوسری حکومت "اونتگا" کی تھی۔ اس کا پایۂ تخت اجین تھا۔ تیسری حکومت شمالی اودھ میں قائم تھی جس کا دارالسلطنت سرسوتی تھا۔ کوشلوں نے مشرق میں کاشی کی ریاست کو اور شمال میں شاکیہ قوم کی سلطنت کو فتح کرکے اپنی حکومت کو نیپال کی ترائی تک بڑھا لیا تھا۔ چوتھی حکومت مگدھ یعنی بہار کی تھی جو خوب ترقی کر رہی تھی۔ حکومت مگدھ کا دارالسلطنت پاٹلی پتر یعنی پٹنہ تھا جس نے کہ اس زمانہ میں بہت بڑی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ غرضکہ اس زمانہ میں بہت سی نئی نئی اور

طاقتور حکومتیں عالم وجود میں آچکی تھیں۔

ہندوستان پر ایران کا حملہ

عین اُس وقت جبکہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مندرجہ بالا حکومتیں ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ بیرونی طاقتیں ہندوستان کی زرخیزی سے فائدہ اُٹھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ چنانچہ ایران کے بادشاہ درکشا سپ نے بہت بڑی فوج کے ذریعہ سندھ پر حملہ کر دیا۔

ایران کی حکومت اُس زمانہ میں دُنیا کی طاقتور ترین حکومت شمار کی جاتی تھی اور ایرانی برابر اپنی حکومت کی حدود کو وسعت دیتے چلے جا رہے تھے۔ ہندوستان پر حملہ سے قبل انھوں نے افغانستان کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اس کے بعد بلوچستان اور سندھ میں اپنی فوجیں اُتار دیں۔ بلوچستان اور سندھ کو فتح کرنے کے بعد ۵۱۶ھ قبل مسیح ایرانی امیر البحر سکائی لیکس نے پنجاب کا بھی ایک حصّہ فتح کر لیا۔ پنجاب کی فتح کے بعد ایرانی تمام مفتوحہ علاقوں کو ایران کے زیرنگیں کرنے کے بعد ایران واپس چلے گئے۔ اور اب ایرانیوں کو ہر سال ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں سے ایک بڑی رقم بطور خراج ملنے لگی۔ تقریباً دو سو برس تک یہ علاقے ایران کی حکومت کے ماتحت رہے۔

ہندوستان پر سکندر اعظم کی یورش

جس طرح آرین قوم اور ایرانی ہندوستان کی زرخیزی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تھے بالکل اسی طرح یونان کا بادشاہ سکندر اعظم بھی ہندوستان کی قدرتی دولت پر قبضہ جمانے کے لئے مضطرب اور بے چین تھا چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے سب سے پہلے ایران پر حملہ کر دیا۔

ایران اور یونان میں زمانۂ دراز سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اور اب ایران کی حکومت

بڑی حد تک کمزور بھی ہو چکی تھی لہٰذا ایران سکندرِ اعظم کے حملہ کی تاب نہ لا سکا۔ سکندرِ اعظم نے سنہ ۳۳۱ قبل مسیح ایران کے دار السلطنت پر قبضہ جما لیا۔ اور اس کے بعد سارا ایران سکندرِ اعظم کے قبضہ میں آ گیا۔

ایران کی فتح کے بعد سکندرِ اعظم نے افغانستان اور ہندوستان کے ان علاقوں کی جانب رُخ کیا جو تقریباً دو سو برس تک ایران کے زیرِ نگیں رہے تھے۔ چنانچہ سکندر کابل۔ سوات اور سرحدی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد سنہ ۳۲۶ قبل مسیح دریائے سندھ کو پار کر کے ٹیکسلا کی جانب بڑھا۔ جو اس زمانہ کا سب سے بارونق شہر تھا۔ ٹیکسلا کے راجہ نے سکندر کا نہایت ہی پُرجوش طریقہ پر خیر مقدم کیا اور اسے خیر مقدم کرنا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ اسی نے اپنے حریف راجہ پورس اور اس کی حکومت کو سکندر کے ہاتھوں ختم کرانے کے لئے سکندر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ غرضکہ ٹیکسلا کے راجہ نے سکندر کا صرف خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ پنجاب کے راجہ پورس پر حملہ کرنے کے لئے سکندر کو ہر ممکن فوجی امداد بھی دی۔

سکندر اور پورس کی جنگ

سکندر اور اس کی یونانی فوج نے چند روز ٹیکسلا میں قیام کے بعد پورس کو پیغام بھیجا کہ یا تو پورس سکندر کی اطاعت قبول کر لے۔ ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جائے پورس ایک نہایت ہی حوصلہ مند اور بہادر راجہ تھا۔ اس نے سکندر کا اعلانِ جنگ قبول کر لیا۔ اور صاف الفاظ میں سکندر کو مقابلہ کی دعوت دیدی چنانچہ سکندر اور پورس کی فوجوں کا مقابلہ دریائے جہلم کے کنارے شروع ہو گیا۔

پورس کی فوج میں تیس ہزار پیدل۔ چار ہزار سوار۔ تین سو رتھ اور دو سو ہاتھی تھے۔ دونوں حکمرانوں میں سخت ترین مقابلہ ہوا لیکن پورس کو محض اس بنا پر شکست ہو گئی۔ چونکہ پورس کے ہاتھیوں نے بگڑ کر خود اپنی ہی فوج کو

کچل ڈالا تھا لیکن اس بے اندازہ نقصان کے باوجود پورس بڑی مردانگی کے
ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہونے کے بعد گرفتار ہو گیا۔
سکندر اعظم جو بہادروں کی قدر کرتا تھا اس کے دل پر پورس کی شجاعت کا بے حد اثر
ہوا۔ اور اس نے پورس کو اس کی حکومت واپس کر کے اپنا دوست بنا لیا۔ اس کے بعد
سکندر مگدھ یعنی بہار کی حکومت کو فتح کرنے کے لئے مشرق کی جانب بڑھا لیکن راستہ ہی میں
اس کی فوج نے ہمت ہار دی۔ اب سکندر کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔
کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ چنانچہ سکندر راجہ پورس اور راجہ ٹکسلا کو اپنا قائم مقام مقرر
کرنے کے بعد ایران کے راستہ یونان کو روانہ ہو گیا لیکن راستہ کی تکالیف نے سکندر کو بیمار
کر دیا اور یہ بیماری اس قدر بڑھی کہ سکندر بابل کے مقام پر ۳۲۳ قبل مسیح ۳۲ برس کی عمر
میں راستہ ہی میں موت کا شکار ہو گیا۔

آریوں کی یورش سے سکندر کے حملہ تک

ہندوستان پر آرین قوم کی یورش سے لیکر سکندر اعظم کے حملہ تک

ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان تھوڑے وقفہ کے بعد برابر
بیرونی حملہ آوروں کی عنایتوں کا شکار بنتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم ہندوستانی
تاریخ ہم کو یہ بھی بتاتی ہے کہ اس برِ عظیم میں جو متعدد حکومتیں قائم تھیں وہ بری طرح سے
خانہ جنگی کے مرض میں مبتلا تھیں۔ اور یہ خانہ جنگی ہی بیرونی حملہ آوروں کے لئے باعث
ترغیب بنتی رہی ہے لیکن اس سب کے باوجود اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ
ہندوستان کے قدیم زمانہ کی اکثر و بیشتر حکومتیں عوام کے فائدہ کے لئے بہت
کچھ کرتی رہی ہیں۔ اور ان حکومتوں نے ہندوستان کے تمدن اور معاشرت کے بلند
کرنے میں زمانہ سابقہ کے مطابق کافی حصہ لیا ہے۔
یہ حقیقت ہے کہ جب آرین قوم شروع میں ہندوستان میں داخل ہوئی تو ہندوستانی

کے قدیم باشندے یعنی دراوڑ نیم وحشیوں کی سی زندگیاں گذارتے تھے۔ نہ یہاں باقاعدہ حکومتیں تھیں اور نہ کوئی نظام حکومت۔ بس دراوڑ قوم کے سرداروں نے چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اس کے علاوہ دراوڑ قوم فنِ جنگ میں بھی بہت پیچھے تھی لیکن آرین قوم کے ہندوستان میں آنے کے بعد یہاں باقاعدہ حکومتوں کے بننے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور یہاں ایسی ایسی مضبوط حکومتیں قائم ہوئیں جو سکندر جیسے آزمودہ کار جرنل سے بھی بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔

دوسرا باب

ہندوستان کے ممتاز ہندو اور بودھ حکمران

سنہ ۳۲۱ قبل مسیح تا سنہ ۶۴۷ عیسوی

ممتاز ہندو اور بودھ حکمراں

سکندرِ اعظم کا حملہ جہاں ہندوستان کے لئے ایک مصیبت تھا وہاں اس حملہ کے بعد ہندوستانیوں میں یہ بھی احساس پیدا ہونے لگا کہ ہندوستان میں ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کی جائے جو بڑی حد تک اس ملک کو بیرونی حملہ آوروں کی یورش سے محفوظ رکھ سکے۔

موریہ خاندان کی حکومت

چندر گپت موریہ ہندوستان کا پہلا راجہ ہے جس نے ہندوستان میں ایک نہایت ہی مضبوط حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ چندر گپت کا باپ مگدھ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کی ماں مورا نامی ایک شودر لڑکی تھی چنانچہ چندر گپت کی حکومت چندر گپت کی ماں مورا ہی کی وجہ سے موریہ کہلائی۔

چندر گپت شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود چونکہ ایک اچھوت عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اسلئے مگدھ کی حکومت میں اسکے لئے کوئی جگہ نہ تھی اس غریب کو اوائل عمری میں مگدھ کے راجہ مہاپدم نند نے اچھوت عورت کے پیٹ سے جنم لینے کے جرم میں اپنی حکومت سے جلاوطن کر دیا تھا۔ یہ بیچارہ جلاوطن ہونے کے بعد پنجاب چلا گیا۔ سکندر کے حملہ کے وقت چندر گپت پنجاب ہی میں تھا۔

سکندر کی موت کے بعد جب پنجاب میں طوائف الملوکی پھیلی تو اس نے پنجاب میں اپنی حکومت کے قیام کا ارادہ کیا۔ اور چانکیہ نامی برہمن کی مدد سے جو اس زمانہ کا بہت بڑا مدبر تھا۔ فوج فراہم کی اور فوراً ہی سارے پنجاب پر ۳۲۱ قبل مسیح میں تسلط جما لیا اور چانکیہ کو وزیر کا عہدہ تفویض کر کے پنجاب

میں باقاعدہ حکومت قائم کرلی۔

چندر گپت کو چونکہ محض ایک اچھوت عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے کے جرم میں مگدھ سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ اس لئے مگدھ کے راجہ کے خلاف چندر گپت کے دل میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ چنانچہ پنجاب پر قبضہ جمانے کے فوراً ہی بعد چندر گپت نے مگدھ کے راجہ مہاپدم نند کی حکومت پر ایک بڑی فوج کے ذریعہ حملہ کر دیا۔ مگدھ کے راجہ کو شکست ہوگئی اور چندر گپت نے راجہ کو تخت سے معزول کرنے کے بعد مگدھ کی وسیع حکومت کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد چندر گپت نے شمالی ہند کی دوسری حکومتوں کو فتح کرکے اپنی حکومت کو خوب وسعت دی۔

یونانیوں نے جب ۳۰۵ قبل مسیح یونانی جرنل سیلوکس کی سرکردگی میں ہندوستان پر دوبارہ یورش کی تو چندر گپت کو یونانیوں سے شدید مقابلہ کرنا پڑا تھا سیلوکس سکندر اعظم کا سپہ سالار تھا جس نے سکندر کے مرنے کے بعد شام میں اپنی حکومت قائم کرکے اُسے کوہ ہندوکش تک بڑھا لیا تھا۔ ۳۰۵ قبل مسیح سیلوکس نے سکندر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دریائے سندھ کو عبور کرکے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ لیکن چندر گپت نے حوصلہ مندی سے مقابلہ کرنے کے بعد اُس کو شکست دیدی شکست کے بعد سیلوکس اور چندر گپت میں نہ صرف صلح ہوگئی۔ بلکہ سیلوکس نے اپنی لڑکی کی چندر گپت سے شادی بھی کر دی۔ سیلوکس نے اپنی لڑکی کے جہیز میں کابل ہرات اور قندھار کا علاقہ دیدیا۔ اس طرح چندر گپت کی حکومت کوہ ہندوکش تک پھیل گئی تھی۔

چندر گپت نے ۳۲۱ قبل مسیح میں موریا خاندان کی بنیاد رکھی تھی اور وہ ۲۹۷ قبل مسیح یعنی ۲۴ سال تک اس حکومت کی تعمیر میں مصروف رہا۔ چندر گپت کی حکومت

ہندوستان کی پہلی حکومت تھی جس کو غیر معمولی وسعت حاصل ہوئی۔ ورنہ چندر گپت سے قبل ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔

چندر گپت کا بہترین نظام حکومت

چندر گپت کا نظامِ حکومت اُس زمانہ کے لحاظ سے بہترین نظام حکومت تھا۔ چنانچہ سیلوکس کے یونانی سفیر مقیم ہند میگا ستھنیز نے چندر گپت کے دور حکومت کے جو واقعات قلمبند کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ چندر گپت نے اپنی بہت بڑی حکومت کو پانچ صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہر صوبہ کا ایک گورنر ہوتا تھا۔ اور ہر صوبہ مختلف اضلاع میں تقسیم تھا۔ اور ہر ضلع کا ایک افسر ہوتا تھا۔ رعایا سے پیداوار کا چوتھائی حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ عوام پر ٹیکس نہ ہونے کے برابر تھے۔ زراعت کی ترقی کے لئے نہریں بنوائی گئی تھیں۔ سڑکیں ملک میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ جن پر مسافروں کے آرام کے لئے درخت لگوائے گئے تھے۔ کنوئیں کھدوائے گئے تھے۔ اور سرائیں تعمیر کرائی گئی تھیں۔

جرائم کے انسداد کے لئے نہایت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ مجرموں کے ہاتھ اور پاؤں تک کٹوا دئے جاتے تھے۔ ان سخت سزاؤں کا یہ اثر تھا کہ ملک چوری کی لعنت سے بڑی حد تک پاک تھا۔ لوگوں کو اپنے گھروں اور مکانوں میں تالے تک لگانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ حکومت کی جانب سے دستکاروں کی خوب ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ غرضکہ چندر گپت نے اپنی حکومت کو صرف وسعت ہی نہیں دی۔ بلکہ اس کا نظام حکومت بھی اُس زمانہ کے اعتبار سے بہترین تھا۔

چندر گپت کا پوتا مہاراجہ اشوک

۲۹۷ قبل مسیح میں چندر گپت کے مرنے کے بعد چندر گپت کا بیٹا بندوسار تخت پر بیٹھا۔ جو ۲۷۲ قبل مسیح تک یعنی ۲۵ سال حکومت کرتا رہا۔ لیکن بندوسار نے

اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ اُس نے چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد اُنھیں اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔

بندوسار کی موت کے بعد بندوسار کا چھوٹا بیٹا اشوک وردھن ۲۷۲ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ اشوک کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے تخت حاصل کرنے کے لئے نہ صرف اپنے باپ بندوسار کو قتل کر دیا تھا۔ بلکہ اپنے بڑے بھائی سوساما اور دوسرے سب بھائیوں کو بھی تہہ تیغ کرا دیا تھا لیکن تخت پر بیٹھنے کے بعد مہاراجہ اشوک نے جس قابلیت کے ساتھ حکومت کی ہے۔ اس کی مثال ہندو تاریخ میں ملنی ناممکن ہے۔

مہاراجہ اشوک ایک طرف بہترین سپہ سالار تھا۔ دوسری جانب بہترین منتظم اور مدبر۔ چنانچہ اس نے اپنے چالیس سالہ دورِ حکومت میں عوام کی بہبودی کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ اس کے دورِ حکومت کو ایک تمثیلی دورِ حکومت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مہاراجہ اشوک کو یوں تو بہت سی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنی پڑیں لیکن سب سے بڑی لڑائی جو مہاراجہ اشوک نے لڑی وہ کالنگا یعنی اڑیسہ کی جنگ تھی۔ چنانچہ مہاراجہ اشوک نے کالنگا پر جو ایک خود مختار ریاست تھی ۲۶۱ قبل مسیح ایک جرار فوج کے ذریعہ حملہ کر دیا۔ اور ایک خوفناک جنگ کے بعد کالنگا یعنی اُڑیسہ کو فتح کرنے کے بعد اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس جنگ میں ڈیڑھ لاکھ آدمی قید ہوئے۔ ایک لاکھ مارے گئے اور لاکھوں خانماں برباد ہو گئے۔

اس قتل و خون اور غارتگری کا مہاراجہ اشوک کے دل و دماغ پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ مہاراجہ کو جنگ سے نفرت ہو گئی۔ اور مہاراجہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہی ہو وہ آئندہ کبھی جنگ نہیں کریگا۔ اور اپنی بقیہ زندگی خلقِ خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دیگا۔ غرضکہ اس تبدیلی قلب کے بعد اشوک کو خلقِ خدا کی خدمت اور مذہبی کاموں

میں ایک کیف سا محسوس ہونے لگا اور وہ بدھ مذہب اختیار کرنے کے بعد اس کا پکا پیرو بن گیا۔ اسے بدھ مذہب اس لئے پسند تھا کیونکہ بدھ مذہب کا عدم تشدد کا اصول اور خدمتِ خلق کی تعلیم عین اس کے مزاج کے مطابق تھی۔

بدھ مذہب کی ترقی

اشوک کے بدھ مذہب میں داخل ہونے کے بعد اس مذہب کو بے حد عروج حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو بدھ مذہب حکومت کا مذہب بن گیا تھا۔ دوسرے مہاراجہ اشوک نے اس مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ خود مہاراجہ اشوک بدھ مذہب کے مقدس مقامات پر جاتا تھا تاکہ عوام میں اس مذہب سے گہری دلچسپی پیدا ہو۔ اس کے علاوہ مہاراجہ اشوک نے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مستقل پروگرام بنا رکھا تھا جس پر بڑی باقاعدگی کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔

بدھ مذہب کے مبلغ چین۔ جاپان۔ لنکا۔ مصر۔ شام۔ یونان اور تمام بیرونی ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ مہاراجہ اشوک نے بدھ مذہب کی تعلیم کے لئے بے شمار کتابیں تصنیف کرائیں۔ بدھ مذہب میں چونکہ اہنسا سب سے بڑا اصول ہے اس لئے انسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جانوروں تک پر ظلم کرنا خلافِ قانون قرار دیدیا گیا۔ جانوروں کی قربانی گناہِ عظیم سمجھی جانے لگی۔ خود مہاراجہ اشوک نے شکار اور گوشت کھانا موقوف کر دیا۔

بدھ مذہب کے پھیلنے کے بعد چونکہ عوام ہندو دھرم کے ماننے والوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے اور ملک میں بدھ اور غیر بدھ کا نیا فتنہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس لئے مہاراجہ اشوک نے دوسرے مذاہب کے احترام کے لئے خاص احکامات جاری کئے اور دوسرے مذاہب کی توہین کرنے والوں کو

سنگین سزائیں دیں جس کے بعد یہ فتنہ بڑی حد تک دب گیا۔

مہاراجہ اشوک کی ساری عمر یہ کوشش رہی کہ اس کی حکومت کے باشندوں کا اخلاق نہایت بلند ہو۔ اور ان کو ایسی تعلیم دی جائے کہ قانون کے خوف کے بغیر خود بخود ان کو بدکاری۔ دروغگوئی۔ شراب خواری، چوری اور دیگر مذموم افعال سے نفرت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے بدھ واعظ ملک کے کونے کونے میں لوگوں کو پند و نصائح کرتے پھرتے تھے۔ اور ان پند و نصائح کا عوام کے اخلاق پر نہایت ہی اچھا اثر پڑا۔ غرضکہ عوام میں بُرے کاموں سے نفرت اور اچھے کاموں سے رغبت اشوک کے زمانہ میں عام تھی۔ انسانی ہمدردی، صداقت شعاری، دیانتداری اور دوسروں کی عزت کرنا ہر شخص اپنے لئے فرض خیال کرنے لگا۔

اشوک ہندوستان کا پہلا اور آخری بدھ راجہ ہے جس نے ملک گیری کی ہوس کو ترک کر کے انسانوں کو انسان بنانے کا وہ اہم فرض انجام دیا جو صرف مذہبی اوتار ہی انجام دیا کرتے ہیں۔ مہاراجہ اشوک نے ملک کے کونے کونے میں مینار بنوا کر ان پر عوام کے فائدے کے لئے مفید تعلیمات درج کرائیں۔ تاکہ راہ چلتے مسافر بھی ان تعلیمات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اشوک کی حکومت میں خوشحالی

مہاراجہ اشوک کی حکومت ایک نہایت ہی عظیم الشان حکومت تھی جو شمال میں کشمیر۔ نیپال اور افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ مغرب میں بلوچستان۔ سندھ گجرات اور مالوہ کے علاقے اس حکومت میں شامل تھے۔ مشرق میں بنگال اور اڑیسہ تک اس حکومت کو وسعت حاصل تھی اور جنوب میں۔ بنگلور۔ شمالی مدراس اندھرا تک یہ حکومت پھیل چکی تھی۔ صرف مدراس کا کچھ جنوبی علاقہ جو چیرا۔ چولا۔ پانڈیا

کہلاتا تھا شامل نہ تھا۔ ان علاقوں پر ہندوستان کے قدیم باشندے دراوڑ حکومت کر رہے تھے۔

سلطنت کا انتظام نہایت مکمل تھا۔ مرکزی حکومت پاٹلی پتر یعنی پٹنہ میں قائم تھی جس کے ماتحت تمام صوبے تھے۔ ہر صوبہ ایک گورنر کے ماتحت تھا۔ اور گورنر کے ماتحت ضلعوں۔ شہروں اور قصبوں کے حکام نہایت باقاعدگی کے ساتھ فرائض انجام دے رہے تھے۔ فوجداری اور دیوانی عدالتیں ہر جگہ قائم تھیں۔ بڑے بڑے شہروں میں میونسپل نظام بھی قائم تھا۔ بڑی بڑی سڑکیں سایہ دار درختوں سے ڈھکی ہوئی سائے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر مسافر خانوں اور کنوؤں کا انتظام تھا جا بجا شفا خانے اور یتیم خانے بھی قائم تھے۔ ملک کے اندرونی نظم کو قائم رکھنے کے لئے پولیس اور جاسوسوں یعنی خفیہ پولیس کا بھی جال پھیلا ہوا تھا تعلیم کے لئے بے شمار مدارس کھلے ہوئے تھے۔ بدھ مذہب کے مندروں سے بھی درس و تدریس کا کام لیا جاتا تھا۔ رعایا نہایت خوشحال تھی۔ کیونکہ ایک طرف صنعت و حرفت کے معاملہ میں ملک کافی ترقی کر رہا تھا۔ دوسری جانب خشکی کے راستہ سے وسط ایشیا اور یورپ تک سے نہایت وسیع پیمانہ پر تجارت کی جا رہی تھی۔ غرضکہ اشوک کے زمانہ کا ہندوستان ہر لحاظ سے ایک قابلِ فخر ہندوستان تھا

اشوک کے بعد ہندوستان کے ٹکڑے

مہاراجہ اشوک چالیس سال حکومت کرنے کے بعد ۲۳۲ قبل مسیح میں فوت ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے کمزور جانشین اتنی بڑی حکومت کو نہ سنبھال سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موریہ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا اور ملک میں متعدد خود مختار ریاستیں قائم ہو گئے بعد ہندوستان بہت سے ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۵ قبل مسیح موریہ خاندان کا آخری راجہ برادرتھ جب اپنے ہی سپہ سالار پشپ متر

کے ہاتھوں قتل ہوا تو یہ حکومت بالکل ختم ہو گئی۔

خاندان سنگا۔ کنو اور حکومت اندھرا

موریہ خاندان کے سپہ سالار پشپ متر نے ۱۸۵ قبل مسیح موریہ حکومت کے آخری راجہ برادرتھ کو تہہ تیغ کرنے کے بعد مگدھ کے تخت پر قبضہ کرلیا اور اپنے خاندان کی ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جو سنگا خاندان کے نام سے مشہور ہے لیکن سنگا خاندان کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔

پشپ متر ہی کے عہدِ حکومت میں باختریہ کا بادشاہ مینینڈر کابل اور پنجاب کو فتح کرنے کے بعد ۱۵۳ قبل مسیح مگدھ کی حکومت پر حملہ آور ہوا تھا۔ مگر پشپ متر نے اُسے پسپا کر دیا تھا۔ پشپ متر تقریباً ۳۵ سال حکومت کرنے کے بعد جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا اگنی متر تخت نشین ہوا لیکن یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اگنی متر نے کب تک حکومت کی بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ سنگا خاندان کا آخری راجہ دیوبھوتی تھا جس کو ۷۳ قبل مسیح اس کے وزیر واسدیو کنو نے قتل کر دیا۔ اور اپنی حکومت قائم کر لی۔

سنگا خاندان کے خاتمہ کے بعد کنو خاندان نے تقریباً ۴۵ برس مگدھ پر حکومت کی لیکن اس خاندان کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند کے اندھرا خاندان کے ایک راجہ نے ۲۸ قبل مسیح حکومت مگدھ پر فوج کشی کی اور کنو خاندان کے آخری راجہ سے تخت چھین لیا۔

خاندان اندھرا کی تقریباً تین سو سال مگدھ اور مشرقی ہندوستان پر حکومت رہی سلطنت اندھرا ایک نہایت ہی مضبوط حکومت تھی۔ جو جنوبی ہند میں قائم کی گئی تھی۔ اس میں دکن کا مشرقی حصہ اور تلنگانہ بھی شامل تھے۔ اس سلطنت نے نہ صرف جنوبی ہند میں بلکہ شمالی ہند میں بھی حکومت مگدھ پر قبضہ جمانے کے بعد خوب عروج حاصل

کیا۔ چنانچہ یہ حکومت تیسری صدی عیسوی تک شمالی ہند پر حکمرانی کرتی رہی ہے۔

بیرونی حملہ آوروں کی نئی حکومتیں

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مہاراجہ اشوک کے دورِ حکومت سے قبل ایرانی اور
یونانی ہندوستان پر برابر حملے کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اشوک کے دادا چندر گپت
کے دورِ حکومت میں سکندرِ اعظم کے سپہ سالار سیلوکس نے بھی ہندوستان پر ایک ناکام
حملہ کیا تھا لیکن ان حملوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔

باختریہ میں سیلوکس کے پوتے نے جو حکومت قائم کی تھی۔ اُس کے آگے
چل کر دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ جن میں سے ایک باختریہ حکومت کہلائی۔ اور دوسری
پارتھیا گورنمنٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان دونوں ہی حکومتوں نے سکندر اور سیلوکس
کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہندوستان پر برابر یورشیں کی ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ اشوک
کے مرنے کے بعد جب پنجاب اور کابل کے سرداروں نے حکومت مگدھ کے
خلاف بغاوت کا اعلان کیا تو باختریہ حکومت کے حکمرانوں نے ہندوستانیوں
کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھا کر پہلے تو کوہ ہندوکش کو عبور کیا۔ اس کے بعد کابل
اور پنجاب پر قبضہ جمالیا۔ باختریہ حکومت کا ایک حکمران مینینڈر تو یہ چاہتا تھا کہ وہ
سارے ہی ہندوستان پر قابض ہو جائے لیکن سنگا خاندان کے راجہ پشپ متر
نے اس کو شکست دیکر اس کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

مینینڈر کے مرنے کے بعد اس کے جانشین نہایت کمزور ثابت ہوئے
اور آخر کار باختریہ حکومت کی دوسری شاخ پارتھیا گورنمنٹ نے باختریہ حکومت
کے آخری حکمران ہرمیکس کو تخت سے اُتار کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور اب باختر
خاندان کی بجائے پارتھیا خاندان کابل۔ سندھ اور پنجاب کا حکمران بن گیا۔ لیکن اس
کے بعد یکایک ایک مضبوط چینی قبیلہ۔ شاک۔ یوچی وسطی ایشیا میں پھیلنا شروع

ہوا جس نے کہ پارتھیا حکومت کو جڑ بُنیاد سے اُکھاڑ کر پھینکدیا۔ یہ قبیلہ "خاندان کشاں" کے نام سے مشہور ہے۔ جوں ہی پارتھیا خاندان کے زوال کے بعد ان کو طاقت حاصل ہوئی۔ یہ بھی ہندوستان پر چڑھ دوڑے۔ اور انھوں نے بھی باختریوں اور پارتھیوں کی طرح سندھ تک اپنا قبضہ جمالیا۔

کشاں خاندان کا سب سے مشہور حکمراں کنشک تھا۔ اس کا دارالسلطنت پشپ پور یعنی موجودہ پشاور تھا یعنی کشاں خاندان نے باقاعدہ ہندوستان پر حکومت شروع کردی تھی کنشک بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ اس نے اپنی کشاں حکومت کو کشمیر اور دوسرے علاقے فتح کرنے کے بعد دُور دُور تک پھیلا دیا تھا۔ کنشک کے مرنے کے بعد ۱۶۲ء میں اس کا لڑکا ہوشنک تخت پر بیٹھا لیکن ہوشنک کے مرنے کے بعد کشاں حکومت تقریباً ختم ہوگئی۔ غرضکہ بیرونی حملہ آور اُس زمانہ میں نہ صرف ہندوستان پر متعدد حملے کرتے رہے ہیں بلکہ انھوں نے ہندوستان پر یورش کے بعد اپنی باقاعدہ حکومتیں بھی قائم کرلی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ حکومتیں دیرپا ثابت نہ ہوسکیں۔

ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور

خاندان اندہرا اور خاندان کشاں کی حکومتوں کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں ایک صدی سے بھی زیادہ طوائف الملوکی کا دور دورا رہا جس سردار کو بھی موقع ملتا تھا۔ وہ ایک محدود علاقہ میں اپنی چھوٹی سی خانہ ساز حکومت قائم کرلیتا تھا۔ اس طرح ہندوستان میں بے شمار ناقابل ذکر حکومتیں قائم ہوچکی تھیں لیکن ان حکومتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی حکومت نہیں تھی جس کی جانب توجہ کی جاسکے۔

گپت خاندان کی حکومت

عین اُس زمانہ میں جبکہ ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور تھا چندر گپت

اوّل نے ۳۲۰ء میں پاٹلی پتر یعنی پٹنہ میں تخت نشین ہونے کے بعد اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیا۔ چندر گپت نے بہت تھوڑے عرصہ میں نام نہاد راجاؤں کی خانہ ساز حکومتوں کو کچل ڈالا۔ اور اپنی حکومت کو ترہت۔ اودھ اور بہار تک وسیع کر لیا۔ چندر گپت تقریباً پندرہ برس تک بڑی قابلیت سے حکومت کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔

چندر گپت کی اولاد کی حکومت

گپت حکومت کے بانی چندر گپت اوّل اور اس کی اولاد نے تقریباً تین سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ چندر گپت اوّل کے بعد اس کا بیٹا سمندر گپت اپنے باپ کی وفات کے بعد ۳۳۵ء میں تخت پر بیٹھا اور ۳۷۵ء تک چالیس سال حکومت کرتا رہا۔ سمندر گپت نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ اس نے دکن کی سلطنتوں کو فتح کرنے کے بعد ان سے باقاعدہ خراج وصول کیا اور اسے تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے شہنشاہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

سمندر گپت کے مرنے کے بعد ۳۷۵ء میں سمندر گپت کا بیٹا چندر گپت دوم تخت نشین ہوا جس نے بعد کو بکرماجیت کا لقب اختیار کیا۔ بکرماجیت نے مالوہ گجرات۔ سوراشٹر وغیرہ کے علاقوں کو جن پر شاک خاندان کے راجہ حکومت کرتے تھے۔ فتح کر لیا۔ اور شاکوں کی حکومت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ مہاراجہ بکرماجیت نے مالوہ اور دوسرے علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کے بعد بجائے پٹنہ کے اجودھیا کو دارالسلطنت قرار دیا اور اس کے بعد ۴۰۹ء میں سانچی نامی مقام کو دارالحکومت بنایا تاکہ آسانی کے ساتھ تمام مفتوحہ علاقوں پر حکومت کی جا سکے۔

گجرات اور کاٹھیاواڑ کی فتح سے ایک بڑا فائدہ اسے یہ پہنچا کہ تمام سمندری تجارت بکرماجیت کے ہاتھ میں آ گئی۔ جس سے حکومت کی آمدنی میں بے حد اضافہ

ہوگیا۔ مشہور چینی سیاح فاہیان راجہ بکرماجیت ہی کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا جس نے راجہ بکرماجیت کے دورِ حکومت کی بے حد تعریف کی ہے۔

بکرماجیت تقریباً ۳۸ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کمارگپت ۴۱۳ء میں تخت پر بیٹھا اور نہایت ہی پُرامن طریقہ پر ۴۵۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ کمارگپت کے مرنے کے بعد ۴۵۵ء میں کمارگپت کے بیٹے اسکندر گپت نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی لیکن اسکندر گپت حکومت کو نہ سنبھال سکا۔ اور گپت خاندان کی حکومت جو زوال پذیر ہو چکی تھی۔ اسکندر گپت ہی کے زمانہ میں ختم ہو گئی۔

منگولیا کی ہون قوم کا حملہ

ہندوستان ابتداء ہی سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ اس پر گپت خاندان کی حکومت کے زوال کے ساتھ ہی ۴۵۵ء میں منگولوں نے حملے شروع کر دئے۔ اور بری طرح تباہی مچائی۔ منگول جو ہون قوم کے نام سے مشہور تھے۔ وسط ایشیا سے بڑھتے بڑھتے یورپ و ایشیا کے اکثر علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ چنانچہ ان کے حملوں کی تاب نہ لا کر گپت خاندان کی حکومت کا ہندوستان میں بالکل خاتمہ ہو گیا۔

منگول برابر ۴۵۵ء سے لیکر ۵۰۰ء تک وقتاً فوقتاً ہندوستان پر حملہ کر کے لوٹ مار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۵۰۰ء میں ہون قوم کا ایک منگول سردار تورمان مالوہ میں باقاعدہ اپنی حکومت قائم کر کے مالوہ کا راجہ بن گیا تورمان کا بیٹا مہرکل مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن وہ حکومت کرنے کا اہل ثابت نہ ہو سکا اس نے اپنے ظلم و ستم سے سارے مالوہ کو اپنے خلاف بغاوت کے لئے کھڑا کر لیا۔ چنانچہ ۵۲۸ء میں راجہ یشودھرمن نے مگدھ کے راجہ بالادت کی مدد

سے لہر کل کو ملتان کے قریب شکست دیکر مالوہ کے باشندوں کو اس ظالم راجہ کے پنجہ سے نجات دلائی۔ ہر کل شکست کھانے کے بعد کشمیر بھاگ گیا اور ہر کل کی شکست کے ساتھ ہی منگولیا کی ہون قوم کی مختصر سی حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ ہو گیا۔

وردھن خاندان کا عروج

مالوہ کے آخری منگول راجہ ہر کل کی شکست کے بعد مالوہ کی حکومت جو اس زمانہ میں ایک طاقتور حکومت شمار کی جاتی تھی کمزور ہو گئی۔ اس حکومت کے کمزور ہوتے ہی تھانیسر کے راجہ پربھاکر وردھن نے جو حکومت مالوہ کا ایک ماتحت راجہ تھا۔ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ۶۰۵ء میں پربھاکر وردھن کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا راج وردھن تخت پر بیٹھا۔ راج وردھن نے سب سے پہلے ہون قوم کے جو اثرات اور بااثر لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ان کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد قنوج پر چڑھائی کی۔ قنوج اس زمانہ میں حکومت مالوہ کا ایک صوبہ تھا چنانچہ راج وردھن نے مالوہ کے راجہ کو اس جنگ میں شکست دینے کے بعد قنوج کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ پھر اس کے بعد راج وردھن نے بنگال پر فوج کشی کی لیکن بنگال میں نہایت عیاری کے ساتھ ایک سازش کے ماتحت اُسے قتل کر دیا گیا۔

راج وردھن کی موت کے بعد ۶۰۶ء میں اس کا چھوٹا بھائی ہرش وردھن تخت پر بیٹھا۔ اور تخت پر بیٹھتے ہی فوراً بنگال پر حملہ کرنیکے بعد بنگال کے راجہ کو شکست دیدی اور بنگال کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ ہرش وردھن جو اپنے زمانہ کے مشہور ترین حکمرانوں میں سے ہوا ہے۔ اس نے بہت جلد وردھن خاندان کی حکومت کو ہندوستان میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا۔ گپت خاندان کی حکومت کے بعد یہ پہلی حکومت تھی جو ہندوستان کے بیشتر حصہ پر حاوی تھی۔

ہرش وردھن کے زمانہ میں یہ حکومت کس قدر وسعت اختیار کر چکی تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نیپال اور کامروپ تک یہ حکومت پھیلی ہوئی تھی سنہ ۶۲۰ء میں ہرش وردھن نے دکن کی چالوکیہ حکومت پر بھی حملہ کیا تھا لیکن اس حملہ میں وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہرش وردھن نے قنوج کو اپنا دار السلطنت بنا لیا تھا۔ جہاں اُس نے بے شمار عمارتیں۔ تالاب اور مندر بنوائے اور بدھ مذہب کی بہت سی خانقاہیں تعمیر کرائیں۔

چینی سیاح ہوان سانگ جو ہرش وردھن کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے ہرش وردھن کو اپنے زمانہ کا شہنشاہ قرار دیا ہے۔ اس سیاح کا بیان ہے کہ بیس پچیس چھوٹے بڑے راجہ ہرش وردھن کے ماتحت تھے۔ ہرش وردھن اگرچہ بدھ مذہب کا پیرو تھا لیکن اس نے ہندو مذہب کے مقلدوں کو بھی اپنی حکومت میں پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ہرش وردھن کا نظام حکومت نہایت مکمل تھا۔ رعایا خوشحالی کی زندگی گذارتی تھی۔ اس کے زمانہ میں مجرموں کو بہت سخت سزائیں دی جاتی تھیں تعلیم کا بھی بہت اچھا انتظام تھا۔ ہرش وردھن ایک اچھا شاعر اور مصنف بھی تھا۔ ہرش وردھن نے ۶۴۷ء میں وفات پائی۔ اُس کے مرنے کے بعد اس کے جانشین حکومت کو نہ سنبھال سکے چنانچہ سارے ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ اور یہ حکومت ہرش وردھن کی موت کے فوراً ہی بعد ختم ہو گئی۔

ہندو مذہب کی حالت

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو پتہ چلتا ہے کہ بدھ مذہب کی ابتدا سے لیکر مہاراجہ ہرش وردھن کی وفات تک جو بارہ سو برس گزرے ہیں۔ ان بارہ سو برس میں ہندو مذہب۔ بدھ مذہب کے سیلاب میں دب کر رہ گیا تھا۔ یوں تو بدھ مذہب کو ابتدا ہی سے کافی عروج حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن مہاراجہ

اشوک کے دورِ حکومت سے لیکر مہاراجہ ہرش وردھن کے دورِ حکومت تک یعنی تقریباً نوسو برس تو بدھ مذہب کی حالت یہ رہی ہے کہ یہ ہندوستان اور اس کے گرد و نواح کے ممالک کا واحد مذہب بنا رہا۔ چنانچہ چینی سیاح ہوان سانگ جو ۶۴۵ء تک پندرہ سال ہندوستان میں رہا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بدھ مذہب کے مقابلہ میں تمام دیگر مذاہب نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں بھی ماند پڑ چکے تھے۔ ہوان سانگ لکھتا ہے کہ افغانستان میں بدھ مذہب کے پیرو بے شمار تھے۔ اسی طرح دوسرے ہمسایہ ممالک میں بھی بدھ مذہب انتہائی عروج پر تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ گپت خاندان کے بعض راجاؤں کے زمانہ میں ہندو مذہب کی سرپرستی کسی قدر شروع ہو گئی تھی لیکن بدھ مذہب کیونکہ صدیوں سے حکومت کا مذہب چلا آرہا تھا۔ اس لئے گذشتہ نوسو برس میں ہندو مذہب کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

تیسرا باب

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

۲۶ھ/۶۴۷ء تا ۹۳ھ/۷۱۲ء

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں جبکہ ہندوستان میں مہاراجہ ہرش وردھن کی حکومت ترقی کر رہی تھی۔ عین اسی زمانہ میں ملک عرب میں جو کہ بت پرستوں کا ملک تھا۔ عرب کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیمات نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا جس کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلعم کے پیروؤں یعنی مسلمانوں کی طاقت شدید ترین مخالفت کے باوجود دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی محمد رسول اللہ صلعم بت پرستی کے شدید مخالف تھے۔ آپ نے بنی نوع انسان کو تعلیم دی کہ خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمدؐ اس کا بھیجا ہوا ایک پیغمبر ہے جو تمہاری ہی طرح ایک انسان ہے۔ قرآنِ پاک خدا کی سچی کتاب ہے۔ موت اور قیامت برحق ہے۔ قرآن کی تعلیم میں انسان کی رہنمائی کا مکمل درس ہے۔ یہ بنی نوع انسان کی نجات کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ تھی محمد رسول اللہ صلعم کی وہ سیدھی اور سچی تعلیم جس نے کہ عرب کے بت پرستوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔

محمد رسول اللہؐ کی پیدائش

محمد رسول اللہ صلعم ۲۹ ر اگست ۵۷۰ء کو بروز پیر مکہ کے ایک مشہور تجارت پیشہ خاندان بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ محمد رسول اللہؐ کی زندگی بڑی عجیب ہے جس کی ابتدا ہی مصائب سے ہوتی ہے۔ ابھی آپ اپنی والدہ حضرت آمنہ کے بطن ہی میں تھے کہ آپ کے والد عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم جو تجارت کے لئے شام گئے ہوئے تھے۔ شام سے واپسی پر مدینہ میں رحلت فرما گئے۔ اور اس حادثہ کے چھ سال بعد آپ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ جبکہ مدینہ سے مکہ آ رہی

تھیں۔ راستہ ہی میں رحلت فرما گئیں۔ گویا باپ کا سایہ تو پیدائش سے قبل ہی اُٹھ چکا
تھا لیکن چند سال بعد ماں بھی داغِ جدائی دے گئیں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد محمد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دادا عبدالمطلب آپ کی پرورش کرتے رہے
لیکن دو تین سال کے بعد آپ دادا کے سائے سے بھی محروم ہو گئے۔ اور اب
آپ کی پرورش آپ کے چچا ابو طالب یعنی حضرت علیؑ کے والد کرنے لگے۔

بُت پرستی اور بدکاری کے خلاف جہاد

یوں تو آپ ابتدا ہی سے بُت پرستی
بدکاری۔ شراب نوشی اور تمام بُری باتوں کے مخالف تھے لیکن ۶۱۰ء میں اعلان
نبوت کے بعد آپ نے کھلم کھلا اس نوعیت کی جملہ خرافات کے خلاف باقاعدہ
جہاد شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے بُت پرست آپ کے اور آپ کے
مقلدوں یعنی مسلمانوں کے خون کے پیاسے بن گئے۔ چنانچہ قریش مکہ نے حق پرستی کے
جرم میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سخت ترین اذیتیں دیں۔ آپ کو بارہا زخمی
کیا گیا۔ لیکن آپ مردانہ وار ان تمام مظالم اور زیادتیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ رفتہ
رفتہ یہ مظالم اس حد تک بڑھ گئے کہ رسول اللہ صلعم کو ۱ھ (۶۲۲ء) میں مکہ سے
ہجرت کر کے معہ اپنے ساتھیوں کے مدینہ جانا پڑا۔

مدینہ میں چونکہ رسول اللہ صلعم کے مقلدوں یعنی مسلمانوں کی کافی تعداد موجود تھی
اس لئے وہاں آپ کا نہایت ہی پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ رسول اللہ کے مدینہ ہجرت
کر جانے کے باوجود بھی قریش مکہ چین سے نہ بیٹھے۔ اور وہ برابر مکہ سے بڑی بڑی جرار
فوجیں لے کر مدینہ پر یورش کرتے رہے۔ اس یورش کا رسول اللہ صلعم اور ان کے
ساتھیوں نے بڑی مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور آخر کار ۸ھ (۶۲۹ء)
میں رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں کو قریش مکہ کی سرکوبی کے لئے مدینہ سے مکہ

پر حملہ کرنا پڑا۔ اس حملہ میں قریش مکہ کو شکست ہوئی۔ اور رسول اللہؐ فاتحانہ شان کے ساتھ اسی اپنے آبائی وطن مکہ میں داخل ہو گئے جہاں سے چند سال قبل ان کو نکالا گیا تھا۔

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلعم کے مقلدوں یعنی مسلمانوں کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ برابر بڑھتا گیا۔ چنانچہ آپ کی وفات کے وقت تقریباً تمام اہلِ عرب کا مذہب اسلام ہو چکا تھا۔ آپ نے بارہ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۸ جون ۶۳۲ء کو تریسٹھ سال کی عمر میں دُنیا کو چھوڑ دیا۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد آپ کے جانشین خلیفہ کہلائے جن کے عہدِ حکومت میں نہ صرف ایشیا کے بیشتر ممالک مسلمانوں نے فتح کر لئے بلکہ یورپ کے بھی بہت سے حصوں کو مسلمانوں نے فتح کر لیا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں ہندوستان کی حالت

۸ھ (۶۲۹ء) میں جبکہ فتح مکہ کے بعد ملک عرب میں مسلمانوں کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں مہاراجہ ہرش وردھن کی حکومت خوب ترقی کر رہی تھی۔ یہ حکومت تقریباً سارے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی۔ اور اس زمانہ کی بہت بڑی اور نہایت ہی طاقتور حکومت شمار کی جاتی تھی۔ لیکن ۲۶ھ (۶۴۷ء) میں جبکہ حضرت عثمان غنی کی خلافت کا دور تھا۔ مہاراجہ ہرش وردھن کی موت کے بعد یہ حکومت بالکل پاش پاش ہو گئی۔ اس حکومت کا ختم ہونا تھا کہ سارے ملک میں بدنظمی اور طوائف الملوکی پھیل گئی جو زمانہ دراز تک جاری رہی۔ چنانچہ راجپوتوں نے اس بدنظمی اور طوائف الملوکی سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہندوستان میں جا بجا خود مختار ریاستیں قائم کر لیں اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں راجپوتوں کا زور اس قدر بڑھا کہ ہندوستان بھر میں

کوئی ایسی جگہ باقی نہیں رہی جس پر کہ راجپوت نسل کے لوگ حکمران نہ ہوں۔ اسی لئے جب مسلمان ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو ان کو زیادہ تر راجپوتو ہی سے مقابلہ کرنا پڑا۔

راجپوتوں کے اقتدار میں برہمنوں کا ہاتھ

راجپوت کون تھے۔ اور کس طرح ہندوستان آئے اگرچہ اس کے بارے میں بہت سے فرضی افسانے مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ راجپوت جاٹ۔ گوجر۔ شاک ہون سیتھن اور ان بیرونی اقوام کی اولاد ہیں جو وسط ایشیا سے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد یہیں آباد ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے سپہ گری کو اپنا پیشہ بنالیا تھا چنانچہ مہاراجہ ہرش وردھن اور اس سے قبل کے راجاؤں کی فوج میں زیادہ عنصر ان ہی لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ چونکہ فوجی اسپرٹ رکھتے تھے۔ اس لئے راجہ ہرش وردھن کی حکومت کے بعد جب ہندوستان میں بدنظمی پھیلی تو یہ اپنی جنگ جویانہ اسپرٹ کی بدولت ہندوستان کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئے۔ اور راجپوتوں کے نام سے مشہور ہوئے۔

ان راجپوتوں کو راجپوت بنانے اور ابھارنے میں بہت بڑا حصہ ہندوستان کے ان برہمنوں کا ہے۔ جن کا اقتدار بدھ مذہب کے سیلاب میں ڈوب کر رہ گیا تھا راجہ ہرش وردھن کی موت کے بعد جب کوئی بدھ حکومت باقی نہ رہی تو برہمنوں کو بدھ مذہب کو مٹانے اور ہندو دھرم کو ترقی دینے کا موقع ہاتھ آگیا لیکن فوجی طاقت اور حکومت کی مدد کے بغیر کیونکہ نہ بدھ مذہب مٹایا جا سکتا تھا اور نہ ہندو دھرم کو ابھارا جا سکتا تھا۔ اس لئے برہمنوں نے جاٹ۔ گوجر۔ شاک ہون سیتھن اور دوسری سپاہیانہ اسپرٹ رکھنے والی اقوام کو آگے بڑھایا۔ ان کو کھتری کا اونچا رتبہ عطا کیا۔ اور عوام پر ذہنی اثر ڈالنے کے لئے ان کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ

یہ سورج۔ چاند اور اگنی دیوتا کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی راجپوت اپنے آپ کو سورج بنسی۔ چندر بنسی اور اگنی کلا خاندانوں کا قابل فخر فرزند بتاتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ یہ سپاہیانہ اسپرٹ رکھنے والی باہر سے آئی ہوئی مختلف اقوام کا ایک مجموعہ ہیں جن کو راجپوت کہا گیا۔ اور جنہوں نے اپنی اعلیٰ فوجی اسپرٹ کی بنا پر ہندوستان میں ایک خاص درجہ حاصل کر لیا چنانچہ ان کی حکومتیں اجین۔ قنوج۔ دلی۔ راجپوتانہ۔ گجرات۔ پنجاب۔ سندھ بندھیل کھنڈ۔ مالوہ اور ہندوستان کے تقریباً ہر ایک حصہ میں پھیلی ہوئی تھیں اسی لئے محمد بن قاسم سبکتگین۔ محمود غزنوی۔ محمد غوری اور دوسرے مسلم حملہ آوروں کو ہندوستان میں ان ہی راجپوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

ہندوستان میں مسلمان کب آئے

ہندوستانی اور یورپین مورخین ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بارے میں یہ کہتے رہے ہیں کہ مسلمان سب سے پہلے محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت ۹۳ھ (۷۱۲ء) میں سندھ میں داخل ہوئے لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اس سے بہت پہلے رسول اللہ صلعم کے زمانۂ حیات ہی میں ہندوستان آ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کی پیدائش سے قبل عرب تاجر ملابار۔ کارومنڈل سراندیپ سالدیپ۔ جاوا۔ سماٹرا۔ اور چین کے ساحل تک کشتیوں میں بیٹھ کر جاتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ یعنی ہندوستان اور عرب کے درمیان زمانہ دراز سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ یہاں تک کہ اکثر عربوں نے ہندوستان میں بود و باش بھی اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ جب عربوں نے اسلام قبول کر لیا تو وہ حسب سابق ہندوستان میں بغرض تجارت آتے جاتے رہے۔ اور ان میں سے اکثر نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور اس طرح یہ لوگ اپنے ساتھ اسلامی

تعلیمات کو بھی ہندوستان میں لے آئے اور اس ملک میں دینِ اسلام رفتہ رفتہ پھیلنے لگا غرضکہ سندھ میں مسلمانوں کی فاتحانہ پیش قدمی سے بہت قبل جنوبی ہند اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں اسلام کی تبلیغ خاموشی کے ساتھ جاری تھی اور دن بدن مسلمانوں کی تعداد ہندوستان میں بڑھتی چلی جارہی تھی۔

ہندوستانی راجاؤں کا قبول اسلام

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی بعثت سے لیکر اور محمد بن قاسم کے حملہ کے زمانہ تک ہندوستان میں نہ صرف عوام دینِ اسلام قبول کرتے رہے ہیں بلکہ بعض راجاؤں نے بھی مذہب اسلام اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم کے زمانۂ حیات ہی میں ملابار کا راجہ زمورن سامری مشرف باسلام ہوچکا تھا۔

راجہ زمورن پالویا خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس راجہ نے معجزہ شق القمر دیکھنے کے بعد اس عجیب وغریب واقعہ کو اپنی ریاست کے سرکاری روزنامچہ میں درج کرادیا تھا۔ اس راجہ کا قاعدہ یہ تھا کہ جو اہم واقعات رُونما ہوتے تھے۔ ان کو بطور یادداشت سرکاری روزنامچہ میں درج کرادیتا تھا۔ جب یہ واقعہ سرکاری روزنامچہ میں درج ہوگیا تو راجہ نے سرکاری طور پر اس عجیب وغریب واقعہ کی تحقیق و تفتیش کرائی۔ جب راجہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ واقعہ عرب کے نئے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معجزہ تھا تو وہ فوراً مسلمان ہوگیا۔ اور اپنی ریاست کو ولیعہد کے سپرد کرنے کے بعد بادبانی جہاز کے ذریعہ رسول اللہ صلعم کی زیارت کے لئے عرب کے لئے روانہ ہوگیا لیکن بدقسمتی سے وہ راستہ ہی میں فوت ہوگیا اور اس کی لاش یمن لاکر دفن کی گئی۔

ملابار کے راجہ کے علاوہ سراندیپ کے راجہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

سراندیپ میں بھی عرب تاجر اپنے ساتھ اسلام کی تعلیمات لے کر آئے تھے۔ جن سے پہلے عوام متاثر ہوئے اور عام لوگوں نے دینِ اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ اور بعد میں سراندیپ کا راجہ اسلام کی تعلیم سے متاثر ہونے کے بعد مسلمان ہو گیا۔ مشہور مورخ فرشتہ سراندیپ کے راجہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ :-

"حاکم سراندیپ اسلام کی حقیقت سے واقف ہونے کے بعد صحابۂ کرام کے عہدِ حکومت میں شریعتِ مصطفوی کا گرویدہ اور مقلد ہو گیا تھا"

لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آیا خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں سراندیپ کے راجہ نے اسلام قبول کیا تھا یا خلافت بنو اُمیہ کے دورِ حکومت میں۔ لیکن عام خیال یہی ہے کہ یہ راجہ خلافت بنو اُمیہ کے زمانہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد سراندیپ میں اسلام خوب پھیلا چنانچہ مشہور سیاح ابنِ بطوطہ جب سراندیپ گیا تو اُس نے وہاں بہت سے مسلمان بزرگوں کے مزارات اور مسجدیں پائیں۔

راجہ زمورن سامری اور راجہ سراندیپ کے علاوہ راجہ زمورن سامری کی نسل کا ایک اور راجہ جس کا نام چیرامن پیرومل سامری تھا حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا تھا چنانچہ فرشتہ اس راجہ کے اسلام قبول کرنے کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"عرب اور عجم کے کچھ لوگ بابا آدم کی قدم گاہ کی زیارت کے لئے کشتی میں سوار ہو کر سراندیپ کی طرف روانہ ہوئے اتفاقاً کشتی بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے ملابار پہنچ گئی۔ اور یہ لوگ شہر کدنگلور (کالیکٹ) میں اُتر پڑے۔ اُس جگہ کا راجہ سامری جو اخلاق ستودہ سے آراستہ تھا۔ ان لوگوں سے ملا اور ہر قسم کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ یہاں تک کہ ان سے راجہ نے ان کے مذہب کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ انھوں نے

جواب دیا ہم مسلمان ہیں اور حضرت محمد صلعم ہمارے رسول ہیں سامری نے کہا کہ میں نے یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں سے جو تمہارے مذہب کے مخالف ہیں سُنا ہے کہ عرب - روم - ایران - اور ترکستان میں یہ مذہب رائج ہو چکا ہے لیکن ابھی تک مسلمانوں سے میں نے مذہب اسلام کی بابت دریافت نہیں کیا ہے - میری خواہش ہے کہ آپ مجھ کو اپنے رسول کے کچھ حالات سُنائیں - اور اُن کے معجزات کا حال بھی بیان کریں - راجہ کی اس خواہش پر ان میں سے ایک شخص نے آنحضرت صلعم کے حالات نہایت خوبی سے بیان کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ سامری کے دل میں آنحضرت صلعم کی محبت پیدا ہو گئی - اسکے بعد جب معجزہ شق القمر کا ذکر آیا - تو سامری نے کہا کہ یہ معجزہ تو بہت ہی اہم ہے - ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ جب کوئی عظیم الشان واقعہ ظہور میں آتا ہے تو اس کو سرکاری روزنامچہ میں لکھ لیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت صلعم کے زمانہ کے روزنامچہ کا مُطالعہ کیا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ فلاں تاریخ چاند دو ٹکڑے ہو کر مل گیا - یہ دیکھ کر سامری دینِ اسلام کی صداقت کا قائل ہو گیا - اور کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا - یہ راجہ چونکہ اپنی قوم کے سرداروں سے ڈرتا تھا - اس لئے اس نے اپنے اسلام قبول کرنے کو مخفی رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس کے اظہار سے منع کر دیا تھا -

فرشتہ کے مندرجہ بالا بیان سے یہ ثابت ہے کہ ملابار کا راجہ زمورن سامری ہی صرف مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی نسل میں ایک دوسرا راجہ چیرامن پیرومل سامری نے بھی مذہب اسلام قبول کر لیا تھا - اس راجہ نے مرنے سے قبل اپنے وزراء

اور حکومت کے سرداروں کو ہدایت کی کہ وہ اسلام کی تبلیغ میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیں۔

ورمہ پٹن کے حکمراں کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی دینِ اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اس حاکم کو اسلام کے ساتھ بڑی گہری عقیدت تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں ورمہ پٹن میں نہایت ہی شاندار مسجدیں تعمیر کرائی تھیں اور تبلیغِ اسلام کے کاموں میں بھی یہ حاکم بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتا تھا۔ غرضکہ محمد بن قاسم کے حملہ سے بہت قبل اسلام۔ عوام سے گزر کر ہندوستان کے شاہی محلوں تک کو جگمگا چکا تھا۔

اسلام سے ہندوستانیوں کی گرویدگی

اسلام کی یہ ضوفشانی صرف مالابار اور جنوبی ہند ہی تک محدود نہ تھی بلکہ سندھ پر مسلمانوں کے حملہ سے بہت قبل سندھی عوام میں بھی اسلام برابر مقبولیت حاصل کرتا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ جس زمانہ میں کہ عرب کے مسلمانوں اور ایران کے آتش پرستوں میں سلسلۂ جنگ جاری تھا۔ اُسی زمانہ میں ہندوستانی جاٹ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر حلقہ بگوش اسلام ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان جاٹوں میں سے اکثر نے ہندوستان چھوڑ کر عراق میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔

عرب ان نومسلم ہندوستانی جاٹوں کو "زط" کے نام سے تعبیر کرتے تھے اسکے علاوہ ہندوستان کے ان جاٹوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا جو ہندوستان کے ہندو راجاؤں کی جانب سے ایران کے بادشاہ کی حمایت میں اور مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے سندھ سے ایران بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ جب ایران کے بادشاہ کو مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہو گئی۔ اور جاٹوں کی ایک بڑی

تعداد عربوں کے ہاتھ آئی تو ان جاٹوں نے بخوشی دینِ اسلام قبول کر لیا۔

سندھ کے جاٹوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد عرب اور عراق کے مسلمانوں نے اپنے ان نومسلم "زط" بھائیوں کی بڑی عزت کی۔ ان کو بڑے بڑے عہدے دئے گئے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے عہدِ خلافت میں بصرہ کے خزانہ کا محافظ دستہ اسی قوم "زط" (جاٹ) کے افراد پر مشتمل تھا۔ اس قوم میں بڑے بڑے علما اور صلحا پیدا ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام اعظم حضرت ابو حنیفہ اسی "زط" (جاٹ) قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے فاتحانہ داخلہ سے قبل دینِ اسلام یہاں کس قدر پھیل چکا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے سے بہت پہلے ہندوستان میں جا بجا نہایت شاندار مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ چنانچہ کالیکٹ کولم ہیلی۔ سری کندا پورم۔ درمہ پٹن۔ پندارانی۔ بدپٹن۔ چالیات برکور۔ منگور۔ کلنجر کوٹ۔ کارومنڈل وغیرہ کی بے شمار مسجدیں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے فاتحانہ حملہ سے بہت پہلے بے شمار ہندوستانی حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے۔

ہندوستان پر حملہ سے قبل مسلمانوں کی فتوحات

قبل اس کے کہ ہم ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ کی تفصیلات پر روشنی ڈالیں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ کے ناظرین کو یہ بتا دیا جائے کہ اُس زمانہ میں فاتحانِ اسلام کی سیاسی پوزیشن کیا تھی اور گذشتہ پون صدی کے اندر مسلمان کن کن ممالک کو فتح کر چکے تھے۔

مسلمانوں کی سب سے پہلی قابلِ ذکر فتح تسخیر مکہ تھی جسے ۸ھ (۶۲۹ء) میں خود رسول اللہ صلعم نے فتح کیا تھا۔ اسی سال طائف فتح ہوا اور ۱۱ھ (۶۳۲ء) میں رسول اللہ صلعم

کی وفات کے وقت سارے عرب اور یمن پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

مسلمانوں کی فتوحات کا دوسرا دور خلفائے راشدین کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ حکومت سنہ ۱۱ھ (سنہ ۶۳۲ء) سے لیکر سنہ ۱۳ھ (سنہ ۶۳۴ء) تک شام پر مسلمانوں نے حملہ کیا۔ عراق پر مسلمانوں کو کامل فتح حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد بصرہ اور دمشق بھی اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں یعنی سنہ ۱۳ھ (سنہ ۶۳۳ء) سے لیکر سنہ ۲۴ھ (سنہ ۶۴۵ء) تک مسلمانوں کو نہایت ہی شاندار فتوحات حاصل ہوئیں۔ شہر بعلبک فتح ہوا۔ شہزاد اور حمص پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ بیت المقدس نے اطاعت قبول کر لی۔ مصر اور ایران پر فوج کشی کر کے یہ دونوں ملک مسلمانوں نے فتح کر لئے۔ شام پر بھی مسلمانوں کو کامل فتح حضرت عمرؓ ہی کے دورِ خلافت میں حاصل ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ کی شاندار فتوحات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے عہدِ حکومت میں ۳۶ ہزار شہر اور قلعے فتح ہوئے اور شام ایران اور مصر جیسے تین بڑے ملک حکومتِ اسلامیہ میں شامل ہو گئے۔

خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ کا دورِ حکومت اگرچہ جدید فتوحات کے اعتبار سے زیادہ شاندار نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ کے زمانہ میں جدید فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ سنہ ۲۴ھ (سنہ ۶۴۵ء) سے لیکر سنہ ۳۵ھ (سنہ ۶۵۵ء) تک مسلمانوں کو جو نمایاں فتح حاصل ہوئی وہ افریقہ کی فتح تھی۔ افریقہ کے علاوہ جزیرہ قبرس جزیرہ روڈس اور ایران کے بقیہ حصے حضرت عثمانؓ ہی کے دورِ حکومت میں فتح ہوئے۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کا دورِ حکومت جو سنہ ۳۶ھ (سنہ ۶۵۶ء) سے شروع ہو کر سنہ ۴۰ھ (سنہ ۶۶۱ء) پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی فتوحات سے خالی نظر آتا

ہے کیونکہ حضرت علیؓ کی تمام تر طاقت خانہ جنگیوں کو دبانے پر صرف ہوئی لیکن اس کے بعد بنی اُمیّہ کے دورِ حکومت میں پھر نئے سرے سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

برِّ اعظم افریقہ جو مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے نکل گیا تھا۔ بنی اُمیّہ کے ابتدائی دورِ حکومت میں مسلمانوں نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ اور ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں تو مسلمانوں کو نہایت ہی شاندار فتوحات حاصل ہوئیں۔ چنانچہ ولید کے زمانہ میں سنہ ۸۴ھ (۷۰۳ء) میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ اور سلطنت روم پر حملہ کر کے اس کی بُنیادوں کو ہلا دیا۔ سلطان ولید کے بھتیجے قیتبہ بن مسلمہ نے ایران کی سرحدوں سے گذر کر پہلے تو سنہ ۹۰ھ (۷۰۹ء) میں روسی ترکستان فتح کیا۔ اس کے بعد آدھے سے زیادہ چین فتح کر ڈالا۔ ادھر افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر اور اس کے جنرل طارق نے سنہ ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں پورا اسپین اور پرتگال فتح کر لیا۔ اور جنوبی فرانس پر قبضہ جما لیا۔ اسی زمانہ میں محمد بن قاسم نے سنہ ۹۳ھ ۷۱۲ء میں ہندوستان پر حملہ کر کے سارے سندھ پر تسلط جما لیا۔

ہندوستان پر سنہ ۹۳ھ (۷۱۲ء) میں جب مسلمانوں نے حملہ کیا ہے۔ تو وہ پرتگال۔ اسپین۔ جزیرہ روڈس۔ جزیرہ قبرص۔ برِّ اعظم افریقہ۔ شام فلسطین۔ عرب یمن۔ ایران۔ کابل۔ قندھار۔ روسی ترکستان۔ نصف چین اور دُنیا کے اکثر و بیشتر علاقوں پر قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے گذشتہ پون صدی کے اندر وہ عظیم الشان فتوحات حاصل کی تھیں جن کی مثال آج بھی دُنیا کی تاریخ میں مفقود ہے۔

چوتھا باب

ہندوستان پر محمد بن قاسم کی فوج کشی

۹۳ھ تا ۳۸۵ھ
۷۱۲ء تا ۹۹۵ء

محمد بن قاسم کی فوج کشی

مسلمانوں نے ہندوستان کے جس علاقہ پر سب سے پہلے فوج کشی کی وہ پاکستان کا مشہور صوبہ سندھ ہے مسلمانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سندھ کے علاقہ پر محض اس لئے حملہ کیا تھا چونکہ مسلمان ہندوستان میں تلوار کے ذریعہ اشاعتِ اسلام کے لئے مضطرب تھے لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ امرواقعہ یہ ہے کہ فاتحینِ عرب اپنی دوسری فتوحات میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ شاید سندھ کی جانب کبھی توجہ ہی نہ کرتے لیکن سندھ کے حکمرانوں اور راجاؤں نے مسلمانوں کے مخالفین کی امداد کر کے اور مسلم حکومتوں کے خلاف شورشیں برپا کر کے مسلمانوں کو اس چیز کے لئے مجبور کر دیا کہ وہ سندھ پر ضرور حملہ کر دیں۔

سندھ کے حکمرانوں کی شورش پسندی

سندھ کے راجاؤں اور ایران کے بادشاہوں میں اگرچہ دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی۔ اور ان میں کئی بار لڑائیاں بھی ہو چکی تھیں لیکن جب مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا تو سندھ کے راجہ اور ایران کے بادشاہ دونوں مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے متحد ہو گئے۔ چنانچہ یزدجرد شاہِ ایران سے عرب کے مسلمانوں کی جو تاریخی اور فیصلہ کن جنگ ہوئی ہے۔ اس جنگ میں سندھ کے راجہ نے ایرانیوں کے ساتھ مل کر نمایاں حصہ لیا تھا۔ راجہ نے نہ صرف اپنی فوج شاہِ ایران کی امداد کے لئے بھیجی تھی بلکہ اپنے تمام جنگی ہاتھی بھی اس جنگ میں جھونک دئے تھے۔ ان ہاتھیوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ اسلامی فوج کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ ثقفی کو ایک ہاتھی ہی نے شہید کیا

تھا۔ اسی طرح ایران کے بعد جب مسلمانوں نے مکران پر حملہ کیا تو ایرانیوں کے ساتھ سندھیوں نے بھی اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ حملہ حضرت عمر فاروق کے عہدِ حکومت میں ہوا تھا۔ سندھیوں کی یہ شورش پسندیاں اس کے بعد بھی برابر جاری رہیں۔ چنانچہ مکران کے اسلامی حاکم نے ان کی فتنہ پردازی کو دیکھتے ہوئے سندھ کے راجہ ساہسی پر حملہ کرنے کی حضرت عمر فاروق سے اجازت چاہی تھی لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔

حضرت عثمان غنی کے عہدِ خلافت میں یعنی ۲۴ھ (۶۴۴ء) میں جبکہ سندھ میں راجہ چچ کی حکومت تھی۔ سندھی فوجوں نے مکران کی سرحد پر پے در پے حملے شروع کر دیئے تھے۔ ان حملوں میں ایران کے اُن آتش پرستوں کا بھی ہاتھ تھا جنہوں نے ایران سے فرار ہونے کے بعد سندھ میں پناہ لی تھی۔ اور سندھ کا راجہ ان کو دوبارہ ایران فتح کرنے کی برابر ترغیب دیتا رہتا تھا۔ چنانچہ جب سندھیوں کی یہ شورش پسندی خطرناک حد تک بڑھ گئی تو بصرہ کے حاکم عبداللہ بن عامر نے عبدالرحمٰن بن سمرہ حاکم کرمان کو اس شورش کے دبانے کا حکم دیا۔ عبدالرحمٰن بن سمرہ نے سندھی فوجوں پر حملہ کر کے بھگا دیا اور مکران سے سرحد کیکانان تک کا تمام علاقہ چھین لیا۔ اس کے بعد ۳۸ھ (۶۵۸ء) میں راجہ سندھ نے بلوچستان کی سرحد پر اسی قسم کی ایک اور بغاوت برپا کرا دی جس کو حارث بن مرہ نامی ایک سردار نے فوراً دبا دیا تھا۔ اس واقعہ کے تین سال بعد ۴۱ھ (۶۶۱ء) میں امیر معاویہ کے دورِ حکومت میں پھر راجہ سندھ کی عنایت سے اسی علاقہ میں شورش برپا ہوئی۔ جس کو راشد بن عمر نے فرو کیا۔ لیکن چند ہی روز بعد پچاس ہزار کے ایک لشکر نے جو باغیوں اور سندھیوں پر مشتمل تھا۔ دوبارہ حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں مسلم سپہ سالار راشد شہید ہو گئے۔ لیکن سنان بن سلمہ نے جرأت کا

ثبوت دیتے ہوئے اس شورش کو دبا دیا تھا۔

کابل قندھار جو اُس زمانہ میں خلافتِ اسلامیہ کے ماتحت تھے وہاں ۴۲ھ (۶۶۲ء) میں شدید بغاوت برپا ہوگئی۔ اور اس بغاوت کے بعد ان صوبوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ امیر مہلب ان کی سرکوبی کے لئے گیا۔ امیر مہلب کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر کابل و قندھار کے باغی بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کو بھی سندھ کے راجہ چچ نے ہی پناہ دی تھی۔ امیر مہلب نے ان باغیوں کا تعاقب برابر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اس نے دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان تک ان کا پیچھا کیا۔ اور ملتان کو جو اس زمانہ میں سندھ کا ایک صوبہ تھا۔ فتح کر لیا لیکن امیر مہلب ابھی سندھ کے اس نو مفتوحہ علاقہ کا کوئی انتظام نہ کر سکا تھا۔ کہ اس کو ایک دوسری مہم کے لئے بلخ جانا پڑا۔ امیر مہلب کے جاتے ہی سندھ کے راجہ نے پھر اپنا علاقہ سنبھال لیا۔

۵۵ھ (۶۷۵ء) میں سندھ کا راجہ چچ فوت ہوگیا۔ اور اس کا بڑا لڑکا چندر تخت پر بیٹھا جس کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ نہایت اچھا تھا۔ اسی لئے راجہ چندر کے زمانہ میں مسلمانوں نے سندھ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ لیکن ۶۳ھ (۶۸۳ء) میں چندر کے مرنے کے بعد جب اس کا چھوٹا بھائی داہر تخت پر بیٹھا تو اس نے پھر مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی چنانچہ راجہ داہر نے مسلمانوں کے خلاف ایک اسکیم تیار کی جس کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کے مشرقی مقبوضات پر حملہ کر کے ان کو مشرقی ممالک سے قطعی بے دخل کر دیا جائے اس اسکیم کے ماتحت راجہ داہر کے ملتان کے گورنر نے قندھار پر حملہ کر دیا۔ لیکن عامل قندھار نے راجہ داہر کی فوج کو پسپا کر کے اسے ملتان تک فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

سندھ کے راجاؤں کی ان پے درپے یورشوں سے یہ اندازہ لگانا دشوار

نہیں ہے کہ کس طرح سندھ کے راجہ برابر خلافتِ اسلامیہ کو مقابلہ کا چیلنج دیتے رہے تھے لیکن خلافتِ اسلامیہ اور اس کے نائبین نے برابر درگذر سے کام لیا۔ اس لئے نہیں کہ خلافتِ اسلامیہ کمزور تھی۔ بلکہ اس لئے کہ خلافتِ اسلامیہ اپنی وسیع حکومت میں مزید توسیع کی خواہشمند نہ تھی۔ اور وہ عراق و ایران کے سرسبز اور شاداب ممالک کے مقابلہ میں صوبہ سندھ کے بنجر علاقہ کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ خلافتِ اسلامیہ کی طاقت اور قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی خلافت کی فوجیں سندھ کے راجاؤں سے نبرد آزما ہوئیں۔ سندھ کے راجاؤں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

مکران میں علافیوں کی بغاوت

اموی خلیفہ۔ عبد الملک بن مروان اور ممالکِ شرقیہ کے اسلامی وائسرائے حجاج بن یوسف کے عہدِ حکومت میں اچانک مکران میں پھر بغاوت برپا ہوگئی جس کو دبانے کے لئے سعید بن مسلم کلابی کو مکران کا عامل مقرر کر کے بھیجا گیا۔ سلم کلابی نے شورش پسندوں کو سخت سزائیں دیں۔ اور اس بغاوت کو چند روز میں دبا دیا۔ لیکن سندھ کے راجہ داہر کے دوست محمد بن علافی اور معاویہ بن علافی نے شورش پسندوں کو اپنے گرد جمع کر کے پھر نئے سرے سے مکران میں بغاوت برپا کرادی۔ اور علاقہ مکران کے کئی شہروں پر قبضہ جما لیا۔ علافیوں کی اس شرارت کو دبانے کے لئے جب سعید بن مسلم کلابی نے ان پر حملہ کیا۔ تو اس حملہ میں کلابی کو شکست ہوئی اور وہ علافیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ علافیوں نے مسلم کلابی کو قتل کر کے اس کی کھال اتروائی۔ اور اچھی طرح لاش کی بے حرمتی کی پھر انھوں نے مکران میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

علافیوں کی اس خود مختاری کے اعلان کے بعد خلافتِ اسلامیہ کے لئے

یہ ضروری ہو گیا کہ وہ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوری قدم اٹھائے چنانچہ سعید تمیمی اور اس کے بعد محمد بن ہارون کو حجاج نے عامل بنا کر علافیوں کی سرکوبی کے لئے مامور کیا۔ محمد بن علافی اور معاویہ بن علافی لشکرِ اسلامی کے مقابلے کی تاب نہ لا کر پہاڑوں میں کئی سال تک روپوش رہے۔ آخر پانچ سال کے بعد محمد بن ہارون نے معاویہ بن علافی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ لیکن محمد بن علافی پانچ سو سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ بچ کر نکل گیا اور راجہ داہر کے پاس چلا گیا۔

راجہ داہر جس کا اس فتنہ میں بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے اپنی حکومت میں محمد بن علافی کو ایک بڑا عہدہ دیدیا۔ اور بعد میں تو راجہ داہر نے محمد بن علافی کو نہ صرف وزارتِ عظمیٰ کا اہم عہدہ عطا کر دیا۔ بلکہ اس کی اتنی عزت افزائی کی کہ داہر کی حکومت کے سکوں کی پشت پر علافی کا نام تک مضروب ہونے لگا یہ واقعہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ راجہ داہر خلافتِ اسلامیہ کے باغیوں اور دشمنوں کی ہمت افزائی میں کس طرح پیش پیش تھا۔

داہر کے گورنر نے اسلامی جہازوں کو لوٹ لیا

جس زمانہ میں کہ سندھ کا راجہ داہر خلافتِ اسلامیہ کے مشرقی مقبوضات میں بغاوتیں پیدا کر رہا تھا۔ اور خلافتِ اسلامیہ کے باغیوں کو اپنی حکومت میں نواز رہا تھا۔ اسی زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد برابر جنوبی ہند میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ لکادیپ۔ مالدیپ۔ سراندیپ اور ملابار میں مسلمان بکثرت موجود تھے۔ جنوبی ہند کے اکثر راجاؤں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ سراندیپ کے نومسلم راجہ کے تعلقات خلافتِ اسلامیہ کے ساتھ نہایت ہی خوشگوار تھے۔ اس راجہ نے اسلامی مرکز سے اپنے تعلقات کو اور زیادہ استوار کرنے کے لئے قیمتی تحائف سے بھرا ہوا آٹھ جہازوں کا ایک بیڑا اشرفی

ممالک کے اسلامی وائسرائے حجاج بن یوسف کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ ان جہازوں میں قیمتی تحائف کے علاوہ سیکڑوں عازمینِ حج اور سراندیپ میں فوت ہو جانے والے عرب سوداگروں کی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے بھی سوار تھے۔

جہازوں کا یہ بیڑا اچانک طوفان میں پھنس گیا۔ اور بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) سے جا لگا۔ اس زمانہ میں راجہ داہر کا ایک گورنر دیبل میں رہتا تھا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ان جہازوں میں مسلمان ہیں۔ اور خلافتِ اسلامیہ کے لئے تحائف بھی ہیں تو اس نے ان جہازوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ لوٹا اور مسلمان مردوں۔ عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے جیل خانہ میں ڈال دیا۔

مشرقی ممالک کے اسلامی وائسرائے حجاج بن یوسف کو جب راجہ داہر کے گورنر کی اس ناشائستہ حرکت کا علم ہوا تو خلافتِ اسلامیہ کی جانب سے بذریعہ قاصد شدید احتجاج کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ مسلمان قیدیوں کو رہا کیا جائے اور لوٹا ہوا سامان واپس کر دیا جائے۔ لیکن راجہ داہر نے قاصد کو لاپرواہی کے ساتھ جواب دیدیا کہ "جہازوں کو لوٹنے والے ہمارے قبضہ کے نہیں ہیں۔ تم خود اُن سے اگر اپنے قیدی چھڑا لو اور اپنا مال و اسباب لے لو۔"

راجہ داہر کا یہ ذلّت آمیز اور مضحکہ انگیز جواب خلافتِ اسلامیہ کے لئے ایک ایسا کھلا چیلنج تھا جسے کوئی بھی خوددار حکومت گوارہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ حجاج بن یوسف کو سندھ کے راجہ داہر کی سرکوبی کے لئے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت لینی پڑی۔

سندھ پر عربوں کے ناکام حملے

راجہ داہر کے ذلّت آمیز جواب کے

بعد حجاج بن یوسف نے عبد اللہ اسلمی کو ایک مختصر سی فوج دے کر دیبل کی جانب روانہ کر دیا۔ عبد اللہ اسلمی ابھی جنوبی بلوچستان ہی میں تھا کہ راجہ داہر کے بیٹے کیشپ (جے سیہ) نے بلوچستان میں پیش قدمی کر کے اسلامی لشکر کو بری طرح شکست دیدی۔ اس جنگ میں عبد اللہ اسلمی شہید ہو گئے۔

اس ناکامی کے بعد حجاج بن یوسف نے چار ہزار فوج بدیل مجالی کی سرکردگی میں دوبارہ دیبل پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی اور محمد ہارون عامل مکران کو بھی ہدایت کی کہ وہ بدیل مجالی کی ہر ممکن امداد کرے۔ لیکن راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ نے جس کی ہمت پچھلی فتح سے بڑھ گئی تھی۔ راستہ ہی میں اسلامی فوجوں کو گھیر لیا۔ جے سیہ کے ساتھ بے اندازہ فوج اور جنگجو ہاتھیوں کا پورا غول تھا۔ دونوں لشکروں میں بڑے معرکہ کی جنگ ہوئی لیکن اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ اسلامی لشکر کا بیشتر حصہ کام آگیا اور اسلامی سپہ سالار بھی شہید ہو گیا۔ جب حجاج کو اس دوسری ناکامی کا علم ہوا تو اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے پتہ چلا کہ سندھ کا راجہ مقابلہ کی کافی تیاری کر چکا ہے۔

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ

گزشتہ ناکامیوں کو دیکھتے ہوئے حجاج بن یوسف نے خلیفہ کی منظوری کے بعد سندھ پر یورش کرنے کے لئے نہایت ہی وسیع پیمانہ پر انتظامات شروع کر دئے۔ اس مہم کی سرکردگی کے لئے حجاج نے اپنے سترہ سالہ داماد محمد بن قاسم گورنر فارس کو منتخب کیا۔ محمد بن قاسم نو عمر ہونے کے باوجود فارس میں بڑی قابلیت کا ثبوت دے چکا تھا۔ اس لئے یہ اہم کام بھی اسی کے سپرد کیا گیا۔ محمد بن قاسم چھ ہزار اسپ سواروں اور چھ ہزار شتر سواروں کے

لشکر کو لیکر شیراز (کرمان) ہوتا ہوا سندھ کی جانب بڑھا کرمان میں عامل کرمان محمد بن ہارون مع اپنی تین ہزار فوج کے محمد بن قاسم کے ہمراہ ہو گیا۔ ادھر ارمن بیلہ میں راجہ داہر کا لشکر مقابلہ کے لئے تیار کھڑا تھا۔ چنانچہ ۹۳ھ (۷۱۲ء) میں ارمن بیلہ کے مقام پر دونوں لشکروں کی مڈھ بھیڑ ہوئی۔ مگر اس جنگ میں راجہ داہر کی فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ محمد بن قاسم ارمن بیلہ کی فتح کے بعد دیبل (کراچی) کی جانب بڑھا۔ دیبل زمانہ قدیم کی بہت بڑی بندرگاہ تھی دیبل پر حملہ کے وقت مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سمندری بیڑا بھی دیبل پہنچ گیا تھا جس سے لشکر اسلام کو بہت زیادہ تقویت پہنچی۔ غرضکہ دیبل کی بندرگاہ پر راجہ اور مسلمانوں کی فوج میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں مسلمان فتحیاب ہوئے اور راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ عرف کیشب کو میدان جنگ سے فرار ہونا پڑا۔ غرضکہ اس طرح دیبل اور گرد و پیش کے علاقہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا

محمد بن قاسم کا ہندو رعایا سے سلوک

سندھ کا راجہ اور اس کے ملک کے وہ باشندے جو زمانۂ دراز سے خلافتِ اسلامیہ اور مسلمانوں کے لئے مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے اُن کا خیال تھا کہ ان پر فتح پانے کے بعد خلافتِ اسلامیہ کا سپہ سالار ان کے ساتھ نہایت ہی سختی کا برتاؤ کرے گا لیکن سندھ کے باشندے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس علاقہ کے باشندوں کو مکمل مذہبی آزادی دیدی گئی کہ وہ جس طرح بھی چاہیں عبادت کریں۔ اُن سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ شہر کا انتظام خود ہندوؤں ہی کے ہاتھوں میں دیدیا گیا۔ چنانچہ دیبل کا حاکم اعلیٰ ایک پنڈت کو بنا دیا گیا۔ جو اس سے قبل بتخانوں کا محافظ تھا۔ اور جس نے

مسلمان قیدیوں کے ساتھ نہایت ہی شریفانہ سلوک کیا تھا۔ ہندو حاکم اعلیٰ کے ماتحت حمید بن زرائع کو دیبل کا شحنہ یعنی انسپکٹر جنرل پولیس مقرر کیا گیا۔ اور اس کو ہدایت کی گئی کہ ہندو شہریوں کی جان۔ مال۔ اور جائداد کی پوری حفاظت کی جائے۔ چنانچہ دیبل (کراچی) لوٹ مار اور غارتگری سے بالکل محفوظ رہا۔

دیبل کی فتح اور انتظام سے فارغ ہونے کے بعد محمد بن قاسم شہر بیرون کی جانب متوجہ ہوا۔ لیکن اس شہر کے اُمرا نے پہلے ہی حجاج بن یوسف کے پاس اپنا ایلچی بھیجکر امان طلب کر لی تھی۔ ان اُمرا نے شہر سے باہر آ کر محمد بن قاسم اور اس کی فوج کا نہایت ہی پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اور بے اندازہ رسد اور تحائف اسلامی سپہ سالار کی خدمت میں پیش کئے۔ محمد بن قاسم بھی ان لوگوں کے ساتھ بڑی محبت اور اخلاق کے ساتھ پیش آیا۔

اس کے بعد محمد بن قاسم نے شہر بروج کی جانب رُخ کیا۔ یہاں راجہ داہر کے بھتیجے سے مقابلہ کے بعد یہ شہر بھی فتح ہو گیا۔ لیکن رات کے وقت جاٹوں نے اسلامی فوج پر شبخون مارنے کی کوشش کی۔ جسمیں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور جاٹ گرفتار ہو گئے۔ جب ان جاٹوں کو محمد بن قاسم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو محمد بن قاسم نے ان کو سزا دینے کی بجائے نصیحت کر کے رہا کر دیا۔ محمد بن قاسم کے اس رحم و مروت کا یہ اثر ہوا کہ تمام جاٹ بخوشی مسلمان ہو گئے۔

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے سیوستان کی جانب رُخ کیا جہاں کا حاکم راجہ داہر کا بھتیجہ بجے رائے تھا۔ باشندگان شہر نے متفقہ طور پر بجے رائے سے مطالبہ کیا کہ چونکہ مسلمان کھلے دل کے ساتھ امان دے رہے ہیں۔ اس لئے اُن سے لڑنا بے عقلی ہے۔ مگر بجے رائے نہ مانا اور مسلمانوں سے لڑ بیٹھا۔ آخر ایک رات کو جب وہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا تو سیوستان کے غیر مسلم باشندوں

نے جو پہلے ہی سے مسلمانوں سے صلح کے حق میں تھے ہتھیار ڈال دئے اور محمد بن قاسم کا نہایت ہی پُر تپاک طریقہ پر خیر مقدم کیا۔ جس کے جواب میں محمد بن قاسم کی جانب سے پنڈتوں کو خوب انعام اور اکرام دیا گیا۔ اور ان کو ملک کے بڑے بڑے انتظامی عہدے عطا کئے گئے۔

سیوستان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کی فوجیں بدھیہ کی جانب بڑھیں۔ بدھیہ کا حاکم کاکا جو بڑا سیاست داں تھا۔ اس نے لڑے بغیر اپنے آپ کو اسلامی سپہ سالار کے سامنے پیش کر دیا۔ محمد بن قاسم نے اُسے خلعتِ فاخرہ سے نوازا "امیر ہند" کا خطاب دیا اور اسلامی لشکر کے ایک حصہ کا سپہ سالار بنا دیا۔ کاکا نے محمد بن قاسم کے حُسن سلوک سے متاثر ہو کر نہ صرف خود اسلام قبول کر لیا۔ بلکہ اس کی تحریک پر اُس کی فوج کے بے شمار جاٹ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

راجہ داہر سے فیصلہ کن جنگ

محمد بن قاسم دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے تمام اہم شہروں کو فتح کرتا ہوا اور ہندو رعایا کو نوازتا ہوا شمال کی جانب دُور تک بڑھ گیا۔ جہاں اُس نے بجے رائے سے شدید مقابلہ کے بعد قلعہ سیسم پر قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد جنوب کی جانب بمقام بیرون واپس ہوا تاکہ مفتوحہ علاقوں کے انتظام کو مکمل کر سکے۔

ملک کے اندرونی انتظام سے فارغ ہونے کے بعد محمد بن قاسم راجہ داہر سے اُس کی شورش پسندی کا انتقام لینے کے لئے جنوب کی جانب بڑھا۔ جہاں دریا کے کنارے اُسے ہندو سپہ سالار موکا سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس معرکہ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور موکا مع تیس ہندو سرداروں کے محمد بن قاسم کے پاس چلا آیا۔ محمد بن قاسم نے حسب عادت موکا کی خوب مدارات کی اور جس حصہ ملک پر وہ حاکم تھا۔ اس کی سند حکومت موکا کو لکھ کر دیدی۔ اس کے علاوہ خلعت فاخرہ اور

بیحد مال و دولت موکا کو عطا کی۔

اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے دیبل کا انتظام ایک ہندو پنڈت کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ پنڈت مسلمانوں کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے محمد بن قاسم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس پنڈت کو "مولانا اسلامی" کا خطاب عطا کیا گیا اور سفیر بنا کر راجہ داہر کے پاس روانہ کیا گیا۔ اور راجہ داہر کو پیغام دیا گیا کہ یا تو راجہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لے ورنہ اسلامی لشکر سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے۔

راجہ داہر اس موقعہ پر بجائے اس کے کہ تدبر سے کام لیتا وہ مولانا اسلامی کے ساتھ نہایت سختی کے ساتھ پیش آیا۔ اور اس نے محمد بن قاسم سے کہلوا بھیجا کہ ہم اطاعت کے مقابلہ میں جنگ کو ترجیح دیتے ہیں اور لڑائی کے لئے بالکل تیار ہیں۔ اس جواب کے بعد ایک طرف راجہ داہر نے دریائے سندھ پر ایک بہت بڑی فوج بھیجدی اور دوسری جانب نہایت وسیع پیمانہ پر اس قسم کے انتظامات کر دیئے کہ محمد بن قاسم کسی طرح بھی دریائے سندھ کو عبور نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ راجہ داہر کی فوج نے سیوستان پر حملہ کر کے اُسے مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا لیکن مسلمانوں نے جلد ہی اُسے واپس لے لیا۔ غرضکہ راجہ داہر کی فوج میں اور اسلامی لشکر میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔

راجہ داہر اور اس کے سپہ سالاروں کا مقصد یہ تھا کہ وہ محمد بن قاسم کو دریائے سندھ کے پار ہی جنگ میں مصروف رکھیں تاکہ اسلامی فوجیں دریائے سندھ پار نہ کر سکیں لیکن محمد بن قاسم کے ماہرین جنگ نے بڑی سرعت کے ساتھ کشتیوں کا ایک ایسا پُل بنا لیا جس سے کہ اسلامی فوج بڑی تیزی کے ساتھ دریائے سندھ

کے پار پہنچی شروع ہو گئی۔ اسلامی لشکر کا دریائے سندھ کے پار پہنچنا تھا کہ راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ کی فوج جو دریا کے پار پڑی تھی گھبرا گئی۔ اور ایک بھگدڑ سی پچ گئی اس طرح راجہ داہر کو پہلے ہی بڑے معرکہ میں شکست ہو گئی۔

اس شکست کے بعد راجہ داہر نے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے اپنے مسلم دوست محمد علافی اور اس کی فوج کو بصورت مقدمۃ الجیش روانہ کیا۔ مگر محمد علافی کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب اسلامی لشکر آگے بڑھنے کے بعد جے وار میں مقیم ہو گیا۔ سامنے ہی راجہ داہر اپنے لشکر کو لئے ہوئے خیمہ زن تھا۔ داہر کی فوج میں پچیس تیس ہزار زرہ پوش سپاہی دس ہزار نیزہ بردار اور ساٹھ جنگی ہاتھی تھے۔ اور اسلامی لشکر کی کل تعداد پندرہ ہزار تھی۔ لیکن پھر بھی اُس نے آگے بڑھ کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ راجہ داہر اور اس کی فوج نے بھی بڑی ہمت اور مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا دو دن تک دونوں لشکروں میں زبردست معرکہ جنگ جاری رہا۔ آخر کار تیسرے روز راجہ داہر کی فوج کے پیر اُکھڑ گئے۔ لیکن راجہ داہر ایک ہزار سپاہیوں کے ہمراہ اب بھی میدان میں ڈٹا رہا۔ اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ راجہ داہر کے مارے جانے پر بہت سے برہمنوں۔ ہندوؤں اور فوجی سرداروں نے اپنے آپ کو محمد بن قاسم کی خدمت میں پیش کر دیا اور اسلام قبول کر لیا۔

محمد بن قاسم نے دوسرے دن ایک عام دربار منعقد کرنے کے بعد اپنی حکومت کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ:-

"ہماری حکومت میں ہر شخص مذہبی معاملہ میں آزاد ہو گا۔ جو شخص چاہے اسلام قبول کرلے۔ اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہو گا۔ جو شخص اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے گا۔ اس سے بھی ایک معمولی ٹیکس جزیہ کے نام سے

وصول کیا جائے گا۔ اور جو مسلمان ہو جائے گا اس کو بھی ایک ٹیکس زکوٰۃ کے نام سے ادا کرنا ہو گا۔"

برہمن آباد۔ الور اور ملتان کی فتح

راجہ داہر کے مرنے کے بعد راجہ داہر کا وزیر سی ساگر۔ راجہ کا دوست محمد علافی۔ راجہ کا بیٹا جے سیہ۔ راجہ کی بیوی مائی جو راجہ کی حقیقی بہن بھی تھی اور راجہ کے تمام رشتہ دار، سردار اور امراء نے قلعہ روہڑی میں جمع ہونے کے بعد اس پر غور کیا کہ آئندہ کونسا قدم اُٹھایا جائے۔ راجہ کی بیوی مائی نے تو ستی ہو جانے کا فیصلہ کیا اور وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ چتا میں بیٹھ کر ستی ہو گئی۔ اور باقی لوگوں نے وزیر سی ساگر اور محمد علافی کی اس رائے پر عمل کیا کہ برہمن آباد میں پہنچ کر فوج جمع کی جائے اور مسلمانوں کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ برہمن آباد پہنچنے کے بعد زبردست فوجی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اُدھر محمد بن قاسم نے برہمن آباد اور ان شہروں میں جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے۔ یہ اعلان کرا دیا کہ "جو لوگ اطاعت قبول کر لیں گے اور پُر امن رہیں گے۔ ان کو عام معافی دی جائے گی"۔

داہر کے وزیر سی ساگر نے اس اعلان سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اپنا معتمد محمد بن قاسم کے پاس بھیجا اور اپنی اطاعت شعاری کا وعدہ کیا جس پر محمد بن قاسم نے سی ساگر کے نام کا امان نامہ لکھ کر معتمد کو دیدیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن آباد پر حملہ کیا تو وزیر سی ساگر کی بے حد عزت افزائی کی۔ اور اسے وزارت عظمیٰ کا سب سے بڑا عہدہ عطا کر دیا۔ ادھر راجہ کا بیٹا جے سیہ برہمن آباد کے قلعہ میں محصور ہونے کے بعد اسلامی لشکر کا چھ مہینے تک مقابلہ کرتا رہا۔ اس مقابلہ میں محمد علافی بھی جے سیہ کے ساتھ تھا لیکن جب ان دونوں نے یہ دیکھا کہ اسلامی لشکر پر فتح پانا ناممکن ہے تو جے سیہ اور علافی دونوں برہمن آباد

سے فرار ہو گئے۔

جے سیہ کے چلے جانے کے بعد برہمن آباد کے باشندوں نے محمد بن قاسم کے پاس درخواست بھیجی کہ اگر ہم کو جان و مال کی امان دیدی جائے تو ہم شہر کا دروازہ کھولدینگے۔ محمد بن قاسم نے ان کی درخواست منظور کرلی۔ اور شہر کا دروازہ کھل گیا دروازہ کے کھلتے ہی جوں ہی اسلامی فوج برہمن آباد میں داخل ہوئی تو راجہ کی باقی فوج نے بھی بھاگنا شروع کردیا مگر راجہ داہر کی دوسری بیوی "رانی لادی" آخر وقت تک مقابلہ کرتی رہی۔ اور مقابلہ کرتے ہوئے گرفتار ہو گئی۔ جب اُسے محمد بن قاسم کے رُوبرو پیش کیا گیا تو اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد محمد بن قاسم سے نکاح کرلیا۔ تمام جنگی قیدی رہا کر دئے گئے اور عوام کو ہر قسم کی مذہبی اور تمدنی آزادی عطا کردی گئی۔

برہمن آباد کے اہم مورچہ کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم مقام سستھ کی جانب متوجہ ہوا تو یہاں کے باشندوں نے بھی لڑنے کی بجائے محمد بن قاسم کا پرجوش طریقہ پر استقبال کیا۔ محمد بن قاسم نے ان کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا۔ اسکے بعد محمد بن قاسم نے الور کی جانب رُخ کیا۔ جہاں راجہ داہر کا چھوٹا بیٹا فیوفی حکمرانی کر رہا تھا۔ اسلامی لشکر شہر کے باہر خیمہ زن ہو گیا۔ الور کے باشندوں نے مشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ برہمن آباد کے باشندوں کی طرح مسلمانوں سے جان و مال کی امان مانگ لینا ہی بہتر ہے۔

راجہ داہر کے بیٹے کو جب عوام کے ان ارادوں کا علم ہوا تو وہ الور سے فرار ہو گیا۔ چنانچہ الور کے باشندوں کی خواہش کے مطابق محمد بن قاسم نے ان کو جان و مال کی حفاظت دیدی اور الور پر بغیر لڑے اسلامی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ تسخیر الور کے بعد محمد بن قاسم قلعہ بابیہ کی جانب روانہ ہوا۔ جو دریائے

بیاس کے جنوبی کنارے پر واقع تھا۔ اس قلعہ میں راجہ داہر کا چچازاد بھائی کاکسا بن
چندر بن سیلائج تھا۔ یہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ اور محمد بن قاسم کے
رویہ نے اسے پہلے ہی سے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ محمد بن قاسم جب اس
قلعہ کے قریب پہنچا تو "کاکسا" نے بلا تکلف قلعہ کے دروازے کھول دئے
محمد بن قاسم نے اس کی عزت افزائی کرتے ہوئے اس کو ایک طرف وزیر خزانہ
کا عہدہ عطا کیا۔ دوسری جانب اپنا مصاحب اور سپہ سالار بھی بنا دیا۔

ملک سندھ کے تمام اہم مقامات اور شہروں پر اب مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا
تھا صرف ملتان باقی رہ گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے ملتان کی فتح سے قبل دریائے
بیاس پار کر کے قلعہ اسکلندہ فتح کیا۔ اس کے بعد قلعہ سکہ پر حملہ کیا جو دریائے
راوی کے جنوب میں تھا۔ اس قلعہ کی فتح کے بعد ملتان کا محاصرہ شروع کیا۔
یہاں کا حاکم کاکسا کا بھائی گورسیہ تھا۔ جو دو مہینے تک محصور رہ کر لشکرِ اسلام
کا مقابلہ کرتا رہا۔ مگر اس کے بعد فرار ہو کر کشمیر چلا گیا تو اسلامی فوجوں کا ملتان
پر بھی قبضہ ہو گیا۔ دوسرے شہروں کی طرح اس شہر کے باشندوں کو بھی جان و مال
کی امان دیدی گئی۔ اور شہر کے معززین کو محمد بن قاسم نے حسبِ عادت خوب نوازا۔

سندھ کے پورے ملک پر مسلمانوں کا قبضہ

ملتان کی فتح کے بعد پورے ملک
سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا
تھا۔ اس موقعہ پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس زمانہ کا ملک سندھ موجودہ
زمانہ کے صوبہ سندھ سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ اس زمانہ کے سندھ کی وسعت
کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مغرب میں بلوچستان اور مکران تک
پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں کاٹھیاواڑ گجرات اور بحرِ عرب تک اس کی سرحدیں
پھیلی ہوئی تھیں۔ مشرق میں موجودہ ملک مالوہ کے وسط اور راجپوتانہ تک

یہ وسیع تھا اور شمال میں ملتان سے اُوپر گزر کر جنوبی پنجاب کے اندر تک چلا گیا تھا۔ نیز صوبہ سرحد کا بھی ایک حصّہ اسمیں شامل تھا۔ گویا آج سے بارہ سو برس پہلے کا سندھ ایک ایسا ملک تھا۔ جو موجودہ مغربی پاکستان سے بھی بڑا تھا۔ اور جسمیں بلوچستان۔ مکران۔ صوبہ سندھ۔ صوبہ سرحد کا ایک حصّہ۔ صوبہ پنجاب کا بیشتر حصّہ۔ مالوہ۔ راجپوتانہ۔ کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ شامل تھے۔

سندھ کے باشندوں کا قبولِ اسلام

یوں تو اسلام محمد بن قاسم کے حملہ سے قبل ہی سندھ میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا لیکن محمد بن قاسم کے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد سندھ کے باشندوں کی اسلام سے دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محمد بن قاسم اور اس کے عمال نے سندھ کے ہندو باشندوں کے ساتھ اس قدر شریفانہ اور نرمی کا برتاؤ کیا تھا کہ ان کے دلوں میں محمد بن قاسم اور مسلمانوں کی عزت اور محبت خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے سرزمینِ ہند پر قدم رکھنے کے بعد سے لیکر فتح ملتان تک لاکھوں سندھ کے باشندے بخوشی اسلام قبول کر چکے تھے۔

محمد بن قاسم نے جس وقت سندھ کا معرکہ شروع کیا تھا۔ اس وقت محمد بن قاسم کے ساتھ بارہ ہزار شامی اور عراقی سپاہی تھے۔ جن کی بڑی تعداد مختلف جنگوں میں کام آ چکی تھی۔ لیکن پھر بھی فتح ملتان کے وقت محمد بن قاسم کی فوج میں پچاس ہزار سپاہی موجود تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب کے سب تقریباً نومسلم تھے جنہوں نے بخوشی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی زندگیاں اسلامی سلطنت کے لئے وقف کر دی تھیں۔ محمد بن قاسم کے دورِ حکومت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے یا اس کے عمال نے کسی ایک ہندو کو بھی اسلام

قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ اور اس کی وسیع نظری کا یہ عالم تھا کہ عمال مقرر
کرتے وقت اس کے سامنے ہندو یا مسلم کا کوئی سوال نہ تھا۔ چنانچہ اس نے
دیبل یعنی کراچی کا حاکم ایک پنڈت کو مقرر کیا جو بعد کو بخوشی مسلمان ہو گیا۔ اور
مولٰنا اسلامی کہلایا۔ اس پنڈت کے علاوہ کاکا۔ موکا یسی ساگر۔ کاکسا
وغیرہ کو غیر مسلم ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے عہدے عطا کئے گئے۔
محمد بن قاسم کو اپنے ان ہندو وزرا اور عمال پر اس قدر اعتماد تھا کہ ان کے
مشورہ کے بغیر محمد بن قاسم ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ محمد بن قاسم نے جس رواداری کا ثبوت دیا ہے
وہ اس کی سیاست دانی کا بہترین نمونہ ہے۔ محمد بن قاسم کی اس رواداری
مذہبی آزادی اور حسن سلوک ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے ایک
بہت بڑے ملک کے کئی کروڑ باشندوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ محمد بن قاسم
نے اگر رحم و مروت اور رواداری کے بجائے بزور شمشیر لوگوں کو مسلمان کیا
ہوتا تو اُسے نہ تو اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں کامیابی ہوتی اور نہ اُس کے
چلے جانے کے بعد نومسلم دائرہ اسلام میں قائم رہتے۔ چنانچہ محمد بن قاسم
کے سندھ سے جانے کے بعد ایک بھی ایسی مثال نہیں ہے کہ کسی نومسلم نے دین
اسلام چھوڑا ہو بلکہ دین اسلام کے ماننے والوں کی تعداد محمد بن قاسم کے
چلے جانیکے بعد اور بھی زیادہ بڑھتی چلی گئی۔ محمد بن قاسم نے اپنے دور حکومت
میں جہاں سندھ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ وہاں
مندروں کی تعمیر میں بھی کھلے دل کے ساتھ امداد دی۔ غرضکہ محمد بن قاسم ایک ایسا
لائق سیاستدان تھا جسکی رواداری کو مسلمانوں کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

محمد بن قاسم کی معزولی اور قتل

۹۵ھ (۱۶-۷۱۴ء) میں جبکہ محمد بن قاسم

ملتان کی فتح سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اُسے یہ دلخراش خبر ملی کہ اس کا خسر یعنی ممالک شرقیہ کا وائسرائے حجاج بن یوسف فوت ہو گیا ہے۔ حجاج بن یوسف خلیفہ ولید بن عبدالملک کا دستِ راست تھا۔ حجاج کے مرنے کے بعد خلیفہ کے حوصلے پست ہو گئے۔ چنانچہ اس نے ممالک شرقیہ کے تمام گورنروں کے نام احکامات بھیجدیئے تھے کہ اب تم اپنی فتوحات اور پیش قدمیوں کو روک دو۔ اس حکم کے ملنے کے بعد محمد بن قاسم نے بھی اپنی تمام پیش قدمیاں روکدی تھیں حالانکہ فتح سندھ کے بعد محمد بن قاسم کا پروگرام یہ تھا کہ وہ کشمیر، قنوج اور مشرقی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کرے اور یہ امر واقعہ ہے کہ اگر حجاج بن یوسف کی موت نہ واقع ہوتی اور محمد بن قاسم کی پیش قدمیوں کو نہ روکدیا گیا ہوتا تو چند سال کے اندر یہ بہادر سپہ سالار سارے ہندوستان کو فتح کر چکا ہوتا۔

محمد بن قاسم کی طرح چین کے سپہ سالار قتیبہ بن مسلمہ کو بھی پیش قدمی سے روک دیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ چین کے لئے دوسرا محمد بن قاسم ثابت ہو رہا تھا۔ غرضیکہ حجاج بن یوسف کے مرتے ہی مشرقی ممالک میں مسلمانوں کی پیش قدمیاں رُک گئیں۔ اس کے علاوہ حجاج بن یوسف کی موت کے سات مہینے بعد ۹۶ھ (۷۱۵ء) میں نیا حادثہ پیش آیا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی فوت ہو گیا۔ اور خلیفہ کا بھائی سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہو گیا۔

سلیمان بن عبدالملک۔ حجاج بن یوسف۔ محمد بن قاسم قتیبہ بن مسلمہ اور ان تمام سپہ سالاروں اور گورنروں کا شدید مخالف تھا۔ جن کو کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں عروج حاصل تھا۔ اور اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ ولید اپنے بھائی سلیمان کی بجائے اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانے کے لئے جوڑ توڑ

کرتا رہا تھا۔ اور یہ تمام سپہ سالار اور گورنر ولید کے اس فعل کے حق میں تھے چنانچہ سلیمان نے
تخت پر بیٹھتے ہی اپنے مخالفین سے انتقام لینا شروع کر دیا۔ اور اسی انتقام کا یہ افسوسناک نتیجہ
تھا کہ سلیمان نے قیتبہ بن مسلمہ اور محمد بن قاسم کو پہلے تو انکے عہدوں سے معزول کیا۔ اسکے بعد ان
دونوں کو واپس بلا کر قتل کرا دیا۔ گویا ولید اور سلیمان کی ذاتی عداوت نے خلافتِ اسلامیہ
کو ایسے لائق سپہ سالاروں اور گورنروں سے محروم کر دیا جو اگر زندہ اور برقرار رہتے تو نہ صرف
چین اور ہندوستان میں بلکہ تمام شرقی ممالک میں اسلامی حکومتیں قائم ہو جائیں۔

سندھ میں مسلمانوں نے کس طرح حکومت کی

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں کے بارے میں اغراض پسندوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مسلمان نہایت جابر تھے۔ ظالم تھے
ہندوؤں کے دشمن تھے لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہندوستان
میں مسلمانوں نے کیسی رواداری کے ساتھ حکومت کی ہے۔ اس کا اندازہ ہندوستان
میں مسلمانوں کی سب سے پہلی سلطنت "حکومتِ سندھ" کے حالات سے بخوبی
ہو سکتا ہے۔ سندھ کی اسلامی حکومت کا سب سے پہلا اصول یہ تھا کہ کسی کے مذہبی معاملہ
میں مداخلت نہ کی جائے۔ چنانچہ سندھ کے ہندوؤں اور بدھوؤں کو پوری
آزادی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں پوجا پاٹ کریں۔ اس کے علاوہ سندھ کی
اسلامی حکومت مندروں کی مرمت کو بھی اپنا سیاسی فرض خیال کرتی تھی۔
اس فرض کے پیشِ نظر برہمن آباد۔ ملتان الور اور دیگر مقامات پر اسلامی خزانہ
سے مندروں کی مرمت کرائی جاتی تھی۔

حکومت کے عمال اور سپاہیوں کے نام احکامات جاری ہو چکے تھے کہ
وہ عوام کی جان و مال اور آبرو کا پوری طرح تحفظ کریں۔ اسی لئے سندھ کے
اس عظیم الشان انقلاب میں کسی ایک ہندو عورت کی بے آبروئی کا ایک واقعہ بھی

پیش نہیں آیا۔ بلکہ ہر جگہ عورتوں کی آبرو کا پورا پورا احترام کیا گیا۔ ہندو اُمرا اور جاگیرداروں کی سندھ کی اسلامی حکومت کی جانب سے پوری طرح عزت افزائی کی جاتی تھی۔ خزانہ کا بیشتر حصہ رعایا کی بہبود اور فلاح کے لئے خرچ کیا جاتا تھا۔ کاشتکاروں۔ کاریگروں۔ صناعوں اور سوداگروں کو مالی امداد دی جاتی تھی اور ملک کے اصلی باشندوں یعنی ہندوؤں اور بدھوں کو بھی حکمرانی میں آپ کا حصہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ تمام بڑے بڑے عہدوں پر غیر مسلم ہی قابض تھے غرضکہ مسلمانوں نے سندھ میں جس رواداری کے ساتھ حکومت کی ہے۔ اور جس طرح غیر مسلموں کی دلداری کی ہے۔ وہ کبھی اس سے قبل ہندو حکومتوں میں بھی نہیں ہوئی تھی۔

مسلمانوں کی اسی رواداری کا یہ نتیجہ تھا کہ جب محمد بن قاسم سندھ سے روانہ ہوا تو سارے ملک میں رنج اور غم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ شہر کیرج کے ہندوؤں اور بدھوں نے تو محمد بن قاسم کے چلے جانے کے بعد اس کی یاد میں اس کا ایک بُت بنا لیا تھا۔ اور اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔

محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی حکومت

محمد بن قاسم کے بعد سندھ کا نیا گورنر یزید بن ابی کبشہ بنایا گیا۔ لیکن اسے عہدہ کا چارج لئے صرف اٹھارہ دن ہوئے تھے کہ فوت ہو گیا۔ یزید کے مرتے ہی راجہ داہر کے بیٹے راجہ جے سیہ نے اپنی حکومت کو واپس لینے کی جدوجہد شروع کر دی۔ چنانچہ اُس نے اچانک برہمن آباد پر حملہ کر کے اُس پر قبضہ جما لیا۔ شامی اور عراقی مسلمان اور محمد بن قاسم کے پرانے ساتھی اگر چاہتے تو جے سیہ کو شکست دے سکتے تھے لیکن محمد بن قاسم کے قتل نے سب کو دربارِ خلافت سے متنفر کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ داہر کے بیٹے کی حکومت پھر برہمن آباد میں قائم ہو گئی باقی ملک پر بدستور مسلمانوں کا قبضہ رہا۔

ابی کبشہ کے بعد عامر بن عبد اللہ کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن وہ بھی بہت جلد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد حبیب بن مہلب کو یہ عہدہ تفویض کیا گیا۔ حبیب ابھی صرف چند مختار راجاؤں کو مطیع کر سکا تھا کہ اسے واپس بلا لیا گیا۔ اس کے جاتے ہی راجہ داہر کے بیٹے بھتیجوں اور رشتہ داروں نے سندھ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں۔ غرضکہ سندھ کا اسلامی نظام حکومت بالکل درہم برہم ہو گیا۔

سندھ حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہدِ خلافت میں

خلیفہ سلیمان بن عبد الملک تقریباً تین سال حکومت کرنے کے بعد ۹۹ھ (۷۱۷ء) میں فوت ہو گیا۔ اور اس کی جگہ حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ مقرر ہوئے۔ محمد بن قاسم کے بعد سے اس وقت

تک تقریباً تیس سال گذر چکے تھے۔ ان تیس سال میں سندھ کا نظام بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ نئے نئے گورنر برابر یہاں آتے رہے اور سندھ میں نئے نئے راجہ خود مختاری کا اعلان کرتے رہے۔ غرضکہ خلیفہ سلیمان کا دورِ حکومت سندھ کے لئے بالکل ناکارہ ثابت ہوا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے سندھ کی جانب توجہ کی اور عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کا گورنر مقرر کر کے بھیجا۔ عمر بن مسلم باہلی کی گورنری کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں سندھ کی اسلامی حکومت کے سب سے بڑے مخالف راجہ داہر کے بیٹے راجہ جے سیہ نے بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی باقی تمام راجہ بھی جو راجہ جے سیہ کے رشتہ دار تھے مسلمان ہو گئے۔ ان راجاؤں کے مسلمان ہونے کا عوام پر گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ لاکھوں غیر مسلم سندھیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان راجاؤں کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی ریاستیں ان ہی کے پاس چھوڑ دی گئیں۔ اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔ گویا ان راجاؤں کے اسلام قبول کرنے کے بعد سندھ کا ایک بڑا حصہ پھر اپنے حکمراں خاندان کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ صرف خلافتِ اسلامیہ کی ان راجاؤں پر سیادت باقی رہ گئی۔ ورنہ یہ اپنی ریاستوں میں بالکل خود مختار تھے۔ ہاں ملک سندھ کا ایک حصہ ضرور گورنر سندھ کے زیرِ حکومت تھا۔

سندھ کا ایک تشدد پسند گورنر

سنہ ۱۰۱ھ (سنہ ۷۲۰ء) میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد جب یزید بن عبدالملک تختِ خلافت پر بیٹھا تو اُس نے جُنید بن عبدالرحمٰن کو جو کہ ایک نہایت ہی تشدد پسند حاکم تھا۔ سندھ کا گورنر بنا کر بھیجدیا جنید نے سندھ میں

قدم رکھتے ہی تشدد اور طاقت کے ذریعہ ماتحت راجاؤں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ اس نے گجرات اور اُجین کے راجاؤں کو بذریعہ طاقت خراج گذار بنا لیا۔ اس کے بعد نو مسلم راجہ جے سیہ کے علاقہ میں بھی بلا وجہ اس گورنر نے فوجیں اُتار دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نو مسلم راجہ جے سیہ اور جنید بن عبدالرحمٰن میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور اس جنگ میں راجہ جے سیہ مارا گیا۔ اس افسوسناک حادثہ کے بعد نو مسلم راجہ جے سیہ کا بھائی خلیفہ اسلام سے گورنر کے ظلم و ستم کی شکایت کرنے اور بھائی کا قصاص طلب کرنے کے لئے دمشق کی جانب روانہ ہوا تو جنید نے اُسے نہایت عیاری کے ساتھ دھوکہ دیکر بُلوایا اور قتل کر دیا۔

سندھ کے اسلامی گورنر جنید کے ہاتھوں سندھ کے نو مسلم راجہ جے سیہ کا بلاوجہ قتل اور پھر عیاری کے ساتھ راجہ کے بھائی کو دھوکہ دے کر ہلاک کرنا ایک ایسا مذموم فعل تھا جس کا عوام پر بہت بُرا اثر پڑا۔ اور لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ اب مسلمانوں میں اپنے قول اور عہد کا پاس نہیں رہا۔ چنانچہ سندھیوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات اس نا اہل گورنر کی وجہ سے پھیلنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے نو مسلموں نے اسلام ترک کر دیا۔

سندھ میں عام شورش اور بے چینی

خلیفہ ہشام بن عبدالملک جو یزید بن عبدالملک کی موت کے بعد سنہ ۱۰۵ھ (سنہ ۷۲۴ء) میں خلیفہ بن چکا تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ جنید کی تشدد پسندی اور بے عقلی کی وجہ سے سندھ میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے تو اس نے سنہ ۱۰۷ھ (سنہ ۷۲۵ء) میں جنید کو سندھ کی گورنری سے معزول کر کے ایک نہایت ہی نرم دل حاکم تمیم بن زیاد کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا لیکن نو مسلم راجہ جے سیہ اور اسکے

بھائی کے قتل کی وجہ سے سندھیوں میں جو ناگواری پیدا ہو گئی تھی وہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔ اتفاق دیکھیئے کہ نئے گورنر تمیم کا بھی سندھ آتے ہی اچانک انتقال ہو گیا یعنی اسے ملک کے انتظام کا موقعہ ہی نہیں مل سکا۔ گورنر تمیم کے مرنے کے بعد کافی عرصہ تک سندھ میں کوئی بھی اسلامی گورنر نہیں رہ سکا۔ اس زمانہ میں شورش اور بھی بڑھ گئی۔ نومسلم راجاؤں نے برہمنوں کے ساتھ مل کر حکومتِ اسلامیہ کے خلاف بغاوت شروع کر دی اور نومسلم روسا بھی مُرتد ہونے لگے۔ غرضکہ سندھ کی حالت ناگفتہ بہہ ہو گئی۔

خلافتِ اسلامیہ نے جب سندھ کی یہ نازک حالت دیکھی تو ۱۱۰ھ (۷۲۹ء) میں عوانہ کلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا تاکہ وہ سندھ کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کرے۔ عوانہ کلبی نے سندھ پہنچکر ان شامیوں اور عراقیوں کو نئے سرے سے جمع کیا جو سندھ میں آباد ہو گئے تھے انکی ایک مضبوط فوج بنائی جس کو عمر بن محمد قاسم کی سپہ سالاری میں دیدیا تاکہ وہ باغیوں کو کچلے۔

عمر بن محمد۔ محمد بن قاسم کا وہ لڑکا تھا جو راجہ داہر کی بیوہ رانی لادی سے پیدا ہوا تھا۔ اور جسے محمد بن قاسم ہندوستان جاتے ہوئے سندھ میں چھوڑ گیا تھا۔ عمر بن محمد کی عمر اگرچہ اس وقت صرف سترہ اٹھارہ سال کی تھی لیکن اس نے اپنی غیر معمولی بہادری اور جرات سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے باپ کا سچا جانشین ہے۔ عمر نے فتح پر فتح حاصل کر کے دوبارہ مسلمانوں کی جرات کے افسانوں کی یاد تازہ کر دی۔ اس نے مختصر سے عرصہ میں خلافتِ اسلامیہ کے تمام سرکشوں اور باغیوں کو مطیع و فرمانبردار بنا دیا۔

عمر کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ سندھ کے تمام راجہ اور رؤسا کے دلوں میں اب بھی محمد بن قاسم کی محبت اور عظمت جاگزیں تھی۔ اور سب کے سب اس کے بیٹے عمر کا احترام کرتے تھے۔ غرضکہ عمر بن محمد نے نئے سرے سے

سندھ کے بیشتر حصہ کو خلافتِ اسلامیہ کا مطیع بنا دیا۔ اس اہم کارنامہ سے فارغ
ہونے کے بعد عمر بن محمد نے دریا کے کنارے منصورہ کے نام سے ایک نیا شہر سندھ
میں آباد کیا جو مدتوں سندھ کا پایہ تخت شمار ہوتا رہا ہے۔

خلیفہ ہشام نے عمر بن محمد کی بہادری اور تدبر سے متاثر ہو کر ۱۲۰ھ
(۷۳۸ء) میں عوانہ بن کلبی کی موت پر عمر کو سندھ کی گورنری کی سند عطا کر دی لیکن خلافت
اسلامیہ عمر بن محمد کی قابلیت اور تدبر سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکی۔ کیونکہ ۱۲۶ھ
(۷۴۴ء) میں لائق باپ کا یہ لائق بیٹا فوت ہو گیا۔ عمر کے مرتے ہی سندھ میں
پھر شورش اور بغاوتیں برپا ہونے لگیں اور عمر کے مرنے کے بعد چند سال بعد
۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں خلافت بنی امیہ کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ اور اس کی جگہ
خلافتِ عباسیہ قائم ہو گئی۔

سندھ کے اسلامی گورنر کی بغاوت

خلافتِ بنو امیہ کے ماتحت سندھ میں تقریباً ۴۲ سال متعدد اسلامی
گورنروں نے حکومت کی لیکن اس ۴۲ سال میں کسی ایک گورنر نے بھی کبھی مرکزی حکومت
سے بغاوت نہیں کی لیکن خلافت بنو امیہ کے ختم ہوتے ہی اس زمانہ کے سندھ کے
اسلامی گورنر منصور نے جو اموی خلیفہ کا مقرر کردہ تھا۔ عباسی خلیفہ کو تسلیم کرنے سے
انکار کرتے ہوئے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ منصور کے علاوہ سندھ کے
شامی بھی جو اموی خلافت کے حامی تھے۔ سب کے سب منصور کی حمایت اور
اعانت کے لئے آمادہ ہو گئے۔

منصور کی اس بغاوت کی اطلاع جب عباسیوں کو ہوئی تو عباسی وائسرائے
ابو مسلم خراسانی نے عبدالرحمن نامی ایک سردار کو اس مقصد کے لئے سندھ روانہ کیا کہ
وہ منصور کو معزول کر کے سندھ کی گورنری کا عہدہ سنبھال لے لیکن منصور نے پوری

طاقت کے ساتھ عبدالرحمٰن کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں عبدالرحمٰن مارا گیا۔ عبدالرحمٰن کی موت کے بعد ابو مسلم خراسانی نے موسیٰ بن کعب کو ایک بڑی فوج دیکر منصور کی سرکوبی کے لئے سندھ روانہ کیا۔ منصور نے موسیٰ کا بھی بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن مارا گیا۔ منصور کے مرتے ہی منصور کے ہمنوا اور شامی سردار سندھ سے فرار ہو گئے۔ اور بلوچستان کے قریب کی پہاڑیوں میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے۔ اور یہ بغاوت ختم ہو گئی۔

خلافتِ عباسیہ میں سندھ کی حالت

سندھ کے پہلے عباسی گورنر موسیٰ بن کعب نے سندھ کی تقریباً تمام بغاوتوں کو دباتے کے بعد سندھ کے راجاؤں کو عباسی خلیفہ عبداللہ بن سفاح کی اطاعت کے لئے آمادہ کر لیا اور اس طرح ۱۳۴ھ (۷۵۳ء) میں ملک سندھ خلافتِ عباسیہ کی حدود مملکت میں شامل ہو گیا۔ موسیٰ بن کعب سندھ میں بڑی قابلیت کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد ۱۴۱ھ (۷۵۹ء) میں سندھ میں فوت ہو گیا۔ موسیٰ بن کعب کے انتقال کے وقت خلیفہ منصور عباسی کو دورِ حکومت تھا۔ منصور عباسی نے پہلے تو موسیٰ کے بیٹے عینیہ بن موسیٰ کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن سال بھر کے بعد اس کو معزول کر کے عمر بن حفص کو یہ عہدہ تفویض کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب خلافت سادات کی تحریک حجاز و عراق میں زور پکڑ رہی تھی۔ اور اس تحریک نے خلافت عباسیہ کو سراسیمہ اور پریشان کر رکھا تھا۔ چنانچہ خلافت سادات کی تحریک کے رہنما محمد المہدی نے اپنے بیٹے عبداللہ اشترؒ کو سندھ روانہ کیا تاکہ وہاں کے گورنر کو خلافتِ سادات میں شامل ہونے کی دعوت دے۔

سندھ کا گورنر عمر بن حفص جو پہلے ہی شیعیت کی جانب رجوع تھا۔ اس نے عبداللہ اشتر کی دعوت کو بخوشی قبول کرتے ہوئے محمد المہدی کی بیعت اختیار کر لی اور خلافتِ

عباسیہ سے قطع تعلق کرنے کے بعد محمد المہدی کی خلافت کے لئے جد وجہد شروع کر دی لیکن اسی دوران میں محمد المہدی کو قتل کر دیا گیا۔ عبد اللہ اُشتر نے باپ کے قتل کی خبر سُنی تو وہ سندھ کے ایک سرحدی راجہ کی حکومت میں چلا گیا۔ یہ راجہ رسول اللہ صلعم سے بے حد محبت رکھتا تھا۔ اس نے عبد اللہ اختر کی بے حد تعظیم و تکریم کی یہاں تک کہ اپنی بیٹی کی شادی بھی عبد اللہ اُشتر کے ساتھ کر دی۔

خلیفہ منصور کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے عمر بن حفص کو معزول کر کے ہشام بن عمر کو سندھ کی گورنری کا پروانہ دے کر روانہ کر دیا ہشام نے سندھ پہنچنے کے بعد پہلے تو عبد اللہ اُشتر کو تلاش کر کے قتل کیا اور اس کی ہندوستانی بیوی اور کمسن لڑکے کو گرفتار کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد عبد اللہ اُشتر کے خسر یعنی سرحدی راجہ کے خلاف فوج کشی کر کے اسے بھی ہلاک کر دیا۔ اور اس کی ریاست کو سندھ کے ساتھ شامل کر لیا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد خلیفہ منصور ہشام سے بدظن ہو گیا اور اسے ۱۵۷ھ (۷۷۳ء) میں معزول کر کے معید بن خلیل کو سندھ کی گورنری کا عہدہ عطا کر دیا۔

معید کی گورنری کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ۱۵۸ھ (۷۷۴ء) میں خلیفہ منصور عباسی کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کی جگہ خلیفہ مہدی نے مسندِ خلافت سنبھال لی۔ اسی سال معید بن خلیل گورنر سندھ بھی فوت ہو گیا جس کے مرنے کے بعد خلیفہ مہدی نے رُوح بن حاتم کو سندھ کا گورنر مقرر کر دیا۔ روح بن حاتم کے بعد خلیفہ ہادی کے عہدِ خلافت میں سندھ کے گورنری کی ذمہ داری ابو تراب حاجی کو سپرد کی گئی۔ ۱۷۰ھ (۷۸۶ء) میں خلیفہ ہادی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور ہادی کی جگہ مسندِ خلافت عباسی خاندان کے مشہور فرمانروا ہارون الرشید نے سنبھال لی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ابو تراب حاجی کی موت کے بعد ۱۷۱ھ (۷۸۷ء) میں ابو العاص کو

سندھ کی گورنری کی سند عطا کر دی۔ تین سال کے بعد ۱۷۴ھ (۷۹۱ء) میں یہ اہم عہدہ اسحٰق بن سلیمان کو سپرد کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایک طرف خلافتِ عباسیہ معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی تھی اور دوسری طرف سندھ کے گورنر کو ہندوستان کے راجاؤں میں سب سے زیادہ اقتدار اور طاقت حاصل تھی۔ اسحٰق بن سلیمان نے مسلسل دس سال تک سندھ کی گورنری کے فرائض انجام دئے۔

اسحٰق کے بعد ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) میں داؤد بن یزید کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ داؤد ایک نہایت ہی علم دوست اور باتدبیر حاکم تھا۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں صوبہ سندھ کو خوب ترقی دی۔ اور اُسے علم و فضل کا بہت بڑا مرکز بنا دیا۔ داؤد بن یزید نے تقریباً اکیس سال سندھ میں گورنری کی اور غالباً یہ مدت سندھ کے گورنروں میں سب سے زیادہ طویل تھی۔ داؤد بن یزید کی گورنری ہی کے زمانہ میں خلیفہ ہارون رشید کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد امین الرشید قتل ہوا۔ اور مامون رشید نے مسندِ خلافت پر قبضہ جمایا۔ گویا داؤد نے تین خلفائے عباسیہ کا دور دیکھا ہے۔

داؤد اکیس سال گورنری کے فرائض انجام دینے کے بعد جب ۲۰۵ھ (۸۲۲ء) میں فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے بشیر بن داؤد کو سندھ کی حکومت سپرد کی گئی۔ لیکن بشیر بن داؤد نے دس ہزار درہم سالانہ رقم مرکزِ خلافت کو دینی بند کر دی جس پر اُسے معزول کر کے ۲۱۱ھ (۸۲۸ء) میں حاجب بن صالح کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا مگر بشیر بن داؤد نے اس نئے گورنر کو چارج دینے کی بجائے اس کا دو سال تک مقابلہ کیا۔ آخر غسان بن عباد نے ۲۱۳ھ (۸۳۰ء) میں بشیر بن داؤد پر قابو پانے کے بعد اسے خلیفہ مامون الرشید کی خدمت میں حاضر کیا۔ خلیفہ نے جب دیکھا کہ بشیر بن داؤد نے تمام روپیہ رعایا کی فلاح و بہبود پر صرف کیا ہے تو اس کا قصور معاف کر دیا۔

غسان بن عباد سندھ سے واپس ہوتے ہوئے سندھ کی گورنری کا قلمدان موسیٰ بن یحییٰ کو سپرد کر آیا تھا جس کو بعد میں مرکز سے گورنری کی سند روانہ کر دی گئی۔ ۲۱۸ھ (۸۳۳ء) میں مامون الرشید کے انتقال کے بعد معتصم بن ہارون مسند خلافت پر بیٹھا تو اس نے بھی موسیٰ بن یحییٰ کو بدستور سندھ کی حکومت پر برقرار رکھا۔ ۲۲۱ھ (۸۳۶ء) میں موسیٰ بن یحییٰ نے مرتے وقت اپنے بیٹے عمران بن موسیٰ کو وہاں کی حکومت سپرد کر دی اور خلیفہ نے بھی اس تقرر کو تسلیم کرتے ہوئے عمران کو گورنری کی سند عنایت کر دی۔ عمران کے زمانہ میں بلوچستان کے علاقہ میں جاٹوں نے بغاوت برپا کر دی تھی، جسے عمران نے بڑی ہوشیاری سے دبا دیا۔ دو سال کے بعد عمران فوت ہو گیا اور اس کی جگہ فضل بن ماہان کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ چند روز کے بعد جب وہ بھی مر گیا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے محمد بن فضل کو یہ عہدہ تفویض کیا گیا۔

محمد بن فضل جس کو جدید فتوحات کا بے حد شوق تھا۔ جب سمندری بیڑا لیکر مہاراشٹرا اور مالابار کی فتح کے لئے گیا ہوا تھا تو اس کے بھائی ماہان بن فضل نے سندھ پر قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مگر ماتحت راجاؤں نے متحد ہو کر اس کے خلاف یورش کر دی جس میں ماہان مارا گیا محمد بن فضل خلافت اسلامیہ کی جانب سے سندھ کا آخری گورنر ہوا ہے۔ اس کے بعد خلافت اسلامیہ کو اپنے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ وہ سندھ کے ماتحت حکمرانوں کی جانب توجہ کر سکتی۔

خلیفہ معتصم کے انتقال کے بعد ۲۲۷ھ (۸۴۲ء) میں خلافت عباسیہ میں بری طرح ابتری پھیل گئی جس کی وجہ سے مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے بعد سندھ میں جا بجا بہت سی خود مختار ریاستیں

قائم ہوگئیں۔ ان خود مختار حکمرانوں نے گورنر خراج ادا کرنا بند کر دیا تھا۔ مگر ہر ایک کی کوشش یہ ضرور تھی کہ دربارِ خلافت سے اس کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں باقی رہے لیکن پھر بھی ان میں سے ایک بھی ہندو یا مسلم حکمراں اس کے لئے آمادہ نہ تھا کہ وہ گورنر کا ماتحت بن کر رہے یعنی ۲۲۷ھ (۸۴۳ء) میں سندھ میں گورنروں کی حکومت کا سلسلہ ۱۳۵ سال کے بعد ختم ہوگیا یوں تو ۲۵۸ھ (۸۷۱ء) تک سندھ کے حکمراں دربارِ خلافت سے زبانی وفاداری کا اقرار کرتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں دربار خلافت کا اثر ۲۲۷ھ (۸۴۳ء) ہی میں ختم ہوگیا تھا اور اس ملک میں جا بجا ہندو اور مسلم خود مختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں جنمیں سے ملتان اور منصورہ کی دو بڑی اسلامی ریاستوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان دونوں اسلامی ریاستوں نے سندھ کے خود مختار ہندو راجاؤں سے بھی نہایت خوشگوار دوستانہ تعلقات قائم کر لئے تھے۔ اور یہ سب کے سب اپنی خود مختاری کے معاملہ میں بالکل متحد تھے۔

خلفائے عباسیہ کے ہندو راجاؤں سے تعلقات

خلفائے بنی اُمیہ نے سندھ پر تقریباً ۴۲ سال حکومت کی اور ان کے بعد خلفائے عباسیہ تقریباً ۹۲ سال تک سندھ پر حکمرانی کرتے رہے۔ خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس کے اس طویل دورِ حکومت میں ایک بھی واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جس میں مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی کا رنگ جھلکتا ہو۔ تقریباً تمام اسلامی گورنر انتہائی رواداری کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔ اسلامی گورنروں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں اور بدھوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ یہاں تک کہ خلافتِ اسلامیہ سرکاری روپیہ سے اور اپنے اہتمام سے مندروں کی تعمیر کا انتظام کرتی تھی۔ خلفائے بنو اُمیہ اور بنو عباس کے دورِ حکومت

میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہندو راجاؤں کو غیر معمولی اقتدار حاصل ہو گیا ہے۔ لیکن ان ہندو راجاؤں نے اقتدار حاصل ہونے کے بعد اپنی ریاستوں کے مسلمانوں سے مذہبی تعصب کی بنا پر کبھی بھی کوئی ناروا سلوک نہیں کیا۔ غرضکہ اس طویل زمانہ میں ملک سندھ کے ہندوؤں، مسلمانوں اور بدھوں کے تعلقات نہایت ہی خوشگوار رہے ہیں۔

اُس زمانہ کے ہندو اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہندو علما بغداد تک پہنچ چکے تھے اور مسلم علما ہندو راجاؤں کے درباروں کی رونق بنے ہوئے تھے۔ خلیفہ بغداد ہارون الرشید جس کے تعلقات قنوج کے راجہ سے دوستانہ تھے اس کو خلیفہ نے "ملک الہند" کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ جب خلیفہ ہارون الرشید زیادہ بیمار ہوا تو اس نے سندھ کے گورنر کی معرفت قنوج کے راجہ کے طبیبِ خاص مانک چند کو بلوا بھیجا۔ جو زمانہ دراز تک بغداد میں رہ کر خلیفہ کا علاج کرتا رہا۔ ان واقعات سے یہ چیز صاف طور پر عیاں ہے کہ اس زمانہ میں عوام کے علاوہ ہندو اور مسلم حکمرانوں کے تعلقات بھی کس قدر خوشگوار اور دوستانہ تھے۔

ہندو اور مسلمانوں کے ان مخلصانہ تعلقات کو دیکھتے ہوئے متعصب مورخین کا یہ کہنا کہ مسلمانوں نے سندھ میں اسلامی حکومت قائم کر کے لاکھوں ہندوؤں اور بدھوں کو بالجبر مسلمان کیا اور مندروں کو توڑا۔ خود ہی غور فرما لیجیے کہ کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں اسلام کو سب سے زیادہ فروغ اس لئے حاصل ہوا کہ ایک طرف تو خلفائے اسلام اور ان کے گورنروں نے ماتحت ہندو حکمرانوں اور ہندو عوام کے ساتھ انتہائی رواداری کا ثبوت دیا۔ دوسری طرف سندھ کے باشندے اسلام کی خوبیاں دیکھ کر بخوشی اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ بقول متعصب ہندو مورخین کے اگر مسلمانوں نے بزورِ شمشیر غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کیا ہوتا تو کیا ۱۲۵ سال کے طویل عرصہ تک ہندوؤں اور مسلمانوں اور بدھوں میں

کے تعلقات ایسے ہی خوشگوار اور دوستانہ رہ سکتے تھے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے نہ اس ملک کے مندروں کو ڈھایا اور نہ اس ملک کے رہنے والوں کو خوف یا لالچ کے ذریعہ مسلمان بنانا چاہا۔ بلکہ انھوں نے عوام کے دلوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ اب رہیں وہ لڑائیاں جو اس ملک کے ہندو اور مسلم حکمرانوں میں ہوئیں تو وہ ایسے اسباب کی وجہ سے ہوئیں جن کی بنا پر ہندو۔ ہندوؤں سے اور مسلمان مسلمانوں سے لڑ سکتے تھے۔ اور لڑتے رہتے تھے۔ غرضکہ ان لڑائیوں کا سبب مذہبی تعصب یا اختلاف ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ یہ لڑائیاں محض ملک گیری کے جذبہ کے ماتحت لڑی گئیں۔

سندھ خلافتِ اسلامیہ سے علحدہ ہونیکے بعد

یہ بتایا جا چکا ہے کہ سنہ ۲۲۷ھ (سنہ ۸۴۳ء) کے بعد ملک سندھ متعدد خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور دربارِ خلافت کا اثر و اقتدار ان ریاستوں پر سے ختم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی سندھ کے خود مختار امرا سنہ ۲۵۸ھ (سنہ ۸۷۳ء) تک دربارِ خلافت کے ساتھ اپنی زبانی وفاداری کا محض اس لئے اقرار کرتے رہے۔ چونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اندرونی جھگڑوں سے فارغ ہونے کے بعد خلیفہ پھر سندھ پر حملہ کر دے اور ان کو اس خود مختاری کا مزا چکھنا پڑے لیکن سنہ ۲۵۸ھ (سنہ ۸۷۳ء) کے بعد جب سندھ کے خود مختار ہندو اور مسلم حکمرانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ اب خلافتِ اسلامیہ ان کا کچھ نہیں بنا سکتی تو پھر انھوں نے زبانی وفاداروں کو بھی ترک کر دیا۔

سندھ کی خود مختار ریاستوں میں ملتان اور منصورہ کی اسلامی ریاستوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ان دو اسلامی ریاستوں کے علاوہ اور بھی کئی ہندو اور مسلم خود مختار ریاستیں سندھ میں قائم تھیں۔ ان ریاستوں کے حکمران یا تو

محمد بن قاسم کے سرداروں کی اولاد میں سے تھے۔ یا ان ہندوؤں کی اولاد میں سے
تھے جن کو محمد بن قاسم اور سندھ کے دوسرے مسلم گورنروں نے اہم عہدے عطا
کئے تھے۔ ملتان کی ریاست ایک بہت بڑی ریاست تھی جسمیں بڑے بڑے
شہروں کے علاوہ ایک لاکھ سے زیادہ گاؤں تھے۔ اور ریاست منصورہ
اس سے بھی بڑی تھی۔ اسمیں کئی بڑے بڑے شہر اور تقریباً تین لاکھ گاؤں تھے۔

سندھ سے مسلم حکومت کا خاتمہ

ملتان اور منصورہ کی خود مختار اسلامی
ریاستوں پر ڈیڑھ سو برس تک مسلمان
حکومت کرتے رہے لیکن فتنہ پرداز قرامطہ کی ایک جماعت نے مکران کے راستہ
داخل ہو کر اور بلوچوں کو اپنے ساتھ ملاکر ریاست منصورہ پر یورش شروع
کر دی۔ اور ملتان کی مسلم ریاست کے حکمراں نے بھی مخالفین سے سازش
کر کے منصورہ پر حملہ کر دیا۔ امیر ملتان کا اس جنگ میں شریک ہونا تھا کہ سندھ
کی دوسری تمام ہندو ریاستیں بھی منصورہ کے خلاف آمادۂ پیکار ہو گئیں اور
اس طرح سندھ کی یہ سب سے بڑی مسلم ریاست مسلمانوں کی خانہ جنگی کی بدولت برباد
ہو گئی۔ منصورہ کا برباد ہونا تھا کہ سندھ میں اسلامی رُعب اور طاقت کا
زوال شروع ہو گیا اور منصورہ کا بیشتر حصہ ہندو ریاستوں کا جزو بن گیا۔

مسلم ریاست منصورہ کی تباہی کے بعد جب سندھ کی دوسری مسلم ریاست
ملتان کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں تو ملتان کے مسلم حکمراں کو پتہ چلا کہ
اس نے منصورہ کی ریاست کی تباہی میں حصہ لیکر کس طرح خود اپنی موت
کو دعوت دی ہے چنانچہ پنجاب کے راجہ جے پال اور سندھ کی ہندو ریاست
بھاٹیہ کے راجہ کی سازش سے ۳۸۵ھ (۹۹۵ء) میں سرحدی قبائل کے
سردار حمید خاں لودہی کو آگے بڑھا کر اس سے ملتان پر حملہ کرا دیا گیا۔ بشر

حمید خاں لودھی کو فوجی اور مالی امداد ان ہی راجاؤں نے دی تھی۔ اس حملہ کے بعد سندھ کی یہ دوسری مسلم ریاست بھی ختم ہو گئی۔ اور اب ملتان پر راجہ جے پال کے پٹھو حمید خاں لودھی کا قبضہ ہو گیا۔

حمید خاں لودھی بظاہر تو مسلمان تھا لیکن حقیقت میں اس کا بے دینوں کی جماعت قرامطہ سے گہرا تعلق تھا۔ اور اسی لئے راجہ جے پال کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی۔ قرامطہ ایک نام نہاد مذہب تھا جس کا مقصد اسلام کو دنیا سے مٹانا تھا۔ اس مذہب کے پیرو اپنے آپ کو ظاہر تو مسلمان ہی کرتے تھے لیکن نماز روزہ حج اور زکوٰۃ کے قائل نہ تھے۔ ان کے ہاں حرام و حلال کی کوئی تمیز نہ تھی۔ درحقیقت یہ لامذہبوں اور عیاشوں کی ایک جماعت تھی جو اپنے آپ کو اسلام کی ایک شاخ بتاتی تھی حالانکہ اسلام سے اس جماعت کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ جماعت ایران میں پیدا ہوئی تھی اور مشرق کے اکثر حصوں میں پھیل کر سندھ میں بھی اس کے اثرات پھیل چکے تھے۔ چنانچہ اسی جماعت قرامطہ کی سازشوں سے سندھ کی سب سے بڑی دو مسلم ریاستیں یعنی منصورہ اور ملتان برباد ہو گئیں اور اس طرح سندھ سے ۳۸۵ھ (۹۹۵ء) میں اس مسلم حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس کی بنیاد ۹۳ھ (۷۱۲ء) میں محمد بن قاسم نے رکھی تھی۔

سندھ پر عربوں کی آمد کے اثرات

۹۳ھ میں جبکہ عربوں نے فاتحانہ حیثیت سے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اس زمانہ میں چند نو مسلموں کو چھوڑ کر سندھ کے تقریباً تمام باشندے بت پرست تھے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور بالکل مفقود تھا۔ ملک میں بت پرستی کے ساتھ ساتھ توہم پرستی بری طرح پھیلی ہوئی تھی۔ جادوگروں اور شگون بتانے والوں کی بڑی گرم بازاری تھی۔ مجرموں کے لئے سزاؤں کا معیار بھی اخلاقی اعتبار سے

نہایت پست تھا یعنی مجرموں کو زندہ آگ میں جلا دینا کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔

مسلمان جب سندھ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو انھوں نے یہاں کے اصل باشندوں کے نہ تو مذہب میں کوئی مداخلت کی اور نہ معاشرتی معاملات پر کسی قسم کی پابندی عائد کی۔ اور نہ تبدیل مذہب کے لئے ان کو مجبور کیا۔ بلکہ عربوں نے سندھ میں آنے کے بعد عدل وانصاف اور رواداری کا جو اچھا نمونہ پیش کیا۔ اس سے ملک کے باشندوں کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ عربوں کی آمد کے بعد سے رفتہ رفتہ سندھ کے باشندوں کے اخلاق۔ تمدن اور معاشرت میں تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں۔ اور سندھیوں اور عربوں میں اس قدر یگانگت محبت اور اتحاد پیدا ہو گیا کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا سچا دوست اور ساتھی سمجھنے لگے۔ اکثر و بیشتر سندھیوں نے بُت پرستی ترک کرنے کے بعد مذہب اسلام بخوشی قبول کر لیا۔ اور آپس میں رشتہ اور بیاہ کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا عربوں نے یہاں کی سندھی زبان سیکھی اور سندھیوں نے عربی زبان حاصل کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھی زبان میں عربی الفاظ کثرت سے داخل ہو گئے۔ سندھیوں کے لباس میں بھی نمایاں تبدیلی ہو گئی۔ اور یہاں ایسا لباس پہنا جانے لگا جس کو عرب اور ہند کے مشترکہ تمدن کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ غرضکہ عربوں کی آمد کا سندھیوں کی زبان۔ تمدن معاشرت۔ لباس اور خورد و نوش پر بے حد اثر پڑا اور یہ اثرات آج تک سندھی تہذیب میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

پانچواں باب

سلطان محمود غزنوی کی حکومت

سنہ ۳۷۴ھ تا سنہ ۵۸۲ھ
۹۸۴ء ۱۱۸۵ء

سلطان محمود غزنوی کی حکومت

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ۹۳ھ یا ۷۱۲ء میں کن اسباب کی بنا پر عربوں نے سندھ پر حملہ کر کے یہاں ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ نیز ہم اس چیز پر بھی روشنی ڈال چکے ہیں کہ سندھ کی یہ حکومت کس طرح ابتدا میں خلفائے اسلام کے ماتحت رہی۔ لیکن آخر میں جب خلافتِ اسلامیہ کی گرفت کمزور پڑ گئی تو سندھ کی حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف خود مختار چھوٹی چھوٹی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں تبدیل ہو گئی۔ سندھ میں مسلم حکومت کے زوال کے بعد خلفائے اسلام نے پھر کبھی سندھ یا ہندوستان کی جانب توجہ نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلافتِ اسلامیہ کا مرکز کمزور ہو چکا تھا۔ اور وہ اسلامی حکومتیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں خلافتِ اسلامیہ کے ماتحت حکمرانی کر رہی تھیں۔ تقریباً سب کی سب خود مختار ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں خلافتِ اسلامیہ کی کمزور مرکزی حکومت کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ نئے سرے سے ہزاروں میل دور دراز مقامات کو فتح کرنے کی ہمت کر سکتی۔ جبکہ وہ خود اپنے ہی گھر میں سراسیمہ اور پریشان تھی۔

عربوں کے بعد جن لوگوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی جانب رُخ کیا وہ ترک نسل کے افغانی تھے۔ اور ان افغانی حملہ آوروں میں سب سے پہلے حملہ آور ناصر الدین سبکتگین یعنی محمود غزنوی کا باپ تھا۔ ناصر الدین سبکتگین کے بعد اسکے بیٹے محمود غزنوی نے ہندوستان پر بار بار حملے کئے ہیں لیکن ان حملوں میں سے ہم صرف ان چند خاص خاص اور تاریخی حملوں کا ذکر کریں گے جن کا کہ ہندوستان کی تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔

اس موقعہ پر یہ بتا دینا بھی نہایت ضروری ہے کہ ناصر الدین سبکتگین اور اس کا بیٹا محمود غزنوی دونوں قرامطہ کی اس لامذہب اور انقلابی جماعت کے شدید دشمن تھے جس نے کہ مصر اور عرب سے لیکر ہندوستان تک ایک ہلچل برپا کر رکھی تھی۔ یہ وہی قرامطہ تھے جنہوں نے کہ سندھ میں مسلم حکومت کا چراغ گل کیا۔ مرکز میں خلافت اسلامیہ کے لئے مشکلات پیدا کیں۔ اور اسلامی حکومتوں میں بے اندازہ خونریزیاں کرائیں۔ محمود غزنوی کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر یہ جماعت سندھ کے بعد افغانستان کی جانب بڑھی تو پھر افغانستان کی بھی خیر نہیں۔ غرضکہ سبکتگین اور محمود غزنوی دونوں اس لامذہب اور انقلابی جماعت کے شدید دشمن تھے۔ چنانچہ محمود غزنوی کو ہندوستان اور دوسرے علاقوں میں ان قرامطہ کی سرکوبی کے لئے اکثر حملے کرنے پڑے ہیں۔

ناصر الدین سبکتگین اور محمود غزنوی کے حملوں کی تفصیلات بیان کرنے سے قبل ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ افغانستان اور وہاں کی قدیم حکمران طاقتوں پر بھی ہلکی سی روشنی ڈال دی جائے تاکہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو محمود غزنوی اور امیر سبکتگین کے پیشرو حکمرانوں کے حالات سے بھی کسی نہ کسی حد تک واقفیت ہو جائے۔

افغانستان خلافت اسلامیہ کا ایک صوبہ

افغانستان جو ہزارہا سال سے بُت پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس پر سب سے پہلے حضرت عثمان غنی کی خلافت کے زمانہ میں حملہ کیا گیا۔ اور اس حملہ میں فتوحات بھی حاصل ہوئیں لیکن پھر بھی افغانستان میں عربوں کی باقاعدہ حکومت قائم نہ ہو سکی۔

خلافتِ راشدہ کے بعد بنو اُمیہ کے دورِ حکومت میں مشرقی ممالک کے

وائسرائے حجاج بن یوسف نے بھی کئی بار اپنے نائبین کے ذریعہ افغانستان پر کابل فتح حاصل کرنی چاہی مگر وہ بھی ناکام رہا۔ اسی طرح خلفائے بنو عباس کے دورِ حکومت میں افغانستان کو خلافتِ اسلامیہ کے زیرِ نگیں لانے کی کوششیں کی گئیں مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔

اس تمام زمانہ میں افغانستان کی حالت یہ رہی کہ اول تو فاتحینِ اسلام کو اس کے فتح کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اور اگر فتح نصیب ہو بھی جاتی تھی تو وہاں کی بغاوتیں اس ساری فتح کو خاک میں ملا دیتی تھیں نویں صدی عیسوی میں جب یعقوب بن لیث نے کابل کو فتح کر کے تمام افغانستان اور روسی ترکستان کو زیر کیا تو اسکے بعد افغانستان اور روسی ترکستان کے بیشتر باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جب خلفائے اسلام کی مرکزی حکومت کمزور ہو گئی تو سندھ کی طرح افغانستان اور روسی ترکستان میں بھی متعدد خود مختار مسلم حکومتیں قائم ہو گئیں۔ جنہوں نے مرکز سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا۔

سامانی سردار الپتگین کی خود مختاری

ان ہی خود مختار حکومتوں میں ممتاز ترین حکومت سامانی خاندان کی تھی۔ جس کا دار السلطنت بخارا تھا جس پر اس خاندان کا پانچواں بادشاہ عبد الملک بن نوح حکومت کر رہا تھا۔ اس بادشاہ کا ایک ترکی غلام الپتگین تھا۔ جو ترقی کرتے کرتے خراسان کا گورنر بن گیا تھا۔ لیکن عبد الملک بن نوح کی موت کے بعد جب اس کا بھائی منصور بن نوح تخت پر بیٹھا تو الپتگین اس خوف سے غزنی بھاگ گیا۔ کیونکہ اس نے منصور کی تخت نشینی کی مخالفت کی تھی۔ غزنی پہنچنے کے بعد الپتگین نے غزنی کے حاکم ابوبکر کو مار بھگایا۔ اور اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کے بعد غزنی اور کابل میں اپنی ایک نئی حکومت قائم کر لی۔ غرضکہ یہ علاقہ

سامانی حکومت سے نکل گیا۔ اور منصور بن نوح الپتگین کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ۳۵۲ھ (۹۶۳ء) میں جب الپتگین مر گیا تو اس کا بیٹا اسحٰق تخت پر بیٹھا جو تخت نشینی کے فوراً بعد ہی فوت ہو گیا۔ اسحٰق کی موت کے بعد پے در پے الپتگین کے دو غلام تخت پر بیٹھے اور دس بارہ سال تک حکومت کرتے رہے۔ ان دونوں غلاموں کے بعد الپتگین کا تیسرا غلام سبکتگین غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ اور بڑی شہرت حاصل کی۔

امیر ناصر الدین سبکتگین کا عہد حکومت

امیر ناصر الدین کون تھا۔ اور کہاں سے آیا تھا۔ اس کے بارے میں مورخوں میں اختلاف ہے بعض کا کہنا ہے کہ وہ ایک ترکی امیر کا لڑکا تھا۔ جسے بردہ فروش اٹھا لائے تھے بعض اس کو ایرانی امیروں کی نسل سے بتاتے ہیں لیکن اس چیز پر سب مورخوں کا اتفاق ہے کہ اسے بردہ فروشوں نے بخارا میں لا کر الپتگین کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ سبکتگین نے الپتگین کے مزاج میں بہت جلد دخل حاصل کر لیا۔ اور برابر ترقی کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ الپتگین نے اس کو امیر الامرا کا خطاب عنایت کیا اور اپنی لڑکی کی شادی بھی اس کے ساتھ کر دی۔

اس موقع پر یہ نہیں فراموش کرنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں مسلم غلاموں کا درجہ اولاد کے بعد ہوتا تھا اور اکثر اوقات غلاموں کو اولاد کی برابر حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عبد الملک بن نوح کے غلام الپتگین کو بلند ترین درجہ حاصل ہوا۔ الپتگین کے مرنے کے بعد جہاں اس کا بیٹا اسحٰق تخت پر بیٹھا وہاں دو غلاموں کو بھی تخت نشینی کی عزت بخشی گئی۔ اور ان دونوں غلاموں کے بعد سبکتگین ۳۶۶ھ (۹۷۷ء) میں تخت پر بیٹھا جو الپتگین کا منہ چڑھا غلام بھی تھا اور داماد بھی۔ سبکتگین نے غزنی کے تخت پر طاقت کے بل پر قبضہ نہیں جمایا تھا۔

بلکہ غزنی کی حکومت اس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی یعنی غزنی کے امرا اور حکام نے اس کو حکومت کی ذمہ داری کا اہل قرار دیتے ہوئے یہ عہدہ پیش کیا تھا جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا تھا۔ امیر سبکتگین ایک حوصلہ مند سردار تھا۔ اسلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ غزنی کی چھوٹی سی حکومت پر قناعت کر سکتا۔ چنانچہ اس نے تخت نشین ہونیکے ساتھ ہی اپنے گرد افغانی سپاہیوں کی ایک بڑی طاقت فراہم کر لی اور ان کے ذریعہ بست، قصدار، لمغان اور سیستان کو بھی حکومت غزنی میں شامل کر لیا۔

سبکتگین کو ابھی اپنی حکومت کو مضبوط بنانے سے فرصت نہیں ملی تھی کہ سامانی حکومت کے بادشاہ نوح بن منصور کی حکومت پر خود اسکے عاملوں نے علم بغاوت بلند کر کے حملہ کر دیا۔ اب نوح بن منصور کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ تمام پرانی مخالفتوں کو نظر انداز کر کے سبکتگین سے جسکی طاقت بے حد بڑھی ہوئی تھی امداد طلب کرے غرضکہ اس نے سبکتگین کو ہرات اور نیشاپور کے باغی عاملوں کے مقابلہ میں امداد دینے کے لئے لکھا۔ سبکتگین ایک بڑی فوج لیکر بخارا کی طرف بڑھا اور باغی عاملوں کو مار بھگایا۔ اس معرکہ میں امیر سبکتگین کا بیٹا محمود غزنوی بھی اسکے ساتھ تھا۔ اس فتح کے بعد نوح بن منصور نے سبکتگین کو "ناصر الدین" اور اس کے بیٹے محمود کو "سیف الدولہ" کا خطاب دیا اور غزنی کی سند حکومت کے علاوہ خراسان کا وہ تمام ملک بھی ناصر الدین سبکتگین کے سپرد کر دیا جس پر کہ نیشاپور کے باغی عامل نے قبضہ جما لیا تھا۔

سبکتگین اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد چاہتا تھا کہ اپنی نئی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرے کہ یکایک اسے اطلاع ملی کہ ترکستان کے حکمران ایلک خاں نے نوح بن منصور کے خلاف بخارا پر چڑھائی کر دی ہے۔ سبکتگین ایک جرار فوج لیکر بخارا دوڑا۔ اسکے پہنچتے ہی دونوں حکومتوں میں صلح ہو گئی لیکن ابھی یہ بخارا ہی میں تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ بعض باغیوں اور دیلمیوں کے لشکر نے محمود کو نیشاپور میں تنہا پا کر

چڑھائی کر دی ہے۔ اس اطلاع کے پانے کے ساتھ ہی وہ بیٹے کی امداد کے لئے تیزی کے ساتھ پلٹا۔ اور طوس کے میدان میں دونوں باپ بیٹوں نے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے بعد مخالفین کی طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

راجہ جے پال کا غزنی پر پہلا حملہ

جس زمانہ میں کہ امیر سبکتگین کو افغانستان اور اسکے ملحقہ علاقوں میں فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ اسی زمانہ میں پنجاب میں راجہ جے پال کی حکومت خوب ترقی کر رہی تھی۔ یہ مشرق کی طاقتور ترین حکومت شمار کی جاتی تھی۔ راجہ جے پال کی حکومت کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مشرق میں سرہند تک اور شمال و مغرب میں لمغان تک یعنی پشاور اور غزنی کے درمیانی علاقہ تک پھیلی ہوئی تھی شمال میں کشمیر بھی اس حکومت میں شامل تھا۔ اور جنوب میں یہ حکومت ملتان تک چلی گئی تھی۔ اس حکومت کا دارالسلطنت بھٹنڈہ تھا اور اس کو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ مشرق کی مضبوط ترین حکومت سمجھا جاتا تھا۔

راجہ جے پال اور امیر سبکتگین کی حکومتوں کی سرحدیں کیونکہ ملتی تھیں۔ اس لئے ان دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف خوف اور اندیشوں کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ راجہ جے پال امیر سبکتگین کی فتوحات اور بڑھتی ہوئی طاقت کا بڑی غور اور تشویش کے ساتھ مطالعہ کر رہا تھا۔ اور اس کو یہ فکر تھی کہ سبکتگین اور اس کی طاقت کا وہ سیلاب جو افغانستان اور اس کے ملحقہ علاقوں میں بڑھتا چلا جا رہا ہے کہیں ہندوستان کی جانب رخ نہ کر لے۔ لہذا جے پال نے اس اندیشہ کے پیش نظر یہ طے کیا کہ قبل اس کے کہ سبکتگین ہندوستان آئے کیوں نہ اس کے گھر میں گھس کر پہلے ہی سے اس کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ اور ایسی حالت میں جبکہ سبکتگین اور راجہ کے سرحدی علاقوں پر

راجہ اور امیر سبکتگین کے سپاہیوں میں چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہو رہی تھیں تو راجہ کو سبکتگین کے خلاف معرکہ آرائی کرنے کا ایک جواز بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ چنانچہ راجہ جے پال جو ہر وقت سبکتگین کے حالات سے باخبر رہتا تھا جب اس کو معلوم ہوا کہ سبکتگین بخارا کی جنگ میں اُلجھا ہوا ہے۔ امیر سبکتگین کے بیٹے محمود کو نیشاپور میں باغیوں اور دیلمیوں نے گھیر رکھا ہے تو اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ایک بہت بڑے لشکرِ جرار کے ساتھ ۳۷۶ھ (۹۸۶ء) میں غزنی پر چڑھائی کر دی۔ اس لشکرِ جرار میں بے اندازہ پیدل۔ سوار اور ہاتھی تھے۔ اور یہ اتنا بڑا لشکر تھا کہ اس کے ذریعہ بڑی سے بڑی حکومت کو تہہ و بالا کیا جا سکتا تھا۔

امیر سبکتگین اور اس کا بیٹا محمودؒ ابھی طوس کے میدان میں باغیوں اور دیلمیوں سے لڑ ہی رہے تھے کہ راجہ جے پال کا لشکر لاہور سے پشاور اور پشاور سے جمرود ہوتا ہوا سلطنت غزنی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ سبکتگین کو جب یہ معلوم ہوا کہ دشمن اس کے گھر میں گھس چکا ہے تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ فوراً طوس کے میدان میں اپنے دشمنوں کو شکست دینے کے بعد اپنے اہل و عیال اور دارالسلطنت کو بچانے کے لئے غزنی بھاگا۔ چنانچہ لمغان کے میدان میں راجہ جے پال اور امیر سبکتگین کے لشکروں کا مقابلہ ہوا۔

امیر سبکتگین اگرچہ ایک آزمودہ کار جرنیل تھا لیکن اسکے مقابلہ میں بھی اپنے زمانہ کا لائق ترین سپہ سالار تھا۔ اس کے علاوہ امیر سبکتگین کی فوج راجہ کی فوج کے مقابلہ میں ایک چوتھائی سے بھی کم تھی۔ اس لئے امیر کو اس جنگ میں شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آندھی طوفان اور برف باری سے۔ اگر راجہ کے سپاہی۔ اور ہاتھی گھوڑے اکڑ کر مر نہ گئے ہوتے تو شاید سبکتگین کا راجہ پر فتحیاب ہونا آسان نہ تھا۔ چنانچہ امیر سبکتگین کے سپاہی چونکہ شدید برفباری کے عادی تھے اسلئے

ان پر تو کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن راجہ کی ساری کی ساری فوج برف باری کی وجہ سے یا تو ناکارہ ہو گئی یا ختم ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شکست کے بعد راجہ کو عالم مجبوری میں سبکتگین سے جان بخشی کی درخواست کرنی پڑی ۔ غرضنکہ راجہ نے امیر سبکتگین کے پاس پیغام بھجوایا کہ وہ اس چیز کو محسوس کرتا ہے کہ اس نے غزنی پر حملہ کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے جس کے لئے وہ معافی کا خواستگار ہے۔ نیز راجہ نے وعدہ کیا کہ اگر اسے اس مرتبہ معاف کر دیا گیا تو وہ ہمیشہ وفادار رہے گا۔ اس کے علاوہ راجہ نے وعدہ کیا کہ اگر اس کا قصور معاف کر دیا جائے تو وہ بے اندازہ زر و جواہر دس لاکھ درہم نقد پچاس ہاتھی کئی شہر اور سرحدی قلعے بطور تاوان جنگ پیش کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ راجہ نے یہ بھی یقین دلایا کہ یہ سب چیزیں پنجاب پہنچتے ہی سبکتگین کے اُن معتمدوں کے حوالے کر دی جائے گی جن کو وہ اپنے ہمراہ لیجانے کے لئے تیار ہے۔ اور جب تک یہ شرائط پایۂ تکمیل کو نہ پہنچیں گی۔ راجہ کے آدمی بطور یرغمال امیر کے پاس رہیں گے۔

امیر سبکتگین کے سامنے جب راجہ جے پال کی یہ شرائط پیش کی گئیں تو امیر فوراً راجہ کو معافی دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن محمود اور فوجی افسروں کی یہ رائے تھی کہ ایک خطرناک دشمن کے قابو میں آجانے کے بعد اُسے چھوڑنا ہرگز دانشمندی نہیں۔ لیکن امیر سبکتگین راجہ کی لجاجت اور خوشامد سے متاثر ہو گیا۔ اور اُس نے راجہ کو معافی دیتے ہوئے اپنے معتمد راجہ کے ساتھ کر دئے تاکہ راجہ دارالسلطنت پہنچتے ہی فوراً تاوانِ جنگ اور زر و جواہر معتمدوں کے حوالے کر دے۔ نیز راجہ کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ سرحدی قلعے اور شہر بھی ان ہی معتمدوں کی نگرانی میں دیدے غرضنکہ راجہ جے پال بُری طرح شکست کھا کر اور اس طرح رہائی حاصل کرنے کے بعد دارالسلطنت میں واپس آگیا۔

راجہ جے پال کی بدعہدی

راجہ جے پال نے بظاہر تو امیر سبکتگین سے وفاداری کا عہد کر لیا تھا لیکن درحقیقت یہ اس کا ایک فوجی حکمہ تھا تاکہ رہائی حاصل ہو جائے اور رہائی کے بعد وہ امیر سبکتگین سے اپنی شکست کا بدلہ لے سکے۔ چنانچہ لاہور پہنچتے ہی اس نے امیر سبکتگین کے معتمدوں کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حالانکہ خود جے پال کے درباری اُمرا اور سمجھدار مصاحب راجہ جے پال کی اس بدعہدی کے شدید مخالف تھے۔ اور انھوں نے راجہ پر بے حد زور دیا کہ راجہ اس طرح بدعہدی کر کے ایک بڑے خطرہ کو دعوت نہ دے لیکن راجہ جو انتقام کے جذبے سے اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے کسی کی بات نہ سُنی اور ہندوستان کے کونے کونے میں تمام راجاؤں کے نام خطوط روانہ کر دئے جن میں لکھا گیا تھا کہ سبکتگین پنجاب پر حملہ کرنے کے بعد تمام ہندو حکومتوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس لئے تمام راجاؤں کا فرض ہے کہ وہ بیرونی حملے سے بچنے کے لئے جمع ہو جائیں۔ ورنہ سب سے پہلے پنجاب کی حکومت ختم ہو گی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے ساری ہندو حکومتیں فنا ہو جائیں گی۔

راجہ نے یہ خطوط کچھ ایسے موثر انداز میں لکھوائے تھے کہ دلی۔ اجمیر قنوج۔ کالنجر اور گجرات کے راجہ اس "دھارمک جنگ" میں کود پڑے اور یہ طے پایا گیا کہ سب متحد ہو کر ایک ایسے دشمن کو کچل ڈالیں جو اُن کے دھن اور دھرم کو بگاڑنے پر تلا ہوا ہے۔ غرضکہ تمام راجاؤں نے اس جنگ کے لئے خزانوں کے منھ کھول دئے۔ اور اپنے بہترین لشکر راجہ جے پال کے حوالے کر دئے جب امیر سبکتگین کو راجہ کی اس بدعہدی کا علم ہوا تو شروع شروع میں تو اُسے یقین نہ آیا لیکن جب امیر کے جاسوسوں نے اُسے اصل حالات سے مطلع کیا تو امیر

سبکتگین نے بھی راجہ کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ مگر راجہ کی فوجیں پہلے ہی سبکتگین کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو چکی تھیں۔

راجہ جے پال اور امیر سبکتگین دوسری جنگ

امیر سبکتگین کو جب یہ اطلاع ملی کہ راجہ جے پال کا لشکر دریائے سندھ پار کرنے کے بعد غزنی کی جانب بڑھا چلا آرہا ہے تو وہ بھی اپنے لشکر کو لیکر غزنی سے باہر نکلا۔ ایک طرف راجہ اپنی شکست کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ دوسری جانب امیر کی کوشش یہ تھی کہ وہ راجہ کو بدعہدی کا خوب مزہ چکھائے۔ دونوں لشکروں کا پہلے کی طرح لمغان کے میدان میں ۳۷۶ھ (۹۸۶ء) میں مقابلہ ہوا۔ راجہ کا لشکر بے پناہ تھا جس میں تین لاکھ پیادے اور سوار تھے اور بہت سے جنگی ہاتھی بھی تھے۔ اس کے برخلاف سبکتگین کی فوج ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ سبکتگین راجہ کے لشکر کی کثرت دیکھ کر شروع شروع میں تو گھبرایا۔ لیکن اس کے بعد اُس نے اچانک راجہ کی فوج پر حملہ کردیا دونوں لشکروں میں گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ راجہ کی فوج ابتدا میں تو مرداوار مقابلہ کرتی رہی لیکن بعد میں راجہ کی فوج میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ جس کی وجہ سے راجہ جے پال کو شکست کھانے کے بعد میدان سے بھاگنا پڑا۔

سبکتگین نے دریائے سندھ کے کنارے تک راجہ جے پال اور اس کی فوج کا تعاقب کیا۔ جب راجہ اپنا لشکر لے کر لاہور کی جانب فرار ہو گیا تو سبکتگین نے پشاور کو اپنی فوجی چھاؤنی بنایا اور یہاں دس ہزار فوج متعین کردی۔ تاکہ یہ فوج سرحدی علاقہ کی حفاظت کرتی رہے۔ اس جنگ میں راجہ جے پال اس قدر سامان چھوڑ کر بھاگا تھا کہ سبکتگین کے نہ صرف تمام مصارف جنگ پورے ہو گئے بلکہ اس کے سابقہ نقصانات کی بھی بڑی حد تک تلافی ہو گئی۔

راجہ جے پال کی یہ دوسری شکست صرف راجہ جے پال کی شکست نہیں تھی۔ بلکہ تمام ہندوستانی راجاؤں کی شکست تھی۔ جسے بہت بری طرح محسوس کیا گیا اور اب متفقہ طور پر غزنی کی حکومت کو ملک کے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھا جانے لگا۔ غرضکہ اس خطرہ کے خلاف نہایت وسیع پیمانہ پر در پردہ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس سے قبل تو یہ معاملہ صرف راجاؤں اور سپاہیوں تک محدود تھا لیکن اب یہ عوام کا خود اپنا قومی اور وطنی مسئلہ بن گیا۔ اور عوام غزنی کی حکومت کو نیچا دکھانے کے لئے بڑے سے بڑے ایثار اور قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔

ہندوستانی راجاؤں اور ذمہ دار حضرات کی رائے تھی کہ سبکتگین خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں پر ضرور جوابی حملہ کرے گا لیکن سبکتگین کی ذاتی الجھنیں اس قدر تھیں کہ وہ بمشکل تمام غزنی سے نکل سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جے پال سے فارغ ہونے کے ساتھ ہی سبکتگین کو سامانی حکومت کے جھگڑوں کو سلجھانے کے لئے جانا پڑ گیا۔ اور ابھی یہ غزنی میں واپس بھی نہیں پہنچا تھا کہ بلخ کے قریب ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) میں بعمر ۵۶ سال فوت ہو گیا۔ اس کے جنازہ کو غزنی لایا گیا جہاں وہ مدفون ہوا۔ امیر ناصر الدین سبکتگین نے تیس سال کے قریب حکومت کی وہ ایک طرف بے نظیر سپہ سالار تھا۔ تو دوسری جانب اعلیٰ درجہ کا منتظم بھی تھا۔ اس کی فیاضی اور انصاف پسندی کی دُور دُور شہرت تھی۔ چنانچہ اس کی موت پر غزنی کی ساری حکومت میں انتہائی رنج اور غم کا اظہار کیا گیا۔

سلطان محمود غزنوی کی تخت نشینی

امیر سبکتگین کا جب انتقال ہوا تو محمود غزنوی دُور دراز فاصلہ پر نیشاپور میں تھا لیکن سبکتگین کا چھوٹا بیٹا امیر اسمٰعیل باپ کے پاس موجود تھا لہٰذا

وہی جانشین قرار دیا گیا۔ بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ امیر سبکتگین نے اپنے چھوٹے بیٹے اسمٰعیل کے حق میں جو کہ الپتگین کی بیٹی سے پیدا ہوا تھا وصیت کی تھی کہ میرے بعد اسی کو تخت پر بٹھایا جائے چنانچہ سبکتگین کے مرنے کے بعد وہی تخت پر بیٹھا لیکن بعض مورخوں کی یہ رائے ہے کہ امیر اسمٰعیل کے حق میں کوئی وصیت نہیں تھی بلکہ وہ میدان خالی پا کر خود ہی تخت پر بیٹھ گیا تھا۔

محمود کو جب چھوٹے بھائی کی اس جسارت کا علم ہوا تو اس نے ایک خط کے ذریعہ بھائی کو متنبہ کیا کہ "تم کم عمری کے باعث فرائض جہانبانی سے ناواقف ہو۔ اگر تم کو جہانبانی کا تجربہ ہوتا تو سب سے پہلے میں تمہاری حمایت کرتا لیکن چونکہ تم ناتجربہ کار ہو اس لئے تم کو چاہئے کہ میرے راستہ سے ہٹ جاؤ۔ اگر باپ نے تم کو جانشین بھی کر دیا تھا تو اسمیں مصلحت یہ تھی کہ تخت خالی نہ رہے۔ اور کوئی غیر قبضہ نہ جما لے۔ لہٰذا عقل و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ سلطنت میرے حوالے کر دو۔ میں تمہارے لئے اتنا کر سکتا ہوں کہ بلخ اور خراسان تمہارے حوالے کر دوں"۔

محمود غزنوی کو توقع تھی کہ امیر اسمٰعیل اس مصالحانہ تجویز پر آمادہ ہو جائیگا۔ لیکن امیر اسمٰعیل نے حکومت دینے سے صاف انکار کر دیا جس پر دونوں بھائیوں میں خوفناک جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں امیر اسمٰعیل کو شکست ہو گئی۔ اور محمود غزنوی ۳۸۸ھ (۹۹۸ء) میں تخت نشین ہو گیا لیکن تخت نشین ہونے کے بعد بھی اس نے اپنے مخالف بھائی کے ساتھ نہایت نرمی اور محبت کا سلوک کیا مگر چند روز کے بعد جب سلطان محمود غزنوی کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کا چھوٹا بھائی امیر اسمٰعیل اس کے قتل کی سازش کر رہا ہے تو سلطان نے ایک قلعہ میں بھائی کو نظربند کر کے اس کے آرام و آسائش کا جملہ سامان فراہم کر دیا۔

محمود غزنوی تخت سنبھالتے ہی اپنے ملک کے اندرونی جھگڑوں میں اُلجھ گیا۔ سب سے پہلے محمود کو خراسان کے امیر الامرا بکتوزن کے خلاف جنگ آزمائی کرنی پڑی کیونکہ اس غدار امیر نے خراسان پر قابض ہوکر نہ صرف محمود غزنوی کا حق دبا لیا تھا بلکہ اپنے آقائے ولی نعمت منصور سامانی کو قتل کر کے اور ایک نوعمر لڑکے عبدالملک سامانی کو بخارا کے تخت پر بٹھا کر خود مدار المہام بن بیٹھا تھا۔ محمود غزنوی کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بکتوزن تو شکست کھانے کے بعد فرار ہو گیا لیکن ترکستان کے بادشاہ ایلک خاں نے اچانک بخارا پر حملہ کر کے سامانی خاندان کے آخری نوعمر بادشاہ عبدالملک سامانی کو قتل کر دیا۔ اور اس طرح سامانی خاندان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

بکتوزن کے فرار ہونے کے بعد محمود غزنوی نے خراسان پر قابض ہوکر ہرات اور بلخ وغیرہ کا انتظام کیا۔ اس کے بعد محمود سیستان کے بادشاہ خلف بن احمد کی سرکوبی کے لئے سیستان آیا۔ رعایا اس بادشاہ سے نالاں تھی خلف بن احمد نے بغیر لڑے خود کو محمود غزنوی کے حوالے کر دیا۔ اور اس طرح سیستان پر بھی محمود غزنوی کا قبضہ ہو گیا۔

محمود غزنوی نے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ ایلک خاں والیٔ ترکستان سے دوستانہ تعلقات قائم کرے چنانچہ اس نے ایلک خاں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے۔ اس کے بعد سلطان محمود نے خلیفہ بغداد قادر باللہ عباسی کی خدمت میں درخواست بھیجکر اطاعت کا اقرار کیا اور خلیفہ سے سندِ حکومت کی استدعا کی۔ خلیفہ نے اس استدعا کو بخوشی منظور کرتے ہوئے نہ صرف سند اور خلعت عطا کر دی۔ بلکہ محمود غزنوی کو امین الدولہ یمین الملت کا خطاب بھی عطا کر دیا۔ غرضکہ ان تمام ملکی جھگڑوں میں سلطان محمود غزنوی کے

تقریباً تین سال صرف ہو گئے اور اس دوران میں اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ وہ اپنے پرانے اور آبائی دشمن راجہ جے پال کی طرف توجہ کر سکتا ہے۔

محمود غزنوی افغانستان و خراسان کے علاوہ ترکستان۔ آذربائیجان عراق۔ شام۔ حجاز اور ایشیائے کوچک پر بھی اپنی حکومت و سطوت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اور خلیفہ کی امداد کا بھی متمنی تھا۔ غرضکہ وسطی ایشیا کے جھگڑوں میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ شائد ہندوستان کی جانب وہ ابھی توجہ بھی نہ کرتا لیکن حکومت غزنی کے خلاف راجہ جے پال کی تیاریوں کی اطلاع نے اسے چوکنا کر دیا۔ اور اب اس کی وہ نظریں جو دوسرے ممالک کی جانب بار بار اٹھ رہی تھیں ہندوستان کی جانب یکا یک پلٹ گئیں۔ اور اس نے بھی راجہ جے پال کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

راجہ جے پال کا غزنی پر تیسرا حملہ

پنجاب کا راجہ جے پال جو محمود غزنی کے باپ امیر سبکتگین کے مقابلہ پر دو مرتبہ شکست کی ذلت اٹھا چکا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو غزنی کی حکومت کو نیچا دکھانے کے بعد اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کر لے۔

سبکتگین جیسے تجربہ کار جرنیل کے مرنے کے بعد راجہ جے پال کو یہ امید ہو گئی تھی کہ وہ نوعمر محمود غزنوی کو نیچا دکھا کر آسانی سے اپنے ابنائے وطن میں دوبارہ عزت حاصل کر سکے گا۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر وہ ۳۹۱ھ (۱۰۰۱ء) میں بارہ ہزار سوار تیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی لیکر محمود غزنوی کے مقابلہ کیلئے روانہ ہو گیا۔ اور اس نے سندھ کا دریا پار کر لیا۔ ادھر محمود غزنوی بھی پشاور کے گورنر کے اطلاع دینے پر غزنی سے پشاور کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ پشاور کے

قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے خیمہ زن ہو گئے۔ اور دونوں لشکروں میں گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ محمود غزنوی کے لشکر کی تعداد اگرچہ دس ہزار سے زیادہ نہ تھی لیکن پھر بھی راجہ جے پال کی فوج اس کے مقابلہ پر نہ ٹھہر سکی۔ اور نتیجہ یہ نکلا۔ کہ راجہ کی فوج پانچ ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر اور راجہ جے پال کو مع پندرہ سرداروں کے گرفتار کرا کے لاہور بھاگ گئی۔

محمود غزنوی اس فتح کے بعد راجہ جے پال اور پندرہ ہندو سرداروں کو ساتھ لیکر غزنی چلا گیا۔ غزنی پہنچنے کے بعد راجہ جے پال نے نہایت ہی مؤثر الفاظ میں محمود غزنوی کو یقین دلایا کہ اگر اس مرتبہ اس کی غلطی کو اور نظر انداز کر دیا جائے تو وہ تمام عمر بلا عذر خراج بھیجتا رہے گا۔ اور پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھتے ہوئے محمود کی جانب سے حکومت کرے گا۔ چنانچہ محمود غزنوی نے پھر ایک مرتبہ راجہ پر اعتبار کرتے ہوئے اسے غزنی سے لاہور رخصت کر دیا۔

راجہ جے پال کی خودکشی

راجہ جے پال نے لاہور آنے کے بعد تاج و تخت تو اپنے بیٹے انند پال کے سپرد کیا۔ اور خود شکستوں کی پے در پے ندامت سے اس قدر متاثر ہوا کہ جلتی آگ میں کود کر اپنا خاتمہ کر لیا۔ اور مرتے وقت بیٹے کو وصیت کی کہ وہ محمود کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے اور برابر سالانہ خراج بھیجتا رہے۔

راجہ جے پال کے اس طرح آگ میں کود کر جان دینے کے بارے میں مؤرخوں کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض مؤرخوں کا تو یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ کے رسم و رواج کے مطابق جو راجہ کہ تین مرتبہ اپنے کسی مخالف سے شکست کھا چکتا تھا تو اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ وہ خودکشی کر کے جان دیدے بعض مؤرخوں کا یہ کہنا ہے کہ راجہ جے پال نے اپنی اس خودکشی کے ذریعہ

سارے ہندوستان میں حکومتِ غزنی کے خلاف انتہائی حقارت اور نفرت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ اور یہی راجہ کا اصل مقصد تھا۔ جو کسی طرح بھی راجہ کے اس طرح جان دیئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ راجہ کی اس موت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے قومی شہید کا درجہ دیدیا گیا۔ اور اس کی اس قربانی کے ذریعہ عوام کو حکومتِ غزنی کے خلاف بھڑکانے میں بڑی مدد ملی۔ اس کے علاوہ راجہ کے جانشین انند پال سے پبلک کو قدرتی طور پر غیر معمولی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ غرضکہ راجہ جے پال نے اپنا بلیدان دے کر وہ کام کیا جو شائد وہ زندہ رہ کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

محمود کی حکومت کے خلاف قرامطہ کی سازشیں

راجہ جے پال کی شکست اور انند پال کے باجگذار بن جانے کے بعد محمود غزنوی ہندوستان کی جانب سے بڑی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اور اُس نے تمام تر توجہ اپنی حکومت کے اندرونی معاملات کی دُرستی کے لئے وقف کر دی۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ سیستان کی طرف گیا کیونکہ اس نومفتوحہ ملک میں جماعت قرامطہ کے بعض شرارت پسندوں نے بغاوت کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ محمود نے جاتے ہی جماعتِ قرامطہ کے سرداروں کے قتل کے بعد بغاوت کو دبا دیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ تین سال تک غزنی میں مقیم رہ کر غزنی کی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرتا رہا۔ لیکن اسی دوران میں محمود غزنوی کو انقلابی اور لامذہب قرامطہ کی ان سازشوں کی اطلاع ملتی رہی۔ جو اس کی حکومت کے خلاف در پردہ ہندوستان کے شمال و مغربی علاقوں میں برابر جاری تھیں۔

جماعتِ قرامطہ کی اصل حقیقت

قرامطہ اس زمانہ کی نہایت ہی

خطرناک انقلابی جماعت تھی جو محض اس لئے ایران میں عالم وجود میں آئی تھی تاکہ عربوں کے اقتدار کو اور اسلام کو ہمیشہ کے لئے دُنیا سے ختم کردے۔ اس جماعت کا بانی عبداللہ بن میمون تھا۔ جو ظاہر تو یہ کرتا تھا کہ جماعتِ قرامطہ اسلام ہی کی ایک شاخ ہے۔ لیکن حقیقت میں اس جماعت سے اسلام کا دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بس اتنا تعلق تھا کہ جماعتِ قرامطہ کے متبعین مسلمان بن کر لوگوں کو فریب دیتے پھرتے تھے۔

قرامطہ دراصل اُس زمانہ کے کمیونسٹوں کی ایک لامذہب جماعت تھی۔ جس کا عقیدہ یہ تھا کہ نیک اعمالی یا بداعمالی کی نہ کوئی جزا ہے نہ سزا ہے۔ بس انسان کی زندگی اسی دُنیا میں ختم ہو جاتی ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ کلمہ۔ یہ کسی چیز کے بھی قائل نہ تھے۔ حرام اور حلال میں ان کے ہاں کوئی تمیز نہ تھی۔ عشرت پسندی۔ خونریزی۔ اور مادی فوائد کا حصول ان کا واحد مقصد تھا۔ خانہ کعبہ کی بجائے یہ بیت المقدس کی تقدیس کے قائل تھے۔ ان کی جماعت میں چونکہ جنسی بے عنوانی۔ عیاشی۔ شراب نوشی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کی آزادی تھی اس لئے رفتہ رفتہ لاکھوں نفس پرست اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ ان کا زور اس قدر بڑھا کہ خلیفہ بغداد بھی اس جماعت سے ڈرنے لگا۔ اس جماعت نے سنہ ۲۹۰ھ میں شام پر خوفناک حملہ کر کے اسے تباہ کر ڈالا اور سنہ ۳۱۱ھ میں بصرہ اور کوفہ کو لوٹا اور ابوطاہر کو اپنا پیشوا بنا کر ۳۱۹ھ میں شہر مکہ کی فتح کے بعد وہاں بڑی طرح قتلِ عام برپا کیا۔ اسی موقع پر یہ خانہ کعبہ سے سنگِ اسود اُٹھا کر لے گئے تھے جسے بیس برس تک بحرین میں اپنے قبضہ میں رکھا۔ ان کی اجازت کے بغیر زمانہ دراز تک مسلمان حج تک نہیں کر سکتے تھے چنانچہ خاندانِ عباسیہ کا بیسواں خلیفہ الراضی ان کو سالانہ ایک بہت بڑی رقم محض اسلئے

دیتا تھا کہ وہ حاجیوں کو حج کی ادائیگی سے نہ روکیں۔ ان کے ہاتھوں خلفائے اسلام کی بڑی بڑی بے عزتیاں ہوئیں۔ ہلاکو اور منگوخان نے جب اس فرقہ کے آدمیوں کا قتلِ عام کیا تو اُن میں سے ایک بڑی تعداد بھاگ کر سندھ اور بلوچستان میں چلی آئی تھی۔

سندھ اور بلوچستان میں آباد ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنی انقلابی تحریک کو بدستور جاری رکھا۔ چنانچہ انھوں نے پنجاب کے راجہ جے پال اور سندھ کی ریاست بھاتنہ کے راجہ کے ساتھ سازش کر کے سندھ کی سب سے بڑی دو مسلم ریاستوں یعنی منصورہ اور ملتان کو ختم کر ڈالا تھا۔ اور اس کے بعد سے یہ برابر سازشوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ انھوں نے اپنی سازش کا مرکز محمود غزنوی کی حکومت کو بنایا تھا۔ جس سے کہ ہندو راجہ پہلے ہی خائف اور نالاں تھے۔

قرامطہ کو اُمید تھی کہ وہ اگر سازش میں کامیاب ہو گئے تو غزنی اور ترکستان تک اپنی فتوحات کا پرچم لہرا سکیں گے۔ لیکن محمود غزنوی بھی ان سے غافل نہ تھا۔ اس کو برابر ان کی نقل و حرکت کی اطلاعات غزنی میں پہنچ رہی تھیں اور اس کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ قبل اس کے کہ یہ خطرناک جماعت غزنی یا اس کے مضافات کی جانب رُخ کرے اُسے قطعی کچل دیا جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس جماعت کو ابتدا ہی میں نہ دبا دیا گیا۔ تو وہ غزنی کے لئے اسی طرح مصیبت ثابت ہو سکتی ہے جس طرح کہ وہ خلافتِ اسلامیہ کے لئے بغداد میں ایک وبال بنی رہی ہے۔

قرامطہ کے مرکز ریاست بھاتنہ پر محمود کا حملہ

محمود غزنوی کو اچانک اطلاع

ملی کہ سندھ میں قرامطہ کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ محمود کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعتِ قرامطہ نے بحرین سے جو ان کا مرکزی مقام تھا۔ ایک مہم جہازوں کے ذریعہ بندرگاہ دیبل اور ٹھٹھ بھیجی ہے۔ اور قرامطہ نے سندھ میں وارد ہو کر سندھ کے راجاؤں سے محمودؒ کے خلاف ہر قسم کی امداد پہنچانے کے معاہدے بھی کر لئے ہیں۔ اور ان معاہدوں کی تکمیل میں سب سے زیادہ سندھ کی ہندو ریاست بھاٹنہ کے راجہ بجے رائے اور والئ ملتان داؤد بن نصر کا ہاتھ ہے۔ یاد رہے کہ داؤد بن نصر اُسی حمید خاں لودھی قرامطی کا پوتا تھا جس نے کہ راجہ جے پال اور راجہ بھاٹنہ کے اشارہ پر مسلم ریاست ملتان کو تباہ کر کے خود اس پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کے علاوہ محمود کو یہ بھی اطلاع دی گئی کہ قرامطہ کو امداد دینے کی سازش میں راجہ جے پال کے بیٹے انند پال کا بھی ہاتھ ہے لیکن انند پال نے قرامطہ کو اپنی ریاست میں گھسنے نہیں دیا اس کے برخلاف ریاست بھاٹنہ اور ملتان وہ مقامات تھے جو قرامطہ کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بنے ہوئے تھے۔

جب محمود غزنوی کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے ریاست بھاٹنہ کے راجہ بجے رائے کو پیغام بھیجا کہ ایسی حالت میں کہ تم اپنے آپ کو ہمارا تابع حکم ظاہر کرتے رہے ہو۔ تمہارے لئے یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ تم ہمارے دشمنوں یعنی قرامطہ کو اپنی ریاست میں پناہ دو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہمارے تمہارے درمیان جنگ چھڑ جانے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ بجے رائے نے محمودؒ غزنوی کے اس پیغام کا نہ صرف نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا بلکہ قرامطہ کو اپنی ریاست سے نکالنے سے صاف انکار کر دیا جس پر محمود غزنوی نے خود بجے رائے کی ریاست پر ۳۹۵ھ (۱۰۰۵ء) میں حملہ کر دیا۔ بجے رائے نے بڑی مضبوطی

کے ساتھ محمود کا مقابلہ کیا لیکن اُسے شکست ہو گئی اور وہ میدان سے فرار ہو گیا۔ لیکن محمود کے سپاہیوں نے اس کا تعاقب کر کے اُسے گرفتار کر لیا مگر راجہ نے گرفتار ہوتے کے ساتھ ہی اپنے سینہ میں خنجر مار کر خودکشی کر لی۔

بجے رائے کی فوج میں جتنے بھی قرامطی تھے وہ یا تو مارے گئے یا بھاگ کر ملتان کی ریاست میں چلے گئے۔ محمود کے لئے یہ آسان تھا کر وہ لگے ہاتھوں ملتان کو بھی قرامطہ سے صاف کر دیتا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ جب اس کی فوجیں ملتان کی جانب بڑھیں گی تو قرامطہ کسی دوسری طرف نکل جائیں گے۔ لہذا اس نے یہ طے کیا کہ ملتان پر اچانک حملہ کر کے اور قرامطہ کو چاروں طرف سے گھیر کر بالکل کچل دیا جائے۔ چنانچہ محمود ریاست بھاتنہ کو فتح کرنے کے بعد اس کا انتظام راجہ جے پال کے نو مسلم نواسے سکھ پال کے حوالے کر کے غزنی لوٹ گیا۔

محمود غزنوی کا ملتان پر حملہ

والیٔ ملتان داؤد بن نصر کا دادا حمید خاں لودھی ایک نہایت ہی ہوشیار اور چالاک شخص تھا۔ وہ اگرچہ ابتدا ہی سے قرامطہ کی جماعت کا ایک سرگرم رکن تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ محمود کا باپ سبکتگین قرامطہ کا جانی دشمن ہے تو اس نے اپنے عقائد کو پوشیدہ رکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھا کہ قرامطہ کے سب سے بڑے دشمن سبکتگین سے دوستی پیدا کرے چنانچہ وہ ساری عمر سبکتگین کو اپنی وفاداری اور دوستی کا یقین دلاتا رہا لیکن در پردہ اسکی ریاست میں قرامطہ کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں لیکن حمید خاں لودھی کا پوتا داؤد بن نصر اپنے دادا کی طرح قرامطی عقائد کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ جماعت قرامطہ کے حق میں اس کی سرگرمیاں منظر عام پر آ گئیں اور ان تمام سازشوں کا بھی انکشاف ہو گیا۔ جو وہ سندھ کے ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر محمود غزنوی کی حکومت کے خلاف کرتا رہا ہے۔ چنانچہ والیٔ ملتان داؤد بن نصر کی انہی سرگرمیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ محمود نے ریاست بھاتنہ کی فتح کے فوراً ہی بعد

ریاست ملتان پر اچانک حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس فیصلہ کے مطابق ۳۹۶ھ (۱۰۰۶ء) میں محمودؒ نے یہ طے کیا کہ وہ درہ خیبر کے راستہ سے انند پال کی حکومت میں سے گذرتا ہوا اچانک ملتان پر جھپٹا مارے تاکہ داؤد بن نصر اور اس کے ہمنوا قرامطہ کو فراری کا موقع ہی نہ مل سکے انند پال چونکہ محمود کا باجگذار تھا۔ اس لئے اسے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ پنجاب کا یہ راجہ اس کے ارادوں میں مزاحم ہوگا۔ لیکن دریائے سندھ کے کنارے جب فوج لیکر محمودؒ پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انند پال اُسے ملتان پر حملہ کا راستہ دینے کی بجائے آمادۂ جنگ ہے۔ اور اس نے باجگذاری اور ماتحتی کے تمام عہد ناموں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

راجہ انند پال کی اس تبدیلی کا باعث یہ تھا کہ اول تو وہ فطرتاً محمودؒ کو نفرت سے دیکھتا تھا۔ اور مجبوراً باجگذاری کی شرائط پوری کر رہا تھا۔ دوسرے محمودؒ کے خلاف ہندو عوام میں جو نفرت و حقارت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھتے ہوئے اس نے کسی طرح بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ محمود کو پنجاب کے راستہ سے گذرنے کی اجازت دیکر ہندو عوام کو اپنا دشمن بنا لے۔ اس کے علاوہ داؤد بن نصر والئی ملتان کے دادا حمید خاں لودھی اور اس کے باپ کے دیرینہ تعلقات تھے۔ خود انند پال بھی داؤد بن نصر کے قرامطی ہونے کی وجہ سے اس کا دوست بنا ہوا تھا۔ اس لئے انند پال کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے دوست کی ریاست پر حملہ کے لئے محمودؒ کو اپنی حکومت میں سے راستہ دیتا لہٰذا انند پال نے ایک طرف والئی ملتان کو محمود کے ارادوں سے مطلع کر دیا اور دوسری جانب محمود کی خواہش کو ٹھکراتے ہوئے آمادۂ پیکار ہو گیا۔ اور اس طرح وہ لڑائی جو ملتان کی سرزمین پر لڑی جانے والی تھی پنجاب کی سرزمین پر شروع ہو گئی۔

انند پال اور اس کی فوج زیادہ دیر تک محمود جیسے مضبوط دشمن کے مقابلہ پر نہ ٹھہر سکی۔ انند پال کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ فرار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے میدانِ جنگ سے بھاگنے کے بعد لاہور آکر دم لیا محمود بھی اسکے تعاقب میں دریائے چناب تک جا پہنچا۔ اب انند پال کشمیر بھاگ گیا انند پال کے کشمیر چلے جانے کے بعد پنجاب کا تخت خالی تھا۔ محمود کے لئے اس وقت اچھا موقعہ تھا کہ وہ ملتان کے تبجر علاقہ میں سر پھوڑنے کی بجائے پنجاب کی دولت سے مالا مال ہو جاتا لیکن اس کا منشا اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اس وقت قرامطہ کی سرکوبی کیلئے آیا تھا۔ لہذا انند پال کے فرار ہوتے ہی اس نے فوجوں کا رُخ بلا کسی توقف کے ملتان کی جانب موڑ دیا۔ اور آندھی اور طوفان کی طرح ملتان کو جا گھیرا۔

عین اس وقت جبکہ محمود کی فوجیں ملتان کو محاصرہ میں لے رہی تھیں۔ داؤد اپنا خزانہ اور قیمتی سامان اونٹوں پر لاد کر دکن کی جانب فرار ہونیکی تیاریوں میں مصروف تھا لیکن داؤد کو جب معلوم ہوا کہ اب راہ فرار بھی مسدود ہو چکی ہے تو اس نے پہلے تو مقابلہ کیا اسکے بعد محمود کی گرفت سے بچنے کے لئے عاجزانہ التجائیں شروع کر دیں۔ اور محمود کے پاس پیغام بھیجا کہ "میں مذہب قرامطہ سے توبہ کرتا ہوں اور سچے دل سے مسلمان ہوتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ قرامطہ سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ رکھوں گا۔ اور بیس ہزار درہم سالانہ خراج دارالسلطنت غزنی کو روانہ کرتا رہوں گا" محمود نے پہلے تو صلح سے انکار کر دیا مگر بعد میں آمادہ ہو گیا محمود جو داؤد سے صلح کے لئے نہیں بلکہ قرامطہ کے کچلنے کے لئے آیا تھا۔ کبھی بھی ان شرائط پر صلح کے لئے آمادہ نہ ہوتا اگر وہ ایک نئی اُلجھن میں مبتلا نہ ہو جاتا یعنی اسے اچانک اطلاع ملی کہ غزنی سے اس کی غیر حاضری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایلک خان والیٔ ترکستان نے اس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی جدوجہد شروع کر دی ہے

اور اس کی فوجیں خراسان اور بلخ پر قبضہ بھی کر چکی ہیں۔
محمود کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ داؤد کی شرائط مان لے۔ لہٰذا اس نے داؤد کی شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے ریاست بھاٹنہ کے نئے نومسلم راجہ سکھ پال کو داؤد بن نصر کا نگراں مقرر کر دیا۔ اور داؤد سے سکھ پال کی اطاعت کا اقرار لے کر یعنی سکھ پال کو اپنا جانشین بنا کر فوراً غزنی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور وہاں پہنچ کر چند ہی روز میں ایلک خاں کے اس سائے فتنہ کو دبا دیا جو اس کی غیر موجودگی میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس جنگ میں محمود نے پہلی مرتبہ وہ ہاتھی استعمال کئے تھے جو اسے راجہ بھاٹنہ کی جنگ میں بطور مال غنیمت کے ہاتھ آئے تھے محمود اس جنگ میں تقریباً ایک سال مصروف رہا۔

محمود غزنوی کا ریاست بھاٹنہ پر دوسرا حملہ

ایلک خاں کے فتنہ سے فارغ ہونے کے بعد محمود جب غزنی آیا تو اسے اطلاع ملی کہ نومسلم سکھ پال جس کو محمود نے ریاست بھاٹنہ کا حاکم اور ریاست کا نگراں بنا رکھا تھا۔ اپنے ماموں انند پال کی ترغیب سے مرتد ہو کر باغی ہو گیا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ داؤد بن نصر کی ریاستِ ملتان کو قرامطہ سے پاک کرے۔ خود قرامطہ کا معاون اور مددگار بن گیا ہے۔ اور قرامطہ کی بہت بڑی تعداد ریاست بھاٹنہ میں جمع ہو گئی ہے۔
اس اطلاع کے پاتے ہی محمود بجلی کی سرعت سے غزنی سے روانہ ہو کر ریاست بھاٹنہ پر جا کر مسلط ہو گیا۔ محمود کے اچانک وارد ہونے کی وجہ سے سکھ پال سراسیمہ ہو گیا۔ اور بلا مقابلہ کے اپنے آپ کو محمود کے سامنے پیش کر دیا۔ محمود نے پہلے تو سکھ پال کے قرامطی سرداروں کو تہہ تیغ کیا۔ اس کے بعد سکھ پال کو گرفتار کر کے غزنی لے آیا اور اسے نظر بند کر دیا۔

محمود غزنوی اور ہندوستانی راجاؤں کی سب سے بڑی جنگ

پنجاب کے

راجا انند پال نے محمود کا باجگذار ہونے کے باوجود ملتان پر حملہ کے وقت محمود کے ساتھ جو معاندانہ رویّہ اختیار کیا تھا۔ اس کی بنا پر انند پال کو یقین کامل تھا کہ محمود عنقریب اس پر حملہ کر کے سخت ترین سزا دے گا۔ محمود کے حملہ کے مقابلہ کی کیونکہ تن تنہا انند پال میں تاب نہ تھی۔ اس لئے اس نے نہایت عیاری اور چالاکی کے ساتھ ہندوستان کی تمام ہندو حکومتوں میں اپنے قاصد بھیجکر اور دہرم کی حفاظت کے نام پر اپیل کر کے سب کو محمود کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے آمادہ کر لیا ایک طرف تو راجہ انند پال ہندوستان کے تمام راجاؤں کا ایک مشترکہ محاذ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ دوسری جانب ہندوستانی پنڈت تقریروں کے ذریعہ عوام کو بطور رضا کار بھرتی ہونے کے لئے اُبھار رہے تھے۔

راجہ انند پال اور پنڈتوں کی مشترکہ کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ گجرات بھٹنڈہ دہرہ دون، سونی پت۔ برن۔ مہابن و متھرا۔ اسونی ضلع فتحپور۔ بندیلکھنڈ۔ سرسوا گڈھ قنوج۔ کالنجر۔ اُجین۔ گوالیار۔ اجمیر۔ دہلی۔ تھانیسر۔ نگر کوٹ۔ کشمیر۔ مالوہ۔ میرٹھ۔ اور تقریباً تمام ریاستوں کے راجہ یا تو خود محمود غزنوی کے خلاف لڑنے کے لئے لاہور پہنچ گئے یا انھوں نے اپنی فوجیں اور خزانے بھجوا دئے اور اس طرح لاہور میں بے اندازہ فوج اور دولت جمع ہو گئی۔ لاکھوں فوجی سپاہیوں کے علاوہ پنڈتو کی کوششوں سے بے اندازہ رضا کار بھی اس جنگ میں شامل ہونے کے لئے لاہور پہنچ چکے تھے اور ان رضا کاروں کی امداد کے لئے ہندو عورتوں نے اپنے سونے اور چاندی کے زیورات تک فروخت کر ڈالے تھے جن غریب عورتوں کے پاس زیورات نہیں تھے۔ انھوں نے سوت کات کر جو پونجی پیدا کی تھی وہ اس دھارمک جنگ کیلئے دیدی تھی۔ غرضکہ راجہ انند پال اور پنڈتوں کی مشترکہ کوششوں سے محمود غزنوی کے خلاف ایک ایسا مضبوط اور مشترکہ محاذ قائم ہو گیا تھا جیسی کہ راجہ انند پال کو

سو فی صدی کامیابی کی اُمید تھی۔

انند پال اس بے پناہ لشکر کو لئے ہوئے جسیں کہ متعدد راجہ خود اپنی فوجوں کی کمان کر رہے تھے۔ لاہور سے پشاور پہنچا اور خیمہ زن ہو گیا۔ پشاور میں انند پال کے خیمہ زن ہونے کے بعد بھی ہندو فوج اور ہندو رضا کار چاروں طرف سے محمود پر فتح کا ثواب حاصل کرنے کے لئے اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ اُدہر محمود غزنوی بھی غزنی سے اپنا لشکر لے کر پشاور پہنچ گیا۔ لیکن اس نے راجہ انند پال اور اس کے ساتھی راجاؤں کا عظیم الشان لشکر دیکھا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ محمود غزنوی کی نگاہ جہاں تک کام کرتی تھی۔ ہندوستانی فوجوں کا سمندر ہی موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

محمود جو جنگ میں ہمیشہ پہل کرنے کا عادی تھا وہ اس بے پناہ لشکر کو دیکھ کر کچھ ایسا سراسیمہ ہوا کہ اسے چالیس روز تک ہندوستانی راجاؤں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ محمود یہ دیکھ کر اور بھی پریشان تھا کہ جُوں جُوں وقت گذر رہا ہے۔ ہندوستانی سپاہ میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیونکہ ہر روز ہزاروں سپاہی اور رضا کار ہندوستانی فوج میں شامل ہونے کے لئے چلے آ رہے تھے۔ آخر محمود نے ٹڈی دل ہندوستانی فوج سے بچاؤ کے لئے پہلے تو اپنی فوج کے سامنے خندق کھدوائی اور اسکے بعد ہمت کر کے ہندوستان کے بے پناہ لشکر پر حملہ کر دیا۔

محمود کا حملہ کرنا تھا کہ تیس ہزار ہندوستانی گھکر خندقیں پار کر کے محمود کے لشکر میں گھس آئے اور انھوں نے تھوڑی ہی دیر میں چار ہزار مسلمانوں کو قتل کر ڈالا گھکڑوں کی یہ جرأت دیکھ کر محمود کو بے حد پریشانی پیدا ہو گئی۔ لیکن اس نے ہمت سے کام لے کر پہلے تو گھکڑوں کا قتل عام کیا۔ اور اس کے بعد پوری طاقت کے ساتھ ہندوستانی راجاؤں کے لشکر پر پل پڑا۔ صبح سے شام تک خوفناک

جنگ جاری رہی جب جنگ شروع ہوئی تھی اُس وقت راجہ انند پال کو اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔ لیکن شام ہوتے ہوتے جب ہندوستانی لشکر نے یہ دیکھا کہ مسلمان پیچھے ہٹنا ہی نہیں جانتے اور کم تعداد میں ہونے کے باوجود بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ تو ان کی ہمتیں ٹوٹنے لگیں۔ اسی دوران میں راجہ انند پال کے ہاتھی کو مسلمان حملہ آوروں نے گھیر لیا جس کی وجہ سے راجہ انند پال کو اپنے ہاتھی کو واپس لوٹانا پڑا۔ انند پال کے ہاتھی کا رُخ پھرنا تھا کہ ہندوستانی فوج نے سمجھ لیا کہ راجہ کو شکست ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا۔ فوج نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا اور چند گھنٹوں کے اندر ہی میدان جو ہندوستانی سپاہیوں سے پٹا پڑا تھا۔ بالکل خالی تھا۔

اس جنگ کا نتیجہ اگرچہ محمود غزنوی کے حق میں تھا۔ لیکن اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محمود بھی اس جنگ سے پریشان ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اتنی بڑی تیاری کے ساتھ شاید صدیوں کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر جنگ لڑی گئی تھی۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندو لشکر میں اگر کثرتِ تعداد کے ساتھ نظم و نسق بھی ہوتا تو محمود کا اس بے پناہ لشکر پر فتحیاب ہونا ناممکن تھا۔ ہندو لشکر کی بدنظمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ میدانِ جنگ سے راجہ انند پال کے پیٹھ پھیرتے ہی سارے لشکر کے پیر اُکھڑ گئے۔

محمود غزنوی کا نگرکوٹ پر حملہ

راجہ انند پال فرار ہونے کے بعد لاہور کی بجائے نگرکوٹ پہنچا کیونکہ یہ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ محمود بھی انند پال کے تعاقب میں پتہ لگاتا ہوا نگرکوٹ پہنچ گیا۔ لیکن انند پال موقع پا کر کھسک گیا۔ اور پہاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کسی دُور دراز مقام پر پہنچ گیا۔ محمود نے قلعہ نگرکوٹ کا محاصرہ کر لیا۔ نگر قلعہ کی فوج

نے برائے نام مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈالدیئے۔ قلعہ پر محمود کا قبضہ ہوگیا۔

راجہ انندپال اگر فرار ہونے کے بعد نگر کوٹ نہ جاتا تو شاید محمود ادھر رُخ بھی نہ کرتا لیکن محمود کی خوش قسمتی اُسے اس قلعہ میں لے آئی۔ قلعہ پر قبضہ جمانے کے باوجود بھی محمود کو اس بات کا علم نہ تھا کہ یہاں قارون کے خزانہ سے بھی بڑا خزانہ مندر میں موجود ہے لیکن خود پجاریوں نے جان بچانے کے لالچ میں اس خزانہ کا پتہ محمود کو بتا دیا۔ چنانچہ جب یہ خزانہ کھولا گیا تو محمود حیران رہ گیا کیونکہ آنکھوں سے دیکھنا تو درکنار اس نے ساری عمر کبھی اتنی بڑی دولت کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

محمود خلافِ توقع اس خزانہ کے حاصل کرنے کے بعد بے حد خوش ہوا۔ اس نے اس خزانہ کو اُونٹوں پر لادنے کے بعد اسے غزنی پہنچانے کا حکم دیدیا۔ محمود غزنی ابھی نگر کوٹ ہی میں مقیم تھا کہ اسے راجہ انندپال کا پیغام ملا کہ جس طرح آپ نے اس سے قبل بار بار میری اور میرے باپ کی خطاؤں کو معاف کیا ہے۔ اگر ایک مرتبہ میری معذرت کو اور قبول کر لیا جائے تو میں تادمِ زیست باجگذار اور اطاعت شعار رہوں گا۔" اسی قسم کی درخواست نگر کوٹ کے راجہ کی جانب سے بھی کی گئی۔ محمود غزنوی نے انندپال اور راجہ نگر کوٹ دونوں کی درخواستیں منظور کر لیں۔ چنانچہ انندپال کو پھر ایک مرتبہ غزنی کے ماتحت پنجاب پر حکمرانی کی اجازت مل گئی۔ اور راجہ نگر کوٹ کو بھی معافی دیدی گئی۔

محمود غزنوی کی ہندو فوج

محمود غزنوی کے خلاف دھرم کی حفاظت کے نام پر ہندو رہنما اور پنڈت جس طرح عوام کو اُبھارتے رہے تھے۔ اُس سے محمود غزنوی ناواقف نہ تھا۔ چنانچہ محمود غزنوی نے یہ سوچا کہ ایک بڑی تعداد میں ہندو فوج رکھی جائے تاکہ اس ہندو فوج کے ذریعہ ان ہندو فتنہ پردازوں کو قابو میں رکھا جاسکے جو مذہب کے نام پر ہندو عوام

کو اُس کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے ماتحت محمود غزنوی نے ہندوؤں کے فوج میں بھرتی کئے جانے کا عام اعلان کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار ہندو نوجوان محمود غزنوی کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ چنانچہ یہ ہندو فوج محمود غزنوی کے جانشینوں کے پاس آخر وقت تک رہی۔ محمود غزنوی نے اس دس ہزار فوج کا سپہ سالار بھی ایک ہندو ہی کو مقرر کر دیا۔ محمود اس کام سے فارغ ہو کر اور نگر کوٹ کا خزانہ لیکر غزنی کے لئے روانہ ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جب اس خزانہ کے جواہرات اور سونا چاندی کو ممالکِ غیر کے سفیروں نے غزنی آکر دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔ کیونکہ اتنی دولت روم اور ایران کے سلاطین بھی جمع نہیں کر سکے تھے۔

محمود کا غور اور ملتان پر حملہ

محمود نے قرامطہ کو جس قدر دبانے کی کوشش کی وہ اتنے ہی اس کے دشمن بنتے چلے گئے۔

چنانچہ محمود جس زمانہ میں راجہ انندپال اور دوسرے ہندوستانی راجاؤں سے لڑائی میں اُلجھا ہوا تھا۔ قرامطہ نے غور و ہرات کے حاکم محمد بن سوری کو قرامطی بنانے کے بعد محمود کے خلاف اُبھار دیا۔ چنانچہ محمود جس وقت نگر کوٹ سے غزنی پہنچا تو قرامطہ اپنا کام کر چکے تھے اور غور و ہرات میں سخت شورش برپا تھی لہٰذا محمود کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ محمد بن سوری کے خلاف میدان میں آجائے۔ محمد بن سوری پہلے ہی سے اس معرکہ کے لئے تیار تھا۔ غرضکہ محمود اور محمد بن سوری کے لشکروں میں تنگرہ میں بڑا زبردست مقابلہ ہوا جس میں کہ محمد بن سوری شکست کھانے کے بعد گرفتار ہوا اور اس نے خودکشی کر لی۔

غور کے معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد محمود کو فوراً ملتان کی طرف دوڑنا پڑا جہاں داؤد بن نصر باغی ہونے کے بعد محمود کے خلاف دست درازیوں میں

مصروف تھا۔ اور اس مرتبہ داؤد بن نصر کی پشت پناہی صرف ہندو راجہ ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ اسے مصر کے فرماں روا حاکم بن عزیز عبیدی کی بھی پوری حمایت حاصل تھی۔ حاکم بن عزیز عبیدی خود تو قرامطی نہ تھا لیکن قرامطہ کا اس لئے معاون بنا ہوا تھا کیونکہ قرامطہ نے خلیفہ بغداد کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اور عباسی خلیفہ کی اس نازک پوزیشن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حاکم بن عزیز عبیدی نے مصر میں خود اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔

حاکم بن عزیز عبیدی کو سب سے زیادہ محمود غزنوی کا خوف تھا۔ جو عباسی خلیفہ کا خادم اور طرفدار تھا۔ لہذا حاکم بن عزیز عبیدی نے قرامطہ کے ذریعہ محمود غزنوی کے پرانے دشمن داؤد بن نصر کو، جو خود بھی قرامطی تھا آلۂ کار بنایا۔ چنانچہ داؤد بن نصر کی امداد کے لئے اس نے مصر سے کچھ جہاز فوج اور ہتھیاروں سے مسلح کر کے دیبل کی بندرگاہ پر بھجوا دیئے۔ جہاں سے یہ جنگی سامان اور فوج ملتان پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ داؤد بن نصر نے حاکم بن عزیز کی خلافت پر بیعت کرنے کے بعد محمود کے خلاف کھلم کھلا کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ محمود کو داؤد بن نصر کی ان فتنہ پردازیوں کا علم ہوا تو وہ فوراً ملتان پہنچا اور بجلی کی طرح داؤد بن نصر پر ٹوٹ پڑا۔ اُس نے چن چن کر ملتان میں قرامطہ کو تہ تیغ کیا۔ بعض کو ہاتھی کے پیروں تلے کچلوا ڈالا اور داؤد بن نصر کو قید کر کے غزنی لے گیا۔

محمود کا ناراین اور تھانیسر پر حملہ

محمود کے ناراین پر حملہ کرنے کے بارے میں مورخوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ اس مہم کا ذکر نہ تو طبقاتِ اکبری میں ہے۔ اور نہ تاریخ فرشتہ ہی میں ہے۔ مگر حبیب السیر اور روضۃ الصفا میں اس مہم کے بارے میں اشارہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ناراین کونسا مقام تھا۔ لیکن اتنا ضرور

پتہ چلتا ہے کہ محمود نے کوئی نہ کوئی اس قسم کی مہم تھانیسر کی مہم سے قبل ضرور کی تھی جسمیں اس کو وہاں کے مندروں سے کافی دولت ملی تھی۔ اور لاتعداد ہاتھی اور سامانِ جنگ بھی کافی مقدار میں محمود کے ہاتھ آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۱؁ھ (۱۰۱۰ء) میں محمود نے یہ مہم سر کی تھی۔ اسی طرح محمود کی ایک دوسری مہم کا بھی تذکرہ بعض تاریخوں میں موجود ہے۔ یہ مہم "ناردین" کی مہم کے نام سے مشہور ہے ممکن ہے کہ "نارائن" اور "ناردین" کی مہم ایک ہی ہو جس کو بعض تاریخوں میں "نارائن"۔ اور بعض میں "ناردین" لکھا گیا ہو۔ ناردین کی مہم کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس مہم میں محمود کو بے شمار ہاتھی اور بے اندازہ دولت ہاتھ آئی تھی۔

تھانیسر کی مہم کے بارے میں تقریباً تمام مورخوں کا اتفاق ہے۔ تھانیسر اُس زمانہ میں برہمنوں اور مذہبی پیشواؤں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جہاں ہندو عوام کو دھرم کے نام پر محمود کے خلاف بھڑکانے کی کوششیں زمانۂ دراز سے جاری تھیں۔ لہذا محمود نے یہ فیصلہ کیا کہ برہمنوں اور مذہبی پیشواؤں کے اس سب سے بڑے گروہ پر حملہ کر کے اُن شورشوں کے سرچشمہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے جن کا محمود کو بار بار ہندو راجاؤں کے باغی ہو جانیکی وجہ سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔

مہاراجہ تھانیسر کئی بار راجہ جے پال اور انند پال کے ساتھ مل کر محمود کو بیحد پریشان کر چکا تھا۔ محمود فطرتاً اس سے انتقام بھی لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۴۰۲؁ھ (۱۰۱۱ء) میں محمود کی فوجیں انند پال کے علاقہ پنجاب سے ہوتی ہوئی تھانیسر کی جانب روانہ ہوگئیں۔ انند پال نے اس مرتبہ پہلے کی طرح کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ محمود کو ہر ممکن امداد دی۔ تھانیسر کے راجہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ محمود کی فوجیں اس کی ریاست کی جانب بڑھ رہی ہیں تو اس نے اپنی مدد کے لئے میرٹھ۔ مہابن۔ برن اور قنوج کے راجاؤں کو بلایا لیکن قبل اسکے یہ راجہ اسکی امداد کو پہنچتے۔ محمود کی فوجیں

تھانیسر میں داخل ہو گئیں۔ اور تھانیسر کا راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔

تھانیسر کی فتح کے بعد محمود نے تھانیسر کے اس مشہور بُت خانہ کی جانب توجہ کی جو مدتِ دراز سے محمود کے خلاف پنڈتوں اور مذہبی پیشواؤں کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔ محمود نے بُت خانہ میں داخل ہونے کے بعد بتوں کو توڑا مندر کو لُوٹا۔ اس مندر سے محمود کو بے اندازہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا جس میں کہ ایک نایاب یاقوت بھی تھا جس کا وزن ساٹھ تولہ بتایا جاتا ہے۔ اس کے بعد محمود مندر کے سب سے بڑے بُت "رسوم جگ" کو لیکر غزنی چلا گیا۔

محمود کے ابتدائی حملوں کی تفصیلات کے پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ محمود نے ابتدا میں نہ تو مندروں کی جانب رُخ کیا اور نہ بُتوں کو توڑا۔ لیکن پنڈتوں اور مذہبی پیشواؤں کی مخالفانہ سرگرمیوں نے محمود کو بعد میں اسی طرح پنڈتوں کا بھی دشمن بنا دیا تھا جس طرح کہ وہ قرامطہ کا دشمن تھا۔ اس کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ نگر کوٹ کے مندر سے حاصل شدہ بے اندازہ دولت نے بھی محمود اور اسکے فوجیوں کی توجہ خاص طور پر ان مندروں کی جانب مبذول کر دی ہو جنمیں کہ کروڑوں روپیہ کے خزانے اُس زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ محمود مندروں اور ان کی دولت کی جانب زیادہ تر اس وقت متوجہ ہوا۔ جب اس کے ساتھ مسلم فوج کے علاوہ ہندو فوج کی بھی ایک بہت بڑی تعداد رہتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ ان ہندو فوجیوں یعنی گھر کے بھیدیوں ہی نے محمود کو مندر کے خزانوں کی جانب رہنمائی کی ہو۔ اس لئے کہ خود فوجیوں کا بھی اس میں فائدہ تھا کیونکہ مالِ غنیمت کا ایک خاص حصّہ فوجیوں میں ضرور تقسیم کیا جاتا تھا۔

محمود کا پنجاب اور کشمیر پر حملہ محمود غزنی ہی میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ پنجاب کا راجہ انند پال مر گیا۔

انند پال مرتے دم تک سلطان محمود غزنوی کا فرمانبردار رہا لیکن انند پال کے بیٹے جے پال ثانی نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور خراج ادا کرنے سے بھی منکر ہو گیا۔ سلطان محمود اس کی تادیب کے لئے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ پنجاب کی جانب بڑھا راجہ جے پال ثانی نے مقام نندونہ ضلع جہلم میں ۴۰۴ھ (۱۰۱۴ء) میں محمود کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن جب محمود نے قلعہ نندونہ کا محاصرہ کر لیا تو جے پال فرار ہو کر کشمیر چلا گیا۔

محمود اس کے تعاقب میں کشمیر تک گیا اگرچہ جے پال کشمیر کے اندرونی علاقہ میں داخل ہو گیا اور کشمیر کے راجہ نے اس کو پناہ دے دی۔ اس پر محمود نے کشمیر پر حملہ کر کے کئی قلعے فتح کر لئے۔ کشمیری فوجوں نے بھی محمود کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ آخر محمود کشمیر کی مہم کو ناکام چھوڑ کر اور کافی نقصان اٹھانے کے بعد نندونہ واپس آ گیا۔ اور نندونہ میں اپنا عامل مقرر کرنے کے بعد غزنی واپس چلا گیا۔ محمود کے غزنی واپس چلے جانے کے بعد جے پال ثانی نے لاہور واپس آ کر پھر پنجاب میں حکومت شروع کر دی۔ اور محمود کی خدمت میں سالانہ خراج کے ساتھ درخواست بھیجی کہ "میری نوعمری اور ناتجربہ کاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرا قصور معاف کر دیا جائے۔ آئندہ میں برابر خراج بھیجتا رہوں گا۔" محمود نے جے پال ثانی کی اس درخواست کو منظور کرنے کے بعد پنجاب کی سند حکومت اس کے پاس بھیج دی۔

سلطان محمود ۴۰۶ھ تک غزنی اور خراسان کے اندرونی جھگڑوں میں مبتلا رہا ان سے فارغ ہونے کے بعد وہ مہاراجہ کشمیر کی تادیب کے لئے ایک بڑا لشکر لے کر لوہ کوٹ کے قلعہ پر حملہ آور ہوا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران میں محمود کو اطلاع ملی کہ باغیوں نے حاکم خوارزم کو قتل کر دیا ہے۔ اور خوارزم میں بغاوت پھیل گئی ہے اس تشویشناک اطلاع کے بعد محمود کو مجبوراً ۴۰۶ھ میں قلعہ لوہ کوٹ سے محاصرہ

اُٹھا کر غزنی اور غزنی سے خوارزم جانا پڑا۔ جہاں اس نے باغیوں کو سخت سزائیں دیں جب محمود کو اپنے گھریلو جھگڑوں سے کسی قدر فراغت حاصل ہو گئی تو وہ ۴۰۹ھ میں ایک جرار لشکر لے کر اس ارادہ سے روانہ ہوا کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں پر حملے کر کے اپنے اُن تمام مخالفوں کو کچل ڈالے جو اس کے لئے آئے دن نئی نئی پریشانیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ کشمیر پہنچا کیونکہ لوہ کوٹ کی مہم کو نامکمل چھوڑ کر چلے جانے کی وجہ سے راجہ کشمیر کی نخوت بے حد بڑھ گئی تھی۔ لیکن محمود کے کشمیر میں داخل ہوتے ہی راجہ نے اطاعت قبول کر لی۔ اور محمود کا مطیع اور خراج گذار بن گیا۔

قنوج اور متھرا پر محمودؒ کی فوج کشی

کشمیر کے معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد محمود قنوج اور ان دوسری ہندو حکومتوں پر اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا جنہوں نے راجہ انند پال کے ساتھ مل کر حکومت غزنی کے فنا کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے نئے دوست مہاراجہ کشمیر کو بھی ساتھ لے لیا۔ تاکہ مہاراجہ کشمیر کے سپاہی اس اہم جنگ میں اس کی فوج کی رہنمائی کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہندو سپاہیوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اس معرکہ میں محمود کے ہمراہ تھی۔

مہاراجہ کشمیر اور اس کے سپاہی محمودؒ کی فوج کو پیچیدہ اور دشوار گزار راستوں سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ نکال کر لے گئے۔ یہاں تک کہ سلطان محمود کو رام گنگا کے دہانے پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ رام گنگا کے دہانے پر سلطانی لشکر کا پہنچنا تھا کہ قنوج میں محمود کے حملہ کی اطلاعیں پہنچ گئیں مگر محمود بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کوہ ہمالیہ سے ہوتا ہوا میدان میں اتر کر مع اپنے بے پناہ لشکر کے قنوج کے سامنے جا پہنچا۔

قنوج کے راجہ کنور رائے نے محمود کے لشکر کی کثرت اور شوکت دیکھی تو وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ محمود سے معافی کے لئے

التجا کرے سلطان محمود غزنوی کی یہ خصلت بن گئی تھی کہ وہ کبھی بھی معافی مانگنے والوں کی درخواست رد نہیں کرتا تھا۔ اس لئے راجہ کو یقین تھا کہ اُسکی درخواست کو بھی محمود ضرور شرف قبولیت بخشے گا۔ چنانچہ راجہ اپنے گلے میں دوپٹہ ڈال کر اپنے ہاتھ رومال سے بندھوا کر مع اپنے بیٹوں اور قریبی رشتہ داروں کے محمود کے سامنے مجرم بن کر آن کھڑا ہوا محمود کو راجہ کی یہ انکساری بیحد پسند آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر خود راجہ کے ہاتھ کھولے، گلے سے لگایا اور اپنی برابر تخت پر بٹھایا۔ اور ہر طرح تسلی و تشفی دے کر رخصت کیا۔

محمود کئی دن تک راجہ کا مہمان رہا۔ راجہ نے قیمتی تحائف محمود کی خدمت میں پیش کئے۔ اور مرتے دم تک محمود کا وفادار رہا۔ سلطنت غزنی کے علاوہ قنوج کے راجاؤں کے تعلقات خلفائے اسلام سے بھی نہایت ہی خوشگوار تھے چنانچہ راجہ قنوج ہی نے خلیفہ ہارون الرشید کے علاج کے لئے اپنا ہندو طبیب بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قنوج میں سلمان برابر آتے رہتے تھے۔ اور بغداد قنوج کے ہندوؤں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ غرضکہ قنوج کی عام رعایا میں بھی محمود اور راجہ کنورائے کی صلح کو بے حد پسند کیا گیا۔

شمالی ہند کے راجاؤں کی اطاعت

سلطان محمود نے قنوج کے قیام کے دوران ہی میں ہندو مخبروں کے ذریعہ ان شرارت پسند اُمرا اور راجاؤں کی ایک فہرست تیار کرلی جو محمود کے خلاف سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے تھے۔ چنانچہ محمود نے اب اپنے مخالفین کے خلاف یورش کرنے کے لئے قدم اُٹھایا بقول فرشتہ محمود نے سب سے پہلے میرٹھ کی جانب رُخ کیا۔ اس کے بعد مہابن اور متھرا پہنچا۔ لیکن طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ محمود قنوج سے بلند شہر (برن) گیا اور وہاں سے مہابن ہوتا

ہوا متھرا پہنچا۔ بلند شہر کے راجہ ہردت نے مقابلہ کی تاب نہ لاکر تیس ہاتھی اور بہت سارے دیگر اطاعت قبول کر لی لیکن مہابن کے راجہ نے مقابلہ کیا اور شکست کھانے پر خودکشی کر لی۔ اسکے بعد محمود نے متھرا پر حملہ کیا۔ اور متھرا کی فتح کے بعد یہاں کے سب سے بڑے مندر کو توڑا لیکن باقی مندروں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہاں سے اُس نے ہندوؤں کے اُن شرارت پسند لیڈروں کو بھی گرفتار کیا جو محمود کے خلاف ہندوؤں کو اکساتے رہتے تھے

متھرا سے فارغ ہونے کے بعد محمود نے اسونی ضلع فتحپور کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ نے نذرانہ پیش کر کے مُعافی طلب کی تو محمود نے اُسے معافی دیدی، اس کے بعد محمود مالوہ، دہلی، اجمیر اور اُن تمام ریاستوں کے راجاؤں کی جانب متوجہ ہوا۔ جو راجہ انندپال کے ساتھ مل کر غزنی کی حکومت کو مٹانے کے درپے تھے۔ ان میں سے چند راجاؤں کے علاوہ باقی تمام راجہ روپیہ، نذرانہ اور تحائف دینے کے بعد محمود کے باجگذار اور اطاعت شعار بن گئے۔ اور اس طرح محمود نے اپنے اس تاریخی حملہ کے ذریعہ سارے شمالی ہندوستان کو اپنا باجگذار اور مطیع بنا لیا۔

اس بڑے حملے میں محمود نے حتی المقدور مندروں کے توڑنے اور اُنکی دولت لُوٹنے سے اجتناب کیا۔ شاید اس طرح وہ ہندوؤں کے دلوں میں جگہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مشہور ہندو مورخ سُجان رائے کا کہنا ہے کہ جب محمود اپنی اس عظیم الشان فتح کے بعد غزنی لوٹتا ہے تو اس کے پاس کُل پانچ لاکھ بیس ہزار درہم یعنی آج کل کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھا۔ گویا اتنے بڑے معرکہ میں محمود کو صرف یہ حقیر سی رقم ہاتھ آئی تھی جس سے صاف ظاہر ہے کہ محمود کے اس حملہ کا مقصد کسی طرح بھی حصول دولت نہیں تھا۔

کالنجر پر محمود کا حملہ

محمود کے ہندوستان سے جاتے ہی ہندوستانی راجاؤں نے حسبِ دستور پھر محمود کے خلاف

سازشیں شروع کر دیں۔ اس مرتبہ ان سازشوں کا سب سے بڑا محرک کالنجر کا راجہ نندا تھا۔ جس نے قنوج۔ متھرا۔ بلند شہر۔ میرٹھ اور تمام ان مقامات کے راجاؤں کو جنہوں نے کہ محمود کی اطاعت قبول کی تھی ملامت آمیز اور غیرت دلانے والے خطوط لکھے اور اُن کو اُبھارا کہ وہ سب متحد ہو کر محمود کے خلاف مشترکہ محاذ قائم کریں۔

کالنجر کے راجہ کے اس پروپیگنڈے کا یہ اثر ہوا کہ قنوج کے راجہ کنور رائے کے علاوہ باقی تمام راجہ اس بات کے لئے آمادہ ہو گئے کہ وہ کالنجر کے راجہ کی قیادت میں محمود کی طاقت کو توڑنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھیں گے یہاں تک کہ پنجاب کا راجہ جے پال ثانی بھی اس سازش میں شریک ہو گیا۔ لیکن قنوج کا راجہ کسی طرح بھی ان کے ساتھ شریک نہ ہوا جس سے ناراض ہو کر کالنجر کے راجہ نندا نے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

قنوج کے راجہ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ محمود کی حمایت کے جُرم میں تمام راجہ اُس کے دشمن بن گئے ہیں۔ اور کالنجر کے راجہ نے اس ملک پر چڑھائی کر دی ہے محمود غزنوی کو اپنی امداد کے لئے لکھا۔ سلطان محمود قنوج کے راجہ کی مصیبت کا حال سُنتے ہی فوراً غزنی سے مختصر سی فوج لے کر قنوج کی طرف روانہ ہو گیا۔ محمود چاہتا تھا کہ پنجاب کے راستہ سے گذر کر جلد سے جلد قنوج پہنچ جائے۔ لیکن جے پال ثانی جو پہلے ہی کالنجر کے راجہ سے سازش کر چکا تھا۔ جب اُس نے یہ دیکھا کہ محمود کی فوج نہایت ہی مختصر ہے تو محمود کے مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ لیکن جے پال ثانی چند گھنٹے بھی مقابلہ پر نہ ٹھہر سکا اور موقع پاتے ہی میدانِ جنگ سے بھاگ گیا۔

محمود جے پال ثانی کو شکست دیتے ہی پوری تیزی کے ساتھ قنوج کی

جانب بڑھا لیکن جب وہ قنوج میں داخل ہوا تو اُسے معلوم ہوا کہ قنوج کا راجہ محمود کی حمایت کے جرم میں اس کے پہنچنے سے قبل ہی کالنجر کے راجہ کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا جا چکا ہے اور کالنجر کا راجہ کالنجر واپس چلا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی محمود ایک منٹ کا توقف کئے بغیر کالنجر کی جانب دوڑا۔ تاکہ راجہ نندا کو سزا دے سکے۔
راجہ جو پہلے ہی سے اس خطرہ کے لئے تیار تھا۔ اپنے چھتیس ہزار سوار، پنتالیس ہزار پیادے۔ اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی لیکر محمود کے مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ سلطان محمود جو مختصر سی فوج لیکر آیا تھا۔ جب اس نے راجہ نندا کا عظیم الشان لشکر دیکھا تو اُسے بڑی تشویش پیدا ہوئی لیکن اُس نے طے کر لیا کہ خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو وہ راجہ نند کو ضرور سزا دے گا۔ ادہر راجہ نندا کی یہ حالت ہوئی کہ وہ محمود کی شکل دیکھ کر ہی کانپ گیا۔ اور اُس پر محمود کی ہیبت کچھ ایسی غالب آئی کہ وہ اپنا تمام سامان میدان جنگ میں چھوڑ کر صبح ہونے سے قبل ہی فرار ہو گیا۔ محمود نے راجہ کا تعاقب کیا لیکن راجہ کسی نامعلوم مقام پر چلا گیا۔
کالنجر کے اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد محمود چاہتا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے پنجاب کے راجہ جے پال ثانی کی خبر لے جس نے کہ اُسے راستہ میں اُلجھا کر قنوج کے راجہ کی جان کھوادی۔ لیکن چونکہ محمود کے پاس فوج بہت تھوڑی تھی اسلئے وہ سیدھا غزنی پہنچا۔ تاکہ لشکر کا معقول انتظام کرنے کے بعد پنجاب پر حملہ آور ہو لیکن غزنی آنے کے بعد وہ سوات اور نیمروز کے جھگڑوں میں کچھ ایسا پھنسا کہ اُسے ڈیڑھ دو سال تک ہندوستان کی جانب رُخ کرنے کی فرصت ہی مل سکی۔

محمود غزنوی کا پنجاب پر دوسرا حملہ

محمود غزنوی کو جوں ہی گھریلو جھگڑوں سے فرصت ملی وہ

۴۱۲ھ میں ایک لشکرِ عظیم لے کر پنجاب کی جانب روانہ ہو گیا۔ راجہ جے پال ثانی کو جب یہ معلوم ہوا کہ محمود ٹڈی دل لشکر کے ساتھ اُسے سزا دینے کے لئے آرہا ہے تو وہ اجمیر بھاگ گیا۔ سلطان محمود نے لاہور اور دہلی کو فتح کر لیا اور لاہور میں آکر قیام کیا اور اُس نے راجہ جے پال اور اس کے بزرگوں کی بدعہدیوں کو دیکھتے ہوئے یہ طے کیا کہ پنجاب اور دہلی کو حکومتِ غزنی سے ملحق کر لیا جائے۔ چنانچہ پنجاب کے تمام اضلاع میں مسلم عمال مقرر کر دیئے گئے اور محمود کا سکہ جاری ہو گیا۔ محمود نے پنجاب کا سب سے پہلا گورنر اپنے محبوب غلام ایاز کو مقرر کیا۔ یہ کشمیری النسل غلام تھا جو محمود کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔ ایاز کی قبر اب بھی رنگ منڈی لاہور میں موجود ہے۔ الغرض سلطان محمود ایاز کو پنجاب کا پہلا اسلامی گورنر مقرر کرنے کے بعد غزنی واپس چلا گیا۔

کالنجر کا راجہ نندا محمود کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا تھا۔ محمود ۴۱۳ھ (۱۰۲۰ء) میں ایک بڑا لشکر لیکر جب اسکی سرکوبی کو دوبارہ آیا تو راجہ گوالیار نے راستہ میں محمود کو روکنا چاہا مگر مقابلہ نہ کرسکا اور فوراً ہی زر و جواہر اور بہت سے ہاتھی پیش کر کے اس نے اطاعت قبول کر لی۔ راجہ گوالیار کو زیر کرنے کے بعد جب محمود کالنجر پہنچا تو اُس نے جاتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ نندا نے محاصرہ سے تنگ آکر محمود سے اپنی گذشتہ خطاؤں کی معافی طلب کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ ساری عمر وفادار رہے گا۔ اس نے تین سو ہاتھی بھی بطور نذر پیش کر دیئے۔ محمود نے اس کا قصور معاف کر کے اسے حکمرانی کا پروانہ دیدیا۔ چنانچہ یہ راجہ تازیست محمود کا مطیع فرمانبردار اور مداح رہا اور محمود بھی اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا۔

سومنات کے مندر پر محمود کا حملہ

سومنات کا مندر جو کاٹھیاواڑ گجرات میں تھا۔ اس پر محمود کا حملہ ہندوستان

کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ حملہ محمود نے کیوں کیا؟ اور اس دُور دراز مقام پر فوج کشی کی محمود کو کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کے بارے میں مورخوں کے مختلف بیانات ہیں بعض مورخوں کا تو یہ کہنا ہے کہ چونکہ متھرا مہابن اور تھانیسر کے برہمن اور مذہبی پیشواؤں نے تھانیسر کے مندر کی طرح سومنات کے مندر کو محمود کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا اور قرامطہ بھی اس مقام پر ان برہمنوں اور مذہبی پیشواؤں سے مل کر محمود کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے اس لئے محمود نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنے مخالفین کے اس نئے مرکز کو بھی تباہ اور برباد کر ڈالے بعض مورخوں کی یہ رائے ہے کہ محمود کو یا تو اپنے ہندو سپاہیوں کے ذریعہ یا کسی دوسرے ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سومنات کے مندر میں بے اندازہ دولت ہے۔ اس لئے دولت کی طمع نے اس کو اس دُور دراز یورش کے لئے مجبور کیا تھا۔ ان مورخوں کا یہ بھی بیان ہے کہ اس یورش میں جن سپاہیوں نے حصہ لیا تھا وہ بغیر تنخواہ کے سپاہی تھے جو محض مالِ غنیمت کے لالچ میں اس معرکہ میں حصہ لینے کے لئے شریک ہو گئے تھے بعض یہ کہتے ہیں کہ محمود نے والئ گجرات کے خلاف یہ حملہ کیا تھا لیکن اسکی خوش قسمتی سے سومنات کی دولت اسکے ہاتھ آ گئی۔

سومنات کے مندر پر محمود کے اس تاریخی حملہ کی تفصیل یہ ہے کہ محمود بڑے اہتمام کے ساتھ اور بہت بڑا لشکر لے کر ملتان کے کٹھن راستہ کو طے کرتا ہوا ۴۱۵ھ (۱۰۲۵ء) میں دو ڈھائی مہینے کی مسافت کے بعد گجرات جا پہنچا۔ گجرات کا راجہ محمود کے اس اچانک حملہ سے سراسیمہ ہو گیا اور شہر چھوڑ کر کسی طرف بھاگ نکلا۔ گجرات پہنچنے کے بعد محمود نے سیدھا سومنات کی طرف رُخ کیا اور اس نے سومنات کی فصیلوں کے قریب عین مندر سے متصل اپنے خیمے ڈال دیئے۔

سومنات کا مندر کس قدر عظیم الشان تھا۔ اس کا اندازہ مورخوں کے اس

بیان سے ہوسکتا ہے کہ اس عمارت کے در و دیوار میں بے شمار جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ چھپن ستون مرصع جواہرات کے لگے ہوئے تھے۔ دو سو من سونے کی زنجیر لٹکی ہوئی تھی۔ اسمیں سیکڑوں گھنٹے آویزاں تھے۔ اس مندر کے مصارف کے لئے دو ہزار گاؤں وقف تھے۔ دو ہزار برہمن محافظت کے لئے ہر وقت متعین رہتے تھے۔ پانچ سو نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں اس مندر کی خدمت کے لئے دیو داسیاں بنی ہوئی تھیں اور اس مندر میں اس قدر زر و جواہر تھا جو شاید کسی بڑی سے بڑی سلطنت کے خزانہ میں بھی نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ اس تاریخی مندر کی حفاظت کے لئے دس ہزار راجپوتوں کی فوج بھی ہر وقت سینہ سپر رہتی تھی۔

سلطان محمود کے اس مندر پر حملہ کرتے ہی ایک طرف تو دس ہزار راجپوت میدان میں آگئے اور دوسری جانب ہزارہا عام باشندے اپنے عبادت خانے کو بچانے کے لئے مسلح ہوکر دوڑ پڑے۔ غرضکہ رفتہ رفتہ محمود کے مقابلہ کے لئے مندر سے عقیدت رکھنے والوں کا اتنا بڑا لشکر جمع ہوگیا کہ محمود جیسا بہادر شخص بھی پریشان ہوگیا۔ اس مندر کے تین طرف پانی تھا اور ایک طرف خشکی کا راستہ تھا۔ لہٰذا محمود اس خشکی کے راستہ سے مندر کی جانب بڑھنے کی انتہائی کوشش کررہا تھا لیکن اسے سخت مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ اس کے مقابلہ پر راجپوتوں کی فوج کے علاوہ مسلح شہریوں کا بھی بہت بڑا ہجوم تھا۔

ابھی محمود کو اپنے ان دشمنوں سے جو مندر میں اس کا مقابلہ کررہے تھے نجات نہیں ملی تھی کہ قرب وجوار کے راجاؤں کی چالیس ہزار فوج نے پیچھے سے محمود کے لشکر پر حملہ کردیا۔ اب محمود کا لشکر چاروں طرف سے گھر گیا۔ آگے بھی فوج تھی اور پیچھے بھی اور دائیں بائیں سمندر لہریں مار رہا تھا۔ محمود نے سمجھ لیا کہ اس

معرکہ کا سر ہونا ناممکن ہے۔ اب محمود کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔
کہ وہ پلٹ کر اس عظیم الشان فوج پر پل پڑے جو پشت کی جانب سے محمود کے
لشکر کو کاٹتی چلی آرہی تھی۔ محمود کا پلٹ کر حملہ کرنا تھا کہ پشت کی فوج کے پاؤں
اُکھڑ گئے۔ اسکے بعد مندر کی فوج نے بھی ہمت ہار دی اور مندر میں لڑنے والے
سپاہی سمندر میں کودنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں محمود کا سومنات پر قبضہ ہو گیا۔

محمود نے مندر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے مندر کے بُت سومنات
کو توڑا۔ اس کے بعد مندر کی تمام دولت پر قبضہ جمایا۔ نیز نیرو والہ اور گجرات
کے دوسرے مقامات کے ان راجاؤں کی سرزنش کی جنہوں نے سومنات
کے معرکہ میں محمود کا مقابلہ کیا تھا۔ اور اس کے بعد محمود داب شلیم کو جو گجرات
کے راجہ کا بھائی تھا۔ گجرات کا حاکم مقرر کر کے غزنی واپس چلا گیا۔ غزنی جاتے
ہوئے اسے راستہ میں ایسی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جو اس سے
قبل محمود نے شاید اپنے کسی معرکہ میں بھی نہ اُٹھائی ہوں گی۔

سومنات کے حملہ کے بعد محمود نے ہندوستان پر آخری حملہ جاٹوں کی سرکوبی
کے لئے کیا تھا۔ جاٹوں کی سرکوبی سے فارغ ہو کر جب وہ غزنی پہنچا تو بیمار ہو گیا
چنانچہ ۴۲۱ ہجری مطابق ۱۰۳۰ء میں محمود کا اسی بیماری میں ۶۳ سال کی عمر
میں انتقال ہو گیا۔ محمود نے اپنے دورِ حکومت میں بے شمار مہمات میں حصہ لیا
تھا۔ جنمیں سے سترہ حملے صرف ہندوستان پر کئے تھے۔ ان سترہ حملوں میں
تقریباً تمام ان حملوں کی تفصیل ہم نے بیان کر دی ہے جن کا ہندوستان کی تاریخ
سے گہرا تعلق ہے۔

محمود غزنوی کے حملوں پر ایک نظر

محمود غزنوی نے اپنے دورِ حکومت
میں ہندوستان پر جتنے بھی حملے

ہیں ان سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس کا مقصد و منشا یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ محمد بن قاسم کی طرح ہندوستان کو فتح کرے بلکہ وہ اُن خطرات کو دُور کرنا چاہتا تھا جو اس کی حکومت کے لئے پنجاب کے راجہ کی جانب سے برابر پیدا ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اگر راجہ جے پال نے محمود اور اُس کے باپ سبتگین کے دورِ حکومت میں غزنی پر حملے کر کے پیش قدمی نہ کی ہوتی تو شاید سبتگین اور اس کا بیٹا محمود ہندوستان کی جانب رُخ بھی نہ کرتا۔

محمود کو ہندوستان کے مقابلہ میں مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی فتح کا زیادہ شوق تھا لیکن جے پال۔ انند پال۔ اور جے پال ثانی نے بار بار سبتگین اور محمود کو خواہ مخواہ چھیڑ کر اور بدعہدیاں کر کے انھیں ہندوستان پر جوابی حملے کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ان حملوں میں محمود اور اس کی فوج کو نگرکوٹ سے جو بے اندازہ دولت ملی تھی اس نے محمود کو مالامال کر دیا ممکن ہے کہ اس کے بعد محمود نے بعض حملے حصولِ دولت کے لئے بھی کئے ہوں لیکن اس دولت کی چاٹ لگانے والے بھی وہی ہندو راجہ تھے جنہوں نے سبتگین اور محمود کو ہندوستان کا راستہ دکھایا لیکن پھر بھی محمود نے کبھی بھی ہندوستان پر مستقل حکومت قائم کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ صرف آخر میں کاٹھیاواڑ کی عمدہ آب و ہوا نے محمود کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ وہ کاٹھیاواڑ میں بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کرے مگر اس کے امرا غزنی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئے چنانچہ اس کے بعد وہ ایسا غزنی گیا کہ پھر کبھی ہندوستان لوٹ کر نہ آسکا۔

محمود کی ہندو دشمنی کے افسانے ہندوستان کے متعصب مؤرخوں نے محمود کو ہندو قوم اور ہندو دھرم کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے۔ لیکن محمود کے کردار کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے۔

تو پتہ چلتا ہے کہ وہ نئی نئی فتوحات کا تو ضرور شائق تھا لیکن اسے کسی قوم یا مذہب سے کوئی عناد نہ تھا۔ اگر فی الحقیقت محمود ہندو راجاؤں یا ہندو عوام کا دشمن ہوتا تو کیا وہ ہندو راجاؤں کی بار بار شورش پسندیوں کے باوجود ہر تبہ ان کو اسی طرح معافیاں دیتا رہتا جس طرح کہ وہ دیتا رہا ہے۔ حالانکہ محمود کے پاس ان کو تہہ تیغ کرنے کا جواز خود انہی راجاؤں نے اپنی عہد شکنیوں اور بغاوتوں سے پیدا کر دیا تھا۔

محمود کو اگر محض اس لئے ہندوؤں کا دشمن کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کے ہندو راجاؤں کے خلاف بار بار یورشیں کی ہیں۔ اس سے زیادہ یورشیں محمود نے غزنی۔ ترکستان۔ بلخ۔ بخارا۔ سیستان۔ خراسان۔ غور۔ خوارزم اور دوسرے اسلامی علاقوں میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف کی ہیں۔ یہاں تک کہ اس نے تخت پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلی یورش خود اپنے چھوٹے بھائی امیر اسمٰعیل کے خلاف کی جسے اُس نے تخت سے اُتار کر خود تخت پر قبضہ جمایا اور ساری عمر بھائی کو قلعہ میں نظر بند رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ محمود غزنوی ایک باحوصلہ جرنیل تھا جس کو اپنی حکمرانی کے مقابلہ میں نہ کسی ہندو راجہ کی پرواہ تھی اور نہ مسلمان بادشاہ کی جو بھی اس کے مقابلہ پر آیا اُس سے وہ لڑا اور اسے نیچا دکھایا۔ ہمارا خیال ہے کہ جے پال انند پال جے پال ثانی اور ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کی بجائے اگر ہندوستان میں مسلمان بادشاہ بھی حکمراں ہوتے اور وہ ان راجاؤں کی طرح محمود کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور بد عہدیاں کرتے تو محمود ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا جو اُس نے ہندو راجاؤں کے ساتھ کیا ہے چنانچہ قرامطہ جو مسلمان بنتے تھے۔ محمود نے اُن کے ساتھ جو سخت سلوک کیا ہے۔ وہ سب پر عیاں ہے۔

محمود غزنوی اگر فی الحقیقت ہندوؤں کا دشمن ہوتا تو وہ کبھی بھی اپنے لشکر میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو سپاہی نہ بھرتی کرتا۔ اور ہندوستان میں ہندو عمال نہ مقرر کرتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ محمود غزنوی محض فتوحات کا شائق تھا اور اس پر فرقہ پرستی کا الزام لگانا کسی طرح بھی درست نہیں۔

محمود پر مندروں اور بتوں کے توڑنے کا الزام

محمود پر ایک سنگین الزام

یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ مندروں اور بتوں کا دشمن تھا۔ لیکن ان الزام لگانے والوں سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ نگر کوٹ کی مہم سے پہلے محمود ہندوستان کے خلاف پانچ حملے کرچکا تھا۔ اور اس سے قبل دو لڑائیاں اس کے باپ کے زمانہ میں پنجاب کے راجہ سے ہوچکی تھیں۔ ان پانچ سات حملوں میں اس نے نہ کسی مندر کو لوٹا اور نہ کسی بت کو توڑا۔ پھر سمجھ نہیں آتا کہ یکایک نگر کوٹ کی فتح کے بعد یہ "بت شکنی" کا مرض محمود میں کیوں پیدا ہوگیا۔ اور یہ مرض پیدا بھی اس وقت ہوا جب محمود کی فوج میں مسلمان سپاہیوں کے علاوہ ہندو سپاہیوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہوچکی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ محمود کے ہاتھوں نگر کوٹ۔ متھرا اور سومنات کے مندروں اور بتوں کے توڑنے کے جو واقعات رونما ہوئے ان کا تعلق بھی کسی فرقہ پرستی کے جذبہ سے نہیں تھا بلکہ پنڈتوں کی بے عقلی، فتنہ پردازی اور اغراض ہندوؤں کی جاسوسی نے محمود غزنوی کو مندروں کی جانب خاص طور پر متوجہ کردیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب نگر کوٹ کے مندر سے محمود کو بے پناہ دولت ہاتھ لگی ہو تو اسے مندروں کی دولت کی چاٹ پڑگئی ہو۔ اور اسی لئے اس نے متھرا اور سومنات پر بھی ہاتھ صاف کیا ہو یعنی محمود نے جو کچھ کیا وہ عام فطری اور انسانی

خواہش سے متاثر ہو کر کیا۔ اس کا محمود کے مذہبی جذبے یا فرقہ پرستی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ محمود کی جگہ اگر کوئی غیر مسلم بادشاہ ہوتا اور اس کو بھی مندروں کے خزانوں سے اسی طرح دولت ملی ہوتی تو وہ بھی فرشتہ بن کر اس دولت کو ہاتھ لگانے سے گریز نہیں کر سکتا تھا۔

مندروں کی دولت سے بھی کہیں زیادہ محمود کو جس چیز نے خاص طور پر مندروں کی جانب رُخ کرنے کے لئے مجبور کیا وہ یہ ہے کہ برہمنوں اور پنڈتوں نے بڑے بڑے مندروں کو محمود کے خلاف پروپگنڈے کا مرکز بنا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی حکمران بھی اس نوعیت کے مخالفانہ پروپگنڈے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ محمود کو بھی مخالفانہ پروپگنڈے کی روک تھام کے لئے چند خاص مندروں کی جانب رُخ کرنا پڑا۔ محمود کو اگر فی الحقیقت مندروں اور بُتوں سے نفرت ہوتی تو وہ متھرا کے ہزاروں مندروں میں سے صرف ایک دو کی جانب رُخ نہ کرتا بلکہ سب کو توڑ ڈالتا۔ اور اسی طرح پنجاب میں جہاں اسے سب سے زیادہ حملے کرنے پڑے وہ ایک بھی مندر نہ چھوڑتا۔ حالانکہ اس نے پنجاب کے کسی ایک مندر کو بھی کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے علاقوں کے مندروں کو بھی اس نے کبھی نہیں چھیڑا۔ صرف گنے چُنے اُن مندروں پر محمود نے ہاتھ ڈالا ہے جن میں کہ بے پناہ دولت پوشیدہ تھی، یا جو اس کے خلاف پروپگنڈے کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ محمود نہ بُت شکن تھا نہ ہندوؤں کا دشمن۔ اور نہ متعصب مُلّا۔ وہ صرف ایک اولوالعزم بادشاہ تھا۔ پس اس سے زیادہ وہ کچھ نہ تھا۔ لیکن ہم کو افسوس ہے کہ یورپین اور ہندوستان کے متعصب مورخوں نے اسکو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے تاکہ اسکے حالات پڑھنے سے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں برابر نفرت بڑھتی رہے۔

محمود غزنوی کی حکومت کا زوال

محمود کے مرتے ہی محمود غزنوی کے بیٹوں امیر مسعود اور امیر محمد میں تخت و تاج کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ امیر مسعود اور امیر محمد دونوں بالکل ہم عمر تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ امیر مسعود امیر محمد سے صرف چند گھنٹے پہلے پیدا ہوا تھا۔ امیر مسعود امیر محمد کے مقابلہ میں حکمرانی کی زیادہ قابلیت رکھتا تھا کیونکہ وہ محمود کے ساتھ مختلف معرکوں میں بے نظیر شجاعت اور فوجی قابلیت کا ثبوت دے چکا تھا۔ محمود غزنوی بھی ابتدا میں امیر مسعود سے بے حد خوش تھا اور اسے ولی عہد بھی مقرر کر دیا تھا لیکن امیر محمد کی سازشوں نے جلد ہی محمود غزنوی کو امیر مسعود سے بدظن کر دیا چنانچہ آخر عمر میں محمود غزنوی نے امیر مسعود کو ولیعہدی سے ہٹا کر امیر محمد کی ولیعہدی کا اعلان کر دیا تھا۔

جب محمود غزنوی کا انتقال ہوا تو اس کا بڑا بیٹا امیر مسعود اصفہان میں تھا اور امیر محمد گرگان میں تھا۔ امیر محمد فوراً گرگان سے غزنی پہنچا اور باپ کی جگہ تخت نشین ہو گیا لیکن اُمرائے سلطنت زیادہ تر امیر مسعود کی جانب مائل تھے چنانچہ پنجاب کا گورنر امیر ایاز جب محمود کے انتقال کی خبر سُن کر لاہور سے غزنی آیا تو اس نے تقریباً تمام اُمرا اور غلاموں کو اس چیز کے لئے آمادہ کر لیا کہ امیر محمد کو معزول کر دیا جائے اور اس کی جگہ امیر مسعود کو تخت پر بٹھا دیا جائے بس پھر کیا تھا قاصد پر قاصد غزنی سے امیر مسعود کے پاس دوڑنے لگے۔ ادھر امیر مسعود نے بھی امیر محمد کے خلاف فوج کشی کی پوری طرح تیاریاں کر لیں۔ اور ایک بڑی فوج لیکر ۱۳ جمادی الاول ۴۲۲ھ (۱۰۳۱ء) کو بلخ سے غزنی کی جانب

روانہ ہو گیا۔ دونوں بھائیوں کی فوجوں میں غزنی کے قریب جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں امیر مسعود کو فتح حاصل ہوئی۔ امیر محمدؔ گرفتار ہو گیا جسے امیر مسعود نے اندھا کر کے ایک قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ اور غزنی کے تخت پر خود بیٹھ گیا۔ امیر محمدؔ کی سلطنت صرف پانچ مہینے رہی۔ اس کے بعد امیر محمدؔ نے نو برس قید میں گذارے لیکن آخر میں ایک سال کے لئے اُسے پھر حکومت حاصل ہو گئی تھی۔

سلطان مسعود کا دورِ حکومت

سلطان مسعود نے غزنی کے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ہندو فوج کے سپہ سالار سوندرائے کو محض اس جرم میں معزول کر دیا۔ کیونکہ سوندرائے امیر محمدؔ کا حامی تھا۔ سوندرائے کی معزولی کے بعد یہ عہدہ جگ ناتھ کے سپرد کیا گیا۔ اس کے بعد سلطان محمود نے ہندوستان کے معاملات کی جانب توجہ کی۔ مسعود کو ہندوستان سے اطلاع ملی کہ قلعہ سرسوتی والوں نے کچھ مسلمان سوداگروں کو لوٹ کر اُن کو اس قلعہ میں قید کر دیا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی مسعود نے ایک بڑا لشکر لیکر ۴۲۴ھ (۱۰۳۳ء) میں قلعہ سرسوتی پر حملہ کر دیا۔ یہ قلعہ کشمیر کے کسی درہ میں تھا۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ اور ان مسلم سوداگروں کو جو اس قلعہ میں قید تھے رہائی مل گئی۔ یہ سلطان مسعود کا ہندوستان پر پہلا حملہ تھا۔ اس حملہ کے بعد سلطان مسعود پنجاب کے انتظام کی جانب متوجہ ہوا۔

پنجاب کے جدید انتظام کی ضرورت اس لئے پیش آئی۔ کیونکہ سلطان مسعود نے پنجاب کے گورنر امیر ایاز کو جس کی کوششوں سے اسے غزنی کا تخت ملا تھا۔ اپنی مصاحبت میں رکھ لیا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں پنجاب کا جدید انتظام نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ سلطان مسعود نے احمد نیالتگین کو تو ہندوستان کی سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور کیا اور قاضی شیراز کو عہدہ

تفضادیکر تمام مالی اور اندرونی انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ احمد نیا لتگین نے اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوتے کے ساتھ ہی قنوج۔ کالنجر اور تمام ماتحت ہندو ریاستوں سے خراج وصول کیا اور بنارس وغیرہ کے فتح کرنے کے بعد حکومتِ غزنی کے مقبوضات کو بڑھاتا رہا۔ لیکن قاضی شیراز جو احمد نیا لتگین کا شدید مخالف اور ہندوستان میں غزنوی مقبوضات کا واحد گورنر تھا۔ برابر جھوٹی شکایتیں کر کے سلطان مسعود کو احمد نیا لتگین کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے مسعود کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ عنقریب احمد نیا لتگین علم بغاوت بلند کرنے والا ہے۔

سلطان مسعود نے قاضی شیراز کی باتوں کے فریب میں آ کر جگ ناتھ نامی سپہ سالار کو ہندو فوج کے ساتھ احمد نیا لتگین کی گرفتاری اور سرکوبی کے لئے ہندوستان بھیجدیا جس نے ہندوستان پہنچتے ہی تحقیقِ حال کئے بغیر احمد نیا لتگین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ احمد نیا لتگین کو مجبوراً مقابلہ کرنا پڑا اس مقابلہ میں جگ ناتھ مارا گیا۔ جگ ناتھ کی موت نے مسعود کو احمد نیا لتگین کی بغاوت کا یقین دلا دیا۔ چنانچہ مسعود نے دوبارہ تلک نامی ایک ہندو کو سپہ سالاری کا عہدہ دیکر نیا لتگین کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ تلک ایک نائی کا لڑکا تھا۔ جسے غزنی کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ تلک نے ہندوستان آنے کے بعد بڑی عیاری کے ساتھ احمد نیا لتگین کو قتل کر دیا۔

سلطان مسعود کا ہندوستان پر حملہ

ہندوستان سے غزنی واپس جانے کے بعد تلک نے سلطان مسعود کو ترغیب دی کہ وہ قلعہ ہانسی کو ضرور فتح کرے کیونکہ یہ قلعہ مسلمانوں کے خلاف شورش کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا ہے۔ مسعود تلک کے کہنے پر اس حملہ کے لئے

آمادہ ہو گیا۔ مگر اُمرائے سلطنت نے اس حملہ کی شدید مخالفت کی۔ کیونکہ اُس زمانہ میں سلجوقیوں نے بڑا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اور یہ اندیشہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں خراسان۔ ماوراالنہر اور خوارزم کے علاقے سلطنت غزنی کے قبضے سے نہ نکل جائیں۔ چنانچہ اُمرا نے سلطان مسعود سے التجا کی کہ "ایسے نازک وقت میں جبکہ غزنی میں آپ کا رہنا ضروری ہے۔ آپ کا ہندوستان کی جانب رُخ کرنا کسی طرح درست نہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ آپ کی غیر موجودگی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے سلجوقی تمام ملک پر چھا جائیں اور پھر ان کا نکالنا ناممکن ہو جائے"۔

سلطان جو ہندوستان جانے کے لئے بے چین تھا اس نے کسی کی بات نہ مانی چنانچہ ۴۲۹ھ (۱۰۳۸ء) میں اس نے دریائے جہلم پار کر کے اور قلعہ ہانسی کے سامنے پہنچ کر فصیل قلعہ کے نیچے قیام کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر کے فتح کر لیا۔ اس کے بعد سونی پت پر لشکر کشی کر کے وہاں کے راجہ کو زیر کیا۔ پھر وہاں سے لاہور آیا۔ جہاں اس نے اپنے بیٹے مجدود کو چھوڑ کر امیر ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کیا اور اس کے بعد غزنی واپس چلا گیا۔

غزنی پہنچنے کے بعد اسے پتہ چلا کہ سلجوقی سارے ملک میں چھا چکے ہیں سلطان مسعود نے ملک کو سلجوقیوں سے نجات دلانے کے لئے کئی معرکہ کی لڑائیاں لڑیں لیکن سلجوقی برابر حاوی ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخری شکست کے بعد مسعود کے غزنی سے پاؤں اُکھڑ گئے۔

سلطان مسعود کی ہندوستان کو ہجرت

سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی شورشوں اور بغاوتوں سے پریشان ہو کر سلطان مسعود نے غزنی سے ہندوستان ہجرت کرنے کا فیصلہ

کر لیا اور یہ طے کیا کہ وہ لاہور کو دار السلطنت قرار دینے کے بعد ہندوستان کی حکومت کو مضبوط بنائے گا۔ اور ہندوستان سے لشکر جمع کرنے کے بعد غزنی اگر سلجوقیوں کی اچھی طرح سرکوبی کرے گا۔

غزنی کے امیروں اور سرداروں نے ہر چند کوشش کی کہ سلطان مسعود ہندوستان ہجرت نہ کرے بلکہ غزنی میں رہ کر ہی سلجوقیوں کا مقابلہ کرے۔ لیکن سلطان مسعود نے کسی ایک کی نہ سنی۔ بلکہ اُس نے تمام مال اور خزانوں کو ہندوستان بھیجنے کے لئے اونٹوں پر بار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ہندو فوج کی نگرانی میں تین ہزار اونٹ۔ سونا۔ چاندی اور جواہرات سے لادھ کر اس نے ہندوستان کی جانب روانہ کر دیئے۔ تمام اعزا۔ اقارب اور اہل و عیال بھی اس ہجرت میں مسعود کے ساتھ تھے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے اندھے بھائی امیر محمد کو بھی قید خانہ سے نکلوا کر ساتھ لے لیا تھا۔

سلطان مسعود کی بدقسمتی کہ جوں ہی یہ قافلہ دریائے جہلم کے کنارے پہنچا تو ہندو لشکر نے خزانہ کے لوٹنے کے لالچ میں بغاوت کر دی اور سارا خزانہ لوٹ لیا اور سلطان مسعود کو گرفتار کرنے کے بعد اس کے اندھے بھائی امیر محمد کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ مسعود کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ امیر محمد کے بیٹے احمد کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

سلطان مسعود کی اس ناکام ہجرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تمام مال و دولت جو محمود غزنوی مختلف معرکوں میں ہندوستان سے غزنی لے گیا تھا۔ نہ صرف یہ ساری دولت ہندوستان واپس آ گئی۔ بلکہ اس کے سود میں وہ دولت بھی ہندوستان چلی آئی جو محمود نے ہندوستان کے علاوہ دوسرے معرکوں میں جمع کی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کسی ایک شخص کے پاس نہ رہی بلکہ ہندو

سپاہیوں میں بٹ گئی۔

امیر مودود کا باپ کے انتقام کیلئے ہندوستان پر حملہ

سلطان مسعود کی اس بے کسانہ موت نے مسعود کے بیٹے امیر مودود کو جو اس وقت بلخ میں تھا۔ بے حد مشتعل کردیا۔ امیر مودود بلخ سے غزنی پہنچا اور غزنی سے لشکر جمع کرنے کے بعد اپنے چچا امیر محمد اور اس کے بیٹے احمد سے انتقام لینے کے لئے ہندوستان کی جانب روانہ ہوگیا۔ جہلم کے قریب امیر مودود اور امیر محمد میں جو اب سلطان محمد بن گیا تھا سخت مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں امیر محمد اور مسعود کا قاتل احمد دونوں مارے گئے۔

اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد مودود نے اپنے بھائی مجدود پر بھی جو لاہور میں امیر ایاز کی زیر نگرانی فرمانروائی کر رہا تھا حملہ کرنا چاہا لیکن جب مجدود اور ایاز بھی مقابلہ کے لئے تیار ہوگئے تو مودود غزنی واپس چلا گیا لیکن ایک سال کے بعد ۴۳۳ھ میں مودود ایک بڑا لشکر لے کر دوبارہ لاہور پر حملہ آور ہوا۔ ابھی دونوں لشکروں میں مقابلہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۹ ذی الحجہ ۴۳۳ھ (۱۰۴۲ء) کو مجدود نہایت ہی پراسرار طریقہ پر اپنے خیمہ کے اندر مردہ پایا گیا۔ اور ایاز بھی اچانک مرگیا جس کے بعد پنجاب کا سارا ملک بغیر لڑے ہوئے مودود کے قبضہ میں آگیا۔

پنجاب سے فارغ ہونے کے بعد مودود غزنی لوٹ گیا۔ جہاں سلجوقیوں نے شدید ہنگامے برپا کر رکھے تھے۔ جب ہندوستان کے راجاؤں نے یہ دیکھا کہ غزنی کی حکومت کمزور ہوچکی ہے تو ان سب نے ایک ایک کرکے اپنی خودمختاری کا اعلان کرنا شروع کردیا۔ اُدھر امیر مودود غزنی پہنچنے کے بعد اس طرح سلجوقیوں کے جھگڑوں میں اُلجھا کہ وہ مرتے دم تک ہندوستان واپس نہ آسکا۔ غرضیکہ ۴۴۱ھ

(۱۰۵۰ء) میں مودود درد قولنج میں مبتلا ہونے کے بعد ۳۹ سال کی عمر میں ۹ سال حکومت کرنے کے بعد رحلت کر گیا۔

محمود غزنوی کے خاندان کا زوال

اگر بغور دیکھا جائے تو محمود غزنوی کی سلطنت کا زوال تو محمود غزنوی کی موت کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی امیر مودود تک حکومت غزنی اور اس کے ہندوستانی مقبوضات کسی نہ کسی حد تک قائم رہے لیکن امیر مودود کے مرنے کے بعد غزنوی خاندان کا زوال اس تیزی کے ساتھ شروع ہوا کہ مختصر سے عرصہ میں غزنوی حکومت کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

امیر مودود کے مرنے کے بعد تین مہینے علی بن مسعود نے حکومت کی اُس کے بعد چار سال عبدالرشید بن مسعود نے حکومت کی۔ اس کے بعد فرخ زاد بن مسعود چھ سال تک حکمراں رہا۔ اس کے بعد ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا جس نے کہ سلجوقیوں سے صلح کرنے کے بعد کئی بار ہندوستان پر حملے کئے۔ اُس نے ہندوستان کے سرکشوں کو اچھی طرح سے دبایا بعض کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا اور بعض کو اس نے قتل کر دیا۔ سیاوش گرد عرف چنڈی کا قلعہ فتح کیا۔ اجودھن یعنی پاک پٹن فتح کر کے وہاں کی بغاوتوں کو اس نے دبایا۔

جب ابراہیم بن مسعود ۴۸۱ھ میں فوت ہو گیا تو اس کا بیٹا مسعود بن ابراہیم تخت نشین ہوا جس نے سولہ سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ارسلان شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ارسلان شاہ کا بھائی بہرام شاہ جب سلطان سنجر سلجوقی کی مدد سے ارسلان شاہ کو معزول کر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ تو ارسلان شاہ بھاگ کر ہندوستان آ گیا۔ اور ایک بڑا لشکر لے کر بہرام شاہ

کی مخالفت میں غزنی پر چڑھائی کر دی مگر بہرام شاہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بہرام شاہ نے ہندوستان پر بھی حملے کئے تھے اور یہاں کے باغیوں کو پوری طاقت کے ساتھ دبایا تھا۔

بہرام شاہ کی وفات کے بعد ۵۴۷ھ میں اس کا بیٹا خسرو شاہ تخت نشین ہوا جو علاء الدین حسین غوری کے مقابلہ سے فرار ہو کر لاہور چلا آیا تھا۔ اور لاہور آ کر ۵۵۵ ہجری میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا جس کو سلطان شہاب الدین غوری پنجاب سے گرفتار کر کے ۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۵ء میں غزنی لے گیا تھا۔ یہ غزنی خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔

خاندان غزنی کے زوال کے وقت ہندوستان کی حالت

محمود غزنوی کی وفات کے وقت پنجاب۔ ملتان اور سندھ کے اکثر علاقے سلطنت غزنی کے جزو بن چکے تھے۔ گجرات۔ مالوہ۔ اجمیر۔ دلی۔ بہاین۔ بلند شہر۔ قنوج۔ متھرا میرٹھ گوالیار۔ کالنجر اور دوسری بے شمار ہندوستانی ریاستیں غزنی کو باقاعدہ خراج ادا کرتی تھیں۔ سلطان مسعود کے زمانہ میں سونی پت اور بنارس کے رہے سہے علاقے بھی باجگذار بنا لئے گئے تھے لیکن سلطان مسعود کی غزنی سے ہندوستان کو ہجرت۔ اور غزنی کے خزانہ کی بربادی نے ہندوستانی ریاستوں میں پھر بغاوت کی لہر پیدا کر دی۔ جو امیر مودود کی وفات کے بعد کھلم کھلا منظر عام پر آ گئی چنانچہ دلی کے راجہ اننگ پال نے یہ دیکھتے ہوئے کہ غزنی کی مرکزی حکومت کمزور ہو چکی ہے۔ غزنی کے تمام باجگذار راجاؤں کو دہرم کے نام پر حکومت غزنی کے خلاف بغاوت کے لئے ابھارا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نگر کوٹ اور دلی کے

علاقے حکومت غزنی سے نکل گئے۔ لیکن بعد میں دہلی کے علاقے پر پھر غزنوی اقتدار چند روز کے لئے قائم ہو گیا تھا۔ مگر ۴۶۳ھ ہجری میں ہندوؤں نے پھر زور پکڑ کر تھانیسر اور ہانسی وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

سلطان ابراہیم نے ۴۶۵ھ میں دوبارہ ان علاقوں کو فتح کر لیا۔ اور ہندو راجاؤں سے خراج بھی وصول کیا۔ پنجاب اور سندھ کے علاقے بدستور حکومت غزنی کا جزو بنے رہے۔ لیکن وہاں بھی چھوٹی موٹی بغاوتیں برابر رونما ہوتی رہیں۔ ادہر بنارس کے راجہ چندر دیو نے ۴۸۱ھ میں قنوج پر حملہ کر کے قنوج کے سابق راجہ کنور رائے کے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دیا۔ اور قنوج پر قبضہ جما لیا۔ غرضکہ خاندان غزنی کے زوال کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی کی سی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ اور ہر جگہ بغاوتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ صرف پنجاب اور سندھ میں یہ وبا کسی حد تک کم تھی اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ جب غزنی کا مرکز ہی کمزور ہو چکا تھا۔ تو اس نوعیت کی شورشوں اور بغاوتوں کا اٹھ کھڑا ہونا بالکل قدرتی ہے۔

چھٹا باب

سلطان شہاب الدین غوری کی حکومت

۵۷۱ھ تا ۶۰۲ھ

۱۱۷۵ء - ۱۲۰۶ء

سلطان شہاب الدین غوری کی حکومت

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ محمد بن قاسم نے کن حالات میں ۹۳ھ (۷۱۲ء) میں سندھ پر حملہ کیا تھا اور محمد بن قاسم کی قائم کردہ اسلامی حکومت کس طرح زمانہ دراز تک علاقہ سندھ میں فرمانروائی کرتی رہی ہے۔ محمد بن قاسم کا دور ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا پہلا دور تھا جو کئی صدی تک قائم رہا۔

محمد بن قاسم کی قائم کردہ حکومت کے بعد ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا دوسرا دور سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے شروع ہوتا ہے۔ ان حملوں کی تفصیلات پر غائر نظر ڈالنے کے بعد یہ چیز صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ محمود غزنوی کے حملے محمد بن قاسم کی جنگی سرگرمیوں سے بالکل مختلف تھے۔ محمد بن قاسم کا منشا تو یہ تھا کہ وہ سندھ اور ہندوستان میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم کرے اس کے برخلاف محمود غزنوی کے حملوں کا منشا اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ محمود اپنی پڑوسی حکومت یعنی حکومتِ پنجاب کے خطرات سے بے نیاز ہو جانا چاہتا تھا۔ اور اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے راجاؤں کو اپنا باجگذار بنانے کے بعد ان کی جانب سے بے فکر ہو جائے۔

لیکن آخری دورِ حکومت میں محمود اور اس کے جانشینوں نے بھی یہ ضروری سمجھا کہ پنجاب اور سندھ کے علاقوں کو باقاعدہ حکومت غزنی کے ساتھ ملحق کر لیا جائے چنانچہ غزنی کے آخری بادشاہوں نے لاہور کو اپنا دار السلطنت بنا لیا تھا۔ اور ان کے آخری جانشین خسرو ملک کو شہاب الدین غوری لاہور سے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

غزنوی دورِ حکومت کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا تیسرا دور شہاب الدین غوری سے شروع ہوتا ہے۔ شہاب الدین غوری اور محمد بن قاسم کے ارادوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جس طرح محمد بن قاسم سندھ میں اور ہندوستان میں ایک مضبوط اسلامی حکومت کے قیام کا خواہشمند تھا بالکل اسی طرح شہاب الدین غوری بھی یہ چاہتا تھا کہ وہ ہندوستان میں ایک نہایت ہی مستحکم اسلامی حکومت قائم کر دے چنانچہ محمد غوری نے محمود غزنوی کی طرح محض ہندو راجاؤں کو باجگذار بنانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ہندوستان میں اپنے عمال مقرر کر کے غوری حکومت کو برابر وسعت دیتا چلا گیا۔ اس نے صرف صوبہ سندھ پنجاب اور شمالی ہند پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اس کی فتوحات کا وسیع دائرہ بنگال تک پھیل چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم ہندوستان میں شہاب الدین غوری کی فتوحات پر تبصرہ کریں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ شہاب الدین غوری کے آبا و اجداد کون تھے اور ان کی جنگی سرگرمیاں کب سے شروع ہوئیں۔

شہاب الدین غوری کے آبا و اجداد

شہاب الدین غوری کا سلسلۂ نسب غور کے رئیس شنسب بن حریق سے ملتا ہے جو ابتدا میں بت پرست تھا لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہ کے دورِ حکومت میں اس نے اسلام قبول کر لیا تھا شنسب بن حریق سے جو نسل چلی وہ شنسبی کہلائی۔ انہی میں لودھی اور سوری پٹھان بھی شامل ہیں۔ چنانچہ محمد بن سوری حاکم غور جس نے کہ قرامطہ کا آلۂ کار بن کر محمود غزنوی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ وہ بھی اسی شنسبی نسل سے تھا اور شہاب الدین غوری کے آباو اجداد میں سے تھا۔

محمد بن سوری کی شکست اور خودکشی کے بعد محمود غزنوی نے اس کے بیٹے امیر ابوعلی کو غور کی حکومت پر اس لئے فائز کر دیا تھا کہ وہ قرامطہ کے معاملہ میں اپنے باپ کی ضد تھا یعنی اس کو بھی محمود غزنوی کی طرح قرامطہ سے نفرت تھی۔ امیر ابوعلی کے بعد اس کا بھائی شیث غور کے تخت پر بیٹھا۔ پھر شیث کا بیٹا امیر عباس حاکم ہوا۔ اس کے بعد امیر محمد بن امیر عباس نے تخت سنبھالا۔ پھر امیر محمد کا بیٹا قطب الدین حسن غور کا حکمراں ہوا۔ اس کے بعد قطب الدین کا بیٹا عزالدین حسن غور کے تخت پر بیٹھا۔

امیر عزالدین حسن نے یہ دیکھتے ہوئے کہ غزنی کی حکومت کمزور ہو گئی ہے سلطان سنجر سلجوقی کی مدد سے حکومتِ غور کی خود مختاری کا اعلان کر دیا جس کو غزنی کے سلطان مسعود بن ابراہیم کو بادلِ ناخواستہ گوارا کرنا پڑا۔ اس آزادی کے اعلان کے بعد ہی سے سلطنتِ غور کا عروج شروع ہوا لیکن یہ سب کے سب اپنے مورثِ اعلیٰ محمد بن سوری کی طرح مذہب قرامطہ کے پیرو تھے۔ عزالدین حسن جس نے کہ حکومتِ غور کی خود مختاری کا اعلان کر کے اس حکومت کی بنیادیں مستحکم کیں۔ شہاب الدین غوری کا دادا تھا۔

امیر عزالدین جب مرا تو اس کے سات بیٹے تھے جو سب کے سب جیّد تھے۔ عزالدین کے مرنے کے بعد غور کی حکومت جو کافی وسیع ہو چکی تھی۔ اسکے بڑے بیٹے سیف الدین سوری کو ملی لیکن اس نے اپنی حکومت کو اپنے دوسرے چھ بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ جن کے نام یہ ہیں۔ شہاب الدین غوری کا باپ بہاءالدین سام قطب الدین محمد۔ علاءالدین حسین۔ شجاع الدین۔ شہاب الدین محمد۔ فخرالدین مسعود۔ غرضکہ سیف الدین سوری نے اپنے ان سب بھائیوں میں حکومت کے مساوی حصے تقسیم کر دیے۔

ان سب بھائیوں میں اگرچہ بے حد محبت تھی لیکن ایک بھائی قطب الدین محمد دوسرے بھائیوں سے خفا ہو کر غزنی کے سلطان بہرام شاہ مسعود کے پاس چلا گیا تھا۔ بہرام شاہ نے اس کو سازش کے شبہ میں قتل کرا دیا تھا قطب الدین کا قتل ہونا تھا کہ تمام غوری بھائیوں میں بہرام شاہ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ امیر سیف الدین والئی غور ایک بڑا لشکر لے کر غزنی پر حملہ آور ہوا بہرام شاہ کو شکست ہو گئی اور وہ غزنی چھوڑ کر ہندوستان بھاگ گیا اور اس طرح امیرانِ غور کا غور کے علاوہ غزنی پر بھی قبضہ ہو گیا۔ بہرام شاہ ہندوستان سے فوج جمع کرنے کے بعد دوبارہ غزنی پہنچا اور غزنی پر حملہ کر دیا سیف الدین جب مقابلہ پر آیا تو سیف الدین کی فوج نے جو غزنی کے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس سے غداری کر کے اسے گرفتار کرا دیا۔ بہرام شاہ نے سیف الدین کی خوب تذلیل کر کے اسے بڑی بے دردی سے قتل کرایا۔ اور غزنی پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔

بہرام کے ہاتھوں قطب الدین کے قتل کے بعد دوسرے بھائی سیف الدین سوری کے قتل کی افسوسناک اطلاع سن کر شہاب الدین غوری کا باپ بہا رالدین سام آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ فوراً بہرام شاہ کے مقابلہ کے لئے غزنی روانہ ہو گیا لیکن ابھی راستہ ہی میں تھا کہ فوت ہو گیا۔ تین بھائیوں کی پے درپے موت نے علاء الدین حسن کو بُری طرح مشتعل کر دیا۔ چنانچہ علاء الدین حسن ایک جرار لشکر لیکر غزنی پر پل پڑا۔ بہرام شاہ نے ہندی لشکر کے ذریعہ مقابلہ کیا مگر اسے شکست پر شکست ہوئی اور بہرام شاہ غزنی کا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ علاء الدین حسن جو غصہ سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے غزنی میں داخل ہو کر سات شبانہ روز قتلِ عام کرایا۔ شہر میں آگ لگا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ غرضکہ غزنی کا کوئی گھر جلنے سے اور کوئی خاندان قتل ہونے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اسی لئے

علاء الدین کو "جہاں سوز" کہتے ہیں۔ علاء الدین جہاں سوز ایک معرکہ میں سلطان سنجر کے ہاتھ بھی گرفتار ہو گیا تھا جس نے چند روز کے بعد علاء الدین کو رہا کر دیا تھا۔ علاء الدین حسن جو پہلے ہی سے مذہب قرامطہ کا پیرو تھا جب حسن بن صباح کی جماعت ملاحدہ نے اسے دعوت دی تو وہ ملاحدہ کی جماعت میں بھی شامل ہو گیا۔

علاء الدین حسن جہاں سوز کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت پر بیٹھا سیف الدین محمد ایک نہایت ہی سچا اور با خدا حکمراں تھا جس کو کہ قرامطہ اور ملاحدہ سے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ وہ ملاحدہ کی سازش کے ماتحت اپنے ہی سپہ سالار ابو العباس شیش کے ہاتھوں دھوکہ سے اس وقت قتل ہوا جبکہ وہ ترکان غز کے خلاف معرکہ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہا تھا سیف الدین کے مقتول ہونے پر غوری کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور غوریوں کو ترکان غز کے مقابلہ میں شکست ہو گئی۔ سیف الدین محمد جس کو کہ ابو العباس شیش نے قتل کیا تھا سلطان شہاب الدین غوری کا چچا زاد بھائی تھا۔

غیاث الدین کی تخت نشینی

سیف الدین محمد کے قتل کے بعد سپہ سالار ابو العباس شیش نے بہاء الدین سام کے بڑے بیٹے شمس الدین کو یعنی شہاب الدین غوری کے بڑے بھائی کو غیاث الدین کے لقب کے ساتھ تخت نشین کیا۔ غیاث الدین کی تخت نشینی سے فارغ ہونے کے بعد منتشر لشکر کو فراہم کر کے ابو العباس نے ترکان غز کو شکست دی لیکن غیاث الدین کی حیثیت ایک کٹھ پتلی بادشاہ سے زیادہ نہ تھی سپہ سالار ابو العباس شیش اس پر بالکل حاوی تھا حقیقت میں اصل بادشاہ شیش ہی تھا۔

شہاب الدین غوری جو اس زمانہ میں بامیان میں تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا بڑا بھائی تخت نشین ہو چکا ہے۔ اور سپہ سالار ابو العباس شیش نے

اسے کٹ پتلی بنا رکھا ہے تو وہ فوراً بھائی کے پاس فیروزہ کوہ پہنچا اور دونوں بھائیوں نے مل کر سپہ سالار ابوالعباس شیش کے پنجہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے تدبیریں شروع کر دیں۔ ادھر ابوالعباس شیش بھی غیاث الدین سے بدظن ہو چکا تھا چونکہ غیاث الدین بھی اپنے چچا زاد بھائی اور بشیر وسیف الدین کی طرح قرامطہ اور حسن بن صباحی ملاحدہ کا شدید دشمن تھا۔ چنانچہ ابوالعباس شیش نے غیاث الدین کے خلاف غور کے لوگوں میں شورش پیدا کر دی لیکن شہاب الدین غوری نے جرأت سے کام لیکر سپہ سالار ابوالعباس شیش کو سر دربار قتل کرا دیا اور اس طرح وہ سارے فتنے دب گئے جو حکومت غور کے خلاف ابوالعباس شیش اور اس کے حواریوں اور قرامطہ نے کھڑے کر رکھے تھے۔

ایک ملک میں دو بادشاہ

کہتے ہیں ایک میان میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن غور کے سلطان غیاث الدین نے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین غوری کو اپنی حکومت میں برابر کا شریک کر کے اس قول کو غلط ثابت کر کے دکھا دیا غیاث الدین سے پہلے اس کے باپ اور چچاؤں میں بھی ایسا ہی اتحاد تھا کہ یہ سب بھائی ایک دوسرے پر جان قربان کرتے تھے۔ اور انھوں نے اپنی حکومت کو ساتوں بھائیوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ چنانچہ جب غیاث الدین تخت پر بیٹھا تو اس نے بھی اپنے باپ بہاء الدین سام اور اپنے چچاؤں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین غوری کو اپنی حکومت میں برابر کا شریک کر لیا۔ غیاث الدین نے ابتدا میں تو شہاب الدین غوری کو تگین آباد اور گرم سیر کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا۔ لیکن بعد کو ۵۶۹ھ میں غزنی کو فتح کرنے کے بعد بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شہاب الدین غوری کو معز الدین کے لقب کے ساتھ

غزنی کے تخت پر بٹھادیا۔ بھائی کی تخت نشینی سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود اپنے دارالسلطنت فیروزہ کوہ میں واپس چلا گیا اور ان علاقوں کے انتظام میں مصروف ہوگیا جو اس نے اپنی حکومت کے لئے رکھ لئے تھے۔

ان دونوں بھائیوں میں ساری عمر ایسا اتفاق اور یکجہتی رہی کہ اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ شہاب الدین اپنے علاقہ کا با اختیار بادشاہ بھی تھا اور بڑے بھائی کا اطاعت گذار ماتحت بھی۔ اس نے ساری عمر اپنے بڑے بھائی کا پوری طرح احترام کیا۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی فوجی سرگرمیوں کے لئے علحدہ علحدہ میدان تجویز کر لئے تھے۔ چنانچہ بڑا بھائی غیاث الدین ملک کے اندرونی نظام کی درستی اور بغاوتوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے ترکانِ غز کو اپنا مطیع بنایا۔ اُمرائے سنجر کو شکست دیکر ہرات و بلخ وغیرہ کا علاقہ فتح کیا۔ اور خوارزم شاہی حکومت کو شکست دیکر اپنے قدموں میں جھکا لیا۔ اس کے علاوہ حسن بن صباحی ملاحدہ کی خوب سرکوبی کی۔ اسی دوران میں چھوٹا بھائی شہاب الدین غوری ہندوستان میں فتوحات حاصل کرتا رہا۔ غرضکہ ان دونوں نے اپنی جنگی سرگرمیوں کے لئے علحدہ علحدہ جو میدان تجویز کر لئے تھے۔ اس میں ان کو بے اندازہ کامیابی حاصل ہوئی۔ سلطان غیاث الدین ۴۳ سال حکومت کر کے بعمر ۶۳ سال ۵۹۹ھ ہجری (۱۲۰۳ء) میں فوت ہوگیا۔ بھائی کے مرنے کے بعد شہاب الدین غوری ساری حکومت کا واحد فرمانروا بن گیا۔ شہاب الدین غوری نے اپنے دورِ حکومت میں جو بے نظیر جنگی فتوحات حاصل کی ہیں۔ ان کا اندازہ اس تاریخ کے مندرجہ ذیل واقعات سے ہوسکتا ہے۔

سلطان شہاب الدین غوری کے حملہ سے پہلے ہندوستان کی حالت

شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر سب سے پہلا حملہ ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۵ء میں کیا تھا لیکن اس حملہ سے قبل اور حکومتِ غزنی کے زوال کے بعد ایک سو سال کا عرصہ ہندوستان میں ایسا گزرا جس پر تاریخی لحاظ سے تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن پھر بھی اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس درمیانی عرصہ میں ہندوستان کی حکومتوں میں اہم سیاسی انقلابات رُونما ہوتے رہے ہیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ راجپوت راجہ جو پہلے طاقتور تھے بہت کمزور ہو گئے۔ اور وہ کمزور راجپوت راجہ جن کو غزنوی دورِ حکومت میں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ انھوں نے غزنوی حکومت کے زوال کے بعد خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ یہ تو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ حکومتِ غزنی کے زوال کے بعد پنجاب اور سندھ کو چھوڑ کر باقی تمام شمالی ہند کے راجاؤں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اب ہم کو یہ بتانا ہے کہ شہاب الدین غوری کے حملہ سے قبل ہندوستان میں کون کونسی اہم حکومتوں نے اُبھرنے کے بعد خود مختارانہ حیثیت سے فرمانروائی شروع کر دی تھی۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ سنہ ۴۸۳ھ میں بنارس کے راجہ چندر دیو راٹھور نے قنوج کے راجہ کنور رائے کی اولاد کو اس جرم میں قتل کر ڈالا تھا کیونکہ کنور رائے کی اولاد حکومتِ غزنی کی اطاعت شعار تھی۔ چنانچہ کنور رائے کی اولاد کو قتل کرنے کے بعد راجہ چندر دیو نے قنوج میں راٹھور خاندان کی حکومت قائم کر دی تھی۔ اسی راٹھور خاندان کا راجہ جے چند شہاب الدین غوری کے حملہ کے وقت قنوج پر حکومت کر رہا تھا اور یہ اپنے آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ تصور کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ہندوستان کے تمام راجہ اپنے آپ کو اس کا باجگزار تصور کریں۔

اسی زمانہ میں قنوج کے راجہ جے چند کے علاوہ دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کا بھی بڑا دور دورا تھا اور اس کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کا سب سے

بڑا راجہ ہے۔ اور اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ ہندوستان کے دوسرے تمام راجہ اس کے اطاعت گذار بن کر رہیں۔ چونکہ قنوج اور دہلی دونوں حکومتوں کے راجاؤں میں برتری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس لئے ان دونوں میں اَن بَن رہتی تھی۔ اور یہ اَن بَن اس قدر تک بڑھ گئی کہ جب قنوج کے راجہ جے چند نے اپنی راجکماری سنجوگتا کا سوئمبر کیا۔ تو پرتھوی راج کی تذلیل کی خاطر اس کا بُت بنوا کر دربان کی جگہ کھڑا کر دیا۔ لیکن پرتھوی راج جس کو سنجوگتا سے محبت تھی۔ سنجوگتا کو بھرے مجمع میں سے اُٹھا کر اور گھوڑے پر سوار کر کے لے گیا۔ اور اس طرح راجہ جے چند کو اپنی تذلیل کا جواب دیدیا۔ اس واقعہ کے بعد پرتھوی راج اور جے چند میں خوب ٹھن گئی اور اس خانہ جنگی سے یہ دونوں بڑی حکومتیں کمزور ہوتی چلی گئیں۔

دہلی اور قنوج کی ان دو بڑی حکومتوں کے علاوہ گجرات میں بگھیلے راجپوتوں کی بھی ایک مضبوط حکومت تھی۔ اور بنگال و بہار اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی کئی راجپوت راجہ بڑی شان سے حکومت کر رہے تھے۔ لاہور اور پنجاب پر اگرچہ کسی نہ کسی حد تک غزنوی خاندان کا برائے نام اقتدار باقی تھا۔ لیکن سندھ اور ملتان میں بغاوت پھیل چکی تھی۔ یہ تھی سلطان شہاب الدین کے ہندوستان پر حملہ سے قبل اس ملک کی حالت۔

شہاب الدین غوری کا ملتان پر حملہ

غزنی کے تخت پر بیٹھنے کے بعد سلطان شہاب الدین غوری تقریباً دو سال تک تو غزنی کی حکومت کو مضبوط بنانے اور اس کو قرامطہ یعنی حسن بن صباحی ملاحدہ سے پاک کرنے میں مصروف رہا۔ غزنی کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد وہ سب سے پہلے پنجاب کی جانب رُخ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ پنجاب جو زمانہ دراز سے غزنی کا ایک ماتحت صوبہ رہا ہے۔ اب اسے واپس ملنا چاہیئے کیونکہ وہ غزنی کی مرکزی حکومت

کا فرمانروا بن چکا تھا اور اس کا پنجاب اور دوسرے غزنی کے ماتحت علاقوں پر جائز حق تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ پنجاب کی جانب رُخ کرتا اسے ملتان سے اطلاع ملی کہ حسن بن صباحی ملاحدہ نے ملتان پر قبضہ جمالیا ہے۔

ملتان بھی چونکہ پنجاب کی طرح حکومتِ غزنی کا ایک ماتحت صوبہ تھا۔ اس لئے شہاب الدین غوری ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۵ء میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ ملتان پر حملہ آور ہوا۔ ملاحدہ نے سخت مقابلہ کے بعد شکست کھائی۔ بے شمار ملاحدہ شہاب الدین کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد شہاب الدین غوری نے اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو ملتان کا عامل مقرر کیا اور خود مقام اُچ پر جہاں ملاحدہ جمع تھے حملہ کر دیا۔ راجہ اُچ قلعہ میں محصور ہو کر شہاب الدین غوری کا مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن اُچ کی رانی نے شہاب الدین غوری سے سازش کر کے راجہ کو ہلاک کر دیا اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ غرضکہ اس طرح اُچ پر شہاب الدین غوری کا قبضہ ہو گیا۔ شہاب الدین نے اُچ کو بھی علی کرماخ کے ماتحت کر دیا اور راجہ اُچ کی لڑکی سے نکاح کر کے اسے اور بیوہ رانی کو غزنی لے گیا۔ یہ دونوں ماں بیٹیاں غزنی پہنچنے کے بعد دو سال کے اندر اندر مر گئیں۔

شہابُ الدین غوری کو گجرات میں شکست

شہاب الدین غوری نے چونکہ حسن بن صباحی ملاحدہ کو غزنی۔ ملتان۔ اُچ اور سنقران میں بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کیا تھا۔ اس لئے ملاحدہ کے مرکز "قلعہ الموت" (ایران) کا حاکم محمد بن علی ذکرا جو حسن بن صباح کا جانشین تھا۔ شہاب الدین کا جانی دشمن بن گیا۔ اور اُس نے نیرودالہ (گجرات) کے راجہ بھیم دیو سے شہاب الدین کے خلاف ایک جنگی معاہدہ بھی کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ بھیم دیو نے ایک بڑا لشکر فراہم کر کے ملتان اور اُچ کو شہاب الدین ...

کرماخ سے نکالنے کی تمام تیاریاں مکمل کرلیں۔ شہاب الدین غوری کو جب اس سازش کا علم ہوا تو وہ ۵۷۴ھ مطابق ۱۱۷۸ء میں سیدھا ملتان پہنچا اور وہاں کے حالات کو درست کرنے کے بعد نیر و والہ (گجرات) کی جانب رُخ کیا تاکہ وہاں کے راجہ کی قلعہ الموت والوں سے سازش کرنے پر اچھی طرح سرکوبی کرے۔ لیکن سلطان کو اس سفر میں ریگستان کی وجہ سے اور پانی نہ ملنے کی بنا پر سخت تکالیف اور تباہی کا سامنا ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری جب نیر و والہ (گجرات) کے قریب پہنچا تو اس کی فوج کا بیشتر حصہ راستہ کی صعوبتوں اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی سلطان نے راجہ پر حملہ کر دیا۔ راجہ اور ملاحدہ کی فوج نے جو کثیر تعداد میں تھی۔ اس جنگ میں شہاب الدین کو شکست دیدی۔ اس شکست کے بعد شہاب الدین غوری کو سخت ناکامی کے بعد واپس لوٹنا پڑا۔ واپسی میں سلطان کو سخت مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا ہوا۔ الغرض سلطان اپنے ہزاروں سپاہی ضائع کرکے اور سخت ترین تکالیف برداشت کرنے کے بعد بڑی مشکل سے غزنی پہنچا۔ اب اسے احساس ہوا کہ سندھ اور گجرات پر حملہ کرنے کے لئے پنجاب کے علاقہ پر سب سے پہلے قبضہ جمانا کس قدر ضروری ہے۔

شہابُ الدین غوری کا پشاور اور لاہور پر حملہ

سلطان شہاب الدین غوری ۵۷۵ھ ہجری مطابق ۱۱۷۹ء میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ پشاور پر حملہ آور ہوا۔ پشاور کی فتح کے بعد اُس نے پنجاب کے مغربی اضلاع کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ اور ان اضلاع کے انتظام اور استحکام سے فارغ ہونے کے بعد ۵۷۶ھ مطابق ۱۱۸۰ء میں اس نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ خسرو ملک حاکم لاہور جس میں کہ شہاب الدین غوری کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اس نے سلطان سے عاجزانہ درخواست کی کہ ہمیں

بدستور لاہور کا حاکم رہنے دیا جائے۔ خسرو ملک نے بطور یرغمال اپنے بیٹے کو بھی سلطان کے پاس بھیجدیا اور ایک ہاتھی بھی نذر کیا اور اطاعت کا وعدہ کیا۔ سلطان نے خسرو ملک کی درخواست قبول کرلی اور وہ لاہور سے محاصرہ اُٹھانے کے بعد غزنی واپس چلا گیا۔

سلطان شہاب الدین کا کراچی پر حملہ

اب جبکہ شہاب الدین پنجاب کو مطیع بنا چکا تھا اور پنجاب کے مغربی اضلاع میں اپنے عمال مقرر کرچکا تھا۔ تو اس نے سوچا کہ پنجاب کے راستہ سندھ کی اہم ترین بندرگاہ دیبل (کراچی) پر قبضہ جمائے چونکہ دیبل ہی وہ مقام تھا جس کے ذریعہ ملاحدہ المموت۔ نیروالہ (گجرات) کے راجہ بھیم دیو کو ہر قسم کی امداد پہنچاتے رہتے تھے۔ چنانچہ شہاب الدین غزنی میں توقف کئے بغیر پھر پنجاب واپس آگیا اور پنجاب سے سندھ ہوتا ہوا دیبل (کراچی) پر حملہ آور ہو گیا۔

شہاب الدین نے دیبل (کراچی) اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا سارا علاقہ فتح کرنے کے بعد دیبل (کراچی) میں ایک عامل مقرر کردیا۔ اس طرح سلطان نے گجرات اور سندھ کے درمیان ایک مضبوط دیوار قائم کردی تاکہ گجراتی راجہ اور قلعہ المموت کے ملاحدہ کے درمیان فوجی امداد کا راستہ بند ہو جائے اور اس امداد کے بند ہونے کے بعد وہ سازشیں خود بخود ختم ہو جائیں۔ جو گجراتی راجہ اور ملاحدہ برابر کرتے رہتے تھے۔ اس انتظام کے بعد شہاب الدین غوری غزنی واپس چلا گیا۔

پنجاب کی فتح اور خاندان غزنی کے آخری حکمران کی گرفتاری

سلطان شہاب الدین غوری پنجاب کو مطیع بنانے کے بعد اور دیبل (کراچی) کو فتح کرکے ہندوستان کی

جانب سے مطمئن ہوگیا تھا لیکن اس کے جاسوسوں نے اسے غزنی میں اطلاع کیا کہ خسرو ملک نے پنجاب کو غوری اقتدار سے نکالنے کے لئے ہندو راجاؤں سے ساز باز شروع کردی ہے۔ اور اس مقصد کے لئے وہ ہندوؤں کی مشہور جنگجو قوم گکھڑوں کو اپنی فوج میں بھرتی کررہا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی شہاب الدین غوری ۵۸۰ھ مطابق ۱۱۸۳ء میں ایک بڑی فوج لے کر پنجاب آیا۔ خسرو ملک لاہور کے قلعہ میں محصور ہوکر مقابلہ کرتا رہا۔ جب لاہور کا قلعہ فتح نہ ہوا تو سلطان نے سیالکوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کرکے سردار حسین خرمیل کو پنجاب کے مفتوحہ علاقوں کا عامل بنا کر اس قلعہ میں چھوڑ دیا۔ اور حکم دیا کہ وہ خسرو ملک کی تادیب میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھے۔ اس انتظام کے بعد سلطان شہاب الدین غزنی چلا گیا۔

سلطان کے غزنی جاتے ہی خسرو ملک نے پنجاب کے تمام مفتوحہ علاقہ کو گکھڑوں اور ہندو سپاہیوں کی مدد سے نکال لیا اور قلعہ سیالکوٹ پر حملہ کرکے وہاں کے عامل سردار حسین خرمیل کو قلعہ میں محصور ہونے پر مجبور کردیا۔ سردار حسین نے محصور ہونے کے باوجود بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک خسرو اس قلعہ کو تسخیر کئے بغیر لاہور واپس چلا گیا۔ جب ان واقعات کی اطلاع سلطان شہاب الدین غوری کو ملی تو اس نے ایک لشکر عظیم کے ساتھ دوبارہ ۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۵ء میں لاہور پر حملہ کردیا۔ خسرو ملک حسب سابق پھر قلعہ میں محصور ہوکر بیٹھ گیا۔

سلطان کو جب یقین ہوگیا کہ اس طرح خسرو ملک پر قابو پانا مشکل ہے تو اس نے جنگی چال چلی یعنی اپنی فوجیں ہٹالیں اور یہ ظاہر کیا کہ وہ خراسان جارہا ہے فوجوں کے ہٹنے کے بعد خسرو ملک جوں ہی قلعہ سے باہر آیا تو سلطان نے اسے

اچانک حملہ کر کے گرفتار کر لیا خسرو ملک کے گرفتار ہوتے ہی لاہور اور سارے پنجاب
پر شہاب الدین غوری کا قبضہ ہو گیا۔ شہاب الدین غوری نے ملتان کے گورنر
علی کرماخ کو لاہور بلایا۔ اور پنجاب و ملتان کے صوبوں کی گورنری اس کے سپرد
کر کے غزنی چلا گیا۔ اور اپنے ساتھ حکومتِ غزنی کے آخری بادشاہ خسرو ملک
کو بھی گرفتار کر کے لے گیا۔ اور اس طرح ہندوستان سے محمود غزنوی کی اولاد
کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ لاہور سے غزنی جانے کے بعد خسرو ملک
پانچ سال زندہ رہا۔ پانچ سال کے بعد اسے اور اس کے سارے خاندان
کو قلعہ برجستان میں جہاں وہ مقید تھا قتل کر دیا گیا۔

پرتھوی راج کے مقابلہ میں شہاب الدین کو شکست

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کا ہندوستان میں بڑا دور دورہ تھا ہندوستان
پر سلطان شہاب الدین کے حملوں سے قبل اس راجہ نے حکومتِ غزنوی کے
آخری حکمران خسرو ملک سے مشرقی پنجاب اور دہلی کا علاقہ چھین لیا تھا۔ اور خسرو
ملک پرتھوی راج کی اس جسارت کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکا۔ لیکن اب جبکہ
حکومتِ غزنی کے سارے حقوق غوری حکومت کو حاصل ہو چکے تھے اور سلطان
شہاب الدین نے سندھ، ملتان اور پنجاب کے علاقوں پر پوری طرح قبضہ جما لیا
تھا تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ مشرقی پنجاب اور دہلی کے ان تمام علاقوں کی واپسی
کے لئے پرتھوی راج سے مطالبہ کیا جائے جو غزنوی سلطنت کا ایک حصہ تھے۔
اور جن کا بجا طور پر جائز حقدار غزنوی حکومت کا جانشین شہاب الدین غوری
تھا۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین نے رائے پتھورا (پرتھوی راج) سے
ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا کہ سلطنتِ غزنی کے مقبوضہ

علاقے فوراً واپس کر دو اور جس طرح سلطان محمود غزنوی کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے اسی طرح اب ہماری سیادت کو تسلیم کرو۔

پرتھوی راج نے سلطان کے اس خط کا نہایت سختی سے جواب دیا اور اُس نے راجہ جے پال اور انند پال کی تقلید کرتے ہوئے شہاب الدین غوری کے خلاف مشترکہ محاذ قائم کرنے کے لئے بے شمار راجاؤں کو دعوت دیدی بس پھر کیا تھا حسبِ سابق بے شمار فوجیں اور خزانے پرتھوی راج کے پاس پہنچنے لگے ادہر شہاب الدین غوری نے حالات کا جائزہ لئے بغیر ایک چھوٹے سے لشکر کے ذریعہ بھٹنڈہ پر جو کہ پرتھوی راج کے قبضہ میں تھا حملہ کر کے فتح کر لیا۔ اور قاضی ضیاء الدین تولکی کو بارہ سو آدمیوں کی فوج اس قلعہ کی حفاظت کے لئے دیکر سلطان خود لاہور کے لئے روانہ ہو گیا۔

ابھی سلطان راستہ ہی میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ پرتھی راج اور اس کا بھائی کھانڈے رائے متعدد راجاؤں کے ہمراہ دو لاکھ سپاہی اور بے شمار ہاتھی لئے سلطان کے مقابلہ کے لئے آرہا ہے اب سلطان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اُسے پوری تیاری کے بغیر پرتھوی راج سے چھیڑ چھاڑ شروع نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ سلطان کے ساتھ اس وقت مشکل سے تین چار ہزار سپاہی تھے جو کسی طرح بھی پرتھوی راج کے بے پناہ لشکر سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی سلطان کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ دشمن کے مقابلہ سے منہ موڑ کر کمزوری کا ثبوت دے۔

سلطان شہاب الدین کی اس مختصر سی فوج کا پرتھوی راج کے عظیم الشان لشکر سے ترائن یعنی کورکشتر کے تاریخی میدان میں ۵۸۶ھ (سنہ ۱۱۹۱ء) میں مقابلہ ہوا۔ ایک طرف غوریوں کی مختصر سی فوج تھی اور دوسری طرف تمام بڑے بڑے

راجاؤں کا بے پناہ لشکر سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ شروع میں تو غوریوں کا لشکر بہادری سے لڑتا رہا لیکن جب راجپوتوں کی یورش نے ان کی فوج کا دایاں اور بایاں بازو توڑ دیا تو غوری لشکر میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی۔ لیکن شہاب الدین غوری عین لشکر کے وسط میں چاروں طرف سے گھر جانے کے باوجود بڑی شجاعت سے ہر چہار طرف کے حملوں کو روکتا رہا۔ کھانڈے رائے سلطان کو کچلنے کے لئے اپنا ہاتھی بڑھا کر لایا تو سلطان نے ایسا نیزہ مارا کہ کھانڈے رائے کے دانت جھڑ گئے۔ اسکے جواب میں کھانڈے رائے نے سلطان پر جو حملہ کیا وہ نہایت ہی مہلک اور شدید ثابت ہوا۔ کھانڈے رائے کی تلوار سلطان کے شانہ کو کاٹتی ہوئی اس قدر گہری اتر گئی کہ سلطان کی جان خطرہ میں پڑ گئی۔

سلطان گھوڑے سے گرنے ہی والا تھا کہ ایک خلجی غلام لپک کر سلطان کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور سلطان کو تھام لیا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ اسے بچا کر نکال لایا۔ سلطان کا زخمی ہونا تھا کہ رہی سہی غوری فوج بھی میدان سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ راجپوتوں نے چالیس میل تک سلمانوں کا تعاقب کیا۔ سلطان کو بیہوشی کی حالت میں لاہور لایا گیا۔ غوری فوج کے بچے کھچے سپاہی بھی لاہور پہنچ گئے۔ سلطان نے شدید زخمی ہونے کے باوجود صرف چند روز لاہور میں آرام کیا۔ اس کے بعد سلطان غزنی چلا گیا۔ سلطان کے غزنی چلے جانے کے بعد بھٹنڈہ کے قلعہ کا عامل قاضی ضیاء الدین تولکی محصور رہنے کے باوجود تقریباً ایک سال تک پرتھوی راج کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار دونوں میں صلح ہوگئی اور ضیاء الدین تولکی قلعہ خالی کر کے لاہور چلا گیا۔ تولکی کے جانے کے بعد پرتھوی راج نے پھر اس قلعہ پر قبضہ جما لیا۔

سلطان شہاب الدین غوری یہ تو سمجھتا تھا کہ مٹھی بھر آدمیوں کے ذریعہ اس کا پرتھوی راج کے بے پناہ لشکر پر فتح پانا ناممکن ہے۔ لیکن اس کو اس بات کا تصور بھی نہ تھا کہ اس کی فوج کے سردار اور سپاہی اُسے دشمنوں کے نرغہ میں لڑتا ہوا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے سلطان کو سپاہیوں اور سرداروں کی اس بزدلانہ اور غیر وفادارانہ روش سے بے حد صدمہ ہوا چنانچہ غزنی پہنچنے کے بعد سلطان نے اُن بزدلوں کو سخت ترین سزائیں دیں جنہوں نے محض اپنی جان بچانے کیلئے فرار ہونے کی ذلت گوارا کی تھی۔ ان بزدلوں کے منہ پر توبڑے چڑھا دیئے گئے اور ان میں دانہ بھر دیا گیا۔ اور ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ گھوڑوں کی طرح دانہ کھائیں جنہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا ان کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ان بزدلوں کا غزنی کے گلی کوچوں میں گشت کرانے کے بعد اچھی طرح انکی تذلیل کی گئی جن لوگوں کو سلطان نے یہ عبرتناک سزائیں دی تھیں۔ وہ عموماً غور، خلیج اور خراسان کے باشندے تھے۔ افغان ان میں کوئی بھی نہ تھا یعنی افغانوں نے آخری وقت تک سلطان کا ساتھ دیا تھا۔

شہاب الدین کا ڈیڑھ سو راجاؤں سے مقابلہ

سلطان شہاب الدین غوری نے غزنی آنے کے فوراً ہی بعد پرتھوی راج سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ادھر پرتھوی راج بھی غافل نہ تھا وہ جانتا تھا کہ شہاب الدین غوری انتقام لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا چنانچہ اس نے ہندوستان کے تقریباً تمام راجاؤں کو دھرم کے نام پر جوش دلا دلا کر شہاب الدین غوری کے خلاف اچھی طرح سے اُبھارا پنڈتوں اور برہمنوں نے اپنی موثر تقریروں کے ذریعہ ہندو عوام کو اس "دھرم یگ" میں حصہ لینے کی ترغیب دی جس کا نتیجہ یہ

نکلا کہ جب ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں شہاب الدین غوری کا لشکر لاہور ہوتا ہوا ترائن یعنی کورکھشتر کے میدان کے سامنے پرتھوی راج کے مقابلہ کیلئے خیمہ زن ہوا تو سلطان ہندو لشکر کی کثرت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پرتھوی راج کے لشکر میں تین ہزار جنگی ہاتھی تین لاکھ سوار اور بے شمار پیادہ فوج تھی یعنی کسی طرح بھی اس لشکر کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد چھ سات لاکھ سے کم نہ تھی۔ اس بے اندازہ فوج کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ سو راجہ بنفسِ نفیس اپنی اپنی ریاستوں کی فوجوں کے ہمراہ موجود تھے غرضکہ اکیلے شہاب الدین غوری کے لئے کورکھشتر کے میدان میں ہندوؤں کا اتنا بڑا لشکر جمع تھا جو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

یوں تو انند پال نے بھی محمود غزنوی کے مقابلہ کے لئے اسی طرح ایک بے پناہ لشکر جمع کیا تھا جس میں قومی رضا کار تک شامل تھے لیکن پرتھوی راج کا یہ لشکر انند پال کے لشکر سے بھی بازی لے گیا۔ اس کے برخلاف شہاب الدین غوری جو بڑے سے بڑا لشکر فراہم کر کے لا سکا تھا۔ اس کی مجموعی حیثیت پرتھوی راج اور اسکے ساتھی راجاؤں کے لشکر کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی یعنی شہاب الدین غوری کے لشکر کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی جس میں اسی ہزار پیادے اور چالیس ہزار سوار تھے۔ ہندو لشکر صرف تعداد ہی کے لحاظ سے بڑھا ہوا نہیں تھا بلکہ انہیں مسلمانوں کو شکست دینے کا قومی اور مذہبی جوش بھی کافی موجود تھا۔ اُنکے مذہبی اور قومی جوش کا اندازہ مشہور مورخ فرشتہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ ڈیڑھ سو ہندو راجاؤں نے پرتھوی راج کے سامنے اپنی پیشانی پر قشقہ شجاعت لگانیکے بعد یہ عہد کیا اور قسمیں کھائیں کہ "ہم جبتک مسلمانوں کو شکست دیکر فنا نہ کر دینگے کسی کو منہ نہ دکھائیں گے"۔ فرشتہ کے ان الفاظ سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہے کہ راجپوتوں میں مسلمانوں کو شکست دینے کے سلسلہ میں کس قدر جوش تھا۔

جنگ شروع ہونے سے قبل شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو ایک پیغام بھیجا تھا جس کے ذریعہ پرتھوی راج کو اطاعت قبول کرنے اور جنگ کی تباہی سے باز رہنے کیلئے کہا گیا تھا۔ اسی قسم کا ایک خط سلطان لاہور سے بھی پرتھوی راج کو اس سے قبل روانہ کرچکا تھا جس کا نہایت ہی تلخ جواب سلطان کو مل چکا تھا چنانچہ اس مرتبہ بھی پرتھوی راج نے نہایت ہی سخت الفاظ میں سلطان کو کورا جواب دیدیا اور پرتھوی راج کو ایسا ہی جواب دینا بھی چاہیئے تھا کیونکہ ہندو لشکر کی کثرت ہندوستان کے سیکڑوں راجاؤں کا شہاب الدین غوری کے خلاف اجتماع نیز ہندو عوام کا جوش صاف طور پر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ پرتھوی راج کو سوفی صدی فتح حاصل ہوگی۔

پرتھوی راج اور شہاب الدین غوری میں جنگ

پرتھوی راج کے اس تلخ جواب کے بعد سلطان شہاب الدین کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ فریق ثانی کی فوجوں کی کثرت کی پروا کئے بغیر حملہ کردے۔ چنانچہ سلطان نے اپنی فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کردیا۔ بارہ ہزار انتخابی سواروں کا دستہ تو اپنی کمان میں رکھا اور بقیہ تمام فوج چار حصوں میں تقسیم کرکے چار مختلف سپہ سالاروں کی کمان میں دیدی۔ اور ایسا انتظام رکھا کہ ہر فوج تین گھنٹے سے زیادہ نہ لڑے اور ہر تین گھنٹے کے بعد تازہ دم فوج تھکی ہوئی فوج کی جگہ لیتی چلی جائے اور باری باری سے چاروں سپہ سالار اسی طرح اپنی فوجوں کو لڑاتے رہیں۔ اسکے علاوہ یہ بھی ہدایت کردی تھی کہ تھکی ہوئی فوج جب میدان سے ہٹے تو اس طرح ہٹے کہ دشمن کو یہ شبہ ہو کہ یہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ تاکہ جونہی ہندوؤں کی فوج مسلمانوں کی تھکی ہوئی فوج کے تعاقب میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہوکر نکل آئے تو اسلامی فوج کے تازہ دم دستے اس کا آگے بڑھ کر صفایا کردیں۔ اس فوجی نظام کے قائم کرنے کے بعد شہاب الدین غوری نے

طلوعِ آفتاب سے قبل ہی اپنی فوج کو ہندوؤں کے لشکر پر حملہ کرنے کا حکم دیدیا اور خود بارہ ہزار سوار لیکر ایک بلند مقام سے لڑائی کا تماشہ دیکھنے لگا۔

سلطان کے حکم کے مطابق پہلے فوج کا ایک حصہ حملہ آور ہوا۔ اور وہ مقررکردہ پروگرام کے ماتحت لڑکر پسپا ہوگیا۔ پھر فوج کے دوسرے حصہ نے آگے بڑھ کر جگہ لیلی۔ جب فوج کا دوسرا حصہ پسپا ہوگیا تو فوج کے تیسرے حصہ نے مورچہ سنبھال لیا اور جب تیسرا حصہ بھی پسپا ہوتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تو اس کی جگہ فوج کے چوتھے حصے نے لیلی۔ اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو فوج میں تھکان قطعی پیدا نہیں ہوا۔ دوسرے ہر مرتبہ جب فوج کا ایک حصہ پسپا ہوتا تھا تو ہندو فوج اس کو میدان سے بھاگا ہوا سمجھ کر پیچھا کرتی تھی اور اس طرح ہندو لشکر کے ٹھوس اور مضبوط پہاڑ میں رخنہ پڑجاتا تھا۔ چنانچہ جب ہندو سپاہی پسپا شدہ فوج کے تعاقب میں آتے تھے تو پسپا ہونیوالی مسلم فوج اور مورچہ سنبھالنے والی مسلم فوج دونوں مل کر اس کا صفایا کردیتی تھیں۔ اسکے علاوہ بار بار مسلمانوں کے پسپا ہونیکے بعد پھر انکے مستحکم ہوجانے سے ہندو فوج پر ذہنی اثر بھی بہت برا پڑرہا تھا یعنی بار بار ان کی فتح کی امیدیں مایوسیوں میں بدل جاتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو لشکر میں کچھ گھبراہٹ سی پیدا ہوگئی۔

سلطان شہاب الدین جو بڑا ہی نبض شناس جرنل تھا جب اس نے ہندو فوج میں سراسیمگی کے آثار دیکھے تو عصر کے قریب فیصلہ کرلیا کہ اب خود اُس کے حملہ آور ہونے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ اس نے اچانک اپنے بارہ ہزار سوار لیکر لشکر کے اُس قلب پر پوری طاقت سے حملہ کردیا۔ جہاں پرتھی راج اور ڈیڑھ سو ہندو راجہ کھڑے ہوئے سپاہیوں کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ سلطان کے حملہ کرتے ہی سلطان کا باقی تمام لشکر بھی ہندو فوج پر ٹوٹ پڑا۔ پھر کیا تھا چشم زدن میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ راجپوتوں کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ بہت سے راجہ مارے گئے۔

پرتھوی راج اور اسکے بھائی کھانڈے رائے سپہ سالار نے یہ رنگ دیکھا تو انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ راہ فرار اختیار کی جائے چنانچہ ذراسی دیر میں سارا میدان لاشوں سے پٹا ہوا تھا جو بچ گئے وہ فرار ہو چکے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہاب الدین کا حملہ ایک طوفان تھا جس نے کہ راجپوت لشکر کو خس و خاشاک کی طرح اُڑا کر رکھ دیا۔ راجپوتوں کی اس شکست کے بعد غوری سپاہیوں نے ان کا تعاقب شروع کیا۔ اس تعاقب میں پرتھوی راج کو قلعہ سرستی کے پاس زندہ گرفتار کرنیکے بعد قتل کر دیا گیا پرتھوی راج کا بھائی کھانڈے رائے بھاگتا ہوا زخمی ہوا۔ اور مارا گیا اور اس طرح ہندوستان کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا معرکہ شہاب الدین غوری کی فتح پر ختم ہوا۔

اجمیر دہلی اور دوسرے شہروں پر سلطان کا قبضہ

ہندوستان کی اس جنگ عظیم کے بعد سلطان نے سرستی۔ ہانسی۔ سامانہ۔ کہرام وغیرہ کے قلعوں کو فتح کیا۔ اسکے بعد شہاب الدین غوری پرتھوی راج کے دارالسلطنت اجمیر کی جانب بڑھا۔ جہاں معمولی سے مقابلہ کے بعد اجمیر پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔

سلطان نے اقرار اطاعت لیکر اجمیر کی سلطنت پرتھوی راج کے بیٹے کولہ جی کے حوالہ کر دی۔ اس کے بعد سلطان دہلی آیا۔ دہلی میں پرتھوی راج کا دوسرا بیٹا تورپن جی حکمراں تھا۔ تورپن نے سلطان سے معافی چاہی اور حکومت کے برقرار رکھنے کی درخواست کی۔ سلطان نے اس سے بھی اقرار اطاعت لیکر دہلی کی حکومت اسی کے حوالے کر دی سلطان دہلی میں داخل ہوئے بغیر دہلی کی حکومت تورپن جی کے حوالہ کر کے واپس چلا گیا۔ اس نے قلعہ کہرام کو جو دہلی سے ستر میل پر واقع تھا جدید مفتوحہ علاقوں کے انتظام کا مرکز قرار دیا۔ اور اپنے محبوب اور وفا شعار غلام قطب الدین ایبک کو ان نو مفتوحہ علاقوں کا عامل مقرر کیا۔ ان تمام فتوحات اور انتظامات سے فارغ

ہونے کے بعد سلطان ۵۸۸ھ میں غزنی واپس چلا گیا۔

میرٹھ اور علی گڑھ وغیرہ کی فتح

اُس زمانہ میں میرٹھ کے قلعہ میں جو راجہ حکومت کرتا تھا وہ پرتھوی راج کا رشتہ دار تھا شہاب الدین نے اس راجہ کو کچھ نہیں کہا اور یہ بدستور میرٹھ میں حکمرانی کرتا رہا۔ لیکن سلطان کے ہندوستان سے جاتے ہی میرٹھ کے راجہ نے پرتھوی راج کے بیٹے تورن جی کو جسے سلطان نے دہلی کی حکومت سپرد کر دی تھی۔ ورغلانہ شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں ملکر علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ قطب الدین ایبک کو جب انکی بغاوت کی اطلاع ملی تو اُس نے ۵۸۹ھ میں دہلی اور میرٹھ دونوں مقامات پر حملے کر کے انکو فتح کر لیا۔ قطب الدین ایبک کو جب یہ معلوم ہوا کہ علی گڑھ کا راجہ جو پرتھوی راج کا عزیز ہے شرارت پر آمادہ ہے تو علی گڑھ پر حملہ کر کے اسے بھی فتح کر لیا۔ اُس کے علاوہ گرد و نواح کے دوسرے علاقے بھی قطب الدین ایبک نے فتح کر لئے۔ قطب الدین ایبک نے ان جدید علاقوں کی فتح کے بعد کہرام کی بجائے دہلی کو دارالسلطنت قرار دیدیا۔

قنوج۔ بنارس۔ گوالیار اور بدایوں پر حملہ

راجہ جے چند والئی قنوج اور پرتھوی راج میں یُوں تو دشمنی تھی لیکن جے چند نے جب دیکھا کہ سلطان شہاب الدین غوری ایک ایک کر کے تمام راجاؤں کی حکومتوں کو ختم کرتا چلا جا رہا ہے تو اس نے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے راجاؤں کو پیغام بھیجا کہ وہ سب مل کر پرتھوی راج کے خون کا شہاب الدین غوری سے انتقام لیں۔ چنانچہ جے چند نے راجہ گوالیار راجہ بدایوں اور اودھ و بہار تک کے راجاؤں کو شہاب الدین غوری کے مقابلہ کے لئے اپنے ساتھ ملا لیا قطب الدین ایبک کو جے چند کی ان سازشوں کا علم ہوا تو اس نے فوراً سلطان کو اطلاع کی سلطان یہ اطلاع پاتے ہی فوراً غزنی سے دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔ اور دہلی پہنچنے

کے بعد راجہ جے چند کی سرکوبی کے لئے قنوج کی جانب بڑھا۔ ابھی سلطان قنوج پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ قطب الدین ایبک نے پہلے ہی سے قنوج پہنچکر جے چند کے لشکر کو شکست دیدی۔ جے چند اس لڑائی میں قطب الدین ایبک کے تیر سے مارا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے بنارس۔ گوالیار اور بدایوں وغیرہ پر پے در پے حملے کرکے ان کو فتح کیا اور ان تمام مقامات پر اپنے عامل مقرر کر دئے۔

ہندوستان کا پہلا اسلامی وائسرائے قطب الدین ایبک

پنجاب ملتان اور سندھ تو پہلے ہی مسلم حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ اب جدید فتوحات کے بعد تقریباً پورا صوبہ اودھ یعنی یوپی بھی حکومتِ اسلامیہ کا ایک جزو بن گیا۔ اور اس چیز کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ سلطان کا ایک نائب ہندوستان میں رہ کر ہندوستان کے مفتوحہ صوبوں کے انتظام کو حسن وخوبی کے ساتھ چلائے۔ اس اہم مقصد کے لئے سلطان کی نظرِ انتخاب سب سے پہلے اپنے وفاشعار غلام قطب الدین ایبک پر پڑی جو وفاشعار ہونے کے علاوہ صوبہ اودھ کی فتوحات اور انتظام میں بھی اپنی غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دے چکا تھا۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو تمام ہندوستانی مقبوضات کے لئے اپنا نائب یعنی وائسرائے مقرر کر دیا۔ اور اس کے بعد خود ۵۹۱ھ میں غزنی کے لئے روانہ ہوگیا۔

قطب الدین ایبک کا گجرات پر حملہ

قطب الدین ایبک ایک بہترین منتظم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بہت ہی لائق جرنیل بھی تھا چنانچہ اس نے ہندوستان کا وائسرائے بنتے ہی جدید فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے قطب الدین نے اس بغاوت کو دبایا جو پرتھی راج کے بیٹے کولہ جی کے خلاف اجمیر میں کھڑی ہو گئی تھی۔ کولہ جی

چونکہ اسلامی حکومت کا باجگذار تھا۔ اس لئے دوسرے ہندو راجہ اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے اس کی حکومت میں بغاوتیں برپا کرا کے پریشان کر رکھا تھا۔ قطب الدین ایک بڑی فوج لے کر اس کی امداد کے لئے جا پہنچا۔ اور اس کے تمام دشمنوں کو مار بھگایا۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک نے ایک بڑا لشکر لیکر ۵۹۲ھ میں نیر وو الہ (گجرات) کے راجہ بھیم دیو کی ریاست پر حملہ کر کے اس سے خراج وصول کیا اور اطاعت کا اقرار لیا۔ راجہ بھیم دیو گجرات کا وہی راجہ ہے جس کے مقابلہ میں شہاب الدین غوری کو ۵۷۴ھ میں بُری طرح شکست ہو گئی تھی۔

قطب الدین ایبک کو پھر ایک بار اجمیر کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ پرتھوی راج کے بیٹے کولہ جی کے اطاعت قبول کرنے پر راجپوت اس کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۵۹۲ھ میں راجپوتوں نے متحد ہو کر کولہ جی پر حملہ کر دیا اور اجمیر پر قابض ہو گئے۔ جب قطب الدین کو کولہ جی کی اس پریشانی کا علم ہوا تو فوراً دلی سے فوج لیکر اجمیر پہنچا۔ باغی راجپوتوں کا قتل عام کیا۔ اور کولہ جی کو پھر اجمیر کے تخت پر بٹھایا۔ اس معرکہ سے فارغ ہو کر قطب الدین ایبک دہلی واپس آ گیا۔

سلطان شہاب الدین کا بیانہ پر حملہ

راجپوتوں کو اگرچہ مسلمانوں کے مقابلہ میں قدم قدم پر ناکامی اور شکستیں ہو رہی تھیں لیکن پھر بھی یہ کہیں نہ کہیں شورشیں برپا کرتے ہی رہتے تھے چنانچہ گوالیار میں راجپوتوں نے ایک بڑے پیمانہ پر بغاوت برپا کر دی اور بغاوت کے بعد انھوں نے بیانہ اور گوالیار کے قلعوں پر قبضہ جما لیا جب شہاب الدین غوری کو یہ خبر ملی تو وہ ۵۹۲ھ میں ایک لشکر لیکر ہندوستان

آیا اوران دونوں قلعوں کو راجپوتوں کے قبضہ سے نکال کر سپہ سالار بہاء الدین طغرل کو اس علاقہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن بہاء الدین طغرل کی موت کے بعد یہ علاقہ بھی قطب الدین ایبک ہی کے انتظام میں آ گیا۔ قطب الدین ایبک سلطان کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھی نئے نئے علاقوں کو فتح کرتا رہا۔ چنانچہ اس نے قلعہ کالپی اور کالنجر کو بھی فتح کر لیا۔

شہاب الدین غوری کی موت کی افواہ

۵۹۹ھ میں شہاب الدین غوری کے بڑے بھائی غیاث الدین غوری کے انتقال کے بعد شہاب الدین غوری اپنے مرحوم بھائی کی وصیت کے مطابق تمام غوری سلطنت کا واحد فرماں روا بن گیا۔ لیکن غیاث الدین کے مرنے پر غوری حکومت کے خلاف جا بجا شورشیں شروع ہو گئیں چنانچہ خوارزم شاہیوں نے حملے شروع کر دئے اور ان حملوں میں شہاب الدین کو بڑی مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک اہم معرکہ کے بعد شہاب الدین غوری کے ہلاک ہونے کی افواہ اکثر علاقوں میں پھیل گئی۔ اور اس افواہ سے ہندوستان میں جا بجا بغاوتیں کھڑی ہو گئیں۔ مشرقی علاقوں کو تو قطب الدین ایبک نے قابو میں لے لیا۔ لیکن پنجاب اور ملتان میں شرارت پسندوں اور ملاحدہ کی سازشوں سے اچھا خاصہ طوفان برپا ہو گیا۔ جسے دبانے کے لئے خود سلطان کو ۶۰۲ھ میں ہندوستان آنا پڑا۔

بہار اور بنگال کی فتوحات

دیبل (کراچی) سندھ۔ ملتان پنجاب۔ اور یوپی کے علاقے تو سلطنتِ اسلامیہ میں پہلے ہی سے شامل تھے۔ اب شہاب الدین کے فوجی افسر بہار اور بنگال کی جانب متوجہ ہوئے۔ چنانچہ بختیار خلجی جو غور کے اُمرا میں سے تھا۔ اور

قطب الدین ایبک کا معتمد خاص تھا۔ اس نے مختصر سی جمعیت سے پہلے تو بہار کے علاقہ کو فتح کیا اور اس کے بعد سارے بنگال کو فتح کرنیکے بعد لکھنوتی یعنی ڈھاکہ کو دارالسلطنت بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اپنے بھائی غیاث الدین کی موت کے بعد شہاب الدین "غوری حکومت" کا واحد حکمران بن چکا تھا اور خوارزم شاہیوں کے ساتھ لڑائیوں میں مصروف تھا۔

گھکڑ قوم کا قبولِ اطاعت

گھکڑ قوم جو ایک لامذہب پہاڑی قوم تھی۔ اس قوم کے سپاہیوں نے محمود غزنوی۔ اور محمد غوری کے مقابلہ میں راجپوتوں کے ساتھ مل کر بڑی بہادریاں دکھائی تھیں۔ لیکن شہاب الدین غوری کے آخری دورِ حکومت میں اس قوم کے سردار کو اسلام سے کچھ ایسا لگاؤ پیدا ہوگیا۔ کہ اس نے بخوشی اسلام قبول کرلیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے شہاب الدین غوری سے اس بات کی خواہش کی کہ اُسے پہاڑی علاقہ کی حکومت دیدی جائے۔ سلطان نے کوہستان کی حکومت کا فرمان بھی سردار کے پاس بھیجدیا اور بے حد انعام و اکرام بھی دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔

ملاحدہ کے ہاتھوں شہاب الدین کا قتل

سلطان شہاب الدین ابتدا ہی سے قلعۃ الموت کے ملاحدہ کا جانی دشمن تھا۔ چنانچہ شہاب الدین کو جب بھی موقع ملا۔ اس نے ان کو بُری طرح قتل کیا۔ شہاب الدین کی اس ملاحدہ دشمنی نے ملاحدہ کو شہاب الدین کا شدید مخالف بنا دیا تھا۔ ۶۰۲ھ ہجری مطابق ۱۲۰۶ء میں سلطان شہاب الدین ہندوستان میں امن و امان قائم کرکے اور ہندوستان کا انتظام کلیتہً اپنے وائسرائے قطب الدین ایبک کے سپرد کرکے غزنی جا رہا

تھا کہ ملاحدہ کو اس پر حملہ کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ سلطان جب لاہور سے دہیک پہنچا جو ضلع جہلم میں تھا۔ تو رات کے وقت اس کا خیمہ چاک کر کے دس بیس ملاحدہ خیمہ کے اندر داخل ہو گئے اور چھریوں سے سلطان کا کام تمام کر دیا۔ بعض مورخوں کا بیان ہے کہ شہاب الدین کے قتل کا واقعہ جہلم میں پیش نہیں آیا تھا بلکہ سندھ میں پیش آیا تھا۔ اس غمناک حادثہ کے بعد سلطان کا جنازہ ہندوستان سے غزنی لایا گیا اور غزنی میں سلطان کے جسم کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

سلطان شہاب الدین غوری پر ایک نظر

سلطان شہاب الدین ایک نہایت ہی بہادر سپہ سالار تھا جس کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم ترین حیثیت حاصل ہے۔ وہ بہادر بھی تھا اور فیاض بھی۔ چنانچہ اس نے جہاں پرتھوی راج جیسے راجاؤں کو بری طرح کچلا وہاں ان راجاؤں کو خوب نوازا جنہوں نے کہ اس کی اطاعت قبول کر کے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے تھے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے سب سے بڑے دشمن پرتھوی راج کے بیٹے کو بھی بدستور اجمیر کے تخت پر برقرار رکھا۔ اور صرف برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ اس کے مخالفوں سے لڑ کر اس کی محافظت بھی کی۔

متعصب مورخوں نے فرضی افسانوں کے ذریعہ شہاب الدین غوری کو بھی محمود غزنوی کی طرح بت شکن اور ہندو دھرم کا دشمن ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا پورا زور صرف کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ "بت شکن" تھا۔ اور نہ "ہندو دھرم" کا دشمن بلکہ ایک حوصلہ مند بادشاہ تھا۔ جو ہر اس طاقت کو کچل ڈالنا چاہتا تھا۔ جو اس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتی تھی۔ اور ہر اس شخص سے وہ خوش تھا جو اس کی سرداری کو تسلیم کرتے ہوئے۔ اس کا مطیع بن جاتا تھا۔ اور یہ فطرت بلا امتیاز مذہب و ملت ہر بادشاہ اور راجہ کی ہوتی ہے

چنانچہ اسی سرداری کی اسپرٹ کی بدولت اس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کردی جو زمانہ دراز تک ہندوستان پر حکمرانی کرتی رہی۔

سلطان شہاب الدین غوری کی اولاد

سلطان شہاب الدین کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی صرف ایک لڑکی تھی۔ سلطان نرینہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ترکی غلاموں ہی کو اولاد سمجھتا تھا۔ اور اُس زمانہ میں غلاموں کا درجہ بھی مسلمانوں میں اولاد کی برابر ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین غوری نے بالکل اولاد ہی کی طرح اپنے غلاموں کی تعلیم و تربیت کی تھی جن میں سے بعض نے بڑے بڑے درجے حاصل کئے۔ چنانچہ جس وقت سلطان مرا ہے تو قطب الدین ایبک بطور وائسرائے ہندوستان میں فرمانروائی کر رہا تھا۔ غزنی کی حکومت تاج الدین یلدوز کے قبضہ میں تھی۔ اور ناصر الدین قباچہ سندھ اور ملتان کی گورنری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

شہاب الدین غوری کے مرنے کے بعد اگرچہ اس کے بھتیجے سلطان محمود کو تخت پر بٹھادیا گیا تھا مگر یہ برائے نام حکمران تھا کیونکہ ساری حکومت تو خانہ زاد غلاموں کے قبضہ میں تھی۔ سلطان محمود کے قبضہ میں تو ایک چھوٹی سی حکومت تھی جو صرف غور۔ ہرات سیستان مشرقی خراسان اور فیروزہ کوہ تک محدود تھی۔

سلطان محمود نے تخت پر بیٹھتے ہی قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا بااختیار بادشاہ ہونیکی سند عطا کردی تھی اور تمغہ بھی بھیجدیا تھا یعنی شہاب الدین غوری کے جانشین نے باقاعدہ طور پر قطب الدین ایبک کو اپنی جانب سے ہندوستان پر حکمرانی کے اختیارات تفویض کردیئے تھے

ساتواں باب

ہندوستان پر خاندانِ غلاماں کی حکومت

۶۰۳ھ تا ۶۸۸ھ

۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء

خاندانِ غلامان کی حکومت

محمد بن قاسم سے لیکر سلطان شہاب الدین غوری کے دورِ حکومت تک پانچ سو سال کے اندر ہندوستان میں جتنی بھی اسلامی حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔ ان سب کی حیثیت ماتحت حکومتوں کی تھی۔ یعنی ان کا اصل مرکز یا تو دمشق میں تھا یا بغداد میں تھا۔ یا غزنی میں تھا۔ لیکن خاندان غلامان کی حکومت سے ہندوستان میں اسلامی فرمانروائی کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جبکہ ہندوستان کی اسلامی حکومت کو ایک خود مختارانہ حیثیت حاصل ہوگئی۔

خاندانِ غلامان کے مسلم فرمانرواؤں کو نہ تو بیرونی ممالک سے احکامات حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ ان کو اپنی فرمانروائی کے لئے غیر ممالک کا منہ تکنا پڑتا تھا۔ بلکہ ہندوستان ایک خود مختار ملک بن گیا تھا۔ وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا اور اس کے حکمرانوں کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس ملک کے خود مختار ہونے کے بعد ہندوستان کا روپیہ نہ دمشق جاتا تھا نہ بغداد۔ اور نہ غزنی۔ بلکہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے غیر ملکی حکام کو ہندوستان میں درآمد کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ بلکہ ہندوستان پر وہ لوگ حکومت کر رہے تھے جو یا تو ہندوستان کے قدیم باشندے تھے یا جنہوں نے غیر ممالک سے ہجرت کے بعد ہندوستان کو اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا۔

ہندوستان میں خاندانِ غلامان کے برسرِ اقتدار آتے ہی بیرونی حملہ آوروں کا بڑی حد تک ہندوستان کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس ملکی حکومت کے قیام کے بعد اگر بیرونی حملہ آور ہندوستان پر اپنی طاقت کے زعم میں حملہ بھی کرتے تھے تو ان

کو مار بھگایا جاتا تھا۔ غرضکہ خاندانِ غلامان کی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان میں ایک ایسی خود مختار ہندوستانی حکومت کی بُنیاد پڑ گئی جو غیر ملکی اثرات سے بڑی حد تک پاک اور آزاد کہی جا سکتی ہے۔

خاندانِ غلامان کے بانی کی ابتدائی زندگی

سلطان قطب الدین ایبک جس نے کہ ہندوستان میں خاندانِ غلامان کی حکومت کی بُنیاد رکھی اُس کی ابتدائی زندگی نہایت ہی دلچسپ ہے۔ قطب الدین ایبک خوشحال ترکستانی خاندان کا فرد تھا جو چھوٹی ہی سی عمر میں کسی بردہ فروش تاجر کے ہاتھ لگ گیا تھا جس نے اُسے نیشاپور لیجا کر قاضی فخر الدین عبد العزیز کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ قاضی فخر الدین عبد العزیز نے اس غلام لڑکے کو اپنی اولاد کے ساتھ نہایت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اس کے بعد ایک سوداگر نے بہت بڑی رقم دیکر اُس کو قاضی فخر الدین سے خرید لیا اور سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کر دیا۔

سلطان کی غلامی میں آنے کے بعد قطب الدین نے قدم قدم پر انتہائی وفاداری اور قابلیت کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے یہ سلطان کی نظروں پر چڑھتا چلا گیا اور اسے اتنا عروج حاصل ہوا کہ سلطان نے اسے ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کر دیا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے مرنے کے بعد سلطان کے جانشین سلطان محمود نے بھی اسے باقاعدہ ہندوستان کی فرمانروائی کی سند عطا کر دی تھی۔ یہ ہے قطب الدین ایبک کی عجیب و غریب زندگی۔

قطب الدین ایبک کی شادی تاج الدین یلدوز کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ تاج الدین یلدوز بھی بہت بڑے پائے کا غلام تھا جو شہاب الدین کے مرنے کے بعد غزنی کا بادشاہ ہوا۔ سندھ کا گورنر ناصر الدین قباچہ جو سلطان شہاب الدین کا منہ چڑھا غلام تھا قطب الدین ایبک کا داماد تھا۔ اور قطب الدین ایبک کا دوسرا داماد خود اس کا غلام

شمس الدین التمش حاکم بدایوں تھا یعنی یہ سب کے سب غلام آپس میں رشتہ داری کے بندھنوں میں بھی جکڑے ہوئے تھے۔

قطب الدین ایبک کا دورِ حکومت

شہاب الدین غوری کی موت کے بعد قطب الدین ایبک ۶۰۳ھ (۱۲۰۶ء) میں دہلی سے لاہور جاکر تخت نشین ہوا اور اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ لاہور میں تخت نشینی کی وجہ یہ تھی کہ محمد غوری کے زمانہ تک دہلی نہ کوئی بڑی جگہ تھی اور نہ اُسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے برخلاف لاہور کو محمود غزنوی کے زمانہ سے ہندوستان کے اسلامی مقبوضات کے دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اسی لئے قطب الدین ایبک کو تخت نشینی کے لئے لاہور جانا پڑا۔

سلطان قطب الدین ایبک نے لاہور میں تخت نشین ہونے کے بعد اپنا زیادہ وقت صرف ملک کے اندرونی انتظام پر صرف کیا۔ جدید فتوحات کی جانب اس نے کوئی خاص توجہ نہ کی۔ قطب الدین ایبک کے دورِ حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی حکومت کا ایک دور تو وہ ہے کہ اس نے بطور وائسرائے ہندوستان میں ۱۱۹۲ء سے لیکر ۱۲۰۶ء تک حکومت کی۔ بحیثیت وائسرائے اس کے کارنامے بہت زیادہ نمایاں ہیں کیونکہ اس زمانہ میں اسے نہ صرف اودھ۔ بہار اور بنگال کی شاندار فتوحات حاصل ہوئیں بلکہ گجرات تک کا علاقہ اس نے فتح کر لیا تھا۔ لیکن ۱۲۰۶ء کے بعد سے جبکہ وہ ہندوستان کے تخت پر ایک با اختیار فرمانروا کی حیثیت سے بیٹھا اور اس کی حکومت کا دوسرا دور شروع ہوا تو اُس کی فتوحات کی رفتار سست پڑ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے خسر تاج الدین یلدوز کے حملوں کے خوف سے لاہور سے باہر قدم نکالنے کی مشکل ہی سے جرأت کر سکتا تھا۔

تاج الدین یلدوز بھی قطب الدین ایبک کی طرح سلطان شہاب الدین غوری

کا غلام تھا۔ اس کے علاوہ یہ قطب الدین ایبک کا خسر و بھی تھا۔ شہاب الدین غوری کے مرنے کے بعد جب یلدوز غزنی کا با اختیار بادشاہ بن گیا تو اس نے کوشش کی کہ پہلے کی طرح اب بھی پنجاب کو غزنی کا ایک ماتحت صوبہ ہونے کی حیثیت سے اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ جب قطب الدین ایبک اس کے لئے تیار نہ ہوا تو یلدوز نے ایک بڑے لشکر کے ذریعہ حملہ کر کے بزورِ شمشیر لاہور تک کا علاقہ لے لیا۔ لیکن جب قطب الدین نے پوری طاقت کے ساتھ جوابی حملہ کیا تو اس جوابی حملہ میں قطب الدین نے نہ صرف پنجاب کو یلدوز کے قبضے سے نکال لیا بلکہ غزنی پر چڑھائی کر کے اور یلدوز کو شکست دیکر اسے غزنی سے بھی بھگا دیا اور وہاں چالیس دن تک حکومت کرتا رہا۔ قطب الدین کے لاہور چلے آنے کے بعد یلدوز نے دوبارہ غزنی پر قبضہ کر لیا۔

قطب الدین ایبک نے خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے چار سال حکومت کی۔ وہ ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۰ء میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کی فیاضی سارے ہندوستان میں مشہور تھی۔ اسے "حاتم ہند" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ اپنے دور کا ایک حوصلہ مند اور لائق ترین بادشاہ تھا۔ دہلی کی قطب مینار جو مسجد قوت الاسلام کی ایک مینار ہے۔ اس کی تعمیر کا سلسلہ قطب الدین ایبک ہی نے شروع کیا تھا۔ لیکن ابھی یہ مسجد ادھوری ہی تھی۔ اور مینار کے نیچے کے صرف دو درجے تعمیر ہوئے تھے کہ قطب الدین ایبک کا انتقال ہو گیا۔

آرام شاہ کے عہد میں حکومت کے ٹکڑے

قطب الدین ایبک کا بیٹا آرام شاہ خاندان غلامان کا دوسرا بادشاہ ہوا ہے جسے قطب الدین ایبک کے مرنے کے بعد ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں تخت نشین کیا گیا۔ لیکن آرام شاہ میں حکمرانی کی ذرہ برابر بھی صلاحیت نہ تھی۔ چنانچہ اس کی کمزوری اور نااہلیت کا یہ اثر ہوا کہ قطب الدین کی وسیع حکومت

ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

سندھ اور ملتان کے گورنر ناصر الدین قباچہ نے جو قطب الدین کا داماد بھی تھا۔ سندھ میں خود مختاری کا اعلان کر کے سلطان کا لقب اختیار کر لیا۔ بختیار خلجی کے جانشین حسام الدین خلجی نے خود مختار ہو کر بہار و بنگال میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ تاج الدین یلدوز نے غزنی سے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور اور سارے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ صرف دہلی اور اودھ کا علاقہ آرام شاہ کے قبضہ میں رہ گیا۔ اس طرح قطب الدین ایبک کی حکومت محض آرام شاہ کی کمزوری اور نااہلیت کی بنا پر چار حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس کے علاوہ ہندو راجاؤں نے بھی بغاوتیں برپا کرنی شروع کر دیں۔

اُمرائے سلطنت نے جب یہ بدنظمی دیکھی تو انھوں نے قطب الدین ایبک کے داماد شمس الدین التمش حاکم بدایوں سے استدعا کی کہ وہ دہلی آ کر ہندوستان کی حکومت کو سنبھالے۔ التمش ایک بہت بڑی فوج لے کر دہلی پہنچ گیا۔ آرام شاہ نے شہر سے باہر نکل کر التمش کا مقابلہ کیا۔ مگر گرفتار ہو گیا۔ اور قید میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ مر گیا۔ آرام شاہ نے ایک سال سے بھی کم حکومت کی لیکن اس کی حکومت میں ہندوستان کی اسلامی حکومت کے چار ٹکڑے ہو گئے۔

سلطان شمس الدین التمش

قطب الدین ایبک کی ابتدائی زندگی کی طرح شمس الدین التمش کی ابتدائی زندگی کے حالات بھی نہایت ہی دلچسپ ہیں۔ التمش ابھی کم عمر ہی تھا کہ اس کے بھائیوں نے حضرت یوسف کے بھائیوں کی طرح خوبصورتی اور فراست سے جل کر کسی بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہ بردہ فروش اسے بخارا میں لاکر فروخت کر گیا۔ خریدار نے التمش کی اپنے بچوں کی طرح تعلیم و تربیت کی۔ اس کے بعد التمش کو حاجی جمال الدین چست قبا نے خرید لیا۔ جو اسے دہلی لے آیا۔ دہلی میں قطب الدین ایبک نے التمش کو ڈھائی ہزار روپیہ میں خرید لیا اور اپنے بیٹے کی طرح تربیت کی تعلیم و تربیت کے بعد اسے میر شکار کا عہدہ دیا۔ پھر گوالیار کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے بعد بلند شہر کے عامل کا عہدہ عطا کیا۔ پھر بدایوں کا ناظم بنا دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری اور گھکڑوں کی آخری لڑائی میں التمش نے بڑی بہادری دکھائی تھی جس سے شہاب الدین غوری نے خوش ہو کر قطب الدین ایبک سے سفارش کی تھی کہ التمش کو آزاد کر دیا جائے اور اس کی پوری طرح عزت افزائی کی جائے۔ چنانچہ قطب الدین نے التمش کو آزاد کر کے اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر دی تھی اور امیر الامرا کا درجہ دیدیا تھا۔ یعنی وہ لڑکا جس کو حضرت یوسف کی طرح اس کے بھائیوں نے دربدر خوار ہونے کے لئے نکال دیا تھا۔ قدرت نے اسے حضرت یوسف کے مانند نہایت ہی بلند مرتبہ پر پہنچا دیا۔

شمس الدین التمش کی فتوحات

التمش امرائے سلطنت کی دعوت پر ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۱ء میں سلطان

شمس الدین التمش کے لقب کے ساتھ دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ التمش پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے تخت دہلی کو زینت دی۔ اور دہلی کو اسلامی ہند کا دار السلطنت قرار دیا۔ دہلی میں التمش کے تخت نشین ہونے کے بعد ان اُمرائے جو التمش کی تخت نشینی کے مخالف تھے۔ اس کی حکومت کے خلاف اندرونی بغاوتیں کھڑی کر دیں جن کو دبانے میں التمش کے تین چار سال صرف ہو گئے۔ اور اس مدت میں اسے ان علاقوں کو نکالنے کی فرصت ہی نہیں ملی جو جو قطب الدین ایبک کی حکومت سے علحدہ ہو کر خود مختار ہو گئے تھے۔

التمش پر تازہ مصیبت یہ آن پڑی کہ تاج الدین یلدوز نے جو پنجاب پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا لاہور سے دہلی پر بھی فوج کشی کر دی۔ اب التمش کو مجبوراً آگے بڑھ کر تراوری کے میدان میں یلدوز کے لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس جنگ کے لئے التمش بالکل تیار نہ تھا لیکن اس کی بے نظیر جنگی قابلیت کی وجہ سے یلدوز شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ التمش نے اس کو بدایوں میں قید کر دیا جہاں چند ہی روز کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ ابھی اس معرکہ سے التمش کو فرصت نہیں ملی تھی کہ ناصر الدین قباچہ نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور تک فتح کر لیا۔ التمش فوراً اس کے مقابلہ کے لئے بڑھا اور اسے شکست دیکر ملتان کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں التمش نے ناصر الدین قباچہ کے خلاف دوبارہ فوج کشی کی۔ ناصر الدین قباچہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر گجرات کی جانب بھاگ گیا۔ التمش نے دیبل (کراچی) تک سارا علاقہ سندھ فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ لیکن چند روز کے بعد ناصر الدین قباچہ نے دوبارہ سندھ پر قبضہ کر لیا۔

ہندوستان پر مغلوں کا پہلا حملہ | جس زمانہ میں کہ ہندوستان میں

قطب الدین ایبک فرمانروائی کر رہا تھا۔ اُسی زمانہ میں وسطی ایشیا کے ایک تاتاری سردار نے چنگیز خاں کا لقب اختیار کرنے کے بعد وسطی ایشیا میں بڑی طرح تباہی اور بربادی شروع کر رکھی تھی چنانچہ چنگیز خاں کی مغل فوج جدہر بھی جاتی قتلِ عام اور لوٹ مار کے ذریعہ لوگوں کو برباد کرتی چلی جاتی۔ قطب الدین ایبک کے بعد سلطان التمش کے عہد حکومت میں چنگیز خاں کی طاقت اتنی بڑھ گئی۔ کہ اس نے وسطی ایشیا کی اکثر اسلامی حکومتوں کو جڑ اور بنیاد سے کھود کر پھینکدیا۔ لاکھوں مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔

چنگیز خاں اور اُس کی فوج کا کوئی مذہب نہ تھا۔ بس اُن کا مسلک یہ تھا کہ جدہر جاتے تھے نسل انسانی کو نیست و نابود کر دیتے تھے چنگیز خاں کی اسی درندہ صفت مغل فوج نے خوارزم شاہی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ چنانچہ ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں جب شاہِ خوارزم جلال الدین اپنی جان بچانے کے لئے سندھ کی طرف بھاگ آیا تو مغلوں کی فوج بھی سندھ اور ملتان میں داخل ہوگئی۔ ملتان اور سندھ کو مغلوں نے خوب لوٹا۔ اور ہزاروں ہندو مسلمانوں کو لونڈی غلام بنایا۔ غرضکہ سندھ میں اچھی طرح طوفان برپا کر کے یہ مغل فوج وسطی ایشیا کو واپس چلی گئی۔ ہندوستان پر مغلوں کا یہ پہلا حملہ شمس الدین التمش ہی کے دورِ حکومت میں ہوا تھا۔

بنگال و بہار کی دوبارہ فتح

۶۲۲ھ مطابق ۱۲۲۵ء میں سلطان شمس الدین التمش بنگال اور بہار کی جانب متوجہ ہوا، تاکہ بنگال و بہار کے باغیوں کو دبائے۔ چنانچہ سلطان نے ایک زبردست حملہ کے بعد حسام الدین خلجی کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ اور وہاں اپنے بیٹے ناصر الدین کو بنگال و بہار کا ناظم مقرر کر کے دہلی واپس آگیا۔ التمش

کے واپس آتے ہی حسام الدین خلجی ناصر الدین سے لڑنے کے لئے آمادہ ہوگیا جس پر دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں حسام الدین خلجی مارا گیا اور اس طرح بنگال اور بہار کا علاقہ التمش کی حکومت میں شامل ہو گیا۔

۶۲۳ھ (۱۲۲۶ء) میں راجپوتانہ پر حملہ کر کے التمش نے قلعہ رنتھنبور فتح کیا کہتے ہیں کہ یہ قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ اس سے پہلے ستر فرمانروا اس پر حملے کر چکے تھے مگر فتح نہ ہو سکا تھا لیکن شمس الدین نے اسے چند ماہ میں فتح کر لیا۔ پھر ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں قلعہ منڈاور کو بھی فتح کر لیا۔ ان مہمات سے فارغ ہونے کے بعد ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) میں التمش نے ناصر الدین قباچہ کی سرکوبی کے لئے سندھ اور ملتان کی طرف دوبارہ فوج کشی کی اور اچ کے قلعہ پر جہاں قباچہ کا وزیر مع فوج کے موجود تھا حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اس فتح کا حال سن کر ناصر الدین قباچہ نے دریائے سندھ میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ قباچہ کی موت کے بعد التمش نے دیبل (کراچی) تک سارا ملک فتح کر کے جا بجا اپنے عامل مقرر کر دیئے اور اس طرح التمش ملتان اور سندھ کی جانب سے بھی بے فکر ہو گیا۔

خلافت اسلامیہ کی جانب سے التمش کی عزت افزائی

شمس الدین التمش

جس کی بہادری اور فتوحات کی خبریں ممالکِ اسلامیہ میں برابر پہنچ رہی تھی۔ اس کو ساری دنیائے اسلام میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کے عباسی خلیفہ المستنصر باللہ نے بھی یہ ضروری سمجھا کہ التمش کی بادشاہی کو تسلیم کرلے چنانچہ عباسی خلیفہ کی جانب سے ۶۲۶ھ (۱۲۲۹ء) میں التمش کو خلعت اور سند بادشاہی سے نوازا گیا۔ جس پر التمش نے خوش ہو کر جشن منایا اور شہر کی آئینہ بندی کی گئی۔ التمش پہلا بادشاہ ہے جس کے عہد حکومت

میں خلفائے اسلامیہ نے ہندوستان کو ایک جداگانہ آزاد حکومت تسلیم کرلیا۔

بنگال کے بعد اُڑیسہ کی فتح

اسی سال ۶۲۶ھ (۱۲۲۹ء) میں سلطان شمس الدین کو بنگال سے اپنے بیٹے ناصر الدین کے فوت ہوجانے کی اطلاع ملی۔ نیز یہ بھی پتہ چلا کر ملکا ملک خلجی نے بنگال میں بغاوت کر کے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی التمش فوج لیکر بنگال کی جانب روانہ ہوگیا۔ ملکا ملک خلجی کو شکست دیکر گرفتار کیا۔ اس کے بعد اُڑیسہ کی جانب متوجہ ہوا۔ اُڑیسہ پر بھی حملہ کر کے فتح کرلیا۔ اور بنگال کے صوبہ کے ساتھ اسے ملحق کر کے ملک علاء الدین جانی کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ ان اہم فتوحات کے بعد التمش دہلی واپس آگیا۔

گوالیار۔ مالوہ اور بھلسہ کی فتح

۶۲۹ھ (۱۲۳۲ء) میں التمش نے قلعہ گوالیار پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیا۔ اس کے بعد ۶۳۱ھ (۱۲۳۴ء) میں التمش نے مالوہ کے باغیوں کی سرکوبی کے بعد بھلسہ کے شہر اور قلعہ کو فتح کیا۔ پھر اس نے اجین پر حملہ کر کے اس پر بھی فتح حاصل کرلی۔ اُجین میں مہاکال دیو کا ایک بہت بڑا بُت خانہ تھا جس میں راجہ بکرماجیت کی ایک بہت بڑی مورت رکھی ہوئی تھی۔ اس مورت کے علاوہ اور بھی بے شمار چھوٹی چھوٹی مورتیاں تھیں۔ یہ بُت خانہ اُن شرارت پسند برہمنوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جو التمش کی حکومت کے خلاف ہندو عوام کو بھڑکا کر بغاوتیں برپا کراتے رہتے تھے چنانچہ التمش نے اس مندر کو مسمار کردیا اور مندر کی ساری مورتیاں اُٹھا کر دہلی لے گیا۔ جہاں اس نے ان مورتیوں کو دفن کرادیا۔

سلطان شمس الدین التمش کی وفات

شمس الدین التمش کو مرتے

دم تک چین نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی ساری عمر لڑائیوں ہی میں صرف ہوئی چنانچہ آخر عمر میں بھی اسے ملتان کی بغاوت دبانے کے لئے فوج کشی کرنی پڑی اسی سفر میں سلطان بیمار ہو کر دہلی واپس آیا۔ اور ۶۳۲ھ مطابق ۱۲۳۵ء میں فوت ہو گیا۔ اس نے ۲۶ سال حکومت کی۔ اس کا مقبرہ قصبہ مہرولی میں دہلی کے بالکل متصل مسجد قوت الاسلام کے پاس آج بھی موجود ہے۔

التمش ایک لائق اور بہادر سپہ سالار اور با اقتدار بادشاہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ ایک خدا پرست صوفی بھی تھا۔ اس کو ہمیشہ بزرگان دین سے گہری عقیدت رہی ہے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی جو اس زمانہ کے نہایت ہی بلند پایہ درویش تھے ان کی مجلسوں میں حاضری کو التمش فخر سمجھتا تھا۔ قطب الدین ایبک قوت الاسلام کی جس مسجد کو نامکمل چھوڑ گیا تھا۔ التمش نے اسے مکمل کرانے کی آخری عمر میں کوشش کی تھی۔ چنانچہ مسجد کا کچھ حصہ اور قطب مینار کے اوپر کے تمام درجے اسی بادشاہ نے تعمیر کرائے تھے لیکن ابھی یہ مسجد مکمل نہیں ہوئی تھی اور دوسرا مینار بننا ہی شروع ہوا تھا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔

التمش پر مندروں کے ڈھانے کا الزام

چونکہ التمش نے اجین کے مہاکال بت خانہ کو توڑا تھا اور اس کی مورتیاں دہلی لے آیا تھا۔ اس لئے اس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ہندو دھرم اور مندروں کا دشمن تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ اس کی حکومت گجرات سے لیکر اڑیسہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس نے ہندوستان کے تقریباً ہر حصہ پر فوج کشی کی تھی تو صرف ایک اسی بتخانہ کے توڑنے پر کیوں اکتفا کیا۔ حالانکہ ہندوستان میں ہزاروں بتخانے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اگر واقعی التمش کو ہندو دھرم سے عناد اور مندروں سے بیر

ہوتا تو وہ کسی ایک بُت خانہ کو بھی نہ چھوڑتا لیکن اس نے اپنی ساری عمر میں مہاکال کے بُت خانہ کے علاوہ کسی دوسرے بُت خانہ کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جس کے معنی یہ ہیں کہ مہاکال کا بُت خانہ نہیں تھا بلکہ التمش کی حکومت کے مخالفین کی سازشوں کا مرکز تھا جس کو اس نے کسی تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی مقصد کے لئے مسمار کر دینا ضروری سمجھا۔

التمش جیسا بادشاہ جس کی حکومت کا مرکز کسی غیر ولایت میں نہیں تھا، بلکہ وہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا، مندروں کو توڑ کر ہندو اکثریت کو بھلا کیونکر ناراض کر سکتا تھا حقیقت یہ ہے کہ التمش ہمیشہ فرقہ پرستی سے بلند رہا ہے۔ اور اس نے مسلمانوں کی طرح ہندو عوام کی دلداری میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور اپنے اسی اعلیٰ مسلک کی بنا پر وہ ہندوستان میں ایک ایسی وسیع اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ سکا جس کی مثال اس سے قبل ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بالکل مفقود تھی۔ اس موقعہ پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ التمش کے درباریوں میں ایک بڑی تعداد ہندو اُمرا کی بھی تھی۔ اور التمش کی نظر میں مسلم اور ہندو اُمرا میں کوئی فرق نہ تھا۔

رکن الدین کے پردہ میں ایک کنیز کی حکومت

التمش کے مرنے کے بعد ۶۳۲ھ

(۱۲۳۵ء) میں اُمرائے دربار نے بڑی توقعات کے ساتھ التمش کے بیٹے رکن الدین کو دہلی کے تخت پر بٹھایا لیکن رکن الدین جو ہر وقت شراب کے نشہ میں مدہوش رہتا تھا اور جسے عیش پرستی کے سوا کوئی کام نہ تھا، بھلا اتنی بڑی حکومت کو کیونکر سنبھال سکتا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ وہ شراب کے نشہ میں ہاتھی پر بیٹھ کر بازاروں میں نکل جاتا۔ اور خزانہ لٹا کر لطف حاصل کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں خزانہ خالی ہو گیا حکومت کے کاموں کی جانب سے وہ قطعی لاپرواہ تھا۔ حکومت اس نے اپنی ماں

کے حوالے کر دی تھی جو التمش کی ایک ترکی کنیز تھی یعنی رکن الدین تو برائے نام بادشاہ تھا۔ اصل حکمراں یہی ترکی کنیز تھی اس کنیز کے اختیار آتے ہی سب سے پہلے التمش کی دوسری بیویوں یعنی اپنی سوکنوں کا اور ان کی اولاد کا قتل عام شروع کر دیا جس سے کہ اُمرائے دربار میں سخت ناگواری پیدا ہوگئی۔ اسی کنیز نے التمش کے چھوٹے بیٹے قطب الدین کو پہلے اندھا کرایا اور پھر قتل کروا دیا۔

اس بد نظمی اور کنیز گردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ۔ بدایوں۔ ہانسی۔ لاہور۔ ملتان اور دوسرے علاقہ کے عاملوں نے رکن الدین کی حکومت کے خلاف بغاوت برپا کر دی اور در پردہ عمال اور اُمرا نے یہ طے کیا کہ رکن الدین کو معزول کر کے اس کی جگہ سلطان التمش کی بڑی بیٹی رضیہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا جائے۔

رکن الدین کو جب حاکم لاہور اور دیگر اُمرا کی اس سازش کا علم ہوا تو وہ فوج لے کر دہلی سے لاہور روانہ ہوگیا تاکہ لاہور کے حاکم کی سرکوبی کرے۔ لیکن اس کے ہمراہی میں جو امیر اور سردار تھے وہ سب کے سب رکن الدین کا ساتھ چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور رضیہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

سلطانہ رضیہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے رکن الدین کی ماں کو جو مختار کل بنی ہوئی تھی گرفتار کر کے قتل کرایا۔ اس کے بعد سلطانہ رضیہ کو رکن الدین کی اُس فوج سے مقابلہ کرنا پڑا جو دہلی پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ بہن اور بھائی کی فوجوں میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ رکن الدین کو شکست ہوگئی اور اسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ قید خانہ ہی میں فوت ہوگیا۔ رکن الدین نے کل سات مہینے حکومت کی لیکن اس کا دور ہندوستان کے لئے بدترین دور ثابت ہوا۔

رضیہ سلطانہ کا عہدِ حکومت

رضیہ سلطانہ جو ۶۳۴ھ (۱۲۳۶ء) میں تخت دہلی پر بیٹھی تھی۔ اسکی حکومت کا زمانہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن اس نے بڑی قابلیت کے ساتھ فرمانروائی کی ہے۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے ان تمام انتظامی خرابیوں کو دور کر دیا جو اس کے بھائی رکن الدین کے دورِ حکومت میں پیدا ہو گئی تھیں۔ رضیہ اپنے باپ التمش کی سب سے زیادہ منظورِ نظر تھی۔ التمش کی رائے تھی کہ وہ اپنے بھائیوں سے کہیں زیادہ لائق ہے۔ اور اس میں حکمرانی کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ التمش نے اپنے بیٹوں کی شراب نوشی اور عیاشی سے نالاں ہو کر ایک مرتبہ رضیہ کی ولیعہدی کا اعلان کرنے کا بھی ارادہ کر لیا تھا۔ مگر امرائے یہ کہہ کر روک دیا کہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے بیٹی کی ولیعہدی کا اعلان کرنا اسی طرح بھی مناسب نہیں لیکن التمش کی رائے درست نکلی۔ آخر امرا کو مجبور ہونے کے بعد رضیہ ہی کو دہلی کے تخت پر بٹھانا پڑا۔

رضیہ ایک تعلیم یافتہ مدبر اور نہایت ہی حسین عورت تھی۔ وہ ایک اچھی شہ سوار اور سپہ سالار تھی۔ چنانچہ اس نے بیشتر لڑائیوں میں اپنی فوجوں کی کمان بڑی قابلیت کے ساتھ خود ہی کی ہے۔ رضیہ میں اس کے سوا اور کوئی کمزوری نہ تھی کہ وہ عورت تھی۔ چنانچہ امرا اور عمال کا ایک بڑا طبقہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ ایک عورت ان پر حکومت کرے۔ اس کے علاوہ رضیہ چونکہ بے حد خوبصورت اور غیر شادی شدہ تھی۔ اس لئے اکثر عمال اور امرا کی یہ دلی تمنا تھی کہ کسی طرح ان کی اس خوبصورت ملکہ سے شادی ہو جائے۔ تاکہ سلطانہ کا شوہر بننے کے بعد ان کو سارے ہندوستان پر فرمانروائی کا موقعہ حاصل ہو جائے۔ غرضکہ بے نظیر جنگی اور انتظامی قابلیت کے باوجود محض عورت

اور نا کتخدا عورت ہونے کی وجہ سے رضیہ کے راستہ میں بے حد مشکلات حائل تھیں

رضیہ سلطانہ کے خلاف اُمرا کی بغاوت

رضیہ سلطانہ کا تخت نشین ہونا تھا کہ اکثر اُمرائے سلطنت نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ چنانچہ وزیر مملکت نظام الملک جنیدی ملک علاء الدین شیر جانی، ملک سیف الدین کرخی اور ملک اعز الدین جیسے بلند پایہ اُمرا رضیہ سلطانہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے بعد ایک بڑی جمعیت کے ہمراہ دہلی کے باہر جمع ہو گئے۔ جب رضیہ سلطانہ کو اس کا علم ہوا تو وہ خود لشکر لیکر ان کے مقابلہ پر گئی اور بڑی بہادری کے ساتھ امراکران سب کو شکست دیدی۔ ان میں سے کسی کو قید کیا، کوئی قتل ہوا۔ اور کسی کو معافی مل گئی۔ رضیہ کی اس بہادری نے سارے ملک پر اس کا سکہ جما دیا۔ غرضکہ بنگال و اُڑیسہ سے لیکر پشاور د کراچی تک اس کی حکومت نہایت ہی مضبوط ہو گئی۔

غلام یاقوت کی وجہ سے رضیہ کے خلاف طوفان

سلطانہ رضیہ کے خلاف جو سب سے بڑا فتنہ کھڑا ہوا۔ اس کا باعث سلطانہ رضیہ کا محبوب غلام یاقوت تھا۔ سلطانہ رضیہ کے مزاج میں اس غلام کو بے حد دخل تھا۔ وہ سایہ کی طرح سلطانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ جب سلطانہ گھوڑے پر سوار ہوتی تو یاقوت اس کی بغل میں سہارا دیکر سلطانہ کو گھوڑے پر بٹھاتا۔ سلطانہ رضیہ اس غلام پر اس قدر مہربان ہوئی کہ اُسے امیر الاُمرا کا عہدہ عطا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے ترک اور افغان اُمرا جو غلام یاقوت کو اس عزت افزائی کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ اُس کے امیر الامرا بنائے جانے پر برافروختہ ہو گئے اور بغاوت کی تیاریاں کرنے لگے۔

سلطانہ رضیہ جو خود غلام خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اور جس کا باپ بھی غلام تھا۔

اور جس کے باپ کا آقا قطب الدین ایبک بھی ایک غلام ہی سے بادشاہ بنا تھا۔ وہ اگر کسی غلام پر غیر معمولی نوازشات کرتی تھی تو اس پر تعجب کی کونسی بات تھی۔ اور ایسی حالت میں جبکہ اُس زمانہ میں غلاموں کو خاندان کا ایک رکن سمجھا جاتا تھا۔ تو یہ قدرتی بات تھی کہ رضیہ کو بھی دوسروں کی نسبت اپنے خاص غلام سے زیادہ قرب ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن وہاں تو سوال غلام اور آقا کا نہیں تھا۔ بلکہ ایک رقیبانہ کاوش تھی جو یاقوت کے خلاف بعض اُمرا کے دلوں میں پیدا ہوئی۔ اور رقیبانہ جذبہ کے ماتحت طرح طرح سے ان اُمرا نے رضیہ کو بدنام کیا۔ رضیہ عورت تھی۔ اور عورت میں ضد کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ یاقوت کی جس قدر مخالفتیں ہوئیں۔ رضیہ یاقوت کو اور زیادہ قربت کا درجہ دیتی چلی گئی۔ چنانچہ اس ضد اور بحث نے رضیہ اور اُمرا کے درمیان ایک مستقل کشاکش برپا کردی۔ جس کا نتیجہ آپس کی جنگ پر جاکر ختم ہوا۔

لاہور اور بھٹنڈہ میں بغاوت سلطانہ رضیہ کو جب معلوم ہوا کہ لاہور کا صوبہ دار ملک اعز الدین آمادۂ فساد ہے تو رضیہ ایک بہت بڑا لشکر لے کر لاہور جا پہنچی۔ ملک اعز الدین مقابلہ کی تاب نہ لاکر سلطانہ سے معافی کا خواستگار ہوا۔ سلطانہ نے اس کی خطا معاف کردی۔ اور دہلی واپس آگئی۔ دہلی آنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ محض یاقوت کی وجہ سے بھٹنڈے کے عامل ملک التونیہ نے علم بغاوت بلند کردیا ہے۔ سلطانہ فوج لیکر اس کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئی۔ اس سفر میں یاقوت بھی سلطانہ کے ہمراہ تھا۔ سلطانی لشکر کے اُمرا نے موقع پاکر بھٹنڈہ پہنچنے سے پہلے ہی یاقوت کو قتل کردیا اور سلطانہ رضیہ کو گرفتار کرکے ملک التونیہ کے پاس بھیجدیا اس کے بعد سب کے سب اُمرا دہلی واپس آگئے۔ دہلی آتے ہی اُن اُمرا نے فوراً معز الدین بہرام شاہ بن التمش کو دہلی کے تخت پر بٹھادیا۔

رضیہ سلطانہ کا ملک التونیہ سے نکاح

کہنے کے لئے تو اُمرا کی یہ مخالفتیں محض غلام یاقوت کی وجہ سے تھیں لیکن حقیقت میں ان مخالفتوں کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہر امیر اس با اختیار اور خوبصورت ملکہ سے شادی کا خواہشمند تھا۔ اگر فی الحقیقت یہ مخالفتیں غلام یاقوت کی وجہ سے تھیں تو یاقوت کے قتل ہونے کے بعد یہ مخالفتیں بھی ختم ہو جاتیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان مخالفتوں کی اصل حقیقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک التونیہ جو سلطانہ کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ جوں ہی سلطانہ سے اس کا نکاح ہو گیا تو یہ امیر ان واحد میں سلطانہ کا ہمدرد بن گیا اور ایسا ہمدرد بن گیا کہ اس نے سلطانہ کو تخت دلانے کے لئے جان تک کی بازی لگا دی۔ جس کے معنی یہی ہیں کہ اُمرا کی سلطانہ سے ساری مخالفت صرف اُسے حاصل کرنے کے لئے تھی۔

ملک التونیہ کو جب یہ خوبصورت عورت حاصل ہو گئی تو اُس نے جاٹوں اور گھکڑوں کی فوج جمع کر کے دہلی پر حملہ کر دیا۔ سلطانہ رضیہ بھی اس حملہ میں شریک تھی۔ لیکن وہ دوسرے اُمرائے سلطنت جو سلطانہ کو حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اب سلطانہ کے علاوہ ملک التونیہ کے بھی دشمن ہو گئے۔ اور انھوں نے سلطانہ اور ملک التونیہ کی فوجوں کا شدید مقابلہ کیا۔ سلطانہ کا بھائی بہرام شاہ بھی اُمراء کی شہ پر ایک بڑا لشکر لے کر مقابلہ کے لئے آ گیا۔ التونیہ اور رضیہ کو شکست ہو گئی اور یہ دونوں جان کر بچا کر بھاگے لیکن راستہ میں کسی گاؤں کے کاشتکاروں نے ان دونوں کو ۶۳۷ھ (۱۲۴۰ء) میں قتل کر دیا۔

اس حادثہ کے بعد رضیہ سلطانہ کی لاش دہلی لا کر دفن کر دی گئی۔ سلطانہ رضیہ نے تقریباً چار سال حکومت کی۔ وہ اپنے زمانہ کی لائق ترین عورت تھی۔ اس میں

حکمرانی کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں اگر وہ شادی شدہ ہوتی۔ اور اس کے لیے پناہ حسن نے اُمرا میں رقیبانہ کشمکش نہ پیدا کر دی ہوتی تو وہ زمانۂ دراز تک حکومت کرتی اور اس کی حکومت سے ملک کو کافی فائدہ پہنچتا۔

معزالدین بہرام شاہ بن التمش

معزالدین بہرام شاہ بن التمش نے ۶۳۷ھ مطابق ۱۲۴۰ء میں تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی سب سے پہلے اُمرائے سلطنت پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اکثر اُمرا بہرام شاہ کے اشارہ پر بڑی بے دردی کے ساتھ قتل ہوئے۔ اختیارالدین جس کے ہاتھ میں ساری حکومت تھی۔ اس کو ترک کی غلاموں نے خود اس کے گھر میں گھس کر اور چھرا مار کر ہلاک کر دیا۔ مہذب الدین جو ایک دوسرا با اقتدار حاکم تھا۔ اس پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ مگر وہ بچ کر بھاگ گیا۔ غرضکہ بہرام شاہ بزدلانہ قتل و خون کا بڑا شائق تھا۔ اور اس نے اپنے غلط طریقہ کار سے تقریباً تمام اُمرا کو اپنا دشمن بنا لیا تھا حکمرانی کے معاملہ میں وہ قطعی کورا تھا۔ چنانچہ اُس کے تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی سارا نظامِ حکومت درہم برہم ہو گیا تھا۔

مغلوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام

مغل جو ایشیائی ممالک میں جابجا تباہی مچاتے پھر رہے تھے۔ اور جنہوں نے التمش کے دورِ حکومت میں سندھ کے علاقہ میں خوب لوٹ مار کی تھی جب ان کو معلوم ہوا کہ دہلی کی حکومت میں بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔ تو وہ آندھی اور طوفان کی طرح پنجاب پر حملہ کر کے ہر طرف چھا گئے۔ لاہور کے صوبہ دار قراقش خاں نے ان کا مقابلہ کیا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ پنجاب کے ہندو اور گھکڑ بھی اس تباہی اور غارتگری میں مغل لٹیروں کے ساتھ

شامل ہوگئے ہیں تو وہ اپنی چھوٹی سی جمعیت کو لیکر دہلی بھاگ گیا۔ قراقش خاں کے دہلی جانے کے بعد مغلوں نے میدان صاف پاکر لاہور اور پنجاب کے اکثر اضلاع کو خوب لوٹا۔ بے شمار مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ اور پنجاب میں اپنی حکومت قائم کرلی۔

بہرام شاہ کے خلاف اُمرائے سلطنت کی سازش

بہرام شاہ

کو پنجاب کے مسلمانوں کی اس تباہی کا جب علم ہوا تو اس نے اکابرین سلطنت کو جمع کرنے کے بعد اُمرا اور سپہ سالاروں کو ایک بڑا لشکر دیکر مغلوں کی سرکوبی کیلئے لاہور کی جانب روانہ کیا۔ لیکن اُمرائے سلطنت بجائے اس کے کہ مغلوں کے اس تازہ فتنے کو رفع کرتے انھوں نے دریائے بیاس کے کنارے جمع ہوکر یہ طے کیا کہ اس لشکر کے ذریعہ سب سے پہلے بہرام شاہ پر حملہ کرکے اُسے معزول کیا جائے۔ کیونکہ اسی کی کمزوری اور نالائقی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مغل پنجاب میں تباہی مچاتے پھر رہے ہیں۔ چنانچہ اُمرائے سلطنت اور تمام لشکر بہرام شاہ کو معزول کرنے کے لئے دہلی کی جانب پلٹ پڑا۔

بہرام شاہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کو ان باغی اُمرا کے پاس بھیجا کہ وہ ان کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائیں۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے علاوہ قاضی القضاۃ قاضی منہاج سراج نے بھی انتہائی کوشش کی کہ موجودہ نازک وقت میں اُمرائے سلطنت اور بہرام شاہ میں صلح ہوجائے۔

اُمرائے سلطنت جو بہرام شاہ کو معزول کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کسی طرح نہ مانے اور انھوں نے دہلی پر حملہ کرکے دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ ساڑھے

تین مہینے تک رہا جس میں دونوں طرف کے بے شمار آدمی مارے گئے۔ آخر کار امرائے سلطنت کو فتح حاصل ہوگئی اور بہرام شاہ گرفتار ہونے کے ۶۳۹ھ مطابق ۱۲۴۲ء میں قتل ہوا۔ اس نے دو سال ایک مہینے اور پندرہ دن حکومت کی۔ بہرام شاہ کے قتل کے بعد امرائے سلطنت نے سابق شاہ رکن الدین کے بیٹے علاء الدین مسعود کو قید خانہ سے نکال کر تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔

سلطان علاء الدین مسعود کے دور میں مغلوں کی یورش

امرائے سلطنت نے ۶۳۹ھ مطابق ۱۲۴۲ء میں سلطان مسعود کی تخت نشینی سے فارغ ہوتے ہی سلطان کے مشورہ سے پنجاب پر لشکر کشی شروع کر دی۔ کیونکہ مغلوں نے بری طرح سے پنجاب میں تباہی برپا کر رکھی تھی۔ غرضکہ امرائے سلطنت نے سخت مقابلہ کے بعد ان مغلوں سے پنجاب کو پاک کر دیا۔ جن کی تباہکاری سے پنجاب کے باشندے تنگ آچکے تھے پنجاب کو بمشکل تمام ان مغلوں سے نجات ملی تھی کہ یکایک مغلوں کے ایک دوسرے لشکر نے تبت کے راستہ بنگال میں داخل ہونے کے بعد وہاں بری طرح سے تباہی برپا کر دی۔ سلطان مسعود نے اس تازہ مصیبت کو دور کرنے کے لئے تیمور خاں قران کو ایک زبردست فوج لیکر فوراً بنگال روانہ کیا۔ اس نے صوبہ دار بنگال کے ساتھ مل کر اچھی طرح سے مغلوں کی سرکوبی کی اور ان کو اسی راستہ سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ جس راستہ سے کہ وہ بنگال میں داخل ہوئے تھے۔

بنگال کے اس فتنہ کے ختم ہوتے ہی سلطان مسعود کو اطلاع ملی کہ مغلوں کا ایک زبردست لشکر منکوتا نامی مغل کی سرکردگی میں ملتان اور اچ کے علاقہ میں گھس آیا ہے اور وہاں اس لشکر نے قتلِ عام اور غارتگری مچا رکھی

ہے۔ سلطان نے یہ سنتے ہی فوراً ہی تمام صوبوں سے فوجیں جمع کیں۔ اور ایک عظیم الشان لشکر لیکر ۶۴۳ھ (۱۲۴۶ء) میں خود مغلوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ ابھی سلطانی لشکر بیاس کے کنارے ہی تھا کہ اس لشکر کی کثرت اور عظمت کا حال سُن کر مغل بھاگ کھڑے ہوئے اور خراسان کی جانب نکل گئے۔ سلطان بھی دہلی دہلی واپس آگیا۔

سلطان مسعود عیش پرستی کا شکار

سلطان مسعود نے کے تخت نشین ہونے کے بعد شروع شروع میں تو حکومت کے کاموں سے بڑی دلچسپی لی۔ اس نے تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی اپنے دونوں چچاؤں جلال الدین بن التمش اور ناصر الدین محمود بن التمش کو قید سے نکالا جلال الدین بن التمش کو قنوج کا اور ناصر الدین محمود بن التمش کو بہرائچ کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے علاوہ سلطان مسعود نے مغلوں کی شورشوں کے دبانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں سلطان مسعود بُری صحبت میں مبتلا ہونے کے بعد عیش پرستی کا عادی بن گیا۔ اور اس کی حالت یہ ہوگئی کہ ہر وقت شراب کے نشہ میں مدہوش رہنے لگا۔

سلطان مسعود کی اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام سلطنت میں کمزوری اور ابتری پیدا ہوتی شروع ہوگئی۔ اب امرائے سلطنت کو پھر نیا حکمران تلاش کرنے کی فکر ہوئی۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ سلطان مسعود کو بھی معزول کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ سلطان مسعود کے چچا ناصر الدین محمود کو جو نہایت ہی باکباز حکمران ہے۔ بہرائچ سے بُلا کر تختِ سلطنت پر بٹھا دیا جائے چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۶۴۴ھ مطابق ۱۲۴۶ء میں سلطان مسعود کو پھر قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اور ناصر الدین محمود بن التمش کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ سلطان

مسعود نے چار برس اور ایک ماہ حکومت کی۔ اس کی حکومت کا ابتدائی دور تو اچھا رہا لیکن آخری دور قطعی مایوس کن ثابت ہوا۔

سُلطان ناصر الدّین محمود

سلطان ناصر الدین محمُود ایک ایسا دُرویش صفت بادشاہ ہوا ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نایاب ہے۔ اس نے تمام عمر اپنے ذاتی خرچ کے لئے حکومت کے خزانہ سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ وہ قرآنِ مجید کی کتابت کی اُجرت کے ذریعہ غریبوں جیسی زندگی بسر کرتا تھا۔ ۶۴۴ھ مُطابق ۱۲۴۶ء میں تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی اُسے مغلوں کی سرکوبی کے لئے دہلی سے نکلنا پڑا۔ مغل حسب عادت ہندوستان میں گھُس آئے تھے۔

غیاث الدین بلبن جو سلطان ناصر الدین کا وزیر تھا۔ اس معرکہ میں سلطان ناصر الدین محمود کے ہمراہ تھا۔ سلطان نے خود تو راوی پار کر کے سوہدرہ کے مقام پر قیام کیا۔ اور بلبن کو فوج دیکر دوآبہ سندھ ساگر کی طرف روانہ کر دیا۔ جہاں پہنچنے کے بعد غیاث الدین بلبن نے مغلوں کو مار مار کر دریائے سندھ کے پار بھگا دیا۔ اور اُن گھکڑوں کو سنگین سزائیں دیں جو لوٹ مار اور غارتگری میں مغلوں کے ساتھ مل گئے تھے۔

ناصر الدین محمُود کے زمانہ میں راجاؤں کی بغاوتیں

سلطان شمس الدین التمش کی موت کے بعد سے دہلی کی حکومت میں جو بدنظمی اور کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو راجاؤں میں بغاوت کے آثار برابر پیدا ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب ناصر الدین محمُود تخت پر بیٹھا تو اسے کمزور سمجھتے ہوئے اکثر ہندو راجاؤں اور سرداروں نے کھلم کھلا بغاوت شروع

کردی۔ چنانچہ ہندوؤں کی اس بغاوت کو دبانے کے لئے ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء)
میں سلطان کو خود پانی پت جانا پڑا۔ پانی پت کے باغیوں کی سرکوبی سے سلطان
فارغ ہی ہوا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ قنوج کے ہندوؤں نے سلطان کے مقابلہ
کے لئے قنوج کے قلعہ میں بڑی تعداد میں سامانِ حرب جمع کر رکھا ہے۔ سلطان
فوج لیکر قنوج کے قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ قلعہ کو فتح کیا اور باغیوں کو عبرتناک سزائیں
دیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ کٹرہ مانکپور کا ہندو راجہ دلکی ملکی باغی ہو گیا ہے۔
سلطان نے وہاں پہنچ کر اس باغی کو گرفتار کیا۔ اور اس طرح یہ فتنہ بھی دب گیا۔
۶۴۶ھ (۱۲۴۸ء) میں سلطان نے قلعہ رنتھمبور پر بھی حملہ کر دیا۔ اس قلعہ کے ہندوؤں
نے بھی شورش برپا کر رکھی تھی۔ پھر سلطان کو اطلاع ملی کہ روہیلکھنڈ اور گنگا جمنا کے
دوآبے میں ہندوؤں نے بغاوت برپا کر رکھی ہے۔ سلطان ایک بڑی فوج لیکر ان
کی سرکوبی کے لئے گیا اور اس بغاوت کو دبانے کے بعد دہلی واپس آگیا۔

مغلوں کی شورش ایک مرض متعدی

سلطان التمش کے دورِ حکومت سے لیکر اس وقت تک
مغل بار بار ہندوستان کے مختلف حصوں میں شورشیں برپا کرتے رہے تھے۔
اور مغلوں کی یہ شورشیں ہندوستان کے لئے ایک مرض متعدی بن گئی تھیں۔ چنانچہ
مغلوں نے ۶۴۸ھ (۱۲۵۰ء) میں دریائے سندھ عبور کر کے پھر ملتان میں شورش
برپا کر دی جسے ملک اختیار الدین نے فوراً دبا دیا۔ اختیار الدین کے بعد صوبہ
سندھ کی گورنری غیاث الدین بلبن کے چچازاد بھائی شیر خاں کے سپرد ہوئی تو
شیر خاں نے بڑی مضبوطی کے ساتھ مغلوں کو کچلا جس کی وجہ سے شیر خاں کا بڑا
نام ہوا۔ ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) میں شیر خاں مغلوں کا تعاقب کرتا ہوا غزنی تک
جا پہنچا اور بے شمار مغلوں کو تہ تیغ کیا۔

ملک میں شورش کا نیا طوفان

مغلوں کی بیرونی شورشوں کی طرح ہندوؤں کی اندرونی شورشوں نے بھی سلطان ناصر الدین محمود کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ چنانچہ سنہ ۶۴۹ھ (۱۲۵۱ء) میں گوالیار، چندیری اور مالوہ وغیرہ میں ہندوؤں نے بغاوتیں کھڑی کر دی تھیں۔ اس کے علاوہ مشہور ہندو سردار جاہر دیو نے بھی سلطان کے مقابلہ کے لیئے دو لاکھ سپاہی تیار کر لیئے تھے۔ سلطان نے اس باغی سردار پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور دوسرے تمام باغیوں کو کچل ڈالا۔

سلطان فتنہ پردازوں کو جتنا دباتا جاتا تھا۔ اتنے ہی یہ سلطان کے مخالف بنتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ سنہ ۶۵۲ھ (۱۲۵۳ء) میں سلطان دورانِ سفر میں جب رام گنگا کے قریب پہنچا تو کئی جگہ راستہ میں ہندوؤں نے سلطان پر قاتلانہ حملہ کی کوشش کی۔ چنانچہ بشیر دستہ کا سردار رضی الملک اسی سفر میں ہندوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جب سلطان نے ان کی یہ شورش پسندی دیکھی تو پھر ان پر حملہ کر دیا۔ اور اچھی طرح سے سرکوبی کی۔ غرضکہ سلطان ناصر الدین محمود کو اپنے دورِ حکومت میں قدم قدم پر شورش پسندوں سے اُلجھنا پڑا ہے۔

وزارت کی تبدیلی پر امرائے سلطنت میں ناگواری

غیاث الدین بلبن ابتدا ہی سے سلطان کا وزیرِ اعظم تھا۔ یہ ایک طرف تو بڑا لائق منتظم تھا اور دوسری جانب بے نظیر سپہ سالار بھی تھا۔ چنانچہ سلطان ناصر الدین محمود کو اپنے دورِ حکومت میں اپنے دشمنوں پر جتنی بھی فتوحات حاصل ہوئی تھیں۔ ان میں بڑا ہاتھ غیاث الدین بلبن کا تھا۔ لیکن علاء الدین ریحانی جو بلبن کا پرانا دشمن تھا یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح بلبن کو بادشاہ کی نظر سے گرا دئے اور اسے اس مقصد میں

کامیابی بھی حاصل ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلبن کی بجائے قلمدانِ وزارت ریحانی کو عطا ہو گیا۔ اور بلبن کو حاکم ہانسی کا عہدہ سپرد کر دیا گیا۔

عمادالدین ریحانی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام گورنروں اور عاملوں کی بھی اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی جو غیاث الدین بلبن کے عہد وزارت میں برسرِ اقتدار تھے امرائے سلطنت اور عمال ابتدا میں تو عمادالدین ریحانی کی ان حرکتوں کو برداشت کرتے رہے لیکن بعد کو ان میں اسقدر ناگواری پیدا ہو گئی کہ سب کے سب بغاوت پر آمادہ ہو گئے جب بادشاہ کو امرا کی اس ناگواری کا علم ہوا تو ریحانی کو بدایوں کا حاکم بنا کر بھیجدیا اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ پھر غیاث الدین بلبن کو مل گیا۔ بلبن کے برسرِ اقتدار آنیکے بعد امرائے سلطنت اور عمال کی ساری ناگواری ختم ہو گئی۔ اور سب نے سلطان کو اپنی وفاداری کا یقین دلا دیا۔

ناصر الدین کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش

سلطان ناصر الدین کا دورِ حکومت اوّل سے لیکر آخر تک بغاوتوں اور سازشوں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے سلطان نے وزارت کی تبدیلی کے بعد امرائے سلطنت اور عمال کو قابو میں کیا ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ اودھ اور کالنجر میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ سلطان فوج لیکر وہاں پہنچا۔ اور اس بغاوت کو دبا دیا۔ غیروں کی بغاوت کے علاوہ خود سلطان کی ماں ملکہ جہاں نے بڑھاپے میں قتلغ خاں سے نکاح کر کے اس کو سلطان کا مخالف بنا دیا تھا۔ چنانچہ قتلغ خاں نے ضلع دہرہ دون کے علاقہ پر قبضہ جما لیا اور پہاڑی ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر سرحد میں سلطان کے مقابلہ کے لئے سامانِ جنگ جمع کرنا شروع کر دیا۔

سلطان نے ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) میں سرمور پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ قتلغ خاں یہاں سے بھاگ کر چتوڑ کے قلعہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد عمادالدین ریحانی اور

حاکم گجرات نے بغاوتیں برپا کردیں۔ سلطان کو ان بغاوتوں کو دبانے میں سخت دشواری پیش آئی۔ عماد الدین ریحانی گرفتاری کے بعد قتل کیا گیا۔ اور حاکم گجرات فرار ہوگیا۔ ابھی ان بغاوتوں سے سلطان کو فرصت نہیں ملی تھی۔ کہ معلوم ہوا کہ مغلوں نے اُچ اور ملتان پر پھر حملہ کر دیا ہے۔ سلطان فوراً ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ لیکن مغل مقابلہ کے بغیر ہی فرار ہو گئے۔

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے پنجاب کے حاکم جلال الدین خاں کو بنگال اور اڑیسہ کا گورنر بنا کر لکھنوتی (ڈھاکہ) بھیجدیا اور پنجاب کی گورنری غیاث الدین بلبن کے چچازاد بھائی شیر خاں کے سپرد کردی۔ اسی زمانہ میں سلطان کو اطلاع ملی کہ کٹرہ مانک پور میں ارسلان خاں اور قلیچ خاں نے فساد برپا کر رکھا ہے۔ لیکن سلطان کے پہنچتے ہی وہاں بھی امن و امان ہوگیا۔

ناصر الدین کے خلاف میواتیوں کی بغاوت

سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت کے آخری دور میں جو سب سے بڑی بغاوت ہوئی وہ میواتیوں نے برپا کی تھی۔ اس بغاوت میں راجپوت۔ میواتی۔ اور سوالک کا راجہ سب ایک ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ ان سب نے مل کر سلطان کے مقابلہ کے لئے ایک بہت بڑا لشکر فراہم کر لیا تھا لیکن غیاث الدین بلبن نے ان پر حملہ کر کے ۶۵۷ھ (۱۲۵۹ء) میں انکو ایسا کچلا کہ پھر یہ سالہا سال تک سر نہ اٹھا سکے۔ یہ میواتی زمانہ دراز سے لوٹ مار اور غارتگری کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ دلی والے بھی ان سے محفوظ نہ تھے لیکن بلبن کی سرکوبی کے بعد ان کے سارے حوصلے پست ہو گئے۔

ہلاکو خاں کا سفیر سلطان ناصر الدین کے دربار میں

اسی سال چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں

کا سفیر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سفیر کی آمد پر استقبال کی شاندار تیاریاں کی گئیں۔ ڈھائی لاکھ فوج اور دو ہزار ہاتھیوں سے شہر کے باہر اس سفیر کا استقبال کیا گیا۔ جب یہ سفیر دربار سلطانی میں حاضر ہوا تو سلطان کی بے اندازہ فوج اور دربار کی شان و شوکت سے کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ واپس جانے پر ہندوستان پر حملہ کرنے کے خیال کو ترک کر دیا۔ چنانچہ چند سال تک مغلوں نے ہندوستان کی جانب رُخ تک نہیں کیا۔

سلطان ناصر الدین محمود کی سادہ زندگی

سلطان ناصر الدین محمود کہنے کے لئے تو ہندوستان کا بادشاہ تھا لیکن اس کی زندگی غریبوں کی طرح نہایت سادہ تھی۔ وہ ایک سال میں اپنے ہاتھ سے دو قرآن مجید لکھتا تھا۔ اور ان ہی کے ہدیہ پر گذارہ کرتا تھا۔ اس کی ایک ہی بیوی تھی جو اپنے ہاتھ سے سلطان کے لئے کھانا پکاتی تھی اور گھر کا سارا کام کاج خود ہی کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی امداد کے لئے ایک خادمہ رکھنے کی سلطان سے خواہش کی تو سلطان نے کہا کہ میری آمدنی اس قدر محدود ہے کہ مجھ میں خادمہ رکھنے کی استطاعت ہی نہیں، رہا شاہی خزانہ وہ سب رعایا کا مال ہے۔ میں اس میں سے ایک کوڑی بھی اپنی ذات کے لئے نہیں لے سکتا۔ سلطان ایک عبادت گذار اور درویش صفت بادشاہ ہوا ہے جس کی ساری عمر بغاوتوں اور سرکشوں کے دبانے میں صرف ہو گئی۔ یہ نیک بادشاہ بیس سال حکومت کرنے کے بعد ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۶ء میں دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن

سلطان ناصرالدین محمود کے چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے اُمرائے وزیر سلطنت غیاث الدین بلبن کو ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۶ء میں دہلی کے تخت پر بٹھادیا۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ اسمیں حکمرانی اور جہانبانی کی بینظیر قابلیت موجود تھی۔ چنانچہ سلطان ناصرالدین محمود کے عہدِ حکومت میں اس نے جس قابلیت کے ساتھ وزارت کی ہے وہ بالکل عیاں ہے۔

غیاث الدین بلبن کی ابتدائی زندگی بھی قطب الدین ایبک اور التمش کی طرح بے حد دلچسپ ہے۔ بلبن بغداد کے ایک بہت بڑے سردار کا بیٹا تھا۔ جب منگولوں نے بغداد کو تاراج کیا تو یہ منگولوں کے ہاتھوں میں اسیر ہوگیا۔ منگولوں نے اسے کسی بردہ فروش کے ہاتھ بیچ دیا۔ جس سے جمال الدین بصری نے خرید لیا۔ اور اسے شمس الدین التمش کی نذر کر دیا۔ التمش چونکہ اس پر بے حد مہربان تھا اس لئے اسے برابر ممتاز عہدوں پر سرفراز کرتا رہا۔ لیکن سلطانہ رضیہ کے عہدِ حکومت میں اسے گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا تھا مگر بعد کو یہ رہا کر دیا گیا اور برابر ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سلطان ناصرالدین کے عہدِ حکومت میں یہ وزیرِ اعظم بن گیا اور اس نے بڑی قابلیت کے ساتھ وزارتِ عظمیٰ کے فرائض انجام دیے۔

بلبن امیرانِ چہلگانی کا سب سے بڑا مخالف

سلطان التمش کی وفات کے وقت اس کے چالیس غلام بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ انہی میں سے ایک بلبن بھی تھا۔ یہ چالیس غلام اُمرائے چہلگانی یا خواجہ تاش کے نام سے مشہور تھے۔ اگر سچ پوچھا

جائے تو دہلی کی حکومت ہی ان چالیس غلاموں کے ہاتھوں میں تھی یہ جو چاہتے تھے کو گذرتے تھے۔ التمش کی وفات کے بعد نا اہل جانشینوں کی وجہ سے دہلی کی حکومت جب کمزور پڑ گئی تو ان اُمرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔

چہلگانی اُمرا جس کو چاہتے تھے تخت پر بٹھا دیتے تھے۔ اور جس کو چاہتے تھے تخت سے معزول کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے ماتحت ہندو راجاؤں کو قابو میں لے کر جہاں چاہے ان سے بغاوتیں برپا کرا دیتے تھے۔ چنانچہ ان چہلگانی اُمرا ہی نے سلطان رُکن الدین کو قتل کرایا۔ اور سلطانہ رضیہ کے خلاف بغاوت کھڑی کی۔ اور ان ہی کے مشورہ سے سلطان بہرام شاہ کا کام تمام ہوا۔ اور انہی کی سازش سے سلطان مسعود قید خانہ میں ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے سلطان ناصر الدین محمود جیسے خدا پرست بادشاہ کو بھی معاف نہیں کیا چنانچہ سب سے زیادہ بغاوتیں اسی فرشتہ صفت سلطان کے عہد حکومت میں کھڑی کی گئیں جن کو دبانے کے لئے بلبن کو بڑی جانفشانی سے کام لینا پڑا۔ ان بغاوتوں میں زیادہ تر ہاتھ ان ہی اُمرائے چہلگانی کا تھا۔ اُمرائے چہلگانی کی اس "ابن الوقتی اور بادشاہ گری" نے بلبن کے دل میں ان کی طرف سے سخت نفرت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ بلبن نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ان اُمرائے چہلگانی کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے بعد سب کو بے دست و پا کر دیا۔

بلبن کو ہندو اُمرا اور حکام پر اعتماد نہ تھا قطب الدین ایبک کے عہد حکومت سے لیکر سلطان ناصر الدین محمود کے عہدِ حکومت تک۔ دہلی کی سلطنت میں ہندوؤں کا اثر و اقتدار برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور ہندو اُمرا بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے

لیکن سلطان ناصر الدین کے عہدِ حکومت میں ہندوؤں نے اُمرائے چہلگانی کے ساتھ سازش کر کے جو پے در پے بغاوتیں کیں اور ان بغاوتوں کی وجہ سے بلبن کو جن شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی وجہ سے بلبن کو ہندو اُمرا اور حکام پر اعتماد نہیں رہا۔ اس کی رائے تھی کہ محمود غزنوی کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک ہندو راجہ اور ہندو حکام جس کردار کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان پر اعتماد کرنا کھلی ہوئی حماقت ہے۔ اس کو برہمنوں سے شدید نفرت تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ ان کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ برسر اقتدار حکومتوں کے خلاف سازشیں کر کے عوام کو انکے خلاف اُبھارتے رہیں۔ بلبن پست اقوام کے لوگوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دینے سے گریز کرتا تھا۔ اس کی رائے تھی کہ پست اور نیچے درجہ کے لوگوں کو بڑے عہدے دینا دیدہ و دانستہ شرفا کے لئے مصیبت پیدا کرنا ہے اس غلطی سے اکثر اوقات حکومتوں کی بنیادیں تک ہل جاتی ہیں چنانچہ اس نے اپنی زندگی میں زیادہ تر عالی نسب اور بڑے خاندانوں کے مسلمانوں کو نوازا۔

بلبن کے زمانہ میں ملک خونریزی سے پاک

ہندوستان میں صدیوں کے بعد بلبن کے زمانہ میں لوگوں نے امن و امان کا دور دورا دیکھا۔ بلبن کے زمانہ میں تقریباً ساری بغاوتیں دب گئی تھیں۔ ان بغاوتوں کے دبنے کا باعث ایک تو چہلگانی اُمرا کا خاتمہ تھا اور دوسرا بڑا سبب بلبن کا رعب داب تھا۔ چنانچہ اس کو دلی سے باہر قدم نکالنے کی بہت ہی کم ضرورت پڑتی تھی۔ اپنے بائیس سال کے دورِ حکومت میں اس کو صرف ایک مرتبہ بنگال کے باغی طغرل خاں کی سرکوبی کے لئے بنگال جانا پڑا تھا۔ جہاں پہنچنے کے بعد بلبن نے طغرل خاں کو قتل کر کے

اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بار وہ میواتیوں کی سرکوبی کے لئے گیا تھا۔ سلطان نے اپنے بھائی شیر خاں کے انتقال کے بعد اپنے بیٹے محمد سلطان کو پنجاب و ملتان کی گورنری کا عہدہ دیدیا تھا۔ محمد سلطان مغلوں کے لئے ایک مضبوط دیوار بنا رہا اس نے مغل حملہ آوروں کا بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ہر مرتبہ ان کو شکست دی لیکن ایک حملہ میں وہ ان ہی مغلوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جس کا سلطان بلبن کو بے حد صدمہ ہوا۔

دہلی میں پناہ گزیں شہزادوں کا ہجوم

بلبن بہت بڑا مہمان نواز اور باحوصلہ بادشاہ تھا۔ اس نے دہلی میں ان تمام بادشاہوں اور شہزادوں کو پناہ دے رکھی تھی جو مغلوں کی یورشوں کی بدولت تخت و تاج سے محروم ہو گئے تھے ان مہاجر بادشاہوں اور شہزادوں کے لئے بلبن کی حکومت کی طرف سے شاہانہ انتظامات تھے ان بادشاہوں اور شہزادوں کی مجموعی تعداد چالیس کے قریب تھی۔ ان کے اہل و عیال اور خدام بھی انکے ساتھ تھے بلبن انکے شاہانہ اخراجات برداشت کرنے میں ایک فخر اور خوشی محسوس کرتا تھا۔

بلبن کے دربار میں مقتدر علما اور صاحبانِ کمال

سلطان بلبن قدر دوست اور علما کا بڑا قدردان تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں مقتدر علما اور اکمال حضرات کا ہمیشہ اجتماع رہتا تھا بلبن کا بیٹا محمد سلطان بھی باپ کی طرح بے حد علم دوست تھا۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو اور خواجہ حسن ایک زمانہ تک محمد سلطان کے ملازم رہ چکے ہیں۔ سلطان بلبن کو اپنے اس بیٹے سے بے حد محبت تھی۔ چنانچہ بلبن کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا محبوب بیٹا محمد سلطان مغلوں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا اور اس صدمہ کے بعد وہ زیادہ مدت تک زندہ نہ رہ سکا۔ چنانچہ ۶۸۵ھ ہجری

مطابق ۱۲۸۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان معزالدین کیقباد

سلطان معزالدین کیقباد خاندان غلامان کا آخری بادشاہ ہوا ہے۔ یہ غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا۔ اس کو محض اس لئے تخت مل گیا کیونکہ بلبن کا بیٹا بغرا خاں بلبن کی موت کے وقت بنگال میں تھا۔ چنانچہ اُمرائے سلطنت نے یہی مناسب سمجھا کہ تخت کو خالی نہ چھوڑا جائے اور بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا جائے کیقباد جس وقت تخت پر بیٹھا اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

جس زمانہ میں کہ بلبن بیمار تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال سے دہلی بلا لیا تھا۔ اور اس کی خواہش تھی کہ بغرا خاں اسی کے پاس رہے تاکہ تخت نشینی کا کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہونے پائے لیکن بغرا خاں باپ کو اطلاع دئے بغیر خاموشی سے بنگال چلا گیا جس کا بلبن کو بے حد رنج اور افسوس ہوا۔ جب بلبن کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو اس نے وصیت کی کہ میرے بعد محمد سلطان مرحوم کے بیٹے کیخسرو کو ملتان سے بُلا کر تخت پر بٹھا دیا جائے لیکن اس وصیت کے تیسرے ہی دن جب اچانک بلبن کا انتقال ہو گیا تو اُمرائے سلطنت کو مجبوراً کیقباد کو تخت پر بٹھانا پڑا۔

کیقباد کی نوعمری اور ناتجربہ کاری اتنی بڑی حکومت کی متحمل نہ ہو سکی۔ چنانچہ سلطنت کے ملتے ہی کیقباد عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔ اور بلبن کا وہ دربار جہاں بادشاہوں علما اور صاحبان کمال کا ہجوم رہتا تھا۔ اب وہاں ڈوم ڈھاری گویئے اور مسخرے نظر آنے لگے۔

کیقباد ہر وقت شراب کے نشہ میں بدمست رہتا تھا۔ اس نے شہر کو چھوڑ کر کیلو گھڑی میں اپنی عشرت گاہ بنالی تھی۔ اسی عشرت گاہ کے متصل کیقباد

کے ہم پیالہ اُمرا اور یاروں کے بھی مکانات بن گئے تھے۔ بادشاہ نے اپنے سارے اختیارات اپنے وزیر نظام الدین کو دیدئے تھے جو درپردہ خود تخت پر بیٹھنے کی سازشیں کر رہا تھا۔ نظام الدین نے چُن چُن کر اُمرا کو قتل کرایا بلبن کے پوتے کیخسرو اور دوسرے شہزادوں کا کام تمام کیا۔ اس کے بعد اس جوڑ توڑ میں لگا رہا کہ کسی طرح کیقباد کو بھی ختم کر کے تخت شاہی پر قبضہ جما لے چنانچہ موقع ملتے ہی اس نے کیقباد کو بھی قتل کرا دیا لیکن اُمرائے سلطنت نے فوراً خلجی خاندان کے ایک امیر ملک جلال الدین کو جو سامانہ کا نائب ناظم تھا۔ اور جس کی عمر ستر سال کی تھی تخت پر بٹھا دیا تو وزیر نظام الدین دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اور اس طرح ترکی غلاموں کے خاندان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد خلجی افغانوں کی حکومت کی ہندوستان میں بُنیاد پڑ گئی۔

خاندانِ غلامان کا سب سے بڑا کارنامہ

خاندانِ غلامان نے ہندوستان میں ۶۰۳ھ (۱۲۰۶ء) سے لیکر ۶۸۸ھ (۱۲۹۰ء) تک بچاسی سال حکومت کی ہے۔ اس خاندان کے دس بادشاہ تخت نشین ہوئے جن میں سے آخری بادشاہ کیقباد تھا۔

اس خاندان کی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں ان مغلوں کے پیر کبھی نہیں جمنے دیئے جنھوں نے کہ دُنیا کی نصف سے زیادہ حکومتوں کو جڑ اور بُنیاد سے اُکھاڑ کر پھینکدیا تھا۔

آٹھواں باب

شاہانِ خلجی کی حکومت

۶۸۸ھ تا ۷۲۱ھ

۱۲۹۰ء ۱۳۲۱ء

شاہانِ خلجی کی حکومت

خاندانِ غلامان نے ہندوستان میں جس خودمختار اور آزاد اسلامی حکومت کی بُنیاد رکھی تھی۔ خلجی خاندان اُس کی دوسری کڑی ہے۔ خلجیوں نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہوئے یہاں حکومت کی اور اس ملک کی ترقی اور فلاح وبہبودی کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ایک محبِ وطن حکومت کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مغلوں جیسی خونخوار بیرونی قوم کا خلجیوں نے بھی اپنے پیشرو حکمرانوں کی طرح بڑی مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور ان کی بھی کوشش برابر یہی رہی کہ کوئی غیرملکی ہندوستان میں قدم نہ رکھنے پائے۔

خلجیوں کی نسل کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور وہ ہندوستان میں کیونکر آئے اس کے بارے میں تاریخ فرشتہ کا یہ کہنا ہے کہ خلجی چنگیز خاں کے داماد قالج خاں کی اولاد ہیں۔ جو قالج کے بعد خالج کہلائے اور اس کے بعد ان کو خالجی یا خلجی کہا جانے لگا۔ لیکن صاحبِ تاریخ سلجوقیان کا بیان ہے کہ ابن یافث کے گیارہ بیٹے تھے جن میں سے ایک کا نام خلج تھا جس کی اولاد خلجی کہلائی۔ اور یہ قول صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ کتب تاریخ میں چنگیز خاں کے عروج سے قبل بھی جا بجا قوم خلج کا ذکر آیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خلجی قبیلہ زمانہ دراز سے غور اور ہرات کے علاقہ میں آباد تھا۔ جس کے اکثر افراد افغانی حملہ آوروں کے ہمراہ ہندوستان آتے رہے ہیں۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین غوری کے عہدِ حکومت میں اسی قبیلہ کے ایک شخص بختیار خلجی نے بنگال و بہار کو فتح کیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک کے دورِ حکومت تک

اس قبیلہ کے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ چنانچہ خلجیوں کا وہ خاندان جس کے دورِ حکومت کا ہم تذکرہ کرنے والے ہیں۔ اس کا اسی افغانی قبیلہ سے سلسلہ نسب ملتا ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

سلطان جلال الدین خلجی کی تخت نشینی

سلطان جلال الدین خلجی ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۹۰ء میں دہلی کے متصل کیلوگرھی میں تخت پر بیٹھا۔ کیلوگرھی وہی جگہ ہے جسے خاندانِ غلامان کے آخری عیش پرست بادشاہ کیقباد نے اپنی عشرت پسندیوں کے لئے منتخب کیا تھا۔ کیقباد یہ چاہتا تھا کہ یہاں ایک نیا شہر تعمیر کرے لیکن اس کی عمر اور حکومت نے وفا نہیں کی۔ کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی نے اسی مقام کو دارالسلطنت کے لئے منتخب کیا کیقباد کے زمانہ کی جو عمارتیں ادھوری پڑی تھیں انکی تکمیل کی جمنا کے کنارے باغ لگوایا اور عمدہ عمدہ مکانات تعمیر کرائے۔

کیلوگرھی جلال الدین خلجی کے زمانہ کی نئی دہلی تھی۔ جسے خلجی سلطان نے خوب آراستہ کیا۔ جلال الدین خلجی کو اس نئی دہلی کے بنانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کیونکہ وہ پرانی دہلی میں بعض اُمرائے سلطنت کے خوف سے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں اُمرائے سلطنت اور دہلی کے باشندے اس کو غاصب خیال کر کے قتل نہ کر ڈالیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا تو عوام میں اور اُمرا کے ایک بڑے طبقہ میں اسکے خلاف انتہائی نفرت پیدا ہو گئی تھی لیکن چند ہی روز کے بعد جب اُمرائے سلطنت اور عوام کو جلال الدین خلجی کی بے اندازہ خوبیوں کا علم ہوا تو بجز چند شرارت پسندوں کے سب اس کے گرویدہ اور عاشق ہو گئے۔

جلال الدین خلجی کی دریا دلی

جلال الدین خلجی ایک طرف تو اتنا

بڑا جنگجو تھا کہ اس نے منگلوں جیسی وحشی قوم تک کے چھکے چھڑا دئے تھے لیکن دوسری طرف انتہا درجہ کا رحم دل خدا ترس اور فیاض بھی تھا۔ چنانچہ اس نے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی نہ صرف اپنے تمام اعزا اور رشتہ داروں کو خوب نوازا۔ بلکہ بلبن کے زمانہ کے اُمرا اور بلبن کے خاندان کے افراد کی بھی خوب پرورش کی۔ وہ طاقت سے لوگوں پر قابو حاصل کرنے کا قائل نہ تھا بلکہ وہ احسان کے ذریعہ دشمنوں کو دوست بنانے کے اُصول پر ساری عمر عامل رہا۔ اُمرائے سلطنت ہمیشہ اس کی اس نرم پالیسی پر اعتراض کرتے رہے لیکن وہ مرتے دم تک اپنے اسی اُصول پر قائم رہا۔

بلبن کا ایک بھتیجہ ملک چھجو تھا جو کہ دہلی کی حکومت کا جائز حقدار تھا اگر کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو وہ تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اس کانٹے کو راستہ سے ہٹاتا لیکن جلال الدین خلجی بجائے اس کے کہ اس کو قتل کراتا یا قید میں ڈلواتا اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اسے کڑہ مانک پور کی صوبیداری پر مامور کر دیا نیز دہلی کی حکومت کے سب سے بڑے حقدار سلطان بلبن کے بیٹے بغرا خاں کو بدستور بنگال کی صوبیداری پر برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے بھتیجوں الماس بیگ اور علاء الدین سے اپنی دونوں لڑکیوں کی شادیاں کر دیں اور اپنے بھانجے احمد حبیب خلجی کو وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ نیز بلبن کے عہد کے معززین کو ان کے مرتبوں پر قائم اور برقرار رکھا۔

سلطان کے تین بیٹے تھے۔ جن میں سے منجھلا لڑکا ارکلی خاں بڑا شجاع اور اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار تھا۔ سلطان نے بڑے لڑکے اختیار الدین کو خانخاناں کا، منجھلے لڑکے کو ارکلی خاں کا اور چھوٹے بیٹے کو قدر خاں کا خطاب عطا کیا۔

غرضکہ جلال الدین نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنوں اور غیروں کے ساتھ جس

دریادلی اور وسیع نظری کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مفقود ہے۔ لیکن افسوس کہ اس دریادل سلطان کی فیاضیوں سے سب ہی نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اور اس کی محبت رحم مروت اور نرمی کو بڑھاپے کی کمزوری پر محمول کیا گیا۔

ملک چھجو کی بغاوت

سلطان کو اپنی اس دریادلی اور وسیع نظری کے جرم میں سب سے پہلے بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کی بغاوت سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس بغاوت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک چھجو کے ہندو مصاحبوں اور کڑہ مانک پور کے ہندو جاگیرداروں نے ملک چھجو کو یہ کہہ کر بغاوت پر اُبھارا اگر حکومت کے اصلی مالک تو آپ ہیں۔ خلجیوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ خود تو حکومت کریں اور آپ کو جو در اصل مالک ہیں نوکر سمجھیں۔ چنانچہ اس نواح کے جاگیردار زمیندار اور ہندو راجہ ملک چھجو کے ساتھ مل گئے اور اُن کی مدد سے پیادوں نیز سواروں کا ایک بہت بڑا لشکر ملک چھجو کے پاس جمع ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ بلبن کا مولازادہ حاتم خاں صوبیدار اودھ بھی اس بغاوت میں ملک چھجو کے ساتھ شریک ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ملک چھجو نے کڑہ مانک پور میں تاج شاہی سر پر رکھ کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور سلطان مغیث الدین کا لقب بھی اختیار کر لیا۔ اس کے علاوہ ملک چھجو کے نام کا سکہ اور خطبہ بھی جاری ہو گیا۔

تاجپوشی کی رسم سے فارغ ہونے کے بعد ملک چھجو لاتعداد ہندو فوج لیکر دہلی کے تخت پر قبضہ جمانے کے لئے کڑہ مانک پور سے روانہ ہو گیا جب سلطان کو اس بغاوت کا علم ہوا تو اس نے فوراً اپنے بیٹے ارکلی خاں کو بطور ہراول ایک دستہ فوج دیکر پہلے روانہ کر دیا۔ اور بعد میں خود ایک بڑا لشکر لیکر ملک چھجو

کے مقابلہ کے لئے جا پہنچا۔ بدایوں سے آگے بڑھ کر ارکلی خاں کے دستہ کا ملک
پجھو کے لشکر سے تصادم ہوا۔ ملک پجھو کی ہندو فوج نے حملہ سے قبل "سلطان
مغیث الدین کی جے" کے خوب نعرے لگائے۔ لیکن جب ارکلی خاں نے
اپنی چھوٹی سی جمعیت سے ان پر حملہ کیا تو یہ سب تتر بتر ہو گئے اور بھاگتے
نظر آئے۔ ملک پجھو بھی فرار ہو گیا۔ لیکن ایک ہندو مقدم نے دوسرے ہی دن
اسے گرفتار کر کے سلطان کی خدمت میں لاکر پیش کر دیا۔

ملک پجھو کے علاوہ ان تمام باغی اُمرا۔ راجاؤں اور جاگیر داروں کو
بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جو اس بغاوت میں ملک پجھو کے ساتھ شامل تھے۔ ارکلی
خاں نے ان سب کو اونٹوں پر سوار کر کے سلطان کے پاس روانہ کر دیا۔

امیر خسرو جو سلطان کے مقربین میں سے تھے۔ ان کا چشم دید بیان ہے کہ باغیوں
کا یہ قافلہ جب دہلی آیا تو ان کی گردنوں میں دو شاخے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ پس
پشت بندھے ہوئے تھے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سلطان نے
ان کو دیکھتے ہی چلا کر کہا "ارے یہ کیا قیامت ہے۔ ان کو اونٹوں سے اُتارو
گردنوں سے دو شاخے نکالو اور اُن کے ہاتھ کھولو اور انھیں معززین اور اُمرا
کے خالی خیموں میں لیجاؤ"۔ بادشاہ کا حکم پاتے ہی ان کا ہاتھ منھ دُھلایا گیا۔ کپڑے
بدلوائے گئے۔ بادشاہ نے ان کی خوب تواضع کی اور اُن سب کا قصور معاف
کر دیا اور ملک پجھو کو ملتان بھیجدیا اور حکم دیدیا کہ انکو نہایت عمدہ مکان میں رکھا جائے
اور عیش و طرب کا سب سامان مہیا کر دیا جائے۔ پھر ملک پجھو کی جگہ اپنے بھتیجے اور
داماد علاء الدین کو کڑہ مانک پور کا حاکم مقرر کر دیا۔

ملک پجھو اور دوسرے باغیوں کے ساتھ بادشاہ کی اس بے موقع نوازشوں
سے وزیر اعظم اور اُمرائے دربار کو سخت ناگواری پیدا ہوئی اور اُمرا نے بادشاہ

سے کہا کہ اگر آپ باغیوں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ اسی طرح نرمی اختیار کرتے رہے تو حکومت کا سارا رعب ختم ہو جائے گا۔ اور ملک کے ہر حصہ میں بغاوتیں برپا ہو جائیں گی۔ بادشاہ نے جواب دیا مجھ کو دنیاوی بادشاہت سے کہیں زیادہ عاقبت کی جوابدہی کا خوف ہے۔ بادشاہ کی اس نرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں چوروں اور ڈاکوؤں تک نے فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کر دیا۔ لیکن جب یہ چور اور ڈاکو بادشاہ کے سامنے پکڑے ہوئے آتے تو بادشاہ ان سے قول و قسم لیکر اور وعظ و پند سُنا نے کے بعد چھوڑ دیتا۔ غرضکہ سلطان جلال الدین خلجی اپنے بدترین دشمنوں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ بھی انتہائی نرمی اور مروت کا سلوک کرتا تھا۔ اس بادشاہ میں یہ ایسی صفت تھی جو اس سے قبل کسی بادشاہ میں نہیں دیکھی گئی۔

سلطان جلال الدین — سلطان کے عہد میں مشہور بزرگ سید مولہ کا قتل

جیسے فرشتہ صفت اور خدا ترس بادشاہ کے عہدِ حکومت میں دہلی کے مشہور بزرگ سید مولہ کا قتل ایک ایسا واقعہ ہے جو کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جلال الدین کے عہد میں یہ ظلم کیونکر ہوا۔ سید مولہ ایک مشہور بزرگ ہوئے ہیں جن کی خانقاہ دہلی میں تھی۔ اور جن کے لنگر سے ہزاروں بندگان خدا کو روزانہ کھانا ملتا تھا۔ بظاہر ان بزرگ کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ لیکن ان کا خرچ ہزاروں روپیہ روزانہ کا تھا۔ اُمرائے سلطنت اور دہلی کے باشندے ان بزرگ کے بے حد معتقد تھے۔

سید مولہ کے قتل کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ بعض شرارت پسند اُمرا کے ورغلانے پر یہ بزرگ اس کے لئے آمادہ ہو گئے تھے کہ سلطان کو قتل کرنے کے

بعد خود اپنی حکومت قائم کرلی جائے چنانچہ جب اس کی اطلاع جلال الدین خلجی کو ہوئی تو بادشاہ نے سید مولہ کو دربار میں بلایا اور اُن سے اس کی حقیقت پوچھی سید مولہ اور ان کے ساتھیوں نے صاف انکار کر دیا مگر بادشاہ کو یقین نہیں آیا اور اس نے اُن لوگوں کو سخت سُست کہنا شروع کر دیا۔ ادھر بادشاہ کے بیٹے ارکلی خاں نے فیل بان کو اشارہ کر کے سید مولہ کو ہاتھی سے کچلوا دیا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد ہی ۶۹۰ھ (۱۲۹۲ء) میں دہلی میں ایسا قحط پڑا کہ ہزاروں تڑپ تڑپ کر مر گئے اور ہزاروں نے جمنا میں ڈوب کر خود کشی کرلی اور اسی سال بادشاہ کا بڑا بیٹا اختیار الدین خان خاناں بیمار ہو کر مر گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ساری مصیبت سید مولہ کے قتل کا نتیجہ تھی۔

مغلوں کا حملہ اور مالوہ کی بغاوت

۶۹۱ھ (۱۲۹۳ء) میں ہلاکو خاں مغل کے پوتے نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ سلطان خود اس کے مقابلہ کے لئے ایک بڑی فوج لیکر پنجاب پہنچا۔ سلطان کو مغلوں پر فتح حاصل ہو گئی۔ اور مغل سردار گرفتار ہونے کے بعد سلطان کی خدمت میں پیش کئے گئے لیکن بعد میں جانبین کی کوششوں سے صلح ہو گئی۔ ہلاکو خاں کا پوتا خود سلطان سے ملاقات کے لئے آیا۔ اس صلح کے بعد مغل ہندوستان سے واپس چلے گئے لیکن چنگیز خاں کا ایک پوتا الغو خاں معہ چند بڑے بڑے سرداروں کے سلطان جلال الدین کی خدمت میں رہ گیا جب سلطان پنجاب سے دہلی واپس ہوا تو الغو خاں اور دوسرے مغل سردار بھی سلطان کے ساتھ دہلی آ گئے۔ اور ان سب نے بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ سلطان نے نو مسلم الغو خاں کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ باقی مغلوں نے اپنے بیوی بچوں کو دہلی بلا لیا اور دہلی میں آباد ہو گئے۔

۶۹۱ھ (۱۲۹۳ء) میں جب سلطان جلال الدین کو اطلاع ملی کہ مالوہ میں بغاوت برپا ہو گئی ہے تو سلطان اپنے بیٹے ارکلی خاں کو دہلی میں چھوڑ کر خود مالوہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اجین کو فتح کیا۔ وہاں کے بت خانہ کو توڑا۔ مالوہ کو تخت وتاراج کیا لیکن محاصرہ کے باوجود رنتھنبور کا قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ رنتھنبور کا راجہ مع اہل وعیال کے قلعہ بند ہو گیا تھا۔ آخر سلطان اس قلعہ کو فتح کئے بغیر ہی محاصرہ اُٹھانے کے بعد دہلی واپس آ گیا۔ وزیر اور اُمرائے سلطنت نے بلاوجہ محاصرہ اُٹھانے اور بغیر فتح کے واپس چلے آنے کا سبب پوچھا تو بادشاہ نے کہا کہ "یہ قلعہ فتح تو ضرور ہو جاتا لیکن اس پر اتنی زیادہ انسانی جانیں قربان ہو جاتیں کہ ان کے مقابلہ میں اس قلعہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ میرے نزدیک انسانی جان اتنی ارزاں نہیں ہے جتنی کہ بادشاہ عام طور پر سمجھتے ہیں"۔

سلطان کے داماد اور ملکہ میں عداوت

علاء الدین جو سلطان کا داماد بھی تھا اور بھتیجہ بھی اس کے تعلقات اپنی بیوی اور ساس کے ساتھ نہایت خراب تھے۔ معاملات اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ علاء الدین کو ہر وقت خوف رہتا تھا کہ ملکہ جہاں یعنی اس کی ساس اسے قتل نہ کرا دے۔ چنانچہ ملک چھجو کی بغاوت کو دباتے کے بعد جب سلطان جلال الدین بدایوں سے دہلی واپس آیا اور ملک چھجو کی جگہ علاء الدین کو کڑا مانک پور کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا تو علاء الدین اس تقرر سے بے حد خوش ہوا کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ دارالسلطنت سے دور رہے تاکہ ملکہ جہاں کا ہاتھ اس پر نہ پڑ سکے۔

علاء الدین اور کڑہ کے فتنہ پردازوں کی سازش

جب علاء الدین

ملک چھجو کی جگہ کڑہ مانکپور کا حاکم ہو کر کڑہ پہنچا اور کڑہ کے ہندو راجاؤں اور
جاگیرداروں کو یہ معلوم ہوا کہ علاء الدین کے تعلقات ملکہ جہاں سے کشیدہ ہیں تو بقول
ضیا برنی ان فتنہ پردازوں نے ملک چھجو کی طرح علاء الدین کو بھی سلطان اور ملکہ
کے خلاف ابھارنا شروع کیا اور علاء الدین کو یہ یقین دلادیا کہ چھجو کو محض روپیہ
کی کمی کی وجہ سے شکست ہوگئی تھی اگر آپ روپیہ فراہم کرلیں تو ہم آپ کو دہلی کا
تخت دلانے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی علاء الدین کے ہندو
مصاحبوں نے اس کو مشورہ دیا کہ اگر بھلسہ پر حملہ کیا جائے تو وہاں سے بے اندازہ
دولت ہاتھ آسکتی ہے چنانچہ علاء الدین بھلسہ پر حملے کے لئے موقع تلاش کرنے لگا

علاء الدین کا بھلسہ پر حملہ

جب ۶۹۱ھ (۱۲۹۳ء) میں مندور کے ہندوؤں کی بغاوت نے زور پکڑا
اور سلطان نے مندور جاگران کی سرکوبی کی تو علاء الدین نے بھلسہ پر فوج کشی کی
سلطان سے اجازت حاصل کرلی چنانچہ علاء الدین نے مال و دولت کے لالچ میں
بھلسہ پر حملہ کرکے اسے فتح تو کرلیا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ اسے وہاں سے برائے
نام مال غنیمت اور کانسی کے ایک بہت بڑے بت کے سوا کچھ نہیں ملا جسے وہ
گاڑی پر لدھوا کر دہلی لے گیا۔ سلطان جلال الدین نے اس فتح سے خوش ہو کر اس
مرتبہ اودھ کا ملک بھی اس کی حکومت میں دیدیا۔

علاء الدین نے اپنے اوپر سلطان کو مہربان دیکھ کر روپیہ جمع کرنے کی ایک
دوسری ترکیب سوچی۔ اس نے سلطان سے کہا کہ "چندیری کا علاقہ حکومت دہلی
سے بالکل الگ ہوگیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو دو سال تک کڑہ اور اودھ
کا خراج روک کر اپنی فوجی طاقت بڑھالوں پھر اس فوج سے چندیری اور
دوسرے علاقے فتح کرکے دہلی کی حکومت میں ان کو شامل کردوں۔ اور اسکے

بعد سارا خراج بھی ادا کردوں" سلطان نے اجازت دیدی۔ علاء الدین یہ چال چلنے کے بعد دہلی سے کڑہ آیا اور در پردہ دکن پر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ محض اس لئے کہ اسے دکن سے بے حد مال و دولت ملنے کی اُمید تھی۔

علاء الدین کا دکن پر حملہ

۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) میں علاء الدین دیوگیر (دولت آباد) پر حملہ کی غرض سے چھ ہزار سوار لیکر کڑہ سے روانہ ہوگیا۔ لیکن سب پر ظاہر یہی کیا کہ وہ چندیری کی فتح کے لئے جارہا ہے۔ اس مہم کو پوشیدہ رکھنے کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس نے سلطان جلال الدین سے اجازت لئے بغیر محض دولت کے لالچ میں یہ قدم اُٹھایا تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ دیوگیر کی دولت اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ چنانچہ علاء الدین بڑی تیزی کے ساتھ منزلوں کو طے کرتا ہوا دو مہینے کے اندر دیوگیر کے قریب جا پہنچا۔ راستہ میں متعدد ریاستیں اسے ملیں لیکن اس نے کسی طرف بھی رُخ نہ کیا کیونکہ اس کی منزلِ مقصود تو دیوگیر تھی جہاں اُس زمانہ میں بے اندازہ دولت موجود تھی۔

علاء الدین نے دیوگیر کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے شہر ایلچ پور کو فتح کیا اور اس کے بعد فوراً دیوگیر یعنی دولت آباد کی فتح کے لئے روانہ ہوگیا۔ جب دیوگیر کے راجہ رام دیو کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اس کی ریاست پر چڑھائی کردی ہے۔ تو وہ فوج لیکر شہر سے نکلا اور علاء الدین کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن راجہ کے دکھنی سپاہی جو مسلمانوں کا نام سُن کر ہی خائف ہوگئے تھے۔ علاء الدین کی فوج کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکے۔ راجہ کو شکست ہوگئی اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر قلعہ میں پناہ گزیں ہوگیا۔ علاء الدین نے آگے بڑھ کر شہر دیوگیر پر قبضہ کرلیا۔ اور دل کھول کر مہاجنوں کو اور شہر کے

باشندوں کو لوٹا۔ اس کے بعد قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔ اور یہ شہرت دیدی کہ مسلمانوں کی بیس ہزار فوج دیوگیر کے قلعہ کو فتح کرنے کے لئے اور آ رہی ہے راجہ نے سوچا کہ پہلے ہی کافی تباہی مچ چکی ہے۔ اگر بیس ہزار فوج اور آگئی تو جان بچانا بھی مشکل ہو جائیگا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ مسلمانوں سے صلح کرلی جائے چنانچہ صلح کی بات چیت شروع ہوئی اور صلح ہو گئی۔ صلح کی شرائط کے مطابق راجہ نے علاءالدین کو پچاس من سونا کئی من موتی اور بے اندازہ ریشمی کپڑا بطور نذر دیا۔

علاءالدین اس مالِ غنیمت کو حاصل کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اچانک راجہ کے بیٹے نے جو ریاست سے باہر تھا قریب جوار کے راجاؤں کی امداد سے ایک بڑا لشکر جمع کر لیا اور علاءالدین کے مقابلہ پر آنے کے بعد علاءالدین کو چیلنج دیا کہ جو کچھ تم نے لوٹ مار کی ہے اور مالِ غنیمت حاصل کیا ہے وہ سب رکھ دو۔ اور فوراً ریاست سے باہر چلے جاؤ۔ ورنہ تم یہاں سے زندہ بچکر نہیں جا سکو گے۔ ہمارے پاس تمہارے مقابلہ کے لئے بے اندازہ لشکر اور طاقت موجود ہے۔ علاءالدین نے اس کے جواب میں فوراً پلٹ کر دکھنی لشکر پر حملہ کر دیا۔ راجہ کا بیٹا بڑی بہادری کے ساتھ لڑا لیکن آخر میں ہندو فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور علاءالدین کو فتح حاصل ہو گئی۔

علاءالدین اب پھر قلعہ کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے شہر میں قتل عام اور غارتگری بھی شروع کر دی۔ راجہ نے پھر دوبارہ صلح کی بات چیت شروع کی۔ لیکن علاءالدین کسی طرح صلح کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر راجہ کے ایلچیوں نے بڑی منت سماجت کے بعد علاءالدین کو صلح کے لئے آمادہ کر لیا۔ لیکن اس مرتبہ راجہ کو اپنا سب کچھ علاءالدین کو دیدینا پڑا یعنی راجہ نے چھ سو من سونا، سات من موتی۔ دو من لعل۔ یاقوت اور زمرد وغیرہ۔ ایک ہزار من چاندی۔ چار ہزار ریشمی کپڑے

کے تھان اور بے اندازہ غلہ علاء الدین کی نذر کیا۔ اس کے علاوہ ایلچپور اور اس کے متعلق علاقے بھی علاء الدین کے مطالبہ پر راجہ نے اسے دیدیئے۔ غرضکہ علاء الدین جہاں سے بہت بڑا خزانہ لیکر کڑہ کیلئے روانہ ہوگیا مورخوں کی رائے ہے کہ علاء الدین نے دیوگیر سے جو دولت حاصل کی تھی وہ اس تمام مال و دولت کے مجموعہ سے بدرجہا زیادہ تھی جو محمد بن قاسم کے تا سے لیکر شہاب الدین غوری کے زمانہ تک مسلمانوں نے ہندوستان سے حاصل کی تھی۔

سلطان جلال الدین خلجی کا قتل

علاء الدین کی یہ دیرینہ تمنا اور آرزو پوری ہو چکی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح بے اندازہ مال و دولت حاصل ہو جائے تاکہ اس دولت کی مدد سے وہ اپنے چچا جلال الدین خلجی کو راستہ سے ہٹانے کے بعد دہلی کے تخت پر قابض ہو سکے جہاں تک کڑہ اور قرب و جوار کے ہندو راجاؤں۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کا تعلق ہے وہ پہلے ہی سے علاء الدین کے مصاحب اور ہمنوا بنے ہوئے تھے بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو انھوں ہی نے علاء الدین کو اس مقصد کے لئے ابھارا تھا۔ اور انھوں ہی نے دیوگیر کی بے اندازہ دولت کا اسے پتہ بتایا تھا۔ اب جبکہ علاء الدین کے پاس دولت بھی تھی اور اس کے مددگار بھی موجود تھے تو اس نے سلطان جلال الدین کو راستہ سے ہٹانے کے لئے سازشیں شروع کردیں۔

سلطان جلال الدین گوالیار میں تھا کہ اسے پتہ چلا کہ اس کے بھتیجے نے دکن پر حملہ کر کے بے اندازہ دولت حاصل کی ہے۔ اس اطلاع پر جلال الدین بیحد خوش ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ وہ اس فتح پر مبارکباد دینے کے لئے خود کڑہ جائے مگر وزیر اعظم اور امراء جو علاء الدین کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے انھوں نے بادشاہ کو خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اس سفر سے روکا اور بادشاہ دہلی چلا آیا۔

سلطان جلال الدین کے دہلی آنے کے بعد سلطان کو علاء الدین کا ایک خط ملا جس میں انتہائی خوشامد اور لجاجت کا اظہار کرتے ہوئے وفاداری کا یقین دلایا گیا تھا۔ اور قدمبوسی کی تمنا اور آرزو کا اظہار کیا گیا تھا۔ بادشاہ اس خط سے بے حد خوش ہوا۔ ادھر علاء الدین کے بھائی الماس بیگ نے بادشاہ کو شیشے میں اتارنا شروع کیا اور بادشاہ سے کہا کہ چونکہ علاء الدین بغیر آپ کی اجازت کے دکن پر حملہ آور ہوا تھا اسلئے وہ آپکی خدمت میں حاضر ہونے سے ڈرتا ہے۔ اور وہ اتنا خوفزدہ ہے کہ اندیشہ ہے کہ کہیں زہر نہ کھالے۔ اس لئے آپ جو اس کے باپ کی جگہ ہیں خود کڑہ جا کر اس خوف کو اسکے دل سے کیوں نہیں نکال دیتے۔ سادہ دل بادشاہ اس کے لئے تیار ہو گیا چونکہ وہ فوج کے ہمراہ جانا چاہتا تھا اس لئے الماس بیگ نے اس موقع پر بادشاہ کو فوج لے جانے سے باز رکھنے کے لئے پٹی پڑھائی کہ اگر آپ فوج لیکر جائینگے تو اندیشہ ہے کہ علاء الدین اس کا کچھ اور مطلب سمجھ کر کہیں خودکشی نہ کرلے یا دکن کا سب مال لیکر کسی طرف کو نہ نکل جائے اس لئے آپکو چاہیئے کہ یہ سفر بغیر فوج کے کریں۔

بادشاہ جس کو کہ خود بھی دکن کے خزانہ کی بے حد طمع تھی جب اس کو خزانہ کے نکل جانیکا خوف دلایا گیا تو وہ بغیر فوج کے الماس بیگ کو ہمراہ لیکر کڑہ روانہ ہو گیا بادشاہ کو اپنے بھتیجے علاء الدین پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ وہ کسی وسوسے یا اندیشے کے بغیر کڑہ پہنچ گیا لیکن جیسے ہی وہ کشتی سے اترا علاء الدین کے آدمیوں نے تلوار کے ذریعہ اس کا کام تمام کر دیا۔ سلطان کو جس وقت جام شہادت پلایا گیا وہ روزہ سے تھا۔ یہ واقعہ ۱۷ رمضان ۶۹۴ھ (۱۲۹۵ء) کو پیش آیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ۱۷ رمضان ہی کو حضرت علیؓ شہید ہوئے تھے۔ اور یہی مبارک دن اس خدا ترس بادشاہ کو بھی نصیب ہوا۔ قتل کے بعد بادشاہ کا سر کاٹ کر اور اسے نیزے پر چڑھا کر شہر اور فوج میں گھمایا گیا۔

سلطان جلال الدین خلجی کی بلند شخصیت

سلطان جلال الدین خلجی جس نے صرف چھ سال ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ ایک نہایت ہی نیک دل خدا ترس اور فیاض طبع انسان تھا۔ وہ عام بادشاہوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے سینہ میں ایک درد بھرا دل تھا۔ وہ معمولی سے معمولی انسان کی تکلیف پر بے چین ہو جاتا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ اس کی رعایا میں سے کسی ایک فرد کو بھی تکلیف نہ پہنچے۔ اس نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو نوازنے میں کبھی خست سے کام نہیں لیا۔ ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے یہاں تک کہ وہ اپنے ایک عزیز یعنی علاء الدین ہی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا دورِ حکومت ملک اور رعایا کے لئے ایک نعمت تھا۔

قدر خاں کی تخت نشینی

چچا کا خاتمہ کرنے کے بعد اب علاء الدین کیلئے دہلی کے تخت کے حاصل کرنے کا سب سے بڑا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ اس کو سب سے بڑا اندیشہ سلطان کے بیٹے ارکلی خاں سے تھا۔ جو سلطان کا صحیح جانشین ہونے کے علاوہ لائق ترین سپہ سالار بھی تھا لیکن علاء الدین کی خوش قسمتی کہ سلطان جلال الدین کے قتل کی اطلاع سنتے ہی سلطان کی بیوہ "ملکہ جہاں" نے اپنے نوعمر بیٹے قدر خاں کو رکن الدین ابراہیم کا خطاب دیکر تخت پر بٹھا دیا۔ ارکلی خاں جو اس وقت ملتان میں تھا۔ اسے جب ماں کی اس بے انصافی اور زیادتی کی خبر پہنچی تو اس نے بدظن ہو کر ملتان سے دہلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اس طرح ملکہ جہاں کی بے عقلی سے علاء الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہو گیا۔

علاء الدین اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے فوراً ایک بڑے لشکر کے ساتھ دہلی

کے لئے روانہ ہوگیا۔ وہ جس علاقہ سے بھی گذرتا تھا روپیہ لٹاتا جاتا تھا تاکہ عوام کی ہمدردی اس کو حاصل ہو جائے۔ بلند شہر کے قریب علاء الدین کے لشکر کا مقابلہ سلطانی اُمرا کے لشکر سے ہوا۔ لیکن علاء الدین نے سلطانی لشکر کے سرداروں کو چالیس چالیس اور پچاس پچاس من سونا دے کر اپنے ساتھ ملالیا اور سلطانی لشکر کے سپاہیوں میں دل کھول کر روپیہ تقسیم کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطانی لشکر بھی اس کا ساتھی بن گیا۔ جب علاء الدین دہلی پہنچا ہے تو دہلی کا تخت اس کے لئے خالی تھا۔ اس لئے کہ علاء الدین کی ساس یعنی قدر خاں کی ماں علاء الدین کے خوف سے دہلی چھوڑ کر ملتان کے لئے روانہ ہو چکی تھی۔ اور دہلی کا نام نہاد بادشاہ قدر خاں بھی اسی کے ساتھ جا چکا تھا۔

سلطان علاء الدین خلجی

سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۵۶ء کو دہلی میں داخل ہونے کے بعد بڑی دھوم کے ساتھ اپنی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ تین شبانہ روز جشن منایا گیا۔ سرکاری خرچ پر دہلی کی آئینہ بندی ہوئی اور جا بجا شراب کی سبیلیں لگائی گئیں۔ مقربین اور عزیزوں کو خطابات عطا کئے گئے۔ چنانچہ اپنے بھائی الماس خاں کو الغ خاں کا خطاب دیا۔ ملک نصرت کو نصرت خاں کا خطاب عطا ہوا۔ ضیا برنی کے باپ موید الملک کو برن یعنی بلند شہر کی حکومت دی گئی۔ اور دیگر مقربین کو بھی خوب نوازا گیا۔

جلال الدین کے خاندان پر بے پناہ مظالم

خطابات عہدوں اور جاگیروں کی تقسیم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان علاء الدین نے اپنے چچا جلال الدین کے خاندان کی بیخ کنی کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے ملتان کی جانب فوج بھیجکر سلطان جلال الدین خلجی کے بیٹوں کو گرفتار کر کے اندھا کرایا۔ ارکلی خاں کے دو بیٹوں کو قتل کرا دیا سلطان جلال الدین کے داماد الغو خاں نبیرہ چنگیز خاں اور ملک احمد حبیب کی آنکھیں نکلوا کر ان کو قلعہ ہانسی میں قید کر دیا۔ اور اپنی ساس ملکہ جہاں کو جس کا علاء الدین پرانا دشمن تھا مع حرم کی دوسری عورتوں کے دہلی میں قید کر دیا۔ غرضکہ علاء الدین نے اپنے چچا جلال الدین کے خاندان کو ایک سرے سے بالکل صاف کر دیا۔

اس قتل عام اور غارتگری سے فرصت پانے کے بعد ۶۹۶ھ (۱۲۹۷ء)

میں علاء الدین نے الغ خاں اور ظفر خاں کو ان مغلوں کے مقابلہ کے لئے بھیجا جو سندھ ملتان اور پنجاب کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے برابر بڑھے چلے آرہے تھے۔ جالندھر کے قریب مغلوں کے لشکر میں اور علاء الدین کی فوج میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں مغل حسب معمول شکست کھا کر بھاگ گئے۔ غرضکہ علاء الدین نے تخت پر بیٹھنے کے فوراً ہی بعد کچھ تو قتل و خون اور تشدد سے اور کچھ مغلوں پر فتح پا کر اچھی طرح سے سارے ملک پر اپنی دھاگ بٹھادی۔

گجرات اور سوستان کی فتح

سلطان علاء الدین جب اپنے چچا کے خاندان کو ٹھکانے لگا چکا اور اسے یہ یقین ہوگیا کہ اب اس کی حکومت مستحکم ہوگئی ہے تو اس نے جدید فتوحات کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے اس نے گجرات اور سوستان کی فتح کے لئے لشکر روانہ کئے۔ چنانچہ ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) میں اس کے بھائی الغ خاں اور نصرت خاں نے گجرات پر حملہ کر دیا۔ گجرات در اصل اسلامی حکومت کا مقبوضہ تھا لیکن وہاں کے راجہ کرن رائے نے خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس لئے گجرات کو نئے سرے سے فتح کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ الغ خاں اور نصرت خاں نے گجرات اور نہروالا کو تاخت و تاراج کر کے فتح کر لیا۔ راجہ کرن رائے نے بھاگ کر دیوگیر کے راجہ رام دیو کے پاس پناہ لی اس کی رانی کنولا دیوی۔ دوسری رانیاں، لوٹ کیا خزانہ اور بہت سے ہاتھی سلطانی لشکر کے ہاتھ آئے۔

گجرات کے بعد نصرت خاں کھمبات پہنچا وہاں کے ساہوکاروں سے بہت کچھ جواہرات اور روپیہ وصول کیا۔ اور ایک ساہوکار سے نہایت ہی حسین غلام جس کا نام کافور تھا زبردستی چھین لیا۔ ساہوکار نے اس لڑکے کو امرد بنا کر اپنی خدمت کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ غرضکہ گجرات اور کھمبات سے فارغ ہونیکے بعد

الغ خاں اور نصرت خاں یہ تمام مالِ غنیمت لیکر دہلی کی طرف روانہ ہو گئے اور گجرات کا علاقہ حکومت دہلی کے نائب کے سپرد کر دیا۔ لیکن راستہ میں فوج نے الغ خاں اور نصرت خاں کے بُرے سلوک سے تنگ آ کر بغاوت کر دی۔

اس بغاوت میں سلطان کا بھانجہ اور نصرت خاں کا بھائی مارا گیا۔ نصرت خاں اور الغ خاں اس بغاوت کو دبانے کے بعد مالِ غنیمت اور لونڈی غلاموں کو لیکر دہلی پہنچے اور ان کو سلطان علاءالدین کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان کی نظر کنولا دیوی پر پڑی تو وہ اس کے حسن وجمال پر ایسا لٹو ہوا کہ اُسے مسلمان کر کے نکاح کر لیا۔ اور اسے ملکہ کا درجہ دیدیا۔ کنولا دیوی کے علاوہ کافور غلام بھی سلطان کا ایسا منظورِ نظر ثابت ہوا کہ سلطان کی نوازشوں نے اسے وزارتِ عظلے کے عہدہ تک پہنچا دیا۔

گجرات کی طرح سوستان بھی جو سندھ کا ایک حصہ تھا۔ زمانۂ دراز سے سلطنت اسلامیہ کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا لیکن سوستان کے راجہ جھیل دیو نے مغلوں کے زیر اثر آنے کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا جس کی بنا پر اسی سال ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) میں ظفر خاں نے اس ریاست پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ راجہ اور اس کے مغل دوستوں کو گرفتار کر کے مع مالِ غنیمت کے دہلی بھیجدیا۔ اور اس طرح سوستان پر پھر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ غرضکہ ان فتوحات نے علاءالدین کی طاقت اور غرور میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

مغلوں کا دہلی پر سب سے بڑا حملہ

مغلوں نے سلطان التمش کے زمانہ سے ہندوستان کو اپنی لوٹ اور غارتگری کا میدان بنا رکھا تھا۔ چنانچہ ۶۹۸ھ (۱۲۹۹ء) میں انھوں نے قتلغ خاں خواجہ کی سرکردگی میں دو لاکھ سواروں کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کر کے سلطان علاءالدین

کیلئے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی مغل اس مرتبہ چونکہ لوٹ مار کیلئے نہیں آئے تھے بلکہ وہ ہندوستان کو فتح کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس لئے وہ شہروں اور قصبوں کو لوٹے بغیر سیدھے دہلی پہنچ گئے اور دو لاکھ کا لشکر لاکر دہلی کی فصیل کے نیچے کھڑا کر دیا۔

مغلوں کے حملہ کی اطلاع ہوتے ہی تمام شہر میں بھگدڑ مچ گئی۔ سلطان علاءالدین نے جوں توں کر کے تین لاکھ کی فوج جمع کی۔ اور اس فوج کا سپہ سالار ظفر خاں کو بنایا جو اس سے قبل بھی مغلوں کو شکست دے چکا تھا سلطان اور ظفر خاں سپہ سالار دونوں اس فوج کو لیکر شہر سے باہر نکلے اور مغلوں پر پل پڑے۔ سخت معرکہ آرائی کے بعد مغلوں کو شکست ہو گئی۔ لیکن ظفر خاں جیسا بہادر اس جنگ میں کام آگیا۔ سلطان نے اس عظیم الشان معرکہ میں فتح حاصل کرنے کے بعد سکندر ثانی کا خطاب اختیار کر لیا۔ چنانچہ یہ خطاب سکوں پر کندہ ہونے لگا اور خطبوں میں پڑھا جانے لگا

علاءالدین کو ایک نیا مذہب جاری کرنیکا خبط

پے در پے کامیابیوں نے سلطان علاءالدین خلجی کو اس قدر مغرور کر دیا تھا کہ اب وہ بادشاہ ہوتے کے ساتھ ساتھ پیغمبری کے بھی خواب دیکھنے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام اُمرائے سلطنت کو جمع کرنے کے بعد اس ارادہ کا اظہار کیا کہ وہ ایک نیا دین رائج کرنا چاہتا ہے تاکہ قیامت تک اس کا نام باقی رہے۔ اور اس کے نام لیوا زندہ رہیں۔ لیکن علاءالملک کوتوال اور دوسرے اُمرائے سلطنت نے ہمت اور جرأت سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کو اس خطرناک ارادہ سے روکا حقیقت یہ ہے کہ علاءالدین کو کامرانیوں نے اندھا کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو انسانی مخلوق سے بلند تصور کرنے لگا تھا۔

علاءالدین کے خلاف بغاوت

سلطان علاءالدین کی اگرچہ ملک

میں کافی دھاک بیٹھ چکی تھی لیکن پھر بھی اس نے اپنے ظلم اور زیادتیوں کی وجہ مخالفین کی بہت بڑی تعداد پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) میں سلطان جب قلعہ رنتھنبور کی فتح کیلئے روانہ ہوا تو راستہ میں سلطان کے بھتیجے سلیمان شاہ نے سلطان کے قتل کرنے کی کوشش کی سلطان زخمی تو ہو گیا مگر بچ گیا۔
سلطان نے رنتھنبور پہنچکر وہاں کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس قلعہ کا راجہ جو سلطنت اسلامیہ کا باجگذار تھا۔ اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اسلئے سلطان اسے سزا دینا چاہتا تھا لیکن راجہ نے اس ہوشیاری کے ساتھ قلعہ کی حفاظت کی کہ کافی عرصہ گذرنے کے بعد بھی قلعہ فتح نہ ہو سکا اور بادشاہ وہاں الجھ کر رہ گیا بادشاہ کو مصروف دیکھ کر اُس کے دو بھانجوں امیر عمر اور منگو خاں نے بدایوں اور اودھ میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ مگر یہ دونوں گرفتار کر لئے گئے اور ان کو بادشاہ کے پاس رنتھنبور ہی بھیجدیا گیا۔ جہاں بادشاہ نے ان کو عبرتناک سزا دینے کے بعد قتل کرا دیا۔ اسی دوران میں حاجی مولیٰ نامی ایک شخص نے دہلی کے بڑے بڑے اہلکاروں کو قتل کر کے سلطان کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا اور دہلی کے تخت پر قبضہ جمانے کے بعد علوی نامی ایک شخص کو تخت پر بٹھا دیا لیکن اُمرائے سلطنت نے مولیٰ اور علوی دونوں کو قتل کر کے اس فتنہ کو دبا دیا۔
غرضکہ سلطان جب تک رنتھنبور میں رہا اس کے خلاف نئی نئی بغاوتیں کھڑی ہوتی رہیں۔ آخر ایک سال کی مسلسل کوشش اور بے اندازہ جانی اور مالی نقصان اٹھانے کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا۔ راجہ ہمیر دیو اور اس کے متعلقین بے دردی کے ساتھ قتل ہوئے۔ رنتھنبور کے اسی معرکہ میں نصرت خاں ایک پتھر سے زخمی ہونیکے بعد ہلاک ہو گیا۔
قلعہ جب فتح ہو گیا تو سلطان کی نظر راجہ کے ساتھی محمد شاہ باغی پر پڑی۔

جو مقتولین کے پاس پڑا تھا۔ مگر بُری طرح زخمی ہونے کے باوجود ابھی تک زندہ تھا۔ بادشاہ نے اسے پہچان لیا اور قریب جاکر کہا کہ اگر تیرا علاج کرا کے تجھے تندرست کرا دیا جائے تو اس احسان کا بدلہ تو کیا دیگا۔ محمد شاہ نے جواب دیا۔ میں تندرست ہو کر تجھ کو قتل کروں گا۔ اور راجہ ہمیر دیو کے بیٹے کو ہندوستان کا بادشاہ بناؤں گا۔ علاء الدین نے ناراض ہو کر اسے ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا یہ امر واقعہ ہے کہ سلطان کو قلعہ رنتھنبور کے معرکہ میں بڑی ہی دشواریوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد سلطان اس قلعہ کو اپنے بھائی الغ خاں کے سپرد کر کے دہلی واپس آگیا۔ الغ خاں پانچ مہینے کے بعد بیمار ہو کر دہلی آتے ہوئے راستہ میں فوت ہو گیا اور اس طرح سلطان علاء الدین کے دو بہترین سپہ سالار نصرت خاں اور الغ خاں اس چھوٹے سے قلعہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

چتوڑ پر حملہ اور پدمنی کی کہانی رنتھنبور کے قلعہ کی طرح چتوڑ کا قلعہ بھی ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ سلطان علاء الدین نے ابتدا میں تو یہ کوشش کی کہ اس قلعہ کا راجہ حملہ کے بغیر ہی اطاعت قبول کر لے لیکن راجہ نے اطاعت سے انکار کر دیا۔ راجہ کے انکار پر سلطان علاء الدین نے ۷۰۳ھ (۱۳۰۳ء) میں اس قلعہ پر حملہ کر دیا۔ اور چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد بمشکل تمام اس قلعہ پر فتح حاصل ہوئی۔ راجہ گرفتار ہو گیا۔ لیکن رانی پدمنی مع راجہ کے متعلقین کے کوہستانی علاقہ میں فرار ہو کر روپوش ہو گئی۔ علاء الدین نے قلعہ چتوڑ کو اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کے سپرد کر کے اس کا نام خضر آباد رکھا۔ اسی قلعہ میں سلطان نے خضر خاں کی ولی عہدی کا بھی اعلان کیا تھا۔ علاء الدین چتوڑ گڈھ کے اس معرکہ سے فارغ ہو کر دہلی آگیا۔ اور اپنے ساتھ چتوڑ کے راجہ رتن سین کو بھی

لے آیا اور اسے نظر بند کر دیا۔ راجہ رتن سین کی گرفتاری کے بعد راجہ کے بھانجے نے خود کو سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ جسے سلطانی میں داخل کر لیا گیا تھا۔

خضر خاں چونکہ عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسلئے وہ چتوڑ گڈھ کے علاقہ کا انتظام نہ کر سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغی راجپوتوں نے چتوڑ گڈھ کے جنگلوں میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔ اور رانی پدمنی کو حاکم قرار دینے کے بعد خود مختارانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ان راجپوتوں کو جب بھی موقعہ ملتا تھا۔ یہ سلطانی علاقہ پر چھاپے مار کر لوگوں کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ جب سلطان کو رانی پدمنی اور راجپوتوں کی اس نئی شرارت کا علم ہوا تو اس نے راجہ رتن سین کے بھانجے سے جو سلطان کا مصاحب بن چکا تھا۔ اس معاملہ میں مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ راجہ رتن سین آپ کے قبضہ میں ہے۔ اس سے کہئیے کہ وہ رانی کو اس قسم کی باغیانہ حرکتوں سے روکے اور اسے بلا کر اپنے پاس ہی رکھ لے تاکہ یہ فتنہ اس طرح خود ہی ختم ہو جائے۔ چنانچہ رتن سین سے کہا گیا۔ تو رتن سین فوراً رانی کو بلانے اور اسے اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔

رتن سین نظر بندی کے باوجود دہلی میں بڑے آرام کی زندگی گذار رہا تھا۔ اس لئے یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ راجہ اس معاملہ میں کسی قسم کے فریب سے کام لے گا۔ چنانچہ راجہ نے ایک خاص پیغام کے ذریعہ رانی کو بلانے کیلئے خط بھی بھجوا دیا۔ لیکن راجپوتوں نے یہ چال چلی کہ رانی کی بجائے پالکیوں میں مسلح راجپوتوں کو بٹھا کر بھیجدیا اور راجپوت سپاہیوں کو بطور محافظتی دستہ کے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار کر کے ان پالکیوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور یہ مشہور کیا کہ رانی پدمنی راجہ کے طلب کرنے پر دہلی جا رہی ہے۔ چنانچہ رانی پدمنی کا یہ مصنوعی جلوس دہلی کے باہر پہنچنے کے بعد رک گیا۔ اور سلطان کو مطلع کیا گیا کہ

رانی پدمنی آگئی ہے۔ راجہ کو اجازت دی جائے کہ وہ رانی کے جلوس کو آگر اپنے ہمراہ لے جائے سلطان نے اجازت دیدی لیکن راجہ چند محافظوں کی نگرانی میں رانی کے استقبال کے بہانے جوں ہی شہر سے باہر آیا اور مصنوعی جلوس کے قریب پہنچا تو راجپوتوں نے پالکیوں میں سے کود کر پہلے تو راجہ کے محافظوں کا صفایا کیا اور اس کے بعد راجہ کو گھوڑے پر بٹھا کر فرار ہو گئے اور سب راجہ کے اپنی خفیہ کمین گاہ میں پہنچ گئے۔

سلطان کو جب راجہ کے فرار ہونے کا علم ہوا تو وہ راجپوتوں کی اس عیاری پر حیران رہ گیا۔ ادھر راجہ رتن سین نے چتوڑ گڈھ کے علاقہ میں پہنچنے کے بعد لوٹ اور غارتگری شروع کردی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن بادشاہ کا بیٹا خضر خاں حاکم چتوڑ بدستور عیش و عشرت میں مصروف رہا۔ آخر کار بادشاہ نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر راجہ رتن سین کے بھانجے کو چتوڑ کا حاکم بنا کر بھیجا اور خضر خاں کو واپس بُلا لیا۔ راجہ کے بھانجے نے کسی نہ کسی طرح راجپوتوں کو اپنی جانب مائل کر کے اس فتنہ کو دبا دیا۔ اور اس کے بعد یہ کچھ نہیں پتہ چلا کہ راجہ رتن سین اور پدمنی کا کیا ہوا۔ یہ ہے پدمنی کا وہ قصہ جس کو کہ فسانہ نگاروں نے سلطان علاءالدین اور پدمنی کی عشق کی کہانی بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ تقریباً تمام ہی مستند مورخوں نے اس بے سرو پا داستانِ عشق کو بے بُنیاد قرار دیا ہے۔

سلطان علاءالدین کوئی مذہبی پیشوا نہ تھا نہ کوئی اسلامی رہنما تھا اور نہ اس کا ذاتی کیرکٹر ہی اتنا بلند تھا کہ مسلم مورخ خواہ مخواہ پدمنی کے داغ کو اس کی پیشانی سے دھونے کی کوشش کریں اگر یہ واقعہ درست ہوتا تو مسلم مورخوں نے اسی طرح اس واقعہ کو بھی تاریخ میں درج کر دیا ہوتا جس طرح کہ انھوں نے گجرات کے راجہ کی بیوہ رانی کنولا دیوی پر علاءالدین کے فریفتہ ہونے اور پھر اس سے نکاح کر لینے

واقعہ کو علانیہ تکلف سپرد قلم کردیا ہے یا کافور غلام اور علاء الدین کی محبت کے واقعات کو جس طرح بے کم و کاست تاریخ میں درج کردیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پدمنی اور علاء الدین کے عشق کی کہانی بالکل فرضی اور بے بنیاد ہے جس کو راجپوتانہ کے درباری بھاٹوں کی اختراع سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

مغلوں کے پے در پے ہندوستان پر حملے ۶۹۸ھ (۱۲۹۹ء) میں مغلوں کو دہلی میں جو تاریخی شکست ہوئی تھی اس کے بعد عام خیال یہ تھا کہ اب شاید مغل زمانہ دراز تک ہندوستان کی جانب رُخ نہیں کریں گے لیکن ۷۰۵ھ (۱۳۰۵ء) میں مغلوں نے نئی چال چلی کہ وہ کوہ ہمالیہ کے اندر ہوکر ایک نئے راستہ سے امروہہ تک جا پہنچے اور اس سارے علاقہ کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ علی بیگ مغل اور ترتارک مغل اس حملہ میں چالیس ہزار سواروں کی سرکردگی کر رہے تھے۔ سلطان نے غازی ملک تغلق کو فوراً ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ مغلوں کو شکست ہوئی۔ ان کے دونوں سردار علی بیگ اور ترتارک اور ہزاروں سپاہی گرفتار ہو گئے۔ جن کو تہہ تیغ کردیا گیا یا غلام بنا لیا گیا۔ سلطنت دہلی کو بمشکل اس حملہ سے نجات ملی تھی کہ ۷۰۶ھ (۱۳۰۶ء) میں گنگ نامی ایک دوسرے مغل سردار نے ساٹھ ہزار سواروں کے ساتھ علی بیگ اور ترتارک کا انتقام لینے کے لئے پھر ہندوستان پر حملہ کردیا۔ غازی ملک تغلق نے ان کا مقابلہ دریائے سندھ کے کنارے پر کیا۔ ساٹھ ہزار مغلوں میں سے صرف چار ہزار بچ کر فرار ہو سکے باقی سب مارے گئے۔ ان کا سردار گنگ مغل زندہ گرفتار ہوا جس کو سلطان نے دہلی میں ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔ اس کے بعد اقبال مند نامی ایک مغل سردار نے حملہ کیا اس کو بھی ملک تغلق نے دیبالپور میں شکست دیکر زندہ گرفتار کر لیا۔ اور وہ بھی مع اپنے ساتھیوں کے دہلی میں ہاتھی کے پاؤں سے زندہ کچلوا دیا گیا۔ ان پے در پے

شکستوں سے مغل مرعوب ہو گئے اور ملک تغلق کی دھاک سارے ملک میں قائم ہو گئی۔

سلطان کے منظورِ نظر ملک کافور کی عزت افزائی

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ سلطان علاؤالدین نے کھمبات سے آئے ہوئے کافور نامی ایک خوبرو اور نوعمر غلام کو اپنا منظورِ نظر بنا لیا تھا۔ یہ خوبصورت لڑکا امرد تھا جس نے بہت جلد سلطان کے مزاج میں اس قدر دخل حاصل کر لیا کہ ۷۰۶ھ (۱۳۰۷ء) میں سلطان نے اس کا درجہ تمام اُمرا سے بلند کر کے اس کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ تفویض کر دیا اور اسکے ساتھ ہی اُسے سپہ سالار بنا کر اور ایک لاکھ فوج دیکر دکن کی تسخیر کے لئے روانہ کر دیا۔ ملک کافور چونکہ ایک ناتجربہ کار غلام تھا اور اسمیں سپہ سالاری کی قابلیت نہیں تھی اسلئے سلطان نے حاکم مالوہ عین الملک ملتانی اور حاکم گجرات الغ خاں کے نام فرامین جاری کئے کہ اپنی اپنی فوج لیکر ملک کافور کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ نیز خواجہ حاجی اور دوسرے ماہرین جنگ کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تاکہ فتوحات تو ماہرینِ جنگ کیوجہ سے ہوں اور نام سلطان کے منظورِ نظر ملک کافور کا ہو۔

فوجی افسروں کو دیول دیوی کی تلاش کا حکم

ملک کافور اور خواجہ حاجی کے دکن کی مہم پر روانہ ہونے سے قبل سلطان نے اپنی نو مسلم ملکہ کنولا دیوی کی فرمائش پر ان کو حکم دیا تھا کہ وہ کنولا دیوی کی لڑکی دیول دیوی کو جو کنولا دیوی کے سابق شوہر راجہ کرن سے تھی دکن میں تلاش کرنے کے بعد ملکہ کے پاس دہلی روانہ کر دیں۔ یہ لڑکی اپنے باپ راجہ کرن کے ساتھ بگلانہ (ریاست دیوگیر) میں رہتی تھی سلطان نے گجرات کے حاکم الغ خاں کو بھی حکم بھیجدیا کہ وہ بھی اس لڑکی کی تلاش اور جستجو میں کوئی کمی نہ اُٹھا رکھے چنانچہ الغ خاں کو جب پتہ چلا کہ یہ لڑکی راجہ کرن کے پاس

بگلانہ میں ہے تو الغ خاں نے راجہ کو سلطان کے حکم سے مطلع کر دیا اور لڑکی کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کیا۔ جب راجہ کرن کسی طرح بھی لڑکی کو دینے کے لیے تیار نہ ہوا تو الغ خاں نے راجہ کرن پر حملہ کر دیا۔ راجہ کرن نے لڑکی کو فوراً بگلانہ سے دیوگیر کی جانب روانہ کر دیا تاکہ اس کی شادی دیوگیر کے راجکمار سنگل دیو سے کر دی جائے لیکن اتفاق سے یہ لڑکی سلطانی فوج کے سپاہیوں کے ہاتھ پڑ گئی۔ جنہوں نے اسے الغ خاں کے پاس روانہ کر دیا۔ الغ خاں نے اس لڑکی کو یعنی دیول دیوی کو دہلی بھیج دیا۔ ولیعہد سلطنت خضر خاں نے اس لڑکی کو دیکھا تو وہ عاشق ہو گیا اور بعد میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

ملک کافور کا دیوگیر پر حملہ

جس وقت کہ الغ خاں راجہ کرن کے خلاف بگلانہ پر حملہ میں مصروف تھا۔ اسی وقت ملک کافور کی فوج دیوگیر کی تسخیر کے لئے دیوگیر کی جانب بڑھ رہی تھی ملک کافور نے سلطان کی ہدایت پر راجہ دیوگیر کے خلاف اس لئے فوج کشی کی تھی کیونکہ اس راجہ نے حسب وعدہ علاقہ ایلچپور کا خراج تین سال سے دہلی نہیں بھیجا تھا۔ غرضکہ ملک کافور کی فوجوں نے دیوگیر پر حملہ کر کے ۷۰۶ھ (۱۳۰۷ء) میں اسے فتح کر لیا اور راجہ کو جس نے کوئی مقابلہ نہیں کیا تھا گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ علاء الدین نے دیوگیر کے راجہ رام دیو کی بڑی عزت کی۔ یہ وہی راجہ تھا جس کی بے پناہ دولت کے بل پر علاء الدین دہلی کے تخت پر قابض ہوا تھا سلطان علاء الدین نے راجہ سے اقرار اطاعت لینے کے بعد اسے رائے رایان کا خطاب اور چتر سفید عطا کیا۔ دیوگیر کی ریاست پھر اسے واپس کر دی۔ اور گجرات کے ملک میں سے بھی ایک قطعہ بطور انعام راجہ کو دیدیا۔ نیز راجہ کے بیٹوں اور تمام عزیز و اقارب کو رہا کر کے ان سب کو بڑی عزت کے ساتھ دیوگیر رخصت کیا۔

جھالور اور سیوانہ کی فتح

جس زمانہ میں کہ ملک کافور دکن میں تھا سلطان کو خود سیوانہ کی فتح کیلئے جانا پڑا۔ کیونکہ سلطان کے لشکر نے کئی سال سے سیوانہ کا محاصرہ کر رکھا تھا مگر کامیابی ہی نہیں ہوتی تھی۔ سلطان نے جب پوری طاقت کیساتھ حملہ کیا تو سیوانہ کے راجہ سیتل دیو نے اظہار عجز کیلئے اپنا سونے کا مجسمہ گلے میں زنجیر ڈالکر بھیجدیا اور بادشاہ سے معافی کی درخواست کی۔ بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ جبتک تم خود نہیں آؤ گے معافی نہیں ملسکتی آخر راجہ حاضر خدمت ہو گیا۔ بادشاہ نے اقرار اطاعت لیکر سیوانہ کا قلعہ پھر راجہ کے حوالے کر دیا۔

بادشاہ نے جھالور پر اپنی لونڈی گل بہشت سے حملہ کرایا تھا۔ اس دلچسپ حملہ سے پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین صرف کافور جیسے غلاموں ہی کو ابھارنا نہیں چاہتا تھا بلکہ لونڈیوں اور باندیوں کو بھی سپہ سالار بنا دینے کی فکر میں تھا چنانچہ گل بہشت لونڈی نے جھالور کے راجہ کو محصور کر کے قلعہ بند ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن یہ لونڈی کیونکہ اس معرکہ کے دوران ہی میں بیمار ہو کر مر گئی تھی اس لئے سید کمال الدین نے اس مہم کو سر کیا۔ راجہ اور اسکے بیٹے قتل کئے گئے اور ریاست کا خزانہ دہلی روانہ کر دیا گیا

تلنگانہ، کرناٹک اور ملیبار کی فتح

سلطان نے ۷۰۹ھ (۱۳۰۹ء) میں ملک کافور اور خواجہ حاجی کو ورنگل کے راجہ لدر دیو کے زیر کرنے کیلئے جنوبی ہند کی دوسری مہم پر روانہ کیا۔ ملک کافور کا لشکر دیوگیر ہوتا ہوا ملک تلنگانہ میں داخل ہو گیا پہلے راجہ سے اطاعت کیلئے کہا گیا جب راجہ اطاعت کیلئے آمادہ نہ ہوا تو سلطانی لشکر نے قلعوں اور شہروں کو فتح کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا۔ راجہ خوف کی وجہ سے ورنگل کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اور بعد میں مجبور ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ اور بطور نذرانہ کے تین سو ہاتھی، سات ہزار گھوڑے اور بہت سا سونا چاندی پیش کیا اور ایک معقول زر خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ملک کافور یہ تمام مال غنیمت لیکر دہلی آیا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور اس طرح ملک دکن کا

ایک بڑا حصّہ سلطنتِ اسلامیہ میں شامل ہو گیا۔

اس کے بعد سلطان نے ملک کافور اور خواجہ حاجی کو تیسری مرتبہ فوج دیکر دکن کی جانب روانہ کیا پہلے یہ لشکر دیوگیر آیا دیوگیر کا راجہ مر چکا تھا۔ اسلئے اسکے بیٹے کو سند حکومت دی گئی۔ پھر یہ لشکر آگے بڑھا اور اس نے کنارہ فتح کیا۔ اسکے بعد کرناٹک اور ملابار کا علاقہ فتح کر کے راس کماری تک اسلامی حکومت کو وسعت دیدی پھر یہ لشکر کارومنڈل کی جانب بڑھا اور اس علاقہ کے تمام راجاؤں سے خراج وصول کرتا ہوا اور اقرار اطاعت لیتا ہوا دہلی واپس آگیا۔ ان فتوحات کے بعد ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک اور گجرات سے لیکر بنگال تک ہندوستان کا پورا برّ اعظم مملکتِ اسلامیہ میں شامل ہو گیا۔

ملک کافور کا ظلم اور سیاسی چالیں

دکن کی فتوحات اگرچہ خواجہ حاجی اور دوسرے سپہ سالاروں کی جنگی قابلیت کا نتیجہ تھیں لیکن پھر بھی سلطان علاءالدین کی عنایت سے یہ تمام فتوحات ملک کافور کی ذات سے وابستہ کر دی گئیں۔ دکن کی ان فتوحات کے بعد ملک کافور برابر سلطان پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۷۱۱ھ (۱۳۱۱ء) میں ساری سلطنت ملک کافور کے ہاتھ میں تھی۔ اور اسے سلطان نے مزید اعزاز دینے کے بعد دکن کا وائسرائے بنا دیا تھا۔ دکن کا وائسرائے بننے کے بعد ملک کافور کی دراز دستیاں اور ظلم بے حد بڑھ گیا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے دیوگیر پر حملہ کر کے اس کے نوعمر راجہ کو قتل کیا۔ محض اس جرم میں کہ ملک کافور کو اس کے باغی ہو جانے کا صرف شبہ تھا۔ اس کے بعد ملک کافور نے مہاراشٹر کرناٹک اور جنوبی ہند کے ان راجاؤں پر حملے شروع کئے جنہوں نے کہ خراج نہیں بھیجا تھا۔ ان میں سے بعض راجاؤں کی حکومتیں تو ملک کافور نے اپنے انتظام میں لے لیں اور بعض کو باجگذار اور اطاعت شعاری کے وعدہ کے بعد بدستور حکمراں رہنے دیا۔

ملک کافور نے بادشاہ کے مزاج میں پوری طرح دخل حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے بادشاہ کو بیٹوں اور متعلقین سے متنفر کرنا شروع کیا اور اس ناپاک مقصد میں ملک کافور کو اس لئے اور بھی کامیابی ہو گئی۔ چونکہ خود بادشاہ کے لڑکے ایسے نالائق تھے کہ یہ بادشاہ کے آخری وقت میں بیمار ہو جانے پر اس کو پوچھتے تک نہ تھے۔ یہی حالت بیگمات کی بھی تھی۔ سب کے سب عیش پرستیوں میں مدہوش تھے۔ اور ملک کافور ان کے خلاف بادشاہ کے دل میں زہر پیدا کرتا چلا جا رہا تھا۔

ملک کافور کی ان سیاسی چالوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ براہ راست یا بالواسطہ دہلی کی حکومت پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ بادشاہ جب ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء) میں زیادہ بیمار ہوا تو بادشاہ کی طلبی پر ملک کافور فوراً دہلی پہنچ گیا اور اس نے دن رات بادشاہ کی خدمت کر کے بادشاہ کا دل اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسکے بعد بادشاہ نے ملک کافور کے ورغلانے سے الغ خاں حاکم گجرات اور اس کے بھائی کو قتل کرا دیا۔ اور ولیعہد سلطنت خضر خاں اور اس کا بھائی شادی خاں دونوں گوالیار کے قلعہ میں قید کر دئے گئے۔ اس کے علاوہ خضر خاں کی ماں یعنی ملکہ بھی قلعہ سے نکال دی گئی۔

سلطان جو طویل علالت کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ ۶ شوال ۷۱۶ھ (۱۳۱۶ء) کی رات کو اچانک مر گیا۔ عام خیال یہ ہے کہ ملک کافور نے سلطان کو زہر دیکر ختم کر دیا تھا۔ ملک کافور نے بادشاہ کی موت سے قبل بادشاہ سے ایک دستاویز بھی لکھوائی تھی جس کے ذریعہ ولیعہد سلطنت خضر خاں کو معزول کر دیا گیا تھا اور اسکی جگہ بادشاہ کے چھ سالہ لڑکے شہاب الدین کو وارث تخت و تاج قرار دیدیا گیا تھا چنانچہ بادشاہ کے مرتے ہی ملک کافور نے شہاب الدین کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

علاء الدین خلجی کی حکومت پر ایک نظر

علاء الدین جو اپنے چچا کو قتل کر کے تخت پر بیٹھا تھا، اپنے

زمانہ کا نہایت ہی ظالم اور جابر حکمراں تھا۔ سیاسی اغراض کے لئے لوگوں کو قتل کرادینا اور ان کے گھروں کو برباد کردینا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ علم کے معاملہ میں اس قدر کورا تھا کہ اپنے دستخط بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے بڑا عالم تصور کرتا تھا۔ مذہب سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس کی رائے تھی کہ مذہب دل بہلانے کا ڈھکوسلا ہے۔ لیکن مذہب کو ڈھکوسلا جاننے کے باوجود بھی اس نے محض اس لئے ایک نیا مذہب رائج کرنا چاہا تھا۔ تاکہ وہ پیغمبر بن کر عوام کے دلوں پر حکومت کرسکے۔

ابتدا میں تو وہ عیاش نہ تھا لیکن حکومت ملنے کے بعد اسے عیاشی کا بھی چسکا پڑ گیا تھا۔ وہ خوبصورت عورتوں اور خوشجمال لڑکوں کا بے حد شائق تھا۔ چنانچہ کنولا دیوی سے نکاح اور ملک کافور کی غیر معمولی عزت افزائی صاف طور پر بتا رہی ہے کہ وہ کس قماش کا انسان تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں سب سے پہلے اسی نے خود اپنا اور اپنے بیٹے خضر خاں کا ہندو عورتوں کے ساتھ نکاح کیا۔ وہ شراب کا بھی عادی تھا۔ لیکن آخر عمر میں اس نے شراب بالکل چھوڑ دی تھی۔

علاء الدین جہاں ظالم۔ جابر۔ مذہب سے بیگانہ اور عیش پرستی کا شائق تھا وہاں اپنے دور کا بہت بڑا بہادر اور منتظم بھی ہوا ہے چنانچہ اس نے ہندوستان میں اس قدر فتوحات حاصل کیں کہ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک اور سندھ و گجرات سے لیکر بنگال تک سارا ہندوستان اسلامی حکومت میں شامل ہوگیا۔ وہ ان جرنیلوں میں سے تھا جو شکست کھانا ہی نہیں جانتے۔ اسکے فوجی اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لونڈی اور غلاموں کو بھی اس نے نامور سپہ سالار بنا کر مشہور کردیا۔ ملک کے انتظامی معاملات میں اس کے تدبّر اور ہوشمندی کا یہ عالم تھا۔ کہ اس نے اپنے دور میں ہندوستان کو ایک نرالا ہندوستان بنا دیا تھا۔ عوام

کے اخلاق کی اصلاح کیلئے اس نے شراب پینا، شراب بیچنا سخت ترین جرم قرار دیدیا تھا۔ یہ پہلا بادشاہ ہے جس نے جاگیرداری کی لعنت کو ختم کیا۔ زمینداروں کی زمینداری کو محدود کیا۔ کاشتکاروں کی امداد کی وہ ایک بادشاہ ہونیکے باوجود سرمایہ داری کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ چنانچہ اُس نے سرکاری ملازمین کی بڑی بڑی تنخواہوں میں کمی کر دی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہندوستان کا سب سے پہلا سوشلسٹ لیڈر تھا۔

عام تجارتوں پر بھی اس نے بڑا زبردست کنٹرول قائم کر رکھا تھا کیا مجال کہ کسی چیز کی قیمت ایک پائی بھی کوئی تاجر زیادہ وصول کرسکے ذراسی لغزش پر تاجروں کو سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کے زمانہ میں اجناس اور ضروریات زندگی اس قدر ارزاں تھیں کہ ایک خاندان تین چار روپیہ ماہانہ میں عیش کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے رنٹ کنٹرول ایکٹ نافذ کیا تاکہ مالکان جائداد مکانوں کے کرائے زیادہ وصول نہ کرسکیں حقیقت یہ ہے کہ علاءالدین ہندوستان کی تاریخ میں عجیب و غریب بادشاہ ہوا ہے۔ جہاں اسمیں بہت سی ذاتی خامیاں اور کمزوریاں تھیں وہاں اس نے نئے نئے قوانین نافذ کرکے اپنی رعایا کی بہترین خدمات بھی انجام دی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسی متضاد صفات کا بادشاہ ہندوستان میں کوئی نہیں ہوا۔

شہاب الدین خلجی کی برائے نام بادشاہی

۷۱۶ھ مطابق ۱۳۱۶ء میں ملک کافور نے

علاءالدین خلجی کی موت کے بعد اس کے چھ سالہ لڑکے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھا دیا۔ ملک کافور روزانہ تھوڑی دیر کے لئے شہاب الدین عمر کو لاکر تخت پر بٹھاتا۔ اور پھر اُسے اس کی ماں کے پاس حرم سرا میں پہنچا دیتا اور اسکے

بعد خود ہی اس کے نام سے احکام اور فرامین جاری کرتا رہتا یعنی در اصل شہاب الدین کے پردہ میں ملک کافور ہی فرمانروائی کر رہا تھا۔ ملک کافور نے ولیعہد سلطنت خضر خاں اور اس کے بھائی شادی خاں کی قلعہ گوالیار میں آنکھیں نکلوا دیں۔ خواجہ سرائوں اور پست درجہ کے کمینوں کو بڑے بڑے عہدے دئے۔ شاہی خاندان کے افراد کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کرایا ملک کافور کمسن بادشاہ کی تاک میں بھی تھا تاکہ اسے قتل کر کے خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر دے مگر اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

ملک کافور کا قتل

سلطان علاء الدین کے خاندان کا صرف ایک شہزادہ مبارک خاں باقی رہ گیا تھا۔ جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ یہ شہزادہ بھی قید کر دیا گیا تھا اور اس کے قتل کے احکامات بھی ملک کافور نے دیئے تھے لیکن قاتلوں کو اس شہزادہ پر رحم آگیا۔ اور انھوں نے دوسرے سپاہیوں سے مشورہ کر کے بجائے شہزادہ مبارک کے کافور ہی کو قتل کر ڈالا۔ گویا ملک کافور نے جن لوگوں کو شہزادہ مبارک کے قتل کے لئے متعین کیا تھا وہی لوگ ملک کافور کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوئے۔ ملک کافور سلطان علاء الدین کی موت کے بعد صرف ۳۰ دن زندہ رہا۔ ملک کافور کے خاتمہ کے بعد سلطان علاء الدین کے بیٹے شہزادہ مبارک خاں کو قید خانہ سے نکال کر پہلے تو کمسن بادشاہ کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ اور دو ماہ کے بعد اسے تخت نشین کر دیا گیا۔ مبارک خاں نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین یعنی کمسن بادشاہ کی آنکھیں نکلوا کر خضر خاں اور شادی خاں کے پاس قلعہ گوالیار میں بھیجدیا اور اس طرح یہ تینوں نابینا بھائی ایک جگہ جمع ہوگئے۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ

۷۱۶ھ مطابق ۱۳۱۷ء میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ جب تخت پر بیٹھا تو اس نے تخت نشین ہوتے ہی مملکت ہند کے تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیدیا۔ اور جلاوطنوں کو ہندوستان آنے کی اجازت دیدی۔ فوج میں ہر لعزیزی حاصل کرنے کے لئے چھ مہینے کی تنخواہیں بطور انعام تقسیم کر دیں اُمرائے سلطنت کے منصب بڑھائے۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا۔ اور علاءالدین خلجی کے وہ تمام قوانین منسوخ کر دئے جن کے نفاذ کے بعد جاگیرداری اور زمینداری ختم ہو گئی تھی نیز تاجر اور صناعوں کی لوٹ بند ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس بادشاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی سرمایہ داروں اور تاجروں کے گھروں میں گھی کے چراغ جل گئے۔ غرضکہ مبارک شاہ نے اپنے باپ کے قائم کئے ہوئے بہترین نظام حکومت کو محض چند بڑے آدمیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

گجرات اور دیوگیر میں بغاوت

ہم بتا چکے ہیں کہ ملک کافور کے ورغلانے پر سلطان علاءالدین نے الغ خاں حاکم گجرات اور اس کے بھائی کو قتل کرا دیا تھا۔ الغ خاں کے قتل کے بعد گجرات میں بغاوت برابر بڑھتی چلی گئی۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے اس بغاوت کو دبانے کے لئے عین الملک ملتانی کو ایک بڑی فوج دیکر بھیجا جس نے بڑی قابلیت کے ساتھ اس بغاوت پر قابو پا لیا۔

بادشاہ نے اپنے خسر ظفر خاں کو جس کی لڑکی سے حال ہی میں شادی کی

تھی۔ گجرات کا حاکم بنا دیا۔ ظفر خاں نے چند ماہ کے اندر اندر پورے گجرات پر قابو حاصل کر لیا۔ اور وہاں ہر قسم کا امن و امان ہو گیا۔

اسی زمانہ میں دیو گیر کے راجہ ہرپال نے جو کہ راجہ رام دیو کا داماد تھا دکن میں بڑی طرح ہنگامے برپا کر رکھے تھے۔ ملک کافور نے دکن کا وائسرائے بننے کے بعد دیو گیر کے نوعمر راجہ کو محض شبہ پر قتل کرا دیا تھا۔ جب ملک کافور قتل ہوا، تو ہرپال دیو نے دیو گیر پر قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اور اپنے ساتھ بہت سے دوسرے راجاؤں کو ملا کر سارے دکن میں شورش برپا کر دی تھی قطب الدین مبارک شاہ ۷۱۹ھ ہجری میں خود لشکر لیکر دکن کی طرف گیا۔ اور دہلی میں اپنا جانشین ایک ناتجربہ کار غلام بچے شاہین کو بنا دیا۔ جب بادشاہ دکن پہنچا تو ہرپال اور دوسرے راجہ بغیر لڑے کے بھاگ کھڑے ہوئے ہرپال گرفتار ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کی جیتے جی کھال کھچوا دی۔ اس کے بعد بادشاہ دکن کے انتظامات کو مکمل کرلے کے بعد دہلی واپس آگیا۔

خسرو خاں غلام کی عزت افزائی

جس طرح سلطان علاء الدین نے اپنے منظور نظر غلام ملک کافور کو بڑھاتے بڑھاتے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ بالکل اسی طرح قطب الدین مبارک شاہ نے اپنے باپ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے خسرو خاں غلام کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ خسرو خاں غلام دراصل ایک کم ذات گجراتی ہندو کا لڑکا تھا جس کو سلطان علاء الدین کے ایک سردار ملک شادی خاں نے پرورش کر کے اس کا نام "حسن" رکھ دیا تھا۔ بادشاہ کی نظر اس غلام لڑکے پر پڑی تو عاشق ہو گیا۔ پہلے اسے مصاحب بنایا پھر خسرو خاں کا خطاب دیکر ملک کافور کا تمام علاقہ اور لشکر اس کے حوالے کر دیا۔ یعنی اسے بھی ملک کافور کی

طرح دکن کا وائسرائے بنا دیا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سلطان نے اپنے خسر ظفر خاں حاکم گجرات کو خسرو غلام کی خوشنودی کے لئے قتل کر کے وہاں کا حاکم خسرو غلام کے بھائی حسام الدین کو بنا دیا۔ غرضکہ اس طرح دکن اور گجرات کے دونوں اہم علاقے ان دونوں کم ذات ہندو نژاد بھائیوں کے قبضہ میں آ گئے۔

ان دونوں غلاموں کی بے موقعہ عزت افزائی نے سلطنت کے ہندو اور مسلمان اُمرا کو سلطان سے برگشتہ کر دیا مسلمان تو نالاں تھے ہی مگر ہندو اُمرا کو یہ شکایت تھی کہ اُن نیچ ذات ہندو غلاموں کو ہم پر فوقیت دی جا رہی ہے جن کو اُونچی ذات کے ہندو اپنے پاس کھڑا کرنا بھی گوارا نہیں کر سکتے لیکن بادشاہ جو خسرو خاں غلام پر بُری طرح فریفتہ تھا۔ برابر ان دونوں غلام بھائیوں کو نوازتا رہا۔

بادشاہ کے قتل کی سازش

سلطان جب دیوگیر فتح کر کے اور غلام بھائیوں کو دکن اور گجرات کی حکومت عطا کر کے دیوگیر سے دہلی کی جانب روانہ ہوا تو وہ اُمرا جو سلطان کی سفلہ پروری سے تنگ آ چکے تھے انھوں نے یہ سازش کی کہ راستہ میں اس عیش پرست اور ناسمجھ بادشاہ کو قتل کر دیا جائے اور اسکی جگہ بادشاہ کے چچا زاد بھائی ملک اسد الدین کو تخت پر بٹھا دیا جائے لیکن سلطان کو کسی طرح اس سازش کا علم ہو گیا چنانچہ سلطان نے ساگون گھنٹی کے مقام پر قیام کرنے کے بعد ملک اسد الدین اور اس کے حمایتی اُمرا کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کرا دیا۔ اور اُجین پہنچ کر ایک سردار کو گوالیار روانہ کیا۔ تاکہ وہ ان تینوں نابینا شہزادوں کو جو قید میں تھے۔ فوراً قتل کر دے۔ غرضکہ یہ تینوں شہزادے قتل کر دئے گئے۔ سلطان نے خضر خاں کی بیوی، دیول دیوی یعنی اپنی بھاوج کو دہلی بلوا کر اور حرم میں داخل کر کے اپنی بیوی بنا لیا۔ اور دہلی کے ان تمام اُمرا کو قتل کرا دیا۔ جن پر سلطان کو شبہ تھا۔ دہلی کے مقتولین میں شاہین نامی وہ غلام بھی شامل تھا جس کو کہ بادشاہ اپنا جانشین بنا کر دیوگیر

کی فتح کے لئے گیا تھا۔

بادشاہ حضرت نظام الدین اولیا کا بھی دشمن

حضرت نظام الدین اولیا جو اس زمانہ کے بہت بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے سلطان ان کا بھی دشمن ہو گیا۔ دشمنی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت نظام الدین اولیا کا ہندو مسلم عوام پر سب سے زیادہ اقتدار تھا۔ اس لئے سلطان ان کو اپنی حکومت کے لئے خطرناک سمجھتا تھا۔ دوسرے حضرت نظام الدین اولیا خضر خاں ولیعہد کے پیر تھے۔ اس لئے سلطان کو اُن سے اور بھی عناد تھا۔ سلطان نے اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ عوام اور امرا حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں جانا بند کر دیں لیکن جب کسی نے اس کی بات نہ سُنی تو مجبور ہو کر سلطان نے حضرت کے قتل کی سازش کی اور حضرت کا سر اُتار کر لانے والے کے لئے ایک بہت بڑا انعام مقرر کیا۔ سلطان کا یہ دستور سا ہو گیا تھا کہ جب وہ نشہ کی حالت میں ہوتا تو حضرت کو گالیاں دیا کرتا تھا حضرت چونکہ دہلی اور ہندوستان کے بیشتر حصّوں میں بے حد ہر دلعزیز تھے۔ اس لئے سلطان کی ان حرکتوں نے عوام کے دل میں سلطان کی طرف سے اور بھی نفرت پیدا کر دی تھی۔

خسرو خاں اور حسام الدین کی فتنہ پردازی

فتنہ پرداز غلام خسرو خاں اور اس کے بھائی حسام الدین نے آپس میں متحد ہونے کے بعد در پردہ دکن اور گجرات میں خودمختاری کے اعلان کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ حاکم گجرات حسام الدین نے اپنی قوم کے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیکر بغاوت کے لئے ہموار کر لیا۔ ادھر خسرو خاں نے دکن میں گونڈوانہ اور میسور کے راجاؤں کو

بغیر خطا کے لوٹا اور ان کے خزانہ پر قبضہ جمالیا محض اس لئے کہ دکن میں خود
مختار حکومت کے قیام کے لئے اس کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ خسرو غلام
نے دکن میں ہندوؤں کی ایک بہت بڑی فوج بھرتی کرلی۔ غرضکہ یہ دونوں غلام
بھائی خود مختاری کے اعلان کے لئے پوری طرح تیار ہوگئے۔

گجرات کے اُمرائے سلطنت نے جب یہ دیکھا کہ حسام الدین کے
ارادے اچھے نہیں ہیں۔ اور وہ خود مختاری کے اعلان کی تیاریاں کر رہا ہے تو
انھوں نے گجرات میں بغاوت کے تمام امکانات کو اپنی متحدہ کوششوں سے
ختم کرنے کے بعد حسام الدین کو گرفتار کرکے دہلی بھیجدیا۔ اُمرائے سلطنت کو
توقع تھی کہ سلطان انکی اس وفاشعاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گا لیکن سلطان اپنے
منظور نظر خسرو غلام کے بھائی کی یہ بے عزتی کیونکر گوارہ کرسکتا تھا۔ سلطان نے
دہلی پہنچتے ہی حسام الدین کو اپنا مصاحب خاص بنالیا اور جن اُمرائے سلطنت
نے اسکے خلاف قدم اُٹھایا تھا۔ انکے عہدے گھٹادیئے۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ
حسام الدین کو گجرات نہیں بھیجا بلکہ اسکی جگہ وجیہ الدین قریشی کو گجرات کا حاکم
نامزد کردیا۔ اور اس طرح گجرات کی ہونیوالی بغاوت ادھوری رہ گئی۔

خسرو خاں کی بغاوت میں ناکامی

جنوبی ہند میں چندیری کی عامل ملک
تیمور۔ ملک تگل اور گوا کے حاکم ملک
تلیغہ کو جب اس بات کا یقین ہوگیا کہ غلام خسرو خاں علم بغاوت بلند کرنے کی تیاریوں
میں مصروف ہے اور وہ راجاؤں اور سرداروں کو روپیہ فراہم کرنے کے لئے لوٹ
رہا ہے تو ان اُمرائے سلطنت نے اپنی متفقہ کوشش سے خسرو خاں کو دیوگیر میں
بلاکر نظر بند کردیا اور بادشاہ کو اسکے خطرناک ارادوں سے مطلع کردیا اور یہ لکھ دیا کہ
ہم نے اسکو دیوگیر میں نظر بند کر رکھا ہے۔ اس کے جواب میں فوراً بادشاہ کا فرمان

پہنچا کہ خسرو خاں کو جلد سے جلد حفاظت کے ساتھ ہمارے پاس بھیجدیا جائے چنانچہ
خسرو خاں کو دہلی روانہ کردیا گیا۔

خسرو خاں نے دہلی پہنچکر ان اُمرائے سلطنت کے خلاف بادشاہ کے خوب
کان بھرے جنہوں نے کہ دکن میں اس کی ساری اسکیموں کو خاک میں ملا دیا تھا چند
روز کے بعد ملک تیمور اور ملک تلیغہ بھی دہلی پہنچ گئے اور انھوں نے خسرو خاں
کی فتنہ پردازیوں کے تمام واقعات بادشاہ کے گوش گذار کردیئے۔ ان اُمرا
کو اُمید تھی کہ ان کی اس بروقت کوشش کی قدر کی جائیگی مگر جو سلطان کہ خسرو خاں
کے بھائی کی بھی دل آزاری نہیں گوارا کرسکتا تھا۔ وہ اپنے منظورِ نظر خسرو خاں
کی دل شکنی کیسے برداشت کرتا۔ چنانچہ سلطان بجائے اسکے کہ وفا شعار اُمرا
کو کوئی صلہ دیتا۔ اُلٹا ان کا دشمن ہوگیا۔ ملک تلیغہ کو جیلخانہ میں ڈالدیا گیا۔ اور
ملک تیمور کو چندیری کی حکومت سے معزول کرکے چندیری کا علاقہ بھی خسرو خاں
کی جاگیر میں شامل کردیا گیا۔ اور خسرو خاں کے دوسرے مخالف سرداروں کو
بھی سخت سزائیں دی گئیں۔ سلطان کی اس غلام پروری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس
واقعہ کے بعد کسی کو بھی خسرو خاں کے خلاف زبان ہلانے کی ہمت نہ ہوئی اور
خسرو خاں نے جو چاہا کیا۔ یہاں تک کہ سارے ہندوستان کی سلطنت خسرو خاں
کے ہاتھ میں آگئی۔ بادشاہ صرف نام کا بادشاہ رہ گیا۔ وزیر اعظم سپہ سالار اور سب
کچھ خسرو خاں ہی بنا ہوا تھا۔

تخت حاصل کرنے کیلئے خسرو خاں کا جوڑ توڑ

اُمرائے سلطنت کی فرض شناسی کی
بدولت جب خسرو خاں دکن میں اپنی خود مختار حکومت بنانے میں ناکام رہا تو اس نے
یہ طے کیا کہ کیوں نہ بادشاہ کو ختم کرنے کے بعد دہلی کی سلطنت پر قبضہ جمایا جائے۔

وزیر اعظم وہ بن ہی چکا تھا سپہ سالار بھی وہی تھا۔ اس لئے اس کے واسطے دہلی میں اپنی حکومت کے لئے داغ بیل ڈالنا دشوار نہ تھا۔ چنانچہ اس کے مکان پر جو در اصل ملک کافور کا مکان تھا۔ ان فرقہ پرست ہندوؤں کا اجتماع رہنے لگا۔ جو اسلامی حکومت کو جڑ اور بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ غرضکہ ان ہندو فرقہ پرستوں کے مشورہ سے حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ایک نہایت مکمل اسکیم بنائی گئی۔

اس اسکیم کے ماتحت سب سے پہلے اُن امیروں کو برسر اقتدار لایا گیا جن کو سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے معزول کر دیا تھا۔ اس کے بعد خسرو خاں نے بادشاہ سے یہ کہہ کر کہ میں اپنے ہم قوموں کی ذاتی فوج رکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے چچا رندھول اور جاہر دیو کو گجرات بھیجکر بیس ہزار گجراتیوں کو دہلی بلوایا اور اپنی خاص فوج میں بھرتی کر لیا۔ اس کے علاوہ بیس ہزار کی فوج نواح دہلی کے ہندوؤں کی تیار کی یعنی خسرو خاں نے در پردہ چالیس ہزار کا لشکر آسانی کے ساتھ تیار کر لیا۔ اور بادشاہ پر یہ ظاہر کیا کہ چونکہ مجھ کو مسلم امرائے سلطنت سے خطرہ ہے۔ اسلئے میں نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے اپنے ہم قوموں کی یہ فوج تیار کی ہے لیکن درحقیقت خسرو غلام اس انتظار میں تھا۔ کہ موقع پاتے ہی بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد تخت پر قبضہ جمالے۔

خسرو خاں کے ہاتھوں بادشاہ کا قتل

خسرو خاں نے اگرچہ بادشاہ کے قتل اور حکومت دہلی پر قبضہ جمانے کی یہ سازش نہایت ہی خفیہ طریقہ پر انجام دی تھی۔ لیکن پھر بھی شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ "بادشاہ کی جان خطرہ میں ہے"۔ اس کے علاوہ خسرو خاں نے چونکہ اپنے خاص ہندو لشکر کے علاوہ بقیہ تمام فوجوں کو دہلی سے دور بھیجدیا تھا۔ اس لئے اس ہندو لشکر کے ہر وقت دہلی میں موجود رہنے کو بھی شبہ کی نظر سے

دیکھا جا رہا تھا۔ ہندوستان میں خود مختار اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اتنی بڑی ہندو فوج دارالسلطنت میں متعین کر دی گئی تھی۔ بادشاہ چونکہ خسرو خاں کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ اس لئے لوگوں کو بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرات نہیں ہوتی تھی لیکن پھر بھی بعض اُمرا نے بادشاہ کو اس خطرہ سے آگاہ کر دیا مگر بادشاہ ان سب باتوں کو خسرو سے اُمرا کی ذاتی مخالفت پر محمول کرتا رہا۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ اُس وقت تک خسرو غلام کی وفاداری کا یقین کرتا رہا۔ جب تک کہ خسرو خاں کے ہندو لشکر نے شاہی قلعہ میں گھس کر قتل عام نہیں شروع کر دیا۔ محل پر یہ حملہ رات کے وقت ہوا تھا۔ خسرو خاں اس حملہ کے وقت بادشاہ کے پاس ہی سو رہا تھا۔ جب بادشاہ نے پوچھا کہ یہ شور و غل کیسا ہے تو خسرو خاں نے کہہ دیا کہ "شاہی اصطبل کے کچھ گھوڑے چھوٹ گئے ہیں۔ ان کو سپاہی پکڑ رہے ہیں لیکن چند ہی منٹ کے بعد جب خسرو خاں کا چچا جاہر دیو ایک ہندو جمعیت کے ساتھ برہنہ تلوار لئے بادشاہ کے سر پر پہنچ گیا تو بادشاہ کو ہوش آیا۔ بادشاہ محلسرا کی طرف بھاگا۔ مگر خسرو خاں نے دوڑ کر بادشاہ کے بال جو کسی قدر لانبے تھے۔ پکڑ لئے۔ بادشاہ نے خسرو خاں کو پچھاڑ دیا۔ مگر خسرو خاں نے بادشاہ کے بال اس وقت تک نہیں چھوڑے جب تک کہ خسرو کے آدمیوں نے بادشاہ کو قتل نہ کر دیا۔ بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد بادشاہ کا سر کاٹ کر محل کے صحن میں پھینک دیا گیا۔ اور اس کے بعد شاہی محل میں عورتوں اور بچوں کا قتل عام شروع ہوا۔ یہاں تک کہ خاندانِ شاہی کا ایک ایک بچہ اور ایک ایک فرد تہہ تیغ کر دیا گیا۔ اور اس طرح پانچویں ربیع الاول ۷۲۱ھ مطابق ۲۴ مارچ ۱۳۲۱ء کی رات کو ایک غلام کے ہاتھوں اُس خلجی خاندان

کا خاتمہ ہو گیا جس کی بُنیاد جلال الدین خلجی جیسے نیک بادشاہ نے رکھی تھی۔

نمک حرام خسرو خاں کی تخت نشینی

ملک کافور جو خسرو خاں کا ہم قوم تھا۔ اس کو تو کوشش کے باوجود دہلی کا تخت نصیب نہ ہو سکا لیکن خسرو خاں اپنے آقا اور عاشقِ زار قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کرنے کے بعد دوسرے ہی دن ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) میں ناصر الدین خسرو خاں کا لقب اختیار کر کے دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اور اُمرائے سلطنت میں سے کسی ایک میں بھی اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ اس کی تخت نشینی کے معاملہ میں مزاحمت کر سکتا۔

اُمرائے سلطنت اور صوبیداروں کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ دارالسلطنت دہلی پر خسرو خاں کی فوج کا قبضہ تھا۔ اس لئے یہاں کا کوئی امیر زبان بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ اب رہے صوبوں کے اُمرا۔ ان سب کے بیٹوں اور عزیزوں کو کسی نہ کسی بہانے سے خسرو خاں نے پہلے ہی دہلی بُلا لیا تھا۔ یہ تمام بطور یرغمال اس کے قبضہ میں تھے اگر اُمرا ذرا بھی حرکت کرتے تو ان کے عزیزوں اور بیٹوں کے قتل کا خوف تھا۔ لہٰذا خسرو خاں بڑی بے فکری کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے آقائے ولی نعمت کی بیوی دیول دیوی سے بالجبر نکاح کر لیا۔ اس کی حرکات اس قدر پست تھیں کہ مسلمانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ہندو شرفا میں بھی اس کی کمینگی پر انتہائی نفرت اور حقارت کا اظہار کیا گیا۔

خسرو خاں اور اس کے ساتھیوں کی کمینگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تخت نشینی کے بعد مسلمان گھرانوں کی شریف اور خاندانی عورتوں کو غیر مسلم سپاہیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ مسجدوں کی محرابوں میں بُت رکھوا دئے گئے۔ قرآنِ پاک کی کھلے بندوں توہین و تذلیل کی گئی۔ اور مسلمانوں پر ہر قسم کی

زیادتیاں کی گئیں خسرو خاں اور اس کے ساتھیوں کی ان عامیانہ اور بازاری حرکات سے مسلمانوں کو تو دکھ پہنچا ہی تھا مگر ہندو بھی اس کی حکومت کو اپنے لئے ذلت سمجھتے تھے۔ کیونکہ خسرو خاں اس پرواری قوم سے تھا جس کو ہندو ناپاک تصور کرتے تھے۔ اور جن کو اپنے شہروں اور قصبوں میں گھر تک نہیں بنانے دیتے تھے۔

خسرو خاں کو غازی ملک تغلق سے خطرہ

خسرو خاں دہلی کے تخت پر بیٹھ تو گیا مگر اس کو ہر وقت غازی ملک تغلق صوبیدار دیبال پور کا کھٹکا لگا رہتا تھا غازی ملک تغلق اپنے زمانہ کا مشہور ترین سپہ سالار تھا۔ اس نے مغلوں کو پے در پے شکستیں دیکر بڑا نام پیدا کیا تھا۔ مگر خسرو خاں غازی ملک تغلق کی جانب سے بھی کسی نہ کسی حد تک اس لئے مطمئن تھا۔ کیونکہ اس کا بیٹا ملک جونا خاں تغلق اس کے پاس بطور برغمال موجود تھا خسرو خاں سمجھتا تھا کہ غازی ملک تغلق یہ جانتا ہے کہ جوں ہی وہ دہلی کی جانب بڑھیگا۔ اس کا بیٹا جونا خاں تغلق فوراً قتل کر دیا جائیگا۔ اسلئے وہ دہلی کی جانب رُخ نہیں کر سکتا۔ خسرو خاں ہر وقت جونا خاں کی خوشامدیں لگا رہتا تھا۔ اور اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس کا باپ غازی ملک تغلق اگر دہلی میں بیٹے سے ملنے کے لئے آجائے تو اُسے قتل کر کے اس خطرہ کو بھی ہمیشہ کیلئے مٹا دیا جائے لیکن ان پیش بندیوں کے باوجود ملک جونا خاں تغلق در پردہ خسرو خاں کے خلاف پوری تیاری کر چکا تھا۔ چنانچہ ڈھائی ماہ کے بعد جونا خاں اچانک دہلی سے فرار ہو کر اپنے باپ غازی ملک تغلق کے پاس دیبالپور پہنچ گیا۔ خسرو خاں کو جب یہ اطلاع ملی تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔

دہلی پر حملہ اور خسرو خاں کا قتل

ملک جونا خاں تغلق نے دیبالپور پہنچے

کے بعد ایک لشکر نمک حرام خسرو سے انتقام لینے کے لئے جمع کیا اور یہ دونوں باپ بیٹے یعنی غازی ملک تغلق اور ملک جونا خاں تغلق دہلی کو خسرو خاں سے پاک کرنے کے لئے دہلی کی جانب بڑھے۔ ادھر خسرو خاں نے بھی ہندوؤں کا ایک بہت بڑا لشکر تیار کر کے اپنے بھائی کی سرکردگی میں مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا اور دوسرا لشکر لیکر خود بھی شہر سے نکلا۔ ان دونوں لشکروں کا مقابلہ اندر پرست کے قریب ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ خسرو خاں کا لشکر بے اندازہ تھا لیکن پھر بھی وہ غازی ملک تغلق کے مٹھی بھر سپاہیوں کے مقابلہ پر نہ ٹھہر سکا خسرو خاں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر ایک مقبرہ میں چھپ گیا۔ جہاں سے گرفتار کرنے کے بعد اسے قتل کیا گیا۔

جونا خاں تغلق اور غازی ملک تغلق کا لشکر جب فتحیاب ہونے کے بعد دہلی میں داخل ہوا تو دہلی کا خزانہ بالکل خالی تھا کیونکہ خسرو خاں نے سارے خزانہ کو اپنے ہندو فوجیوں میں تقسیم کر دیا تھا تاکہ مخالفین اگر فتح بھی حاصل کرلیں تو ان کو خزانہ بالکل خالی ملے۔ غازی ملک تغلق نے دہلی میں داخل ہونے کے بعد اس بات کی بے حد کوشش کی کہ شاہی خاندان کا کوئی ایک فرد بھی مل جائے تو اسے تخت پر بٹھا دیا جائے مگر خسرو خاں تو شاہی خاندان کے بچہ بچہ کا صفایا کر چکا تھا۔ اس لئے غازی ملک نے تمام اُمرائے سلطنت اور سپہ سالاروں کو جمع کر کے ان کو اختیار دیا کہ وہ اپنا امیر خود منتخب کرلیں۔ سب نے اتفاق رائے سے غازی ملک تغلق ہی کو اپنا امیر چن لیا جو دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا۔

خلجیوں کے دورِ حکومت پر ایک نظر

سلطان جلال الدین خلجی نے ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۹۰ء میں

خلجی خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ اس خاندان میں پانچ بادشاہ ہوئے ہیں جن کا مجموعی عہدِ حکومت کل ۳۲ سال ہے لیکن حقیقت میں اس خاندان کے صرف دو بادشاہ قابلِ ذکر ہیں جن میں سے ایک جلال الدین خلجی ہے۔ اور دوسرا سلطان علاء الدین خلجی۔ باقی تمام بادشاہوں کا عہدِ حکومت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

غلام خاندان کے بادشاہوں کی طرح خلجی خاندان کے بادشاہوں کو بھی منگل حملہ آوروں کا شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ خصوصیت سے علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت میں تو مغلوں کے اتنے زیادہ حملے ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے لیکن خلجیوں نے بہترین فوجی قابلیت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے ہر حملہ کو پسپا کر دیا۔

خلجیوں کا دورِ حکومت فتوحات کے اعتبار سے بہت زیادہ درخشاں دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ شاہانِ ہند جن کی حکومت صرف شمالی ہند تک محدود تھی۔ خلجیوں نے اس حکومت کو دکن کے دُور دراز علاقوں تک پھیلا دیا گجرات اور سوستان صحیح معنوں میں خلجیوں کے دورِ حکومت ہی میں فتح ہوا۔ خلجیوں کا رنتھنبور چتوڑ، جھالور۔ اور سیوانہ پر حملہ اور ان کی فتح کو ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

مشہور خلجی بادشاہ علاء الدین خلجی کے دامن پر اگرچہ یہ بدنما داغ موجود ہے کہ اس نے اپنے محسن اور چچا جلال الدین خلجی کو قتل کر کے تخت پر قبضہ جمایا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علاء الدین خلجی اپنے زمانہ کا بے نظیر سپہ سالار تھا۔ جس نے کہ اپنی اعلیٰ سپہ گری کی قابلیت کی وجہ سے خلجی حکومت کو ہندوستان میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا۔ اگر دیکھا جائے تو علاء الدین خلجیوں کی حکومت کا آخری بادشاہ تھا۔

جس کے بعد خلجی حکومت برابر زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دو تین بادشاہوں کے بعد بالکل ختم ہو گئی۔

خلجی بادشاہوں نے جہاں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو وسعت دی۔ وہاں اپنی غلام نوازی کی بنا پر خلجی حکومت کے لئے ایک ایسا خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ جس نے کہ خلجی حکومت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ سلطان علاء الدین نے نو مسلم غلام ملک کافور کو اس قدر آگے بڑھایا کہ وہ ملک کے لئے ایک مستقل مصیبت بن گیا۔ اور اسی طرح سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے نو مسلم غلام خسرو خاں کو اس قدر سر پر چڑھایا کہ وہی مبارک شاہ کے پردہ میں حکومت کرتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ اس نے مبارک شاہ کو تہہ تیغ کر کے خود اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے دورِ حکومت میں سارے ملک میں ایک ایسی لاقانونی پھیل گئی تھی۔ جس نے کہ ملک کے سارے امن و چین کو برباد کر ڈالا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر تغلق سرداروں نے اس غلام گردی کی لعنت سے ملک کو نہ پاک کر دیا ہوتا تو شاید ہندوستان کی تاریخ موجودہ تاریخ سے بالکل مختلف دکھائی دیتی۔

اس خاندان میں نیک بادشاہ بھی ہوئے اور ظالم بھی۔ سپہ سالار بھی ہوئے اور عیاش بھی۔ خلجی حکومت میں لغزشیں بھی ہوئیں اور اصلاحات بھی خلجیوں کا دورِ حکومت اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن پھر بھی اس کو ہندوستان کی تاریخ میں اس اعتبار سے نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ خلجیوں ہی کے دور میں مسلمان سارے ہندوستان کے واحد فرمانروا بنے۔

اُردو زبان کی ابتدا خلجیوں کے دورِ حکومت کا ایک اہم ترین واقعہ یہ بھی ہے کہ ان ہی کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں اُردو زبان کی بنیاد پڑی۔ اس زبان کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب مسلمانوں

کی حکومت برِّ عظیم ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی اور اس ملک میں ترک افغانی ہندوستانی اور دوسری قوموں کا باہمی اختلاط شروع ہوا۔ تو ایک ایسی نئی زبان خود بخود پیدا ہو گئی جس میں عربی، فارسی، ترکی، اور ہندی الفاظ شامل تھے تاکہ سب قومیں بلا امتیاز مذہب و ملت ایک دوسرے کی بولی سمجھ سکیں۔

شروع شروع میں ملے جلے الفاظ کی اس زبان کو لشکروں میں رواج حاصل ہوا کیونکہ لشکروں میں ترک۔ افغانی۔ ہندوستانی اور دوسری قوموں کے سپاہیوں کو ایک ساتھ رہنا پڑتا تھا اور ان کو ایسی زبان کی شدید ضرورت تھی۔ جسے سب لشکری سمجھ سکیں اور بول سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نئی زبان کو "زبان اُردو" یعنی لشکری زبان کہا گیا پہلے تو یہ زبان صرف لشکروں تک محدود رہی۔ اس کے بعد لشکروں سے نکل کر اُردو رفتہ رفتہ ہندوستان کے عوام میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی۔

اُردو یعنی لشکری زبان کو ترقی دینے میں ہندوستان کے مشہور بزرگ اور فارسی زبان کے نامور شاعر حضرت امیر خسرو کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے سب سے پہلے اس نئی زبان میں گیت لکھ کر اس زبان کو مقبول عام بنایا۔

حضرت امیر خسرو کے گیتوں کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ مختصر سے عرصہ میں سارے ملک میں پھیل گئے۔ حضرت امیر خسرو ۶۵۲ھ (۱۲۵۴ء) میں ناصر الدین محمود کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے تھے۔ خلجیوں کے دور حکومت میں ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) سے لیکر ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) تک ان کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ ان کی شہرت ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ گئی۔ حضرت امیر خسرو شیخ سعدی کے ہم عصر تھے۔ یہ ابتدا میں صرف فارسی زبان میں نظم و نثر لکھتے تھے۔ لیکن خلجیوں کے دور حکومت میں انھوں نے ہندی یعنی اُردو کے جو گیت لکھے انکو

بے حد مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل ہوئی اور ان گیتوں کی وجہ سے اُردو یعنی لشکری زبان فوجوں اور عوام سے گذر کر شاہی محلوں تک جا پہنچی حضرت امیر خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں اسی سال ہوا ہے جس سال کہ غیاث الدین تغلق فوت ہوا ہے۔

خلجیوں کے دورِ حکومت میں اُردو زبان صرف بولنے ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے باوجود کہ حکومت کی زبان فارسی تھی۔ اُردو کتابوں کی تصنیف کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ شیخ عین الدین گنج العلم کے اُردو رسالوں کی تصنیف کا سلسلہ خلجیوں کے آخری دورِ حکومت ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اُردو زبان کی ترقی میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں نے بھی بڑا حصہ لیا کیونکہ یہ ان کی قدیمی زبان ہندی سے بہت مشابہ تھی اور اس میں ان کی قدیم زبان کے ۷۵ فیصدی الفاظ شامل تھے۔ فارسی زبان کے مقابلہ میں کیونکہ ان کے لئے اس نئی ہندوستانی زبان کا سمجھنا اور لکھنا بہت آسان تھا۔ اس لئے انھوں نے بہت جلد اس نئی زبان کو اپنا لیا۔

اُردو زبان شروع ہی سے دونوں رسم الخطوں میں یعنی فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ ہندوستان کی تمام قومیں چونکہ اس زبان سے دلچسپی لے رہی تھیں اس لئے اس کو بہت جلد بے حد ہردلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اور آگے چل کر یہی اس برِّ عظیم کی قومی زبان بن گئی۔

نواں باب

شاہانِ تغلق کی حکومت

۷۲۱ھ تا ۸۱۷ھ

۱۳۲۱ء تا ۱۴۱۴ء

شاہانِ تغلق کی حکومت

شاہانِ تغلق جو ہندوستان میں شاہانِ خلجی کے جانشین قرار پائے۔ کرونانسل کے ان ترکوں میں سے تھے جو ترکستان سے آکر سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ غیاث الدین تغلق جس نے کہ ہندوستان میں تغلق خاندان کی حکومت کی بنیاد قائم کی۔ اس کا اصلی نام غازی خاں تھا۔ جو ترکوں کی اسی کرونانسل سے تھا۔ یہ پنجاب کی ایک نومسلم جاٹنی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ جس سے کہ غیاث الدین کے باپ نے نکاح کر لیا تھا۔

ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ غیاث الدین تغلق (غازی خاں) ابتدا میں نہایت ہی پریشاں حال تھا۔ اس نے سندھ میں ایک سوداگر کے ہاں بطور سائیس کے نوکری کر لی تھی۔ اس کے بعد یہ الغ خاں حاکم سندھ کے دورِ حکومت میں پیادوں میں نوکر ہو گیا۔ پھر فوج میں سوار بنا دیا گیا۔ اور ترقی کرتے کرتے اُمرائے سلطنت میں اس کا شمار ہونے لگا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس کی بے نظیر جنگی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے دیبالپور کا گورنر بنا دیا تھا تاکہ یہ مغلوں کی یورش کو روک سکے۔ اور اسے غازی ملک کا خطاب بھی دیدیا تھا۔ علاء الدین کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ کیونکہ غیاث الدین (غازی ملک تغلق) نے حاکم دیبالپور کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مغلوں کی ایسی سرکوبی کی کہ مغلوں کے سارے حوصلے پست ہو گئے۔ علاء الدین جب تک زندہ رہا وہ سب سے زیادہ (غازی ملک) غیاث الدین تغلق پر ہی اعتماد کرتا تھا۔

غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی

غازی ملک تغلق غیاث الدین

تغلق کا لقب اختیار کرنے کے بعد اُمرائے سلطنت کے مشورہ سے ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ حکومت سنبھالنے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر اس نے ان تمام انتظامی خرابیوں کو دُور کر دیا جو نمک حرام خسرو خاں کے فتنہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔ اُس کے بعد اس نے خلجیوں کے شاہی خاندان کے جتنے بھی افراد زندہ رہ گئے تھے۔ ان کو جمع کیا۔ اور ان سب کے شاہانہ وظیفے مقرر کئے تاکہ وہ آرام و آسائش کی زندگی گزار سکیں۔

غیاث الدین تغلق خلجیوں کے شاہی خاندان کی عورتوں کا بے حد احترام کرتا تھا اور اُن کی خدمت کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ چنانچہ غیاث الدین نے ان غداروں کو بڑی عبرت انگیز سزائیں دیں جنہوں نے نمک حرام خسرو کے اشارہ پر شاہی خاندان کی بے آبروئی اور تذلیل کی تھی۔ دیول دیوی جو سلطان مبارک شاہ کی بیوہ تھی۔ اس سے خسرو خاں نے مبارک شاہ کے قتل کے تیسرے دن بالجبر نکاح کر لیا تھا جو خلافِ شرع تھا۔ اس خلافِ شرع اور ظالمانہ حرکت میں جن لوگوں نے خسرو خاں کی معاونت کی تھی۔ ان سب کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اس کے علاوہ غیاث الدین نے ان تمام اُمرائے سلطنت کو اپنے سابقہ عہدوں پر سرفراز کیا جو خسرو خاں یا بعض نا اہل خلجی بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں معزول کر دئے گئے تھے۔ غیاث الدین کا بڑا بیٹا جونا تغلق جس نے کہ دہلی کی سلطنت کو دوبارہ فتح کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ اسے ولی عہد مقرر کیا اور الغ خاں کا خطاب دیا۔ دوسرے چار بیٹوں کو بھی بہرام خاں۔ ظفر خاں۔ محمود خاں اور نصرت خاں کے خطابات عطا کئے۔

غیاث الدین نے بہرام ایبہ کو اپنا بھائی بنایا۔ اور کشلو خاں کا خطاب دیکر ملتان اور سندھ کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔ نیز اپنے بھانجے ملک

بہاءالدین اور بھتیجے ملک اسدالدین کو بھی اہم عہدے عطا کئے ملک شادی خاں جو غیاث الدین کا داماد تھا۔ اس کو دیوانی یعنی وزارت کا عہدہ تفویض کیا۔ اس کے بعد ملک کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوا اور ایسے قوانین نافذ کئے جن سے زراعت پیشہ طبقہ کو اور غریبوں کو بے حد نفع پہنچا۔ سلطان نے دہلی کے قریب تغلق آباد کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا اور اسی کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔

ورنگل (تلنگانہ) میں بغاوت

سلطان علاءالدین کے دورِ حکومت میں ملک کافور نے ۷۰۹ھ ۱۳۰۹ء میں ورنگل (تلنگانہ) کے راجہ لدر دیو کو مطیع اور باجگذار بنا لیا تھا لیکن سلطنت اسلامیہ کی گذشتہ بدنظمیوں نے لدر دیو کو بغاوت کے لئے آمادہ کر دیا چنانچہ لدر دیو نے سلطنتِ اسلامیہ سے بغاوت کرنے کے بعد اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا غیاث الدین نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اس باغی راجہ کی سرکوبی کو ضروری سمجھا اور اس مقصد کے لئے اپنے ولیعہد ملک جونا تغلق کو ایک بڑی فوج دیکر ورنگل (تلنگانہ) کی فتح کے لئے روانہ کیا۔ اس مہم میں ملک تیمور۔ ملک تگیں۔ ملک کافور مہردار۔ اور ملک بیرم خاں بھی ولیعہد جونا تغلق کے ہمراہ تھے۔ سلطانی لشکر نے تلنگانہ کے علاقہ میں پہنچنے کے بعد جب راجہ لدر دیو پر حملہ کیا تو راجہ نے پہلے تو بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اپنے آپ کو ورنگل کے قلعہ میں محصور کر لیا۔ جب سلطانی لشکر نے سختی سے کام لیا تو راجہ نے زر و جواہر اور ہاتھی دیکر اطاعت قبول کر لی اور یہ وعدہ کیا کہ وہ سال بسال مقررشدہ خراج پیش کرتا رہے گا۔

راجہ لدر دیو کی اطاعت کے فوراً ہی بعد سلطانی لشکر کے بعض شرارت پسند لوگوں

نے یہ افواہ پھیلادی کہ دہلی میں سلطان غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا ہے
اس اطلاع نے سلطانی لشکر میں اضطراب کی سی کیفیت پیدا کردی۔ چنانچہ
ملک جونا تغلق کے ساتھ جو چار سردار آئے تھے وہ چاروں ملک جونا تغلق کو
چھوڑ کر اور اپنی اپنی فوجیں لیکر چلدیئے۔ اب ملک جونا تغلق کے لئے اس کے
سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اس مہم کو ناتمام چھوڑ کر دہلی کی جانب روانہ
ہو جائے۔ الغرض ملک جونا تغلق دیوگیر کے راستہ دہلی کے لئے روانہ ہوگیا۔
ملک جونا تغلق کے روانہ ہوتے ہی راجہ لدر دیو بدستور خود مختار بن گیا جب
ملک جونا تغلق دیوگیر پہنچا تو اسے دہلی سے آیا ہوا فرمان شاہی ملا جس سے
پتہ چلا کہ بادشاہ بخیریت ہے۔ اور بادشاہ کی موت کی افواہ فتنہ پردازوں
کی شرارت کا نتیجہ تھی۔ ملک جونا تغلق دیوگیر سے سیدھا دہلی آیا۔ اور بادشاہ
کے حکم سے ان تمام فتنہ پردازوں اور سرداروں کو گرفتار کرنے کے بعد زندہ
زمین میں دفن کرادیا۔ جنہوں نے کہ یہ جھوٹ افواہ اڑائی تھی۔ یا جونا تغلق کے
ساتھ بغاوت کی تھی۔

ورنگل (تلنگانہ) پر دوسرا حملہ

سلطان غیاث الدین تغلق نے ورنگل میں لشکر سلطانی کی شکست کو بری طرح محسوس
کیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے جونا تغلق کو ورنگل کی فتح کے لئے چار ماہ بعد
دوبارہ روانہ کیا۔ جونا تغلق نے پہلے بیدر کو فتح کیا۔ اس کے بعد ورنگل فتح
ہوگیا۔ راجہ لدر دیو کو گرفتار کرکے مع مال اور خزانہ کے دہلی روانہ کردیا۔
اس کے بعد جونا تغلق نے تلنگانہ کا پورا علاقہ ۷۲۳ھ (۱۳۲۳ء) میں فتح کرکے
اسکو دہلی کی حکومت میں شامل کرلیا۔ اور وہاں اپنے عمال مقرر کردیئے۔ ورنگل
کا نام تبدیل کرکے سلطان پور رکھ دیا۔ ورنگل کی فتح سے فارغ ہونے کے بعد

جونا تغلق نے جاجنگر کو زیر کیا اور یہاں سے جو مالِ غنیمت ہاتھی اور خزانہ ملا تھا وہ بادشاہ کے پاس دہلی بھیجدیا۔

سلطان غیاث الدین کا بنگال پر حملہ

ورنگل کی فتح کے بعد سلطان غیاث الدین نے بنگال کی جانب توجہ کی بنگال خلجی حکومت کے زوال کے بعد سے دہلی کی مرکزی حکومت سے الگ ہو گیا تھا۔ اور وہاں بنگال کے تخت کے مختلف دعویداروں میں خانہ جنگی جاری تھی۔ سلطان بلبن کا بیٹا ناصر الدین لکھنوتی پر قابض تھا۔ اور اپنے آپ کو بنگال کی حکومت کا زیادہ حقدار سمجھتا تھا۔ اس نے اس معاملہ میں سلطان غیاث الدین سے امداد چاہی۔ غیاث الدین جو پہلے ہی تسخیر بنگال کے لئے سوچ رہا تھا۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا فوراً اپنے ولیعہد جونا تغلق کو دکن سے دہلی بلاکر اپنی جگہ چھوڑا اور خود ایک بڑی فوج لیکر بنگال کے لئے روانہ ہو گیا۔ سلطان کا منھ بولا بیٹا تاتار خاں حاکم ظفر آباد بھی راستہ میں سلطان کے ساتھ اس معرکہ میں شریک ہو گیا۔

ناصر الدین جس نے کہ سلطان کو اپنی امداد کے لئے بلایا تھا۔ جب اسے سلطان کی آمد کا علم ہوا تو اس نے ترہٹ میں سلطان کی قدمبوسی حاصل کی اور قیمتی نذرانہ پیش کیا اور سلطانی لشکر کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کے بعد سلطانی لشکر بہادر شاہ کے مقابلے کے لئے آگے بڑھا بہادر شاہ نے ناصر الدین سے منحرف ہونے کے بعد ستارگاؤں کی حکومت پر قبضہ جما رکھا تھا اور اس کے ظلم و زیادتی سے ستارگاؤں کے باشندے بے حد پریشان تھے۔ بہادر شاہ کو اس معرکہ میں شکست ہو گئی۔ اور اسے قید کر کے دہلی بھیجدیا گیا۔ ناصر الدین کو مشرقی بنگال کی حکومت سپرد کر دی گئی اور

مغربی بنگال کو دہلی کی حکومت کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔ بنگال سے واپس ہوتے ہوئے سلطان غیاث الدین نے ترہٹ کے راجہ پر حملہ کر کے اسے قید کر لیا اور ترہٹ کا علاقہ احمد خاں پسر تلبغہ کے حوالے کر دیا ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) اور ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کے درمیان ان فتوحات سے فارغ ہو کر بادشاہ دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

غیاث الدین تغلق کی پُراسرار موت

جس زمانہ میں کہ سلطان غیاث الدین تغلق بنگال کی فتوحات میں مصروف تھا سلطان کا بڑا بیٹا جونا خاں تغلق اسکی بجائے دہلی میں حکومت کر رہا تھا۔ جب اسکو یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ فتح حاصل کرنیکے بعد دہلی آ رہا ہے تو اس نے بادشاہ کے استقبال کا بڑا اہتمام کیا تغلق آباد کی آئینہ بندی کر کے سارے شہر کو سجایا اور تغلق آباد سے چار میل کے فاصلہ پر ایک چوبی محل تعمیر کرایا تاکہ بادشاہ تغلق آباد آنے سے پہلے اس محل میں آرام کرے اور پھر اسی محل سے تغلق آباد کے لئے بادشاہ کا شاہانہ جلوس روانہ ہو چنانچہ بادشاہ جب تغلق آباد کے قریب پہنچا تو جونا خاں کئی میل آگے بادشاہ کے استقبال کے لئے پہنچ گیا۔ اور بادشاہ کو حسب تجویز جدید تعمیر شدہ چوبی محل میں ٹھہرایا گیا۔ تمام امرائے سلطنت سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ اور اس چوبی محل میں بہت بڑی دعوت دی گئی۔ دعوت کے بعد بادشاہ جب ہاتھیوں کے کرتب دیکھ رہا تھا۔ تو اچانک اس چوبی محل کی چھت گر پڑی اس حادثہ میں بادشاہ اس کا چھوٹا بیٹا اور بہت سے آدمی دب کر ہلاک ہو گئے۔ یہ حادثہ ربیع الاول ۷۲۵ھ مطابق فروری ۱۳۲۵ء میں پیش آیا تھا۔

بادشاہ کی اچانک موت کے اس واقعہ کے بارے میں مورخوں نے جن خیالات

کا اظہار کیا ہے وہ بالکل مختلف ہیں بعض مورخ کہتے ہیں کہ مکان نو تعمیر تھا۔ ہاتھیوں کے دوڑنے کی ضرب کی وجہ سے زمین پر آپڑا۔ حاجی محمد قندھاری کی رائے ہے کہ بجلی کے گرنے سے یہ چوبی محل گرا تھا۔ صدر جہاں گجراتی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ جونا خاں نے ایک طلسم بنایا تھا۔ جس وقت اس کو توڑا مکان گر پڑا۔ تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کا خیال ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا سے سلطان تغلق رنجیدہ تھا۔ اس نے بنگال سے آتے ہوئے حضرت سے کہلا بھیجا تھا کہ میرے دہلی آنے سے قبل آپ دہلی چھوڑ کر چلے جائیے۔ جس پر حضرت نے فرمایا تھا " ہنوز دلی دور است"۔ یعنی سلطان کی موت حضرت نظام الدین اولیا کی بد دعا سے واقع ہوئی۔

مشہور سیاح ابنِ بطوطہ کی رائے ہے کہ جونا خاں نے جان بوجھ کر اس چوبی محل کو ایسا بنایا تھا کہ جب ہاتھیوں کے پاؤں کی ضرب پڑے تو یہ بادشاہ پر گر جائے۔ چنانچہ اس محل کے گرنے سے چند ہی منٹ قبل جونا خاں کا محل سے باہر آجانا اور اس کا شیخ رکن الدین ملتانی کو نماز کے بہانے محل سے باہر لانا بقول رکن الدین ملتانی محل کے گرنے کے بعد زبان سے تو یہ کہنا کہ بادشاہ کو نکالو۔ مگر حرکات و سکنات سے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کرنا اور بادشاہ کے نکالنے میں دیدہ و دانستہ تاخیر کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ جونا خاں کا تعلق بادشاہ کے قتل میں ہاتھ تھا۔ بعض مورخوں کی تو یہاں تک رائے ہے کہ بادشاہ محل گرنے کے باوجود زندہ بچ گیا تھا مگر اندر گھس کر اس کا کام تمام کیا گیا۔ ملک جونا تغلق کے خلاف یہ شبہ اسلئے اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ اس حادثہ کے بعد بجائے اسکے کہ اس کمزور چوبی محل کے تعمیر کرنیوالے انجنیر ملک زادہ احمد بن ایاس کو سزا دی جاتی۔ اس کی خوب عزت افزائی کی گئی۔ یہاں تک کہ اسے خواجہ جہاں کا خطاب بھی عطا کر دیا گیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق کی موت خواہ کسی سبب سے بھی کیوں نہ ہوئی ہو لیکن

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بادشاہ نہایت ہی پُراسرار طریقہ پر مارا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب بادشاہ کی لاش پر سے ملبہ ہٹایا گیا تو وہ اپنے چھوٹے بیٹے کی لاش پر جھکا ہوا تھا جیسے اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بادشاہ کی لاش کے نکالنے کے بعد راتوں رات اس کا جنازہ تغلق آباد لایا گیا۔ جہاں اسکے جسم خاکی کو اُس قبر میں دفن کر دیا گیا جو بادشاہ نے اپنی زندگی ہی میں تیار کرالی تھی۔

غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت پر نظر

سلطان غیاث الدین تغلق کا دورِ حکومت اگرچہ بہت مختصر ہے یعنی اُس نے کل ساڑھے چار سال حکومت کی ہے لیکن اُس نے اس مختصر سے زمانہ میں جس خوش انتظامی کا ثبوت دیا ہے اور مفادِ عامہ کے کام کئے ہیں وہ بیحد قابلِ تعریف ہیں۔ اُس نے کاشت کاروں کے ٹیکسوں میں بیحد کمی کردی تھی۔ تاکہ کاشتکار ملک کی پیداوار کے بڑھانے میں دل و جان سے حصہ لیں ہندوؤں پر جزیہ کے ٹیکس میں بھی کمی کردی تھی۔ جاگیرداروں اور عمال کو سخت ہدایت تھی کہ وہ رعایا کے ساتھ اولاد جیسا سلوک کریں۔ غیاث الدین تغلق انعام و اکرام سے برابر علما اور اہل فن کو نوازتا رہتا تھا۔ اجیروں کی اُجرت میں اُس نے اضافہ کرایا اور تاجروں کی لوٹ مار سے عوام کو بچانے کی تدابیر اختیار کیں۔ فوجی سپاہیوں پر وہ بے حد مہربان تھا۔ ان کی اولاد کی طرح پرورش کرتا تھا۔ اس کے دور میں رہزن پاسبان بن گئے تھے۔ غیاث الدین کا ذاتی کیرکٹر بھی نہایت بلند تھا وہ ایک باشرع مسلمان تھا جو نماز روزے کا سختی سے پابند تھا۔ اُس نے نہ تو کبھی شراب کو ہاتھ لگایا اور نہ زنا کے پاس گیا۔ انصاف اور حق گوئی اس کا شیوہ تھا اسکے انکسار کا یہ عالم تھا کہ وہ بادشاہ بنجانیکے باوجود بھی شاہان خلجی کی اولاد کے ساتھ آقاؤں کی اولاد سمجھ کر سلوک کرتا تھا اور خلجی خاندان کی بیگمات کا اپنی ماں اور بہنوں سے زیادہ احترام کرتا تھا۔

سلطان محمد شاہ تغلق

غیاث الدین تغلق کی موت کے تیسرے دن ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء میں جوناخاں تغلق سلطان محمد شاہ تغلق کے لقب کے ساتھ دہلی کے تخت پر بیٹھا باپ کے جہلم کے بعد یہ تغلق آباد سے دہلی آگیا۔ اور پرانے بادشاہوں کے تخت پر اجلاس کیا۔ یہ اجلاس اس جاہ وجلال اور اس شان وشوکت کا تھا جو شاید ہی کسی بادشاہ کو اس سے قبل نصیب ہوا ہو۔ اجلاس کے روز عوام پر سونے اور چاندی کی بارش کی گئی اور اتنی دولت لٹائی گئی کہ غریب بھی مالامال ہو گئے محمد تغلق عجیب وغریب فطرت کا انسان تھا۔ اسمیں قابل قدر خوبیاں بھی تھیں اور طرح طرح کی بُرائیاں بھی۔ وہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا عالم بھی تھا اور اس سے جاہلانہ حرکتیں بھی برابر سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ غرضکہ وہ ایک ایسا عجیب غریب انسان تھا جس کی مثال ہندوستانی تاریخ میں مفقود ہے۔

خوشحالی اور فارغ البالی کا دور

محمد تغلق کو اتنی بڑی حکومت ورثہ میں ملی تھی جو کوہ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک اور گجرات سے لیکر بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسکی حکومت میں ۲۳ صوبے تھے جو سب کے سب خوشحال تھے اور ان صوبوں کا انتظام بھی نہایت چست تھا۔ فوجی طاقت بھی کافی تھی جس کو محمد تغلق نے ترقی دیکر بہت زیادہ بڑھالیا تھا۔ گجرات۔ مالوہ۔ تلنگانہ۔ کنبیلہ۔ مالابار۔ بنگال۔ جگاؤں۔ سنارگاؤں اور ترہٹ وغیرہ پر پوری طرح تسلط قائم کرنے کے بعد اس نے ان کا انتظام نہایت ہی عمدہ کر دیا تھا ملک کے ہر کونے سے خراج چلا آرہا تھا اور اس قدر

آمدنی تھی کہ محمد تغلق کے اندھا دھند اخراجات کے باوجود بھی ملک نہایت خوشحال تھا۔ مگر یہ خوشحالی کا دور صرف اس کی حکومت کے ابتدائی چند سال تک ہی رہا۔ بعد میں سارا ملک محمد تغلق کی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سے سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔

مغلوں کو رشوت دیکر زیر کرنیکی کوشش

محمد تغلق کے ابتدائی دور حکومت میں یعنی ۷۲۷ھ میں مغل سردار ترمش زین خاں جب ہندوستان کی تسخیر کے لئے ایک بڑا لشکر لیکر پنجاب میں گھس آیا۔ اور ملتان سے لوٹ مار کرتا ہوا دہلی کے دروازہ پر آن پہنچا تو سلطان محمد تغلق نے تلوار کی بجائے زر سے اسے قابو میں لانے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ بہت سا سونا، چاندی اور جواہرات لیکر دہلی سے روانہ ہو گیا۔ اور ملتان، سندھ اور گجرات میں لوٹ مار کرتا ہوا اپنے وطن کو واپس چلا گیا۔ یہ درست ہے کہ اس تدبیر سے دہلی کو خونریزی سے نجات ضرور مل گئی۔ لیکن رشوت دینے کے اس طریقہ کو سلطان کی کمزوری پر محمول کیا گیا۔ اور واقعی یہ سلطان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔

محمد تغلق کی پے درپے حماقتیں

محمد تغلق کیونکہ انوکھے دل ودماغ کا انسان تھا۔ اس لئے اسکے دماغ میں جو نئی نئی تجویزیں پیدا ہوتی تھیں۔ ان کی وجہ سے چند ہی روز میں حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔ محمد تغلق کی سیاسی اور ملکی حماقتوں کی تفصیل اگرچہ بہت طویل ہے لیکن ہم ذیل میں اس کی چند بڑی بڑی حماقتیں درج کرتے ہیں۔

(۱) محمد تغلق کو اس بات کی بڑی تمنا تھی کہ حضرت سلیمان کی طرح پیغمبری اور سلطانی دونوں صفات اس کی ذات میں جمع ہو جائیں۔ اور وہ جن وانس

پر فرماں روائی کر سکے۔ چنانچہ وہ دن رات اسی فکر میں مبتلا رہتا تھا کہ اسے کسی طرح سلیمان ثانی کا درجہ حاصل ہو جائے۔

(۲) محمد تغلق اتنا بڑا خراچ تھا کہ وہ ایک دن میں اتنا خرچ کر دیتا تھا۔ جتنا کہ دوسرے بادشاہ ایک سال میں خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ اس کی اس بُری عادات اور حماقت کی وجہ سے خزانہ خالی ہوتا چلا گیا اور حکومت کی مالی حالت بگڑ گئی۔

(۳) محمد تغلق چونکہ ساری دُنیا کو فتح کرنیکے خواب دیکھا کرتا تھا اسلئے تسخیر عالم کے لئے اُسے روپیہ جمع کرنیکی ہوس پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے اس نے دوآبہ کے خراج کو تگنا اور چوگنا کر دیا۔ اس غیر معمولی خراج سے تنگ آ کر کاشتکاروں نے کاشت کرنی چھوڑ دی جس سے سارے ملک میں قحط پھیل گیا۔ کئی سال تک یہ قحط عام رہا جسکی وجہ سے لاکھوں آدمی مر گئے اور ملک میں افلاس پھیل گیا۔ آخر بادشاہ نے مجبور ہو کر شہروں میں مفت غلہ تقسیم کرنا شروع کیا لیکن ملک اس سے پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔

(۴) غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں صرف سونے اور چاندی ہی کا سکہ چلتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے خزانہ کو پُر کرنے کے لئے تانبے کا سکہ چلایا۔ تاکہ تانبہ دیکر سونا اور چاندی خزانہ میں گھسیٹ لے۔ تانبہ کے اس سکہ کی وجہ سے حکومت کی ساکھ بالکل ختم ہو گئی۔ جعلی سکہ بنانے والوں نے تانبے کے جعلی سکے بنا کر اپنے گھر سونا چاندی سے بھر لئے۔ مگر شاہی خزانہ بدستور خالی رہا۔ آخر بادشاہ کو تانبے کا سکہ واپس لینا پڑا جس سے خزانہ اور بھی خالی ہو گیا اور حکومت کی اقتصادی حالت بالکل بگڑ گئی۔

(۵) محمد تغلق کو چونکہ ساری دنیا کو فتح کرنے کا شوق تھا۔ اس لئے اس نے عراق اور خراسان سے اُمرا کو بُلا کر بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھا تاکہ ان کے ذریعہ آسانی کے ساتھ مشرق وسطیٰ کو فتح کر سکے۔ ان اُمرا اور سرداروں سے

ماتحت تین لاکھ ستر ہزار سوار اُس نے نوکر رکھے۔ پہلے سال تو ان سب کی تنخواہیں خزانہ شاہی سے ادا کر دی گئیں لیکن بعد کو تنخواہیں نہ ملنے کی وجہ سے یہ سارا لشکر منتشر ہو گیا۔

(۶) بادشاہ کا ارادہ ہوا کہ ہمالیہ کے راستہ چین کو فتح کیا جائے۔ چنانچہ ۷۳۸ھ (۱۳۳۸ء) میں اس نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ایک لاکھ سواروں کا لشکر چین کو روانہ کر دیا اور ہدایت کی کہ راستہ میں نئے نئے قلعے بناتے جاؤ اور فتح حاصل کرتے رہو۔ اُمرائے سلطنت نے اس ارادہ سے ہر چند باز رکھنا چاہا مگر بادشاہ کو یقین تھا کہ اس طرح چین سے بے اندازہ دولت ہاتھ آسکے گی۔ چنانچہ اس لشکر کا ایک حصہ تو چین تک جاتے جاتے مر گیا۔ جو باقی رہ گئے تھے۔ وہ ناکام واپس آتے ہوئے ختم ہو گئے۔

(۷) بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی کی بجائے ہندوستان کے بالکل وسط میں ہونا چاہیے۔ تاکہ سارے ملک پر قابو رکھا جاسکے۔ اس خیال کے آتے ہی دیوگیر (دکن) کو دارالسلطنت قرار دیدیا گیا۔ اور اس کے بعد دلی والوں کو حکم ہوا کہ وہ دیوگیر میں جاکر آباد ہوں۔ لوگوں کو دیوگیر پہنچنے کے لئے سفر خرچ بھی دیدیا گیا۔ غرضکہ تبدیل آبادی کی یہ مہم پورے زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی۔ جس میں بے شمار افراد راستہ میں مر گئے جو زندہ بچے وہ بیکاری اور افلاس کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ دلی کی حالت یہ تھی کہ بالکل اُجاڑ ہو گئی۔ دیوگیر کا نام بادشاہ نے دولت آباد رکھا مگر اس دولت آباد میں افلاس تنگ دستی اور مصیبت کے سوا کچھ نہ تھا۔ بادشاہ کی اس حماقت سے خزانہ بالکل خالی ہو گیا اور رعایا برباد ہو گئی۔ غرضکہ محمد تغلق کی اس نوعیت کی حماقتوں کی وجہ سے سارا ملک تباہ اور

برباد ہو گیا۔ رعایا کی بُری طرح مٹی پلید ہوئی۔ خزانہ خالی ہو گیا اور حکومت کی ساکھ بالکل ختم ہو گئی۔

محمد تغلق نے دہلی کو ویران کر دیا

محمد تغلق کی حماقتوں کے سلسلہ میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ محمد تغلق نے دلی والوں کو دلی خالی کر کے دولت آباد کو آباد کرنے کا حکم دیدیا تھا۔ اس حکم کے بعد دہلی کی کیا حالت تھی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ دہلی کے وہ باشندے جن کو اپنے وطن سے بے اندازہ محبت تھی اور دلی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ انھوں نے تنگ آ کر سلطان کو ایک خط لکھا جسمیں سلطان کو جی بھر کر گالیاں دی گئی تھیں۔ اس پر سلطان نے مشتعل ہو کر دہلی کو تباہ کرنے کا قطعی ارادہ کر لیا۔ چنانچہ دلی والوں کے تمام مکانات بالجبر کوڑیوں کے مول خرید لئے گئے اور ان کو حکم دیا گیا کہ وہ دولت آباد جا کر آباد ہوں۔ جب اس پر بھی لوگوں نے دہلی نہیں چھوڑی تو حکم دیا گیا کہ تین روز میں خالی کر دو۔ تین دن کے بعد جو بھی آدمی دہلی میں دکھائی دیگا وہ قتل کر دیا جائیگا۔ اس حکم کے بعد دہلی کی اکثریت نے شہر چھوڑ دیا۔ مگر پھر بھی کچھ اپاہج اور مجبور لوگ دلی میں پڑے رہ گئے جن کو گرفتار کر لیا گیا۔ چنانچہ ایک اپاہج کو بارود سے اُڑا دیا گیا اور ایک اندھے کے لئے حکم ہوا کہ اس کی ٹانگ میں رسی ڈال کر اسے گھسیٹ کر دولت آباد لیجایا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ راستہ میں اندھے کے بدن کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ صرف ایک پاؤں دولت آباد پہنچ سکا۔ غرضکہ لوگ اپنا سارا سامان چھوڑ کر دہلی سے جلا وطن ہو گئے سلطان نے جب اپنے محل کی چھت پر چڑھ کر دیکھا کہ سارے شہر میں نہ دھواں اُٹھتا ہے اور نہ روشنی ہے تو اس نے کہا اب میرے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی۔ اس کے بعد سلطان نے دوسرے ضلعوں کے آدمیوں کو دہلی میں آباد ہونے کیلئے

بُلایا مگر دہلی زمانہ دراز تک آباد نہ ہو سکی۔

ملک کے ہر گوشہ میں بغاوتوں کا طوفان

محمد تغلق کے ظلم و ستم اور حماقتوں سے جب رعایا تنگ آگئی تو اُس نے ملک کے کونے کونے میں بغاوتیں برپا کرنی شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ حکومت کے عمال بھی ان بغاوتوں میں شامل ہو گئے۔ بغاوتوں کی تفصیل اگرچہ بہت طویل ہے لیکن ذیل میں چند اہم بغاوتوں کی کیفیت مختصر الفاظ میں پیش کی جاتی ہے۔

مالوہ کی بغاوت:۔ سب سے پہلے بادشاہ کے بھانجے گرشاسپ نے ۳۹ء میں مالوہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ یہ مالوہ سے دکن آیا اور دکن کے اُمرا کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہاں کو ایک لشکر دیکر اسکے مقابلے کے لیے بھیجا۔ دیو گیر میں خواجہ جہاں اور گرشاسپ کا مقابلہ ہوا۔ اتفاق سے گرشاسپ کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور گرشاسپ مع اہل و عیال کے کنبلہ چلا گیا۔ جہاں شاہی لشکر سے سخت مقابلے کے بعد گرفتار ہو گیا۔ اور بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ بادشاہ نے اس کی کھال کھنچوا دی۔

ملتان کی بغاوت:۔ غیاث الدین تغلق کا منہ بولا بھائی ملک بہرام ایبہ حاکم ملتان جس کو کشلو خاں کا خطاب حاصل تھا۔ اس کو محض اس جرم میں بادشاہ کے آدمیوں نے پریشان اور ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر بادشاہ کی خوشنودی کے لئے دولت آباد نہیں گیا تھا۔ ملک بہرام ایبہ ان ذلتوں کو برداشت نہ کر سکا۔ اور اس نے ملتان میں بغاوت برپا کر دی۔ بادشاہ خود اس بغاوت کو دبانے کے لئے دولت آباد سے ملتان آیا۔ بہرام کو شکست ہو گئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ بہرام کی جگہ قوام الملک کو ملتان کا حاکم بنا دیا گیا۔

ہمالیہ کی تباہ کن مہم :- بادشاہ نے چین کی طرح ہمالیہ کے پہاڑی ہندو راجاؤں کو مطیع کرنے کے لئے ایک نئی مہم اس زمانہ میں شروع کر دی تھی۔ سلطانی لشکر جوں توں کر کے بعض پہاڑی راجاؤں کے علاقوں پر قابض تو ہو گیا لیکن برسات شروع ہوتے ہی لشکر میں بیماری پھیل گئی بیشتر سپاہی مر گئے۔ جو باقی رہے وہ واپس آنے کی کوشش میں پہاڑی راجہ کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ آخر بادشاہ کی پہاڑی راجاؤں سے صلح ہو گئی۔

ملیبار کی بغاوت :- شریف جلال الدین شاہ حاکم معبر نے بھی باغی ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ سلطان ایک بڑا لشکر لیکر اس کی سرکوبی کے لئے جا پہنچا شریف جلال الدین بادشاہ کے لشکر کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر تلنگانہ کے دارالسلطنت بدر کوٹ میں چلا گیا۔ بادشاہ کے لشکر میں وبا پھیل گئی جس سے بے شمار سپاہی اور امرائے سلطنت مر گئے۔ بادشاہ ناکام و نامراد دولت آباد واپس آ گیا۔ راستہ میں وہ خود بھی بیمار ہو گیا۔ اور اس کے مرنے کی افواہ پھیل گئی۔

بنگال کی بغاوت :- ۷۴۱ھ (۱۳۴۰ء) میں بیرم خاں حاکم سنارگاؤں (بنگال) کے انتقال پر وہاں بھی شدید ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ملک فخرالدین نے بغاوت برپا کر کے پہلے تو سنارگاؤں پر قبضہ کر لیا۔ پھر لکھنوتی (ڈھاکہ) کے حاکم قدر خاں کو قتل کیا۔ اس کے بعد چٹ گاؤں پر قابض ہو گیا۔ چنانچہ سنارگاؤں چٹ گاؤں اور لکھنوتی پر فخرالدین نے قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا بادشاہ یہ علاقہ اس سے واپس نہ لے سکا۔

دیوگیر کی بغاوت :- یکایک بادشاہ کو اطلاع ملی کہ دیوگیر میں شدید بغاوت برپا ہو گئی ہے۔ باغی سرداروں نے شاہی عمال اور امرائے سلطنت کو قتل کر دیا ہے۔ بادشاہ سید ھا دلی آیا۔ اور لشکر لیکر دیوگیر روانہ ہوا۔ غرضکہ

بڑی مصیبت اُٹھانے کے بعد دیوگیر پہنچا اور وہاں بغاوت دبانیکے بعد احمد ایاز کو حاکم مقرر کیا۔

لاہور میں بغاوت:۔ بادشاہ جس زمانہ میں کہ دیوگیر کی بغاوت کو دبانے میں لگا ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں لاہور اور پنجاب کے بعض علاقوں میں شدید بغاوت پھیل گئی۔ اس بغاوت کو دبانے کے لئے بادشاہ نے احمد ایاز کو لاہور بھیجا۔ احمد ایاز نے بمشکل تمام اس ہنگامہ کو فرد کیا۔

ملتان میں شاہو افغان کی بغاوت:۔ بادشاہ کو اطلاع ملی کہ شاہو افغان نے بغاوت برپا کر کے ملتان پر قبضہ کر لیا ہے۔ نائب حاکم بہزاد کو مار ڈالا ہے۔ اور حاکم ملتان قوام الملک فرار ہو گیا ہے۔ بادشاہ ایک بڑا لشکر لے کر ملتان پہنچا۔ وہاں کی بغاوت کو دبا دیا۔ شاہو افغان نے اطاعت قبول کر لی۔ اسی مہم کے دوران میں بادشاہ کی ماں مخدومہ جہاں دولت آباد میں فوت ہو گئی۔ جس سے بادشاہ کو بے حد رنج ہوا۔

گھکڑوں کی بغاوت:۔ ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) میں گھکڑوں کے سردار تلک چند نے علمِ بغاوت بلند کر کے لاہور کے حاکم تاتار خاں کو قتل کر دیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہاں کو سرکشوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا اور یہ بغاوت بھی دب گئی۔

تلنگانہ اور کرناٹک میں بغاوت:۔ کرناٹک کے راجہ لال دیو اور لدر دیو کے بیٹے کشنا نائک نے مل کر یہ طے کیا کہ موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کرناٹک اور تلنگانہ کو سلطان کے قبضے سے نکال لیا جائے۔ چنانچہ یہ دونوں بغاوت برپا کرنے کے بعد اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح ۷۴۶ھ (۱۳۴۴ء) میں یہ علاقہ مسلمانوں کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ راجہ کرناٹک نے اپنے بیٹے بجین رائے کے نام پر بجین نگر آباد کیا۔ جو بعد کو بیجاپور کے نام سے مشہور رہا۔

کٹرہ مانک پور میں بغاوت:۔ ۷۴۵ھ (۱۳۴۵ء) میں علاء الدین نامی ایک شخص نے کٹرہ میں بغاوت برپا کر کے سر پر تاج رکھا اور سلطان علاء الدین کا لقب اختیار کیا۔ حاکم اودھ عین الملک اور اس کے بھائی نے جا کر اس بغاوت کو دبایا اور علاء الدین کا سر کاٹ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔

بیدر دکن میں بغاوت:۔ اسی سال بیدر کے حاکم نصرت خاں نے حکومت کا لاکھوں روپیہ غبن کر کے بغاوت برپا کر دی۔ قتلغ خاں دیوگیر سے اور بعض افسر دہلی سے اس بغاوت کو دبانے کے لئے گئے۔ نصرت خاں گرفتار ہو گیا۔ جسے بادشاہ کے پاس بھیج دیا گیا۔

گلبرگہ میں بغاوت:۔ امیر سلطنت علی شاہ جو شاہی محصول وصول کرنے کے لئے دولت آباد سے گلبرگہ گیا ہوا تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ یہ خطہ عمال اور فوج سے خالی ہے تو اس نے ۷۴۶ھ (۱۳۴۶ء) میں گلبرگہ کے صوبیدار کو قتل کر کے غدر مچا دیا۔ گلبرگہ پر قبضہ کر لیا اور لوٹ مار کرتا ہوا بیدر تک آن پہنچا۔ بادشاہ نے قتلغ خاں اور مالوہ کے لشکر کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ علی شاہ سلطانی لشکر سے سخت مقابلہ کرنے کے بعد گرفتار ہوا۔ اسے اور اسکے بھائیوں کو بادشاہ نے قتل کرا دیا۔

اودھ کے صوبیدار کی بغاوت:۔ اودھ اور ظفر آباد کے صوبیدار عین الملک نے اگرچہ اپنے علاقہ میں اس نازک زمانہ میں بھی پوری طرح امن قائم رکھا تھا۔ لیکن بادشاہ اس سے فروعی باتوں پر بدظن ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عین الملک اور اسکے بھائیوں نے بھی بغاوت برپا کر دی۔ اور سرگدواری آنے کے بعد بادشاہ کے تمام ہاتھی اور گھوڑوں کو پکڑ کر لے گئے۔ بادشاہ اس بغاوت سے بہت گھبرایا۔ اس نے فوراً سمانہ، امروہہ، برن (بلند شہر) اور کوئل سے لشکر منگایا اور عین الملک کی سرکوبی کے لئے قنوج کی جانب روانہ

ہو گیا۔ سخت مقابلے کے بعد عین الملک کو شکست ہو گئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ بادشاہ نے اسے معافی دیکر پھر منصب جلیلہ پر سرفراز کر دیا۔ اور اس طرح یہ بغاوت بھی دب گئی۔

محمد شاہ تغلق کی حکومت کے خلاف ان بے شمار بغاوتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بادشاہ کی بے عقلیوں نے کس طرح نظامِ حکومت کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ بغاوتوں کا سلسلہ صرف مندرجہ بالا بغاوتوں ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اور بھی اسی قسم کی لاتعداد بغاوتیں جابجا برپا ہوتی رہیں لیکن یہ بغاوتیں چونکہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ اس لئے ہم نے طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مگر آگے چل کر ہم "امیرانِ صدہ" کی جس بغاوت کا تذکرہ کریں گے وہ ایک ایسی بغاوت ہے جس نے کہ نہ صرف سلطان محمد تغلق کی حکومت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ بلکہ اس بغاوت کے صدمہ نے سلطان کی جان بھی لے لی۔

دہلی والوں کو دہلی میں آباد ہونیکی اجازت

سنہ ۷۴۰ھ مطابق سنہ ۱۳۴۰ء میں جب محمد تغلق دیوگیر کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد دہلی آیا تو اس شہر کو اجاڑ دیکھ کر اسکے دل پر بے حد اثر ہوا۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ محمد تغلق نے دہلی والوں کے لئے تو دہلی میں رہنا جرم قرار دیدیا تھا۔ لیکن دوسرے ضلع کے باشندوں کو اس نے دہلی میں آباد کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود دہلی آباد نہ ہو سکی۔ اب محمد تغلق کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور اس نے دہلی کو دوبارہ آباد کرنے کے خیال سے دہلی والوں کو پھر دہلی واپس آنیکی اجازت دیدی لیکن جو لوگ کہ دولت آباد یا دوسرے شہروں میں آباد

ہو چکے تھے دہلی کیوں واپس آنے لگے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو لوگ دوسرے ضلعوں سے آکر دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ بھی دہلی کی قحط سالی سے تنگ آکر دہلی چھوڑنے لگے۔ سلطان نے ان کو بالجبر دہلی میں رکھنے کی غرض سے دہلی سے باہر جانا قانوناً ممنوع قرار دیدیا۔ لیکن بعد میں جب لوگ فاقہ کشی سے دہلی میں مرنے لگے تو یہ پابندی اُٹھالی گئی۔ اس پابندی کے اُٹھنے کے بعد وہ لوگ بھی یہاں سے چلے گئے جو دوسرے ضلعوں سے آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ بھی دہلی چھوڑ کر دریائے گنگا کے کنارے قصبہ کھور کے پاس ایک شاداب مقام پر جاکر آباد ہو گیا۔ اس مقام کا نام "سورگ دواری" یعنی جنت کا دروازہ رکھا گیا۔ یہاں اچھی خاصی آبادی قائم ہو گئی تھی۔ غرضکہ بادشاہ نے پہلے تو دہلی چھوڑ کر دولت آباد کو اپنی قیام گاہ بنایا۔ پھر دولت آباد سے آکر قیام کرنا چاہا۔ اور جب یہاں بھی جی نہ لگا تو "سورگ دواری" کے ویرانہ کو اپنی قیام گاہ تجویز کیا۔

امیرانِ صدہ کی بغاوت

ملک عزیز حمار حاکم مالوہ کو جب محمد تغلق نے دھار میں حاکم مقرر کر کے متعین کیا تو ہدایت کی کہ دھار اور مالوہ میں جتنی بھی بغاوتیں ہوتی ہیں۔ ان کے بانی مبانی امیرانِ صدہ ہیں۔ لہذا امیرانِ صدہ میں سے جو بھی سر اٹھائے اس کو فوراً کچل دیا جائے۔ امیرانِ صدہ وہ امیر تھے جنکو سو سوار رکھنے کی اجازت تھی۔

ملک عزیز حمار ایک کمینہ فطرت انسان تھا جس کو اُمرا اور شرفا سے فطری عداوت تھی۔ اس نے بادشاہ کی شہ پاکر دھار آتے ہی ستر اسی امیرانِ صدہ کو ایک دعوت کے بہانے بُلایا۔ مجمع عام میں انکی خوب تذلیل کی۔ اور ان کو اسی دعوت میں قتل کر دیا۔ ملک عزیز کے اس ظلم و ستم کا بادشاہ کو علم ہوا

تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور اس کو خلعت عنایت کی لیکن اس واقعہ نے دھار اور مالوہ کے سیکڑوں امیران صدہ میں بغاوت کی لہر دوڑا دی اور یہ بغاوت برابر بڑھتی چلی گئی۔

دھار اور مالوہ کے بعد امیران صدہ کی یہ بغاوت دوسرے علاقوں میں بھی پھیلنی شروع ہو گئی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں وزیر گجرات بادشاہ کیلئے گھوڑے اور خزانہ لیکر بڑودہ سے گزر رہا تھا کہ بڑودہ کے امیران صدہ نے جو باغی ہو چکے تھے اُس پر حملہ کر کے گھوڑے اور خزانہ چھین لیا۔ اسکے بعد باغی امیران صدہ نے جمعیت فراہم کر کے کھمبات پر حملہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ بغاوت سارے گجرات میں اس طرح پھیلی کہ تمام علاقہ تہہ و بالا ہو گیا۔

بادشاہ نے امیرانِ صدہ کی ان شورشوں کا حال سُنا تو دہلی میں اپنی جگہ اپنے چچا زاد بھائی ملک فیروز کو چھوڑنے کے بعد خود ۷۴۸ھ مطابق ۱۳۴۷ء میں گجرات کے لئے روانہ ہو گیا۔ ابھی بادشاہ سلطان پور ہی میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ مالوہ کے امیران صدہ نے حاکم مالوہ ملک عزیز حمار کو قتل کر دیا ہے لیکن بادشاہ سیدھا گجرات چلا گیا۔ گجرات کے متصل کوہ آبو پر پہنچ کر باغیوں کی سرکوبی کی اس کے بعد بھروچ پہنچ کر ملک قبول اور عماد الملک کے ذریعہ امیرانِ صدہ کا قتل عام کرایا۔ اور انکے بیوی بچوں کو تہہ تیغ کیا۔ پھر بادشاہ دولت آباد کی جانب متوجہ ہوا۔ چنانچہ زین الدین رند اور سر رکن الدین تھانیسری کو کہ جو چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ دولت آباد کے امیرانِ صدہ کی سرکوبی کیلئے متعین کیا لیکن امیرانِ صدہ نے دولت آباد پر حملہ کر کے وہاں بھی اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ قلعہ کی فوج کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ عالم الملک سپہ سالار کو قید کر لیا اور تقریباً تمام حکام اور عمال کو قتل کر ڈالا۔ اسکے بعد دولت آباد

میں زیادہ سے زیادہ امیرانِ صدہ کو جمع کرکے اسمٰعیل نامی امیر صدہ کو بادشاہ بناکر اس کو نصیرالدین کا خطاب دیدیا۔ اور رعایا کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ بادشاہ کو جب اس فتنۂ عظیم کا علم ہوا تو وہ دوڑا ہوا دولت آباد آیا۔ غرضکہ امیرانِ صدہ اور بادشاہ میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی مگر امیران صدہ کو شکست ہوگئی اور انھوں نے اپنے آپکو دیوگیر کے قلعہ میں محصور کرلیا۔

بادشاہ نے قلعہ کو فتح کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ابھی قلعہ فتح نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ کو اطلاع ملی کہ ملک طغی نے امیران صدہ کے ساتھ ملکر حاکم گجرات کو قتل کردیا ہے۔ شاہی عمال کو قید کرلیا ہے اور کھمبات کو غارت کرکے بھروچ کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی بادشاہ دیوگیر کے محاصرہ کو ادھورا چھوڑ کر گجرات کی طرف بھاگا۔ ملک طغی بھی بادشاہ کے مقابلے کے لئے تیار تھا۔ احمد آباد میں جنگ ہوئی۔ ملک طغی شکست کھانیکے بعد ٹھٹھہ بھاگ گیا۔ ابھی بادشاہ کو ملک طغی کے فتنے سے فرصت نہیں ملی تھی کہ امیران صدہ کے سرگروہ حسن گانگو نے جو کہ خود بھی امیر صدہ تھا۔ بادشاہ کے داماد عمادالملک کو قتل کرکے سارے دکن پر قبضہ جما لیا حاکم مالوہ کو اپنے ساتھ ملالیا۔ اور دیوگیر کے قلعہ پر حملہ کرکے اسمٰعیل اور ان امیران صدہ کو نکال لیا۔ جو کئی ماہ سے محصور تھے۔ پھر اسمٰعیل کی بجائے جسے نصیرالدین کا خطاب دیا گیا تھا سب امیران صدہ نے اتفاق رائے سے حسن گانگو کو اپنا بادشاہ تسلیم کرکے اسے سلطان علاءالدین کا خطاب دیدیا۔ بادشاہ نے حسن گانگو کے مقابلہ کے لئے دہلی سے لشکر بھجدیا۔ خود گجرات کی شورشوں کو دباتا رہا۔ پے درپے فتنوں اور بغاوتوں کی وجہ سے بادشاہ کی صحت پر بہت برا اثر پڑا۔ چنانچہ بادشاہ باغیوں کی سرکوبی کے سلسلے میں ٹھٹھہ میں تھا کہ بخار میں مبتلا ہوگیا

اور اسی بخار میں ۲۱ محرم ۷۵۲ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو وفات پاگیا۔

محمد تغلق کو قتل اور خونریزی کا شوق

محمد تغلق اپنے زمانہ کا ایک نہایت ہی تند مزاج حکمران تھا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی دن ایسا گذرتا تھا کہ بادشاہ کے دروازہ پر کسی نہ کسی کو قتل نہ کیا جاتا ہو وہ معمولی معمولی خطاؤں پر ہاتھیوں کے پیروں تلے لوگوں کو کچلوا دیتا تھا۔ اور زندہ جسم سے کھال اُتروا کر بھس بھروا دیتا تھا۔ ہر روز سیکڑوں قیدی اس کے سامنے لائے جاتے تھے جنکو سخت سے سخت سزائیں دیجاتی تھیں۔ یہاں تک کہ سلطان اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی سخت سے سخت اذیتیں دیتا تھا۔ اس نے اپنے ایک بھائی مسعود خاں کو قتل کراکے اسکی لاش بازار میں پھنکوا دی تھی۔ جو حسب دستور تین روز تک بازار میں پڑی رہی۔ بادشاہ کے ظلم اور جبر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا تھا جسمیں کوئی مولوی مفتی قاضی یا صوفی اس کے حکم سے قتل نہ ہوتا ہو انسان کے مارنے کا اسے اتنا بھی افسوس نہ ہوتا تھا جتنا پاؤں تلے چیونٹی کے پس جانیکا ہوتا ہے۔ غرضکہ وہ اپنے دَور کا بہت بڑا ظالم اور جابر بادشاہ تھا۔

محمد تغلق ایک بے نظیر سپہ سالار تھا

محمد تغلق کے ظلم، جبر اور حماقتوں کے واقعات سے اگرچہ تاریخیں رنگی پڑی ہیں لیکن اسکے ساتھ ہی اس چیز سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ اسکی بے نظیر سپاہیانہ قابلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک ہی وقت میں ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتوں پر بغاوتیں برپا ہوتی تھیں لیکن وہ گھبرائے بغیر ہر بغاوت کو خود جاکر نہایت آسانی سے دبا دیتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر وہ اتنا بڑا سپہ سالار نہ ہوتا تو ستائیس سال تو

کیا شائد ستائیس دن بھی تخت پر نہیں رہ سکتا تھا۔ ذرا غور فرمائیے کہ پے در پے حماقتوں اور انتہائی ظلم و جبر کے باوجود کوئی متنفس بھی اس کو اپنی جگہ اور ارادہ سے نہیں ہلا سکا۔ حالانکہ ایسے اُلجھے ہوئے دماغ کے انسان کی حکومت صرف چند روزہ ہوا کرتی ہے۔ مگر اس کی بے نظیر سپاہیانہ قابلیت قدم قدم پر اس کے لئے سپر بنی رہی۔ وہ جدھر بھی جاتا تھا اس کی خارا شگاف شمشیر مخالفوں کے پہاڑوں کو کاٹتی چلی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بے نظیر سپہ سالار ہونے کے ساتھ وہ سوجھ بوجھ کا بھی مالک ہوتا تو کوئی تعجب نہ تھا کہ اپنی بے نظیر سپاہیانہ قابلیت سے وہ برِ اعظم ایشیا کے بیشتر حصہ کو فتح کر ڈالتا۔

محمد تغلق کی قابل قدر خوبیاں

محمد تغلق میں صرف ایک ہی خوبی نہ تھی کہ وہ ایک بے نظیر سپہ سالار تھا بلکہ اس کے علاوہ بھی اس میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ فیاضی میں وہ حاتم ثانی تھا اس نے خزانے کے خزانے لٹا دیئے۔ عالموں، فاضلوں اور ماہرین فن کو وہ لاکھوں روپیہ دیتا تھا۔ صاحب کمال دُور دُور سے اس کے دربار میں آتے تھے اور مالا مال ہو کر جاتے تھے۔ اس نے بیماروں کے لئے شفا خانے محتاجوں کیلئے محتاج خانے اور مسافروں کے لئے ہزاروں مسافر خانے بنوا دئے تھے۔ قحط کے زمانہ میں لاکھوں من غلہ مفت تقسیم کراتا تھا۔ اس کے زمانہ میں ڈاک کا انتظام بہترین تھا۔ دُور دراز مقامات کی ڈاک بھی پانچ چھ روز میں پہنچ جاتی تھی۔

محمد تغلق اپنی تمام خامیوں کے باوجود نماز روزہ کا سختی کے ساتھ پابند تھا پانچوں وقت کی نماز پڑھتا تھا اور رمضان کے روزے کبھی قضا نہیں کرتا تھا۔ بلکہ رعایا کو نماز روزے کے لئے بالجبر مجبور کرتا تھا۔ شراب یا کسی نشیلی چیز کو اس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ حرام کاری سے اس کو دلی نفرت تھی۔ قمار بازی اور لہو و لعب

سے وہ دُور بھاگتا تھا۔

محمد تغلق کی علمی قابلیت

سلطان محمد شاہ تغلق کا درجہ علمی اعتبار سے بھی کافی بلند تھا۔ وہ عربی اور فارسی زبان کا عالم تھا۔ اپنے زمانہ کا بہترین خطاط تھا۔ تحریر و تقریر دونوں پر اس کو پوری طرح ملکہ حاصل تھا۔ فارسی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ جو بات ایک دفعہ سُن لیتا عمر یاد رکھتا۔ ہزاروں اشعار اسے یاد تھے۔ کتابیں کی کتابیں ازبر تھیں۔ معقولات اور الٰہیات۔ طبیعات اور ریاضیات سے اس کی طبیعت کو بے حد لگاؤ تھا۔ فن طب میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ مریضوں کا علاج بھی کرتا تھا۔ غرضکہ اس بادشاہ میں ایسی متضاد صفات تھیں جو مشکل سے کسی ایک انسان میں پائی جا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عجوبہ روزگار انسان تھا جسمیں عیوب بھی بے انتہا تھے۔ اور خوبیاں بھی بے اندازہ تھیں۔

محمد تغلق کی موت کے بعد خونیں ہنگامہ

سلطان محمد تغلق کی موت دار السلطنت سے دُور ٹھٹھ (سندھ) میں واقع ہوئی تھی۔ سلطان کا چچازاد بھائی ملک فیروز سلطان کے طلب کرنے پر بیماری کے زمانہ ہی میں اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے آخری وقت میں بادشاہ کی بڑی توجہ کے ساتھ تیمارداری کی تھی، بادشاہ جو پہلے سے اس پر مہربان تھا اس کی اطاعت شعاری اور خدمت سے اور بھی گرویدہ ہو گیا چنانچہ بادشاہ کی موت کا وقت جب قریب آیا تو اُس نے وصیت کی کہ میرے بعد فیروز کو بادشاہ بنایا جائے بادشاہ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس لئے بادشاہ ملک فیروز سے اولاد کی طرح محبت کرتا تھا۔ اس نے ملک فیروز کی اپنی اولاد کی طرح تربیت کی تھی لیکن جس غریب الوطنی اور پریشان کُن حالات

میں بادشاہ کی موت واقع ہوئی۔ وہ ایسے حالات تھے کہ ملک فیروز کی فوراً ہی تخت نشینی عمل میں نہ آسکی۔

بادشاہ جس وقت مرا ہے تو ٹھٹھ میں سلطانی لشکر کے علاوہ مغلوں کا بھی ایک بہت بڑا لشکر موجود تھا۔ جو سلطانی لشکر کے ساتھ ساتھ بغاوتوں کے دبانے میں نمایاں حصہ لے رہا تھا۔ اور بادشاہ کا اطاعت شعار تھا لیکن بادشاہ کی آنکھ بند ہوتے ہی مغل لشکر کے سرداروں کی نیت بگڑ گئی۔ انھوں نے سوچا کہ ایسی حالت میں جب کہ اس ملک کا بادشاہ کوئی نہیں ہے۔ کیوں نہ موقعہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ سلطانی لشکر کے سپاہی دہلی واپس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اور بالکل غیر مسلح اور بے ترتیب تھے مغل لشکر نے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ خزانے کے اونٹ چھین لئے۔ دل کھول کر لوٹ مار کی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ٹھٹھ کے باغی بھی مغل لشکر کے ساتھ مل گئے غرضکہ مغل لشکر نے اچھا خاصہ خونیں ہنگامہ برپا کر دیا جس کی وجہ سے فیروز شاہ کی تخت نشینی کا مسئلہ التوا میں پڑ گیا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق

محمد تغلق کی غریب الوطنی میں موت کی وجہ سے ملک میں جب ابتری اور خانہ جنگی دن بدن بڑھنے لگی اور اُمرائے سلطنت نے دیکھا کہ محض بادشاہ اور سردار کے نہ ہونے سے بدنظمی بڑھتی جارہی ہے۔ نیز یہ بھی اندیشہ ہوا کہ کہیں مغل موقعہ پاکر حکومت پر قبضہ جمانے کی کوشش نہ شروع کردیں۔ تو سب نے متفق ہوکر ملک فیروز سے کہا کہ بادشاہ نے آپ کو ولیعہد مقرر کیا ہے آپ حکومت کی ذمہ داری سنبھالیئے۔ مگر ملک فیروز نے سلطنت کے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن اُمرا کے زیادہ زور دینے پر ملک فیروز راضی ہوگیا۔ تخت پر بیٹھنے سے قبل ملک فیروز نے شکرانہ کے دو نفل ادا کیئے۔ اور گڑگڑا گڑگڑا کر بارگاہِ الٰہی میں سلطنت کی کامیابی کے لیئے دُعا مانگی۔ اسکے بعد ۲۴ محرم ۷۵۲ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۳۵۱ء کو ٹھٹھ میں تاج شاہی سر پر رکھا اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ فیروز تغلق کا تخت نشین ہوتا تھا کہ تمام شہر میں شادیانے بجنے لگے اور مخالفین میں گھبراہٹ پھیلنی شروع ہوگئی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کی ابتدائی زندگی

فیروز شاہ تغلق سلطان غیاث الدین تغلق کے چھوٹے بھائی سپہ سالار رجب کا بیٹا تھا جو ایک نو مسلم راجپوت خاتون بی بی نائلہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ بی بی نائلہ دیپالپور کے راجپوت سردار رانا مل بھٹی کی لڑکی تھی۔ سپہ سالار رجب اور بی بی نائلہ کی شادی اس زمانہ میں ہوئی تھی جس زمانہ میں کہ غیاث الدین تغلق دیپالپور کا گورنر تھا۔ غیاث الدین تغلق ہی

کی کوشش سے یہ بین الملتی شادی انجام پائی تھی۔ فیروز شاہ جب پیدا ہوا، تو دیپالپور میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ غیاث الدین تغلق نے بھائی کے گھر بیٹا پیدا ہونے کی خوشی میں بے اندازہ انعام و اکرام تقسیم کیا۔ لیکن ابھی فیروز شاہ تغلق سات ہی برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بھائی کی موت کے بعد غیاث الدین تغلق نے بھاوج کی ہر ممکن دلداری کی اور فیروز شاہ تغلق کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔

غیاث الدین تغلق کو اپنے اس بھتیجے سے اس قدر محبت تھی کہ کبھی اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ جب غیاث الدین تغلق بادشاہ بن گیا تو جنگی معرکوں میں بھی فیروز شاہ تغلق کو برابر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اسے قدم قدم پر جہانبانی اور شہریاری کی عملی تعلیم دیتا تھا۔ جب غیاث الدین تغلق مرا تو اس وقت فیروز شاہ تغلق کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ غیاث الدین کے مرنے کے بعد محمد تغلق نے فیروز شاہ تغلق کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اس سے بے اندازہ محبت کرنے لگا۔ وہ برابر فیروز شاہ تغلق کو حکمرانی کے اُصول بتاتا رہتا تھا۔ محمد تغلق کے چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے وہ اپنے اس چچازاد چھوٹے بھائی ہی کو اولاد سمجھتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کو بھی اپنے سرپرست اور بڑے بھائی محمد تغلق سے بے اندازہ محبت تھی چنانچہ اسے محمد تغلق کی موت کا بے حد رنج ہوا۔ وہ اتنا رنجیدہ تھا کہ جب اُسے شاہی لباس پہنایا گیا تو اس نے ماتمی لباس پر ہی یہ شاہی لباس زیب تن کر لیا۔ جب اُمرا نے کہا کہ آپ اس ماتمی لباس کو تو اُتار دیجئے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے محض مصالح ملکی کی خاطر یہ شاہانہ لباس پہن لیا ہے۔ مگر میں ماتمی لباس ہرگز نہیں اُتاروں گا۔ کیونکہ یہ اس شخص کے ماتم کا لباس ہے جو میرا محسن۔ میرا

اُستاد۔ میرا آقا اور میرا رہنما اور میرا باپ تھا۔

فیروز شاہ کی مغلوں پر فتح

حکومت کے اختیارات سنبھالنے کے فوراً ہی بعد فیروز شاہ تغلق نے اُن مغلوں کی سرکوبی کے لئے فوج کو ترتیب دیا۔ جنہوں نے کہ ابھی تک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ چنانچہ فیروز شاہ پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا۔ مغلوں نے شروع میں تو مقابلہ کیا لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد ان کے پاؤں اُکھڑ گئے اور ایسے بھاگے کہ بے اندازہ سامان میدانِ جنگ میں چھوڑ گئے۔ اس کے بعد فیروز شاہ نے ٹھٹھے کے باغیوں کی جانب متوجہ ہو کر اُس بغاوت کو فرو کیا، جو مغلوں کے ساتھ مل کر انھوں نے برپا کر رکھی تھی۔ اِن دو اہم معرکوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

دہلی میں ایک دوسرے بادشاہ کی تخت نشینی

جس وقت کہ ٹھٹھہ میں فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ عین اسی وقت محمد تغلق کے نائب اور وزیرِ اعظم خواجہ جہاں نے ایک مجہول النسب چھ سالہ لڑکے کو غیاث الدین محمود شاہ کے لقب کے ساتھ دہلی کے تخت پر بٹھا دیا اور یہ مشہور کیا کہ یہ لڑکا محمد تغلق کا بیٹا ہے۔ حالانکہ ساری دنیا جانتی تھی کہ محمد تغلق کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اس نام نہاد بادشاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھانے کے بعد خواجہ جہاں نے خوب دولت لٹائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ جو پہلے ہی خالی تھا اس پر بالکل جھاڑو پھر گئی۔ جب خواجہ جہاں کو یہ معلوم ہوا کہ ٹھٹھہ میں فیروز شاہ تخت نشین ہو گیا ہے۔ تو اسے اپنی جان کی فکر ہوئی چنانچہ اس نے فیروز شاہ کے مقابلے کے لئے بیس ہزار سواروں کا لشکر فوراً تیار کیا۔ تاکہ موقع آنے پر وہ فیروز شاہ کو

ترکی بترکی جواب دے سکے۔

فیروز شاہ کا پُرجوش خیر مقدم

فیروز شاہ کو اگرچہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خواجہ جہاں نے ایک کٹھ پتلی بادشاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھاکر اس کے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ لیکن اُس نے نہ تو اپنے چہرے سے کسی پریشانی کا اظہار کیا اور نہ فوج ہی پر یہ راز ظاہر ہونے دیا تاکہ فوج میں کسی قسم کی بددلی یا شرارت نہ پیدا ہونے پائے وہ اطمینان کے ساتھ منزلیں طے کرتا ہوا دہلی کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دیپال پور اور ملتان ہوتا ہوا دہلی کے قریب جا پہنچا۔

دہلی کے باشندوں اور اُمرا کو جب یہ اطلاع ملی کہ بادشاہ دہلی آرہا ہے تو دہلی کے بے شمار اُمرا، اور باشندے خوشی خوشی راستہ ہی میں بادشاہ کے پاس پہنچکر شاہی جلوس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان لوگوں کی بادشاہ کے پاس پہنچنے کی وجہ یہ تھی کہ اوّل تو دہلی کے عوام اور اُمرا کو فیروز شاہ سے بے حد عقیدت اور محبت تھی۔ دوسرے یہ کہ خواجہ جہاں کے اس تازہ فتنہ سے دہلی کے باشندوں کو اور اُمرا کو یہ خوف ہو گیا تھا کہ دہلی میں بادشاہ کی آمد پر بڑی خونریزی ہوگی۔ اس لئے اس خونریزی سے بچنے کیلئے اور بادشاہ کی اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے عوام اور اُمرا کا ایک جم غفیر راستہ ہی میں بادشاہ سے آن ملا۔ اس جم غفیر میں اُمرا اور دہلی کے خوشحال باشندوں کے اہل و عیال تک شامل تھے۔ جو لوگ کسی وجہ سے دہلی سے نہیں جا سکے تھے وہ بادشاہ کی آمد کیلئے چشم براہ تھے ابھی بادشاہ راستہ ہی میں تھا کہ خواجہ جہاں کا قاصد فیروز شاہ کے شاہ کے پاس دہلی کے کٹھ پتلی بادشاہ کا فرمان لیکر پہنچا جسمیں فیروز شاہ کو کٹھ پتلی بادشاہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا فیروز شاہ نے اس فرمان کو چاک کر دیا۔ یہی فیروز شاہ کا جواب تھا۔

فیروز شاہ منزلیں طے کرتا ہوا جب دہلی کے قریب پہنچا تو خواجہ جہاں کا دست راست قوام الملک بھی معہ اہل و عیال کے بادشاہ سے آن ملا۔ اور اس طرح خواجہ جہاں کی بالکل کمر ٹوٹ گئی۔

خواجہ جہاں کی فیروز شاہ کی خدمت میں حاضری

قوام الملک اور تمام اُمرا کے قابو سے نکل جانے کے بعد خواجہ جہاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اسے یقین تھا کہ اب اسے بغاوت کے جرم میں زندہ نہیں چھوڑا جائیگا۔ اب اس کے لئے بچنے کی آخری صورت یہی تھی کہ وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد کسی نہ کسی طرح اپنا قصور معاف کرا لے۔ بادشاہ فتح آباد میں ظہر کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اس نے دیکھا کہ خواجہ جہاں مجرموں کی ہیئت بنائے چلا آ رہا ہے۔ خواجہ جہاں کی پگڑی اُتری ہوئی گلے میں پڑی تھی، سر منڈا ہوا تھا۔ ننگی تلوار گلے میں لٹک رہی تھی۔ بادشاہ نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور حکم دیا کہ اسے سبزہ پر لے جائیں۔ اس کے بعد اُمرائے سلطنت سے خواجہ جہاں کے بارے میں مشورہ کیا۔

بادشاہ چاہتا تھا کہ اس اسی سالہ بوڑھے کو معاف کر دیا جائے مگر اُمرائے سلطنت کی رائے تھی کہ اس کو معاف کرنا باغیوں کی ہمت افزائی کرنیکے ہم معنی ہے۔ آخر یہ طے ہوا کہ خواجہ جہاں کو وزارت عظمےٰ کے عہدے سے معزول کر کے سامانہ بھیجدیا جائے۔ اس فیصلہ کے مطابق خواجہ جہاں کو سامانہ کی جانب روانہ کر دیا گیا لیکن ابھی خواجہ جہاں راستہ ہی میں تھا کہ شیر خاں نے اسے قتل کر دیا۔ اب فیروز شاہ کے راستے سے سارے کانٹے ہٹ چکے تھے۔ فیروز شاہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دارالسلطنت

دہلی میں داخل ہوا۔ سارا شہر دلہن بنا ہوا تھا۔ ہر طرف شادیانے بج رہے تھے۔ غرضکہ برابر اکیس دن تک دہلی میں بادشاہ کی آمد پر جشن منایا جاتا رہا۔

فیروز شاہ کو جنگ اور خونریزی سے نفرت

سلطان محمد تغلق جتنا کہ جنگ اور خونریزی کا شائق تھا اتنی ہی فیروز شاہ کو قتل و خون سے نفرت تھی۔ چنانچہ دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے بعد جدید فتوحات کی طرف متوجہ ہونا تو درکنار اس نے سلطنتِ اسلامیہ کے ان علاقوں کے واپس لینے کی بھی کوئی خاص کوشش نہیں کی جن کو کہ باغیوں نے دبا لیا تھا۔ فیروز شاہ کہا کرتا تھا کہ حکومت کو وسعت دینے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ جو حکومت قبضہ میں ہو اس کا انتظام بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کی جائے۔ فیروز شاہ ساری عمر اسی اُصول پر عامل رہا۔ اس کی تمام تر کوشش یہی رہی کہ اس کی رعایا خوش حال رہے اور ملک میں جنگ اور خونریزی نہ ہو لیکن پھر بھی اسے متعدد لڑائیوں میں مجبوراً حصہ لینا پڑا۔

فیروز شاہ کا بنگال پر پہلا حملہ

تخت نشینی کے ابتدائی تین سال میں تو فیروز شاہ نے اپنی جد و جہد کو صرف سلطنت کے اندرونی انتظام تک محدود رکھا۔ لیکن تین سال کے بعد ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں اسے مجبوراً اس لئے بنگال پر حملہ کرنا پڑا۔ کیونکہ بنگال کے باغی الیاس نے سارے بنگال میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اس نے شمس الدین کا لقب اختیار کرنے کے بعد خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اور بنارس تک قابض ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے سوچا کہ اگر اس فتنہ کو نہ روکا گیا تو یہ آگے بڑھ کر ساری حکومت کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ لہذا

فیروز شاہ ایک بہت بڑا لشکر لیکر شمس الدین پر حملہ آور ہوا شمس الدین بادشاہ کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر جزیرہ اکدولہ میں پناہ گزیں ہوگیا۔

فیروز شاہ نے جب یہ دیکھا کہ شمس الدین اس جزیرہ سے باہر ہی نہیں آتا تو بادشاہ جنگی چال چلتے ہوئے اس طرح اپنے لشکر کو پیچھے ہٹا کرلے گیا جیسے وہ ناکام و نامراد واپس جا رہا ہے شمس الدین دھوکہ میں آگیا۔ اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ سلطانی لشکر بھاگا جا رہا ہے۔ جزیرہ سے نکل کر سلطانی لشکر کا تعاقب کیا۔ سلطانی لشکر فوراً ایلٹ پڑا۔ اور ذرا سی دیر میں شمس الدین کی فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ بادشاہ کو فتح ہوئی۔ اور شمس الدین جان بچا کر بھاگ گیا۔ اور قلعہ اکدولہ میں پھر پناہ گزیں ہوگیا۔ سلطانی لشکر نے قلعہ اکدولہ کا سختی سے محاصرہ شروع کیا تو ہزاروں عورتیں اور بچے آہ و فغاں اور فریاد کرتے ہوئے موت کے خوف سے کوٹھوں پر آ گئے۔ بادشاہ کو ان پر رحم آگیا اور حکم دیا کہ اس طرح قلعہ فتح کیا جائے کہ کسی بے گناہ کو گزند نہ پہنچے۔ اسی موقعہ پر جب بادشاہ کے سامنے بنگالی سپاہیوں کے سروں کا انبار پیش کیا گیا تو بادشاہ ان کو دیکھ کر رو دیا اور رو کر کہا کہ یہ سب بیچارے بے قصور تھے محض پیٹ اور اہل و عیال کی پرورش کے جرم میں مارے گئے۔ اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ پنڈوہ میں آیا۔ اور اس کا نام بدل کر اپنے نام پر فیروز آباد رکھا اور وہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہوگیا دہلی میں جب وہ داخل ہوا تو ۴۷ ہاتھی جو اس جنگ میں ہاتھ آئے تھے آگے آگے تھے۔ بادشاہ کا دہلی میں نہایت ہی پرجوش طریقہ پر استقبال کیا گیا۔

بادشاہ کو نئے شہر بنانے کا شوق بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے دہلی سے کچھ فاصلہ پر حصار فیروزہ کے نام سے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ اور امراء کو حکم دیا

وہ بھی اس جدید شہر میں اپنے مکانات تعمیر کرائیں۔ بادشاہ نے خود اپنے لئے بھی یہاں ایک محل بنوایا۔ پانی کے لئے نہر نکالی گئی اور اسی حصار فیروزہ کو ہانسی کی بجائے تحصیل مالگذاری کا صدر مقام قرار دیا۔ اسی طرح بادشاہ نے فتح آباد کے نام سے بھی ایک شہر تعمیر کیا، پھر بادشاہ نے جمنا کے کنارے دہلی سے پانچ میل کے فاصلہ پر فیروز آباد کے نام سے ایک نیا شہر تعمیر کیا۔ ان شہروں کے علاوہ شہر جونپور بھی اسی بادشاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ ابتدا میں اس شہر کا نام سلطان محمد تغلق جوناخاں کے نام پر "جوناپور" رکھا گیا تھا جو کثرتِ استعمال سے جونپور بن گیا۔

فیروز شاہ کا بنگال پر دوسرا حملہ

بنگال کی پہلی مہم کے بعد جب فیروز شاہ دہلی واپس آ گیا تو شمس الدین نے اکدولہ کے قلعہ سے نکل کر لشکر فراہم کیا۔ اور سنار گاؤں پر حملہ کر کے وہاں کے بادشاہ فخر الدین کو قتل کر دیا۔ اور سارا ملک دبا بیٹھا۔ فخر الدین زمانہ دراز سے اس علاقہ میں حکومت کر رہا تھا۔ اس حادثہ کے بعد فخر الدین کا داماد خضر خاں بادشاہ کی مدد حاصل کرنے کے لئے حصار فیروزہ پہنچا۔ اور بادشاہ کو اپنے خسر اور اپنے خاندان کی تباہی کی ساری داستان سنائی۔ بادشاہ نے خضر خاں کو زرد جواہر دے کر مالا مال کر دیا۔ اور حکم دیا کہ بنگال کے لئے فوراً لشکر تیار کیا جائے۔ چنانچہ ۷۶۰ھ (۱۳۵۹ء) میں بادشاہ خود لشکر لیکر بنگال جا پہنچا۔ لیکن بنگال جا کر معلوم ہوا کہ شمس الدین مر چکا ہے۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان سکندر شاہ حکومت کر رہا ہے۔

سکندر شاہ کو جب پتہ چلا کہ بادشاہ ایک بڑا لشکر لیکر اس کی سرکوبی کے لئے آ رہا ہے تو وہ مقابلہ کئے بغیر اپنے باپ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے جزیرہ اکدولہ میں جا چھپا۔ اور اپنے آپ کو قلعہ میں محصور کر لیا۔ سلطانی لشکر نے اس قلعہ کو چاروں

طرف سے گھیر لیا۔ ابھی محاصرہ کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ اتفاقاً قلعہ کا ایک برج جو کمزور تھا۔ آدمیوں کے بوجھ سے گر گیا۔ اور قلعہ میں ایک بہت بڑا خلا ہو گیا۔ سپہ سالار حسام الملک نے اس کو تائید غیبی سمجھتے ہوئے بادشاہ سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو قلعہ کے شکستہ حصے کے راستے قلعے کو فتح کر لیا جائے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ جب قلعہ میں لشکر جائے گا تو ہزاروں پردہ نشین عورتوں کی بے پردگی۔ اور آبروریزی ہوگی اور نااہلوں کے ہاتھوں ان کی عزت برباد ہو جائے گی۔ ابھی توقف کرو دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ فوجی افسر خاموش ہو گئے اور بنگالیوں نے اس برج کو فوراً تعمیر کر لیا۔ لیکن قلعہ میں کیونکہ خورد و نوش کا سامان نہیں رہا تھا۔ اس لئے سلطان سکندر شاہ نے بادشاہ سے صلح کی درخواست کی جو بادشاہ نے اس شرط کے ساتھ منظور کر لی کہ سنار گاؤں کے تخت پر خضر خاں کو بٹھا دیا جائے اسکے بعد بادشاہ نذرانہ کے چالیس ہاتھی لیکر دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔ سفر سے قبل بادشاہ نے جب سنار گاؤں کی حکومت خضر خاں کو پیش کی تو خضر خاں نے اس حکومت کے مقابلہ میں بادشاہ کی مصاحبت کو ترجیح دی۔ غرضکہ بادشاہ اپنی رحمدلی کی بدولت اپنی اس دوسری مہم سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو بنگال کے سارے علاقہ کو فتح کر کے لیے دہلی کی حکومت میں شامل کر سکتا تھا۔

فیروز شاہ کی گمشدگی

بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے برسات کا موسم ارجن پور میں گزارا، اس کے بعد جاج نگر (اڑیسہ) میں آیا۔ جاج نگر کا راجہ بادشاہ کی آمد کی اطلاع سن کر کشتی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ بادشاہ شاہی محل میں گیا۔ محل بہت شاندار تھا۔ اسی محل میں ایک بت خانہ بھی تھا جسمیں کہ جگن ناتھ کی مورتی رکھی ہوئی تھی بادشاہ نے اس مورتی کو دہلی بھیجدیا۔ اس کے بعد سلطانی لشکر نے جب راجہ کا تعاقب کیا تو سلا۷۶۲ھ

(۱۳۶۰ء) میں راجہ نے اطاعت قبول کرلی۔ اور بیس ہاتھی بادشاہ کو نذر کئے۔

بادشاہ جاج نگر سے جب دہلی واپس ہونے لگا تو راستہ بھول گیا۔ اور بادشاہ کا لشکر نامعلوم جنگلوں اور پہاڑوں میں پھنس کر رہ گیا جسکی وجہ سے نہ تو کوئی اطلاع دہلی بھیجی جاسکتی تھی اور نہ دہلی سے بادشاہ کے پاس کوئی اطلاع آسکتی تھی۔ بادشاہ کو دہلی سے نکلے ہوئے ڈھائی سال ہو چکے تھے اور چند ماہ سے تو خان جہاں وزیر اعظم اور اُمرائے سلطنت کو بادشاہ اور اس کے لشکر کی کوئی اطلاع ہی نہیں ملی تھی۔ بادشاہ کی اس گمشدگی سے دہلی کے اُمرائے سلطنت میں بڑی تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے سلطانی لشکر جنگلوں اور پہاڑوں سے نکلا اور دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ فوراً ڈاک کے ہرکارے دہلی دوڑائے گئے دہلی میں جب بادشاہ کی خیریت کی اطلاع پہنچی تو خوشیاں منائی گئیں اور بادشاہ کی آمد پر تو کئی روز تک دہلی میں اچھا خاصہ جشن رہا۔

فیروز شاہ کا نگر کوٹ پر حملہ

راجہ نگر کوٹ جس کو محمد تغلق اپنے زمانہ میں باجگذار بنا چکا تھا۔ مدت سے اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ فیروز شاہ نے بنگال کی مہم سے واپس آنے کے بعد اس سرکش راجہ پر حملہ کر دیا۔ راجہ نگر کوٹ سے بھاگ کر ایک پہاڑی قلعہ میں چلا گیا شاہی لشکر نے اس کی تمام ریاست کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ بادشاہ نے نگر کوٹ میں جوالا مکھی کے اس تاریخی مندر کو بھی دیکھا۔ جس کی بڑی شہرت تھی۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس قلعہ پر حملہ کر دیا جس میں کہ راجہ محصور تھا۔ راجہ نے ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) میں اطاعت قبول کرلی۔ فیروز شاہ نے اس کو چتر و خلعت دے کر نگر کوٹ کی حکومت پر بدستور بحال رکھا۔ لیکن نگر کوٹ کا نام تبدیل کر کے محمد تغلق کے نام پر محمد آباد رکھ دیا۔

فیروز شاہ کا سندھ پر حملہ

فیروز شاہ تغلق ان مصائب اور تکالیف کو نہیں بھولا تھا جو اس کو اور سلطان محمد تغلق کو سندھیوں کے ہاتھوں ٹھٹھہ میں اٹھانی پڑی تھیں۔ چنانچہ اس نے نوّے ہزار سوار اور ساڑھے چار سو ہاتھیوں کے لشکر سے ٹھٹھہ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت ٹھٹھہ میں جام اور بابنیا جو چچا بھتیجے تھے۔ حکومت کر رہے تھے۔ جام اور بابنیا کو ابتدا میں تو شکست ہوئی لیکن سلطانی لشکر میں ایسی بیماری پھیلی کہ ہزاروں سپاہی مر گئے۔ تین چوتھائی گھوڑے ہلاک ہو گئے۔ آخر بادشاہ کو مجبوراً اس مہم کو نامکمل چھوڑ کر گجرات کی طرف جانا پڑا۔ تاکہ گجرات سے نئی فوج لیکر اور تازہ دم ہونے کے بعد ٹھٹھہ پر حملہ کیا جائے لیکن بادشاہ کو راستہ میں ایک نئی مصیبت یہ پیش آئی کہ راجپوت رہبروں نے دھوکہ دے کر "کچھ کارن" کے اس بنجر علاقہ میں بادشاہ اور اس کے لشکر کو پہنچا دیا۔ جہاں نہ پانی تھا اور نہ دانہ چنانچہ شاہی لشکر کا بیشتر حصہ اس بنجر علاقہ میں آ کر مر گیا۔

بادشاہ بمشکل تمام اپنے بچے ہوئے مٹھی بھر آدمیوں کو لیکر گجرات پہنچا اور وہاں سے نئی فوج تیار کر کے ٹھٹھہ پر حملے کے لئے روانہ ہوا۔ گجرات کی اس فوج کے علاوہ سلطانی لشکر کی امداد کے لئے دہلی سے بھی ایک بڑی فوج اور بے اندازہ سامانِ جنگ آ گیا تھا۔ جام اور بابنیا نے جب سلمانوں کا یہ بے پناہ لشکر دیکھا تو انھوں نے لڑے بغیر اپنے آپ کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا اور ۷۷۳ھ (۱۳۷۲ء) میں اطاعت قبول کر لی۔ بادشاہ نے جام اور بابنیا دونوں کو حکم دیا کہ وہ مع اہل و عیال اس کے ساتھ دہلی چلیں اور ٹھٹھہ کی حکومت پر جام کے بیٹے اور بابنیا کے بھائی تماچی کو حاکم مقرر کر دیا۔ تماچی نے چار لاکھ روپیہ بطور نذر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور ہر سال معقول خراج دینے کا وعدہ کیا۔

بادشاہ جام اور بابنیا کو ساتھ لیکر جب دہلی آیا تو بادشاہ کی آمد پر حسب معمول خوشیاں منائی گئیں۔ دہلی آنے کے بعد بادشاہ نے جام اور بابنیا کے رہنے کے لیئے ایک محل دیدیا۔ اور شاہی خزانے سے ان کا وظیفہ مقرر کردیا۔ اور ان دونوں کو شاہی دربار میں کرسی دی گئی۔ چند روز کے بعد جب ٹھٹھ کے حاکم تماجی نے سرکشی کی تو جام خود اس سرکش کی تادیب کیلئے ٹھٹھ گیا اور تماجی کو دہلی بھیجدیا۔

گجرات اور اٹاوہ میں بغاوت

۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) میں خواجہ شمس الدین حاکم گجرات فیروز شاہ سے باغی ہوگیا۔ گجرات کے عمال جو اس سے جلے بیٹھے تھے۔ انھوں نے امیران صدہ کے ساتھ مل کر اسے قید کردیا۔ اور اس کا سر بادشاہ کے پاس بھجوادیا فیروز شاہ کے عہد حکومت میں سوائے اس حاکم گجرات کے کسی نے بادشاہ سے بغاوت نہیں کی۔ بادشاہ نے شمس الدین کی جگہ فرحت الملک کو گجرات کا حاکم مقرر کردیا۔ اسکے بعد ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں جب اٹاوہ کے چند زمینداروں نے شورش برپا کی تو اس نے خود جاکر اس بغاوت کو دبادیا اور مفسدوں کو سخت سزا دی ۷۸۲ھ (۱۳۸۰ء) میں کٹھیر میں کھرکو نامی ایک مقدم نے حاکم بدایوں سید محمد کو بھائیوں سمیت مہمان بلاکر قتل کردیا۔ جب فیروز شاہ کو اس مجرمانہ قتل کی اطلاع ملی تو وہ خود اس مفسد کی سرکوبی کے لیئے کٹھیر گیا۔ اور ہزاروں مفسدوں کو تہہ تیغ کیا۔ اس مہم کے بعد بادشاہ دہلی واپس آگیا۔

فیروز شاہ کو آخری عمر میں صدمہ پر صدمہ

فیروز شاہ تغلق کی حکومت کا بیشتر زمانہ تو بڑے امن اور سکون کے ساتھ گزر گیا۔ لیکن حکومت کے آخری عہد میں اس بادشاہ کو طرح طرح کی پریشانیوں اور صدموں کا سامنا کرنا پڑا۔ فیروز شاہ کو سب سے پہلا صدمہ

یہ پہنچا کہ اس کا وزیرِ اعظم خان جہاں مقبول ۷۷۲ھ (۱۳۷۰ء) میں مر گیا۔
خان جہاں مقبول تلنگانہ کا ایک ہندو مدبر تھا جس نے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام مقبول رکھ لیا تھا۔ سلطان محمد تغلق ہی کے زمانہ میں مقبول کو حکومت میں نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی تھی لیکن فیروز شاہ کے دورِ حکومت میں مقبول کو خانجہاں کا خطاب دیکر وزارتِ عظمےٰ کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خانجہاں مقبول فیروز شاہ کا دست راست تھا جس نے کہ فیروز شاہ کی حکومت کو کامیاب بنانے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ اس لائق وزیر کی موت سے فیروز شاہ کو انتہائی صدمہ پہنچا۔

فیروز شاہ ابھی خانجہاں کے صدمہ کو فراموش نہ کر سکا تھا کہ فیروز شاہ کا بڑا بیٹا اور ولیعہد سلطنت فتح خاں ۷۷۶ھ (۱۳۷۵ء) میں مر گیا۔ یہ لڑکا بڑا ہونہار اور لائق تھا۔ اس کے بعد فیروز شاہ کا دوسرا بیٹا محمد خاں بیمار ہوا۔ اور اسکی بھی موت واقع ہو گئی محمد خاں بھی فتح خاں کی طرح بڑا لائق تھا۔ غرضکہ ان پے درپے صدموں نے بادشاہ کی کمر توڑ دی، ان حادثات کے بعد بادشاہ دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا اور اس کی صحت نے قطعی جواب دیدیا۔

بادشاہ کی کمزوری اور حکومت کی طرف سے بے توجہی کی بنا پر فیروز تغلق کے بیٹے شہزادہ محمد شاہ اور نئے وزیرِ اعظم میں جنگ چھڑ گئی۔ وزیرِ اعظم یہ چاہتا تھا کہ ساری حکومت اس کے ہاتھ میں رہے اور شہزادہ محمد شاہ کی خواہش یہ تھی کہ خود سر وزیرِ اعظم کا اقتدار ختم کیا جائے۔ آخر شہزادہ کو کامیابی ہوئی اور وزیرِ اعظم مارا گیا۔ بادشاہ نے اپنے اندر حکومت کی طاقت نہ دیکھتے ہوئے جیتے جی اپنے بیٹے محمد شاہ کو ناصر الدین محمد شاہ کا خطاب دیکر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا اور خود حکومت سے دستبردار ہونیکے بعد یادِ الٰہی میں مصروف ہو گیا۔

ناصرالدین محمد شاہ کی چندروزہ حکومت

فیروز شاہ نے جیتے جی بیٹے کو اس لئے تخت پر بٹھایا تھا تاکہ آخری عمر میں حکومت کی اُلجھنوں سے اُسے نجات مل جائے لیکن ناصرالدین محمد شاہ ۷۸۹ھ مطابق ۱۳۸۷ء میں تخت پر بیٹھتے ہی عیش و عشرت میں مبتلا ہوگیا اسمیں حکومت کا کام چلانے کی ذرہ برابر بھی صلاحیت نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ باپ کے زمانہ کے آزمودہ کار اُمرا کو علیٰحدہ کرنے کے بعد اُس نے اپنے نالائق دوستوں کی بھرتی شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو تمام اُمرا بگڑ گئے دوسری طرف ملک بہار الدین اور کمال الدین جو محمد شاہ کے چچا زاد بھائی تھے کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ ان دونوں نے شاہی غلاموں کو جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی اپنے ساتھ ملالیا۔ اور اب ان کی محمد شاہ سے باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ بیچارہ بوڑھا بادشاہ جس نے کہ حکومت کی اُلجھنوں سے نجات پانے کے لئے محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا تھا۔ اس کی پریشانیاں اس نالائق بیٹے کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئیں آپس کا یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ محمد شاہ اور ملک بہار الدین وغیرہ میں ایسی خوفناک جنگ ہوئی کہ ہزاروں مارے گئے۔ اس جنگ میں جب ملک بہار الدین اور کمال الدین کو شکست ہوگئی تو یہ دونوں بوڑھے بادشاہ فیروز شاہ تغلق کو پالکی میں بٹھا کر اپنی حمایت کے لئے لے آئے بادشاہ کا آنا تھا کہ محمد شاہ کے لشکر نے محمد شاہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور سارا لشکر بوڑھے بادشاہ کے پاس چلا آیا۔ محمد شاہ نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہ سرمور بھاگ گیا۔ محمد شاہ کے بھاگنے کے بعد بادشاہ نے غلاموں کے کہنے پر اپنے بڑے بیٹے اور ولیعہد فتح خاں مرحوم کے لڑکے تغلق شاہ کو فیروز آباد میں تخت پر بٹھا دیا اور اپنے داماد سید حسن کے قتل کا حکم دیدیا۔ غرضکہ یہ بوڑھا بادشاہ جس کا دماغ جواب دے چکا تھا۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کٹ

بنا ہوا تھا۔ لوگ اسے جس طرح چاہتے تھے نچاتے تھے۔ بادشاہ کی حالت قابل رحم تھی۔ غرضکہ اس ہنگامے کے تھوڑے ہی دن بعد ۳ رمضان المبارک ۷۹۰ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۳۸۸ء کو فیروز شاہ نے چالیس سال حکومت کرنیکے بعد اس دُنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

فیروزشاہ کی حکومت پر ایک نظر

فیروز شاہ تغلق ایک نہایت ہی نیک دل بادشاہ تھا جس کو بنی نوع انسان کے خون بہانے سے انتہائی نفرت تھی۔ چنانچہ اس نے جتنی بھی لڑائیاں لڑیں ان میں محض اپنی نرم دلی کی وجہ سے اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ جب کبھی پوری طاقت کے ساتھ وہ کسی علاقہ پر حملہ کرتا اور لوگوں کے آہ وبکا کی آوازیں بلند ہوئیں تو اس کا دل خوفِ خدا سے لرزنے لگتا تھا۔ وہ بنی نوع انسان کا بہت بڑا ہمدرد تھا اس نے تخت پر بیٹھتے ہی رعایا کے ساتھ جس فیاضی اور نرمی کا سلوک کیا وہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔ اس بادشاہ نے افسروں اور عہدہ داروں کو تنخواہیں دینے کی بجائے زمین دیہات اور جاگیریں دینے کا قاعدہ رائج کر دیا تھا جب کوئی ملازم مرجاتا تو مرنیوالے کا عہدہ اسکے بیٹے کو یا اسکے داماد کو۔ یا غلام کو یا کسی قریبی رشتہ دار کو دے دیا جاتا۔ اس نے ایسے تمام سابقہ قوانین منسوخ کر دیئے تھے۔ جن کے ہوتے ہوئے رعایا کو تکلیف پہنچ رہی تھی۔ یا جن کی وجہ سے رعایا پر غیر معمولی پابندیاں عاید کردی گئی تھیں۔ اسکی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس کی حکومت میں جتنے بھی قوانین نافذ کیے جائیں وہ عین شرع اسلام کے مطابق ہوں۔

فیروزشاہ کی حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسکے دورِ حکومت میں ضروریاتِ زندگی کبھی گراں نہیں ہوئیں۔ رفاہ عام کے کاموں میں یہ سبب

سے زیادہ حصہ لیتا تھا۔ بیکار آدمیوں کو کارآمد بنانے کے لئے اس نے ایک مستقل محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کی وجہ سے ملک سے بیکاری بڑی حد تک دور ہوگئی تھی۔ فیروز شاہ نے تیس کے قریب کارخانے قائم کئے تھے جن میں سے بعض میں نہایت مفید اشیاء اور کپڑا تیار ہوتا تھا۔ غریب لڑکیوں کی شادی کا دفتر بھی اس نے قائم کر رکھا تھا۔ جسکے ذریعہ غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے روپیہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ شفاخانے اور خیرات خانے بھی اس نے قائم کر رکھے تھے یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے کہ خطبوں اور سکوں پر اپنے نام کے ساتھ سابقہ بادشاہوں کے ناموں کو بھی برقرار رکھا۔

فیروز شاہ کو جدید شہر آباد کرنے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ جونپور۔ فیروز آباد اور فتح آباد وغیرہ کئی شہر اس نے آباد کئے۔ جدید ایجادات سے بھی اس بادشاہ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے زمانہ کی عجیب غریب ایجاد طاس گھڑیال تھا۔ جو نماز دن کے اوقات، روزہ کھولنے کا وقت، شب و روز کے گھٹنے اور بڑھنے کا حال بتاتا تھا۔ فیروز شاہ کو غلام جمع کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک لاکھ سے زیادہ غلام اس کے پاس تھے۔ اس بادشاہ کو بچپن ہی سے شکار کا شوق تھا جو بڑھاپے تک رہا۔ فیروز شاہ نے ایک عجائب خانہ بھی قائم کیا تھا جس میں ایک بونا تھا جس کا سر تین آدمیوں کے سر کے برابر تھا۔ دو داڑھی والی عورتیں تھیں۔ ایک دراز قد آدمی تھا جس کا قد دو آدمیوں کے برابر تھا۔ ایک لال چونچ کا سیاہ کوا تھا۔ ایک پانچ پاؤں کی گائے اور تین ٹانگ کی بکری تھی اور ایک ایسی گائے تھی جس کے سم گھوڑے کی طرح تھے۔

اس بادشاہ کی درویشوں اور فقراء سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی کسی مہم کے لئے جاتا تو بزرگان دین کے مزارات پر ضرور حاضری دیتا۔ اس کے علاوہ

فیروز شاہ قرآنِ مجید سے فال نکالے بغیر کوئی نیا کام نہیں شروع کرتا تھا خواب کی تعبیروں کے فن سے بھی اسے بے حد دلچسپی تھی تصنیف وتالیف سے بھی اسے فطری لگاؤ تھا۔ اس نے بہت سی سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا۔ غرضکہ اس بادشاہ میں مجموعی طور پر اتنی خصوصیات تھیں کہ بہت کم بادشاہوں میں دیکھی گئی ہیں۔

شاہانِ تغلق کا زوال

یوں تو سلطان فیروز شاہ تغلق کے تخت سے دست بردار ہونے کے بعد اسکی زندگی ہی میں تغلق حکومت کا زوال شروع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی فیروز شاہ جب تک زندہ رہا۔ حکومت کی ساکھ قائم رہی لیکن فیروز شاہ کے مرتے کے ساتھ ہی تغلق حکومت کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ اس کے جانشین اتنی بڑی حکومت کے سنبھالنے کیلئے بالکل نا اہل ثابت ہوئے اور یہ مضبوط حکومت دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔

سلطان تغلق شاہ کی تخت نشینی

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ فیروز تغلق نے اپنی زندگی ہی میں اپنے پوتے تغلق شاہ کو ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۸ء میں تخت پر بٹھا دیا تھا اور تغلق شاہ کی تخت نشینی کے چند ہی روز بعد فیروز شاہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بوڑھے فیروز شاہ کے مرتے ہی نوجوان بادشاہ نے ملک تاج الدین کو وزیر اعظم کا عہدہ عطا کرنے کے بعد اسے خواجہ جہاں کا خطاب دیا۔ اور اس کو ایک بہت بڑا لشکر دیکر حکم دیا کہ سرمور پر حملہ کر کے محمد شاہ کا کام تمام کر دے۔ لیکن یہ لشکر جب سرمور پر حملہ آور ہوا تو شہزادہ محمد شاہ سرمور سے فرار ہو کر نگر کوٹ پہنچ گیا اور سلطانی فوج ناکام ونامراد واپس آگئی

نوجوان بادشاہ تغلق شاہ کے تخت پر بیٹھنے کے بعد صرف دو کام تھے۔ یہ

بادشاہ یا تو عیش و عشرت میں مست رہتا تھا یا اپنے رشتہ داروں اور قرابتداروں کی گردنیں اڑوایا کرتا تھا۔ حکومت کا سارا کام اہل کاروں کے ہاتھ میں تھا۔ بادشاہ کی عیش پرستی اور ظلم و ستم نے غلامان فیروز شاہ کو جن کا کہ حکومت اور محل میں بے حد اثر تھا۔ اس بادشاہ کا دشمن بنا دیا۔ چنانچہ انھوں نے درپردہ یہ طے کیا کہ تغلق شاہ اور اس کے تمام حاشیہ نشینوں کو قتل کر دیا جائے۔ سب سے پہلے مبارک کبیری امیر الامرا کو قتل کیا گیا۔ جب بادشاہ کو اس سازش کا علم ہوا تو وہ خواجہ جہاں وزیر کو ساتھ لیکر جمنا کی طرف نکل بھاگا۔ لیکن غلامان فیروز شاہی اور نائب وزیر رکن الدین نے ان کو جا پکڑا اور قتل کر ڈالا۔ اور اس طرح تغلق شاہ کی بادشاہی پانچ مہینے اور اٹھارہ روز کے بعد ۲ صفر ۷۹۱ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۳۸۹ء کو ختم ہو گئی۔

سلطان ابوبکر شاہ کی تاجپوشی

غلامان فیروز شاہی نے تغلق شاہ کو ٹھکانے لگانے کے بعد ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں فیروز شاہ کے ایک دوسرے پوتے ابوبکر شاہ کے سر پر تاج شاہی رکھا۔ ابوبکر شاہ ظفر خاں کا بیٹا تھا۔ نائب وزیر رکن الدین کو وزارتِ عظمےٰ کا قلمدان سپرد کیا گیا۔ رکن الدین نے وزارت ملنے کے ساتھ ہی شاہ گروں یعنی غلامان فیروز شاہی کے ساتھ ابوبکر شاہ کو قتل کرنے اور خود بادشاہ بننے کی سازشیں شروع کر دیں، ان سازشوں کا علم جب اُمرائے سلطنت کو ہوا تو انھوں نے رکن الدین اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔

ناصر الدین محمد شاہ کا سامانہ پر قبضہ

فیروز شاہ تغلق کا بیٹا اور ابوبکر شاہ کا چچا ناصر الدین محمد شاہ جو تخت و تاج چھوڑ کر سرمور بھاگ گیا تھا۔ تغلق شاہ نے اسے سرمور میں

قتل کرانا چاہا تھا تو وہ نگر کوٹ چلا گیا تھا۔ محمد شاہ مدت سے اس فکر میں تھا کہ کسی طرح دہلی کے تخت پر قبضہ جمائے کہ اچانک اس کو نگر کوٹ میں اطلاع ملی کہ سامانہ کے امیران صدہ نے حاکم سامانہ سلطان شاہ کو قتل کر دیا ہے تو وہ سیدھا سامانہ آیا اور سامانہ پر قبضہ جمالیا۔ سامانہ کے اُمرا اور امیران صدہ جو اس کے گھرانے کے ہمدرد تھے۔ ان کو ساتھ ملانے کے بعد محمد شاہ نے دہلی پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دہلی میں جب یہ خبر پہنچی کہ محمد شاہ دہلی پر حملہ کرنے والا ہے تو دہلی کے بعض اُمرا بھی ابوبکر کو چھوڑ کر محمد شاہ کے ساتھ مل گئے۔ غرضکہ جب محمد شاہ سامانہ سے دہلی کی جانب چلا تو اس کے پاس بیس ہزار سوار اور بہت سے پیادے تھے اور دہلی کے قریب پہنچنے تک پچاس ہزار سوار ہو گئے۔

ابوبکر شاہ اور محمد شاہ کی خانہ جنگی

ابوبکر شاہ جو پہلے ہی سے محمد شاہ کے مقابلے کے لئے تیار تھا۔ ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور دونوں چچا بھتیجوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں محمد شاہ کو شکست ہوئی لیکن محمد شاہ نے دوبارہ لشکر جمع کر کے ابوبکر شاہ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ غرضکہ فیروز آباد۔ کنڈالی اور پانی پت میں ابوبکر اور محمد شاہ میں کئی لڑائیاں ہوئیں لیکن ان سب لڑائیوں میں محمد شاہ کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ مگر محمد شاہ نے اب بھی ہمت نہ ہاری چنانچہ ایک دن جب محمد شاہ کو پتہ چلا کہ ابوبکر شاہ دہلی سے دُور چلا گیا ہوا ہے تو وہ چار ہزار سوار لیکر دہلی میں داخل ہو گیا، اور قلعہ میں گھس گیا۔ لیکن ابوبکر نے جب پیچھے سے آکر حملہ کیا تو محمد شاہ کو بھاگنا پڑا۔

محمد شاہ کو جب اس طرح کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے محل میں سازش کا جال بچھا دیا محل کے سب آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ جب ابوبکر شاہ

کو اس سازش کا علم ہوا اور اس نے یہ محسوس کر لیا کہ اُمرائے سلطنت اور محل کے لوگ اس کے مخالف ہو گئے ہیں۔ تو وہ ۱۷ رمضان ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) کو محل سے فرار ہو گیا۔ اسکے فرار ہوتے ہی محمد شاہ ۱۹ رمضان کو دہلی پہنچ گیا اور فیروز آباد میں آکر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ملک بشیر کو وزارت کا عہدہ دیا اور اسلام خاں کے خطاب سے بھی سرفراز کیا یعنی اس خانہ جنگی کی بدولت آٹھ مہینے کے بعد ابو بکر شاہ کی حکومت بھی ختم ہو گئی۔

ناصر الدین محمد شاہ کی دوبارہ حکومت

ناصر الدین محمد شاہ جو رمضان ۷۹۲ھ مطابق فروری ۱۳۹۰ء میں دوبارہ دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ ابتدائی دو تین مہینے تو خاموش رہا۔ لیکن اس کے بعد اس نے چن چن کر ان غلامان فیروز شاہی کو قتل کرنا شروع کیا جو بادشاہ گر بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد محمد شاہ نے اسلام خاں کو ایک فوج دیکر ابو بکر شاہ اور اس کے ساتھیوں کو زیر کرنے کے لئے مہندواڑی بھیجا۔ ابو بکر شاہ اور اس کے ساتھی اس حملے کی تاب نہ لا کر معافی کے خواستگار ہوئے۔ ابو بکر کے ساتھی بہادر ناہر کو تو معافی دیدی گئی مگر ابو بکر شاہ کو میرٹھ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ چند ماہ کے بعد مر گیا یا مار ڈالا گیا۔

دہلی کی سلطنت کیونکہ کمزور ہو چکی تھی۔ اور فیروز شاہ تغلق کے بعد جو بادشاہ پے در پے تخت پر بیٹھتے رہے تھے۔ ان کا ملک پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس لئے بعض علاقے تو خود مختار ہو گئے اور بعض علاقوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ چنانچہ ۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں ناہر سنگھ۔ ہیر سنگھ اور بیر بھان نے اٹاوہ میں بغاوت برپا کر دی۔ ان بغاوتوں کے دبانے میں اسلام خاں اور بادشاہ کو شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ بادشاہ کو اس اطلاع سے اور

بھی تشویش پیدا ہو گئی کہ وزیر اعظم اسلام خاں بھی بغاوت کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر بادشاہ نے اسلام خاں کا کام تمام کر دیا۔ پھر اطلاع ملی کہ بہاتو گاؤں کے ہندو زمیندار بغاوت پر آمادہ ہیں۔ ان زمینداروں کو بھی حیلہ سے قتل کرا دیا گیا۔

اسی زمانہ میں اطلاع آئی کہ گجرات کے راجاؤں نے بھی بغاوت برپا کر دی ہے۔ ناصر الدین محمد شاہ نے فوراً ظفر خاں کو مظفر خاں کا خطاب دیکر گجرات روانہ کر دیا جس نے کہ گجرات کی بغاوت کو پہنچتے ہی دبا دیا۔ اس کے بعد بادشاہ میوات کی بغاوت کو دبانے کے لئے خود گیا۔ اور وہاں سے جلیسر آ کر بیمار ہو گیا۔ جلیسر میں اس کو اطلاع ملی کہ بہادر ناہر دہلی کے مقصلات کو لوٹ رہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ کو بیماری ہی کی حالت میں بہادر ناہر کی سرکوبی کے لئے جانا پڑا بہادر ناہر بادشاہ کے آتے ہی بھاگ گیا۔ بادشاہ کی علالت بڑھ گئی اور اسی بیماری میں ۱۷ ربیع الاول ۷۹۶ھ مطابق ۱۳۹۴ء کو چار سال سات ماہ حکومت کرنے کے بعد ناصر الدین محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ محمد شاہ کے عہد حکومت کی اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں کہ اس بادشاہ کے عہد میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کو اہم فوجی عہدے دیئے گئے مگر حکومت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

سلطان سکندر شاہ کی تخت نشینی

سلطان ناصر الدین محمد شاہ کی وفات کے تیسرے دن محمد شاہ کا منجھلا لڑکا ہمایوں خاں ۱۹ ربیع الاول ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) کو سکندر شاہ کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ خواجہ جہاں وزیر ہوا۔ لیکن سکندر شاہ کی بدنصیبی کہ وہ تخت نشین ہوتے ہی بیمار پڑ گیا اور ڈیڑھ ماہ بیمار رہنے کے بعد ۵ ر

جمادی الاوّل ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) کو وفات پا گیا۔ حوض خاص کے پاس اسے سپرد خاک کر دیا گیا۔

سلطان ناصر الدین محمود شاہ کی تخت نشینی

سکندر شاہ کی موت کے پندرہ دن بعد تک یہ طے نہ ہو سکا کہ دہلی کے تخت پر کس کو بٹھایا جائے آخر پندرہ دن کے بعد محمد شاہ کے چھوٹے بیٹے محمود شاہ کے حق میں فیصلہ ہوا۔ چنانچہ ۲۰ جمادی الاوّل ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) کو محمود شاہ کو ناصر الدین محمود شاہ کے لقب کے ساتھ تخت نشین کیا گیا۔ خواجہ جہاں عہدۂ وزارت پر بدستور برقرار رہا۔ اُمرائے سلطنت کو خطابات اور عہدوں سے نوازا گیا۔ لیکن ناصر الدین محمود شاہ کو جو سلطنت ملی تھی اس کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ اور بادشاہ کے لئے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ اس گرتی ہوئی حکومت کو سنبھال سکے۔ حالت یہ تھی کہ سلطنت کے مشرقی علاقوں میں ہندوؤں نے شورش برپا کر رکھی تھی جونپور اور اسکے نواح میں زمینداروں نے سارے نظام کو درہم و برہم کر دیا تھا غرضکہ دُور دراز کے تقریباً تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ بس دہلی کی حکومت برائے نام تھی۔

ملک میں بدنظمی اور طوائف الملوکی

ملک کی اس بدنظمی اور طوائف الملوکی کو دیکھتے ہوئے محمود شاہ نے خواجہ جہاں وزیر اعظم کو ملک الشرق کا خطاب دیکر قنوج سے بہار تک کا انتظام سپرد کیا۔ اور ایک بڑا لشکر اس سارے علاقہ کے مفسدوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ ملک الشرق نے ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں اٹاوہ۔ کویل۔ نواح قنوج۔ جونپور۔ کٹرہ۔ اودھ۔ سندیلہ۔ بہرائچ۔ بہار اور ترہت کے باغیوں کو کچلنے کے بعد نئے سرے سے انتظام قائم کیا۔ اسکے علاوہ رائے جاج نگر

اور لکھنوتی (ڈھاکہ) کو حسب سابق خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔

اسی سال بادشاہ نے سارنگ خاں کو دیبالپور اور چند دوسرے علاقوں کی بغاوت کے فرو کرنے کا کام سپرد کیا۔ سارنگ خاں نے دیبالپور میں شیخ گکھڑ کی سرکوبی کی۔ شیخ لاہور آگیا۔ اور لاہور کے قریب سامو تھلا کے مقام پر سارنگ خاں سے لڑا مگر اسے شکست ہو گئی۔ سارنگ خاں نے لاہور پر قبضہ جمانے کے بعد اسے اپنے بھائی عادل خاں کے سپرد کیا اور خود دیبالپور چلا گیا۔

بادشاہ کو اسی سال گوالیار اور بیانہ کی بغاوت دبانے کے لئے جانا پڑا۔ وہ دار السلطنت میں مقرب خاں کو اپنا جانشین بنا کر اور سعادت خاں باربک کو اپنے ساتھ لیکر گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ اس موقعہ پر سارنگ خاں کے بھائی اقبال ملّو مبارک خاں اور علاء الدین نے سعادت خاں کو راستہ ہی میں قتل کر دینے کی سازش تیار کی جس کا انکشاف ہونے پر مبارک خاں اور علاء الدین کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا مگر اقبال ملّو فرار ہو کر دار السلطنت میں مقرب خاں کے پاس چلا گیا۔ جب بادشاہ اس مہم سے فارغ ہو کر تین مہینے کے بعد دہلی آیا تو مقرب خاں بادشاہ کے استقبال کے لئے گیا۔ لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ سعادت خاں کے مخالف، اقبال خاں عرف ملّو خاں کو پناہ دینے کی وجہ سے بادشاہ اس سے بدظن ہو گیا ہے تو اس نے دہلی آکر لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں جب بادشاہ کو اس کی اطلاع ملی کہ مقرب خاں آمادۂ پیکار ہے تو اس نے سعادت خاں کی ہمراہی میں دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ تین مہینے تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ لیکن اسی دوران میں مقرب خاں کے ہوا خواہوں نے بادشاہ کو سعادت خاں سے بدظن کر کے مقرب خاں سے بادشاہ کی صلح کرادی اور بادشاہ مقرب خاں کے پاس چلا آیا۔

دہلی میں ایک کی بجائے دو بادشاہ سعادت خاں بادشاہ کی اس

تلون مزاجی سے آزردہ خاطر ہونے کے بعد آمادۂ جنگ ہو گیا۔ اس نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ لیکن اسے شکست ہوئی۔ شکست کے بعد وہ فیروز آباد آیا اور اپنے ہوا خواہوں کے مشورے سے فیروز شاہ کے پوتے اور فتح خاں کے بیٹے "نصرت شاہ" کو ربیع الاول ۷۹۷ھ (۱۳۹۵ء) میں فیروز آباد کے تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس طرح دہلی اور نواحِ دہلی میں ایک کی بجائے دو حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اور دو بادشاہ حکومت کرنے لگے یعنی "محمود شاہ" تو دہلی میں حکمرانی کر رہا تھا اور "نصرت شاہ" دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر فیروز آباد میں بادشاہ بن بیٹھا تھا۔

سعادت خاں جس نے کہ نصرت شاہ کو تخت پر بٹھایا تھا۔ اسکو چند ہی روز بعد اُمراء کی مخالفت کی وجہ سے فیروز آباد سے بھاگنا پڑا۔ چنانچہ وہ مقرب خاں کے پاس دہلی چلا گیا، جہاں اس کو دھوکہ دیکر قتل کر دیا گیا۔ سعادت خاں کے خاتمہ کے بعد فیروز آباد کی حکومت میں جو لوگ برسراقتدار تھے، انکے نام یہ ہیں محمد مظفر وزیر اعظم جس کو تاتار خاں کا خطاب حاصل تھا۔ ملک فضل بلخی شہاب ناہر اسی طرح دہلی کی حکومت میں جن لوگوں کو اقتدار حاصل تھا۔ وہ یہ ہیں مقرب خاں وزیر اعظم بہادر ناہر اقبال خاں عرف ملّو خاں غرضیکہ ان دونوں نام نہاد حکومتوں میں روزانہ خانہ جنگیاں برپا رہتی تھیں اور ان خانہ جنگیوں کی بدولت سب سے زیادہ ان بے گناہ شہریوں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ جو ان حکومتوں میں آباد تھے۔ چنانچہ ہندو مسلم شہریوں کے خون سے روزانہ کوچہ و بازار سُرخ دکھائی دیتے تھے۔ ان نام نہاد حکومتوں کی وسعت اور حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دہلی کی حکومت صرف شہر دہلی تک محدود تھی اور فیروز آباد کی حکومت میں دوآبہ، سنبھل، پانی پت، جھجر اور رہتک کا علاقہ شامل تھا۔ ان مختصر سی

حکومتوں میں ایک دو مہینے نہیں بلکہ تین سال تک خانہ جنگی جاری رہی جسمیں رعایا کا خون پانی کی طرح بہتا رہا۔

خضر خاں حاکمِ ملتان پر سارنگ خاں کا حملہ

ہم اس سے قبل بتا چکے ہیں کہ دہلی کی حکومت میں ایک شخص اقبال ملّو بر سر اقتدار تھا۔ اسی اقبال ملّو کا بھائی سارنگ خاں کہنے کو تو دیپال پور اور لاہور میں سلطان محمود کی طرف سے حاکم تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ خود مختار بن چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کیلئے خضر خاں حاکم ملتان پر حملہ کرکے اسے وہاں سے نکال دیا۔ اور ۷۹۸ھ (۱۳۹۶ء) میں ملتان پر بھی قبضہ جما لیا۔ اسکے بعد وہ حاکم سامانہ غالب خاں کو شکست دیکر سامانہ پر بھی قابض ہو گیا لیکن نصرت شاہ کے وزیر تاتار خاں نے سارنگ خاں پر جوابی حملہ کرکے اسے ملتان بھگا دیا۔ اور سامانہ کی حکومت پھر غالب خاں کے سپرد کر دی۔

دہلی کی دونوں حکومتوں پر اقبال ملّو کا قبضہ

ایک طرف تو سارنگ خاں نے یہ طوفان برپا کر رکھا تھا۔ دوسری جانب سارنگ خاں کا بھائی اقبال خاں عرف ملّو سیاسی جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اقبال خاں نے فیروز آباد کے نام نہاد بادشاہ نصرت شاہ کو دہلی کی حکومت دلانے کا لالچ دیکر دہلی بلا لیا۔ اور دھوکہ سے اُس پر حملہ کر دیا۔ نصرت شاہ جان بچا کر بھاگا اور اپنے وزیر تاتار خاں کے پاس پانی پت چلا گیا۔ اقبال خاں نے فوراً جا کر فیروز آباد کی حکومت پر بھی قبضہ جما لیا۔ اسکے بعد اقبال خاں ملّو نے دہلی آکر دھوکہ سے مقرب خاں وزیر اعظم کو بھی ختم کر دیا اور اس طرح وہ دونوں حکومتوں کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔ سلطان محمود شاہ بیچارہ تو محض نام کا بادشاہ رہ گیا۔ گویا ملّو نے بیک وقت دہلی کی دونوں

نام نہاد حکومتوں پر قبضہ جما لیا تھا نصرت شاہ کے وزیر تاتار خان نے اقبال خاں ملو سے انتقام لینے کے لئے دہلی پر حملہ کیا تو اقبال خاں ملو نے پانی پت بھی فتح کر لیا۔ اور تاتار خاں کو دہلی میں شکست دیدی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاتار خان بے دست و پا ہونے کے بعد گجرات میں اپنے باپ ظفر خاں کے پاس چلا گیا اور اقبال ملو بدستور فیروز آباد اور دہلی کی حکومتوں پر قابض رہا۔

امیر تیمور کا ہندوستان کے خلاف جہاد

یعنی اس وقت جبکہ تغلق حکومت دہلی میں دم توڑ رہی تھی ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کر کے اور ہندوستان کو لوٹ کر اس بدنصیب ملک کی پشت میں ایک ایسا خنجر مار اکہ یہ ملک نصف صدی تک نہ سنبھل سکا۔

امیر تیمور کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کی طرف سے اس چنگیز خاں کی نسل سے تھا جس نے کہ نہ صرف سارے مشرق کو تباہ کر ڈالا تھا۔ بلکہ جس کے ہم قوم مغل قطب الدین ایبک کے دورِ حکومت سے لیکر فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت تک بار بار ہندوستان پر حملے کر کے ہندوستان کو لوٹتے رہے تھے۔ امیر تیمور کے باپ کا نام امیر ترغی تھا۔ جو تاتاری ترکوں کا سردار تھا۔ تیمور ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) میں سمرقند کے قریب کش میں پیدا ہوا۔ اور ۳۳ سال کی عمر میں چغتائی ترکوں کا سردار بن گیا۔ اس نے اپنی بے نظیر جنگی قابلیت کی بنا پر چند سال کے اندر اندر نہ صرف سمرقند میں ایک مضبوط حکومت قائم کر لی تھی بلکہ اپنے ۳۶ سالہ دورِ حکومت میں ماوراء النہر، خوارزم، ترکستان، خراسان، عراق، آذربائیجان، فارس، افغانستان، مازندران، کرمان، دیار بکر، خوزستان، مصر، شام، روم اور روس کے بیشتر علاقوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔

امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ سے قبل اپنے بیٹوں اور سرداروں کو جمع کر کے یہ بتایا کہ قرآن مجید میں فال دیکھنے کے بعد مجھ کو ہدایت ہوئی ہے کہ میں کفار کو قتل کروں لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ہندوستان کے خلاف جہاد کروں بتخانوں کو توڑوں اور اس ملک کے لوگوں کو کفر اور شرک سے نجات دلاؤں تاکہ میں خدا کے سامنے ایک غازی اور مجاہد کی حیثیت سے روز قیامت پیش ہوسکوں تیمور نے اس موقعہ پر فوجی سرداروں کے سامنے جہاد کے مسئلہ پر ایک نہایت ہی مؤثر تقریر کی جس کا واحد منشا یہ تھا کہ وہ اپنے فوجی سرداروں میں مذہبی جوش پیدا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تیمور کا یہ "اسلامی جہاد" کس نوعیت کا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ہاتھوں ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمان قتل ہوئے مسجدیں ویران ہوئیں مسلمانوں کے شہر اجڑے اور ہندوستان کی اسلامی حکومت کا قصر زمین بوس ہوگیا حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان پر امیر تیمور کا یہ حملہ کسی مذہبی غرض کے لئے نہیں تھا بلکہ صرف مال و دولت کی خاطر تھا۔ چنانچہ اسی جلسہ میں جنمیں کہ تیمور "جہاد فی سبیل اللہ" کا وعظ سنا رہا تھا۔ جغتائی شہزادوں نے جو کچھ کہا تھا وہ اس چیز کا کھلا ثبوت ہے کہ تیمور اور اسکے ساتھیوں کے ہندوستان پر حملہ کا واحد مقصد حصول زر تھا۔ مرزا شاہ رخ کے الفاظ یہ ہیں "ہم ایران اور توران کے شہنشاہ ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کے فرمانروا نہ ہوں تو یہ باعث شرم ہے۔ ہندوستان فتح کر کے ہم ساتوں اقلیم کے بادشاہ ہو جائیں گے"۔ ایک دوسرے شہزادے محمد سلطان نے فرمایا کہ یہ ہندوستان سونے اور جواہرات سے بھرا پڑا ہے۔ اس ملک میں شرہ کانیں سونے، چاندی، ہیرے، لعل۔ زمرد۔ فولاد۔ تانبے اور پارے کی ہیں یعنی بقول ان شہزادوں کے ہندوستان کی فتح کا مقصد کوئی دینی یا مذہبی خدمت

نہ تھی بلکہ اصل منشا یہ تھا کہ ساتوں اقلیم کی بادشاہت انھیں مل جائے اور ہندوستان کا بے اندازہ زر و جواہر قبضہ میں آجائے۔ شہزادوں کے اس قول کے علاوہ خود تیمور کا عمل اس چیز کا شاہد ہے کہ وہ ہندوستان میں لوٹ مار کرنے کے لئے آیا تھا یا "خدمتِ اسلام" کیلئے۔ وہ اگر خدمتِ اسلام کے لئے آیا تھا تو اس کے ہاتھوں سب سے زیادہ مسلمانوں کا قتلِ عام کون سی اسلامی خدمت تھی۔

ہندوستان پر تیمور کا حملہ

تیمور نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے قبل اپنے پوتے پیر محمد گورنر کابل کو پہلے ہی ہندوستان بھیج دیا تھا۔ تاکہ وہ ہندوستان میں اسکے حملے کے لئے زمین تیار کرنا شروع کر دے چنانچہ پیر محمد نے سنہ ھ (۱۳۹۸ء) میں معمولی لڑائیوں کے بعد دریائے سندھ پار کرلیا۔ اور چھ مہینے کے اندر اندر اوچ اور ملتان پر اپنا قبضہ جمالیا۔ جب تیمور کو اپنے پوتے کی ان فتوحات کا علم ہو گیا تو وہ ۹۲ ہزار سواروں کا لشکر لیکر ہندوستان کی جانب چل پڑا۔ اور دریائے سندھ پار کر کے اپنے پوتے پیر محمد کی فوج سے آن ملا۔ اور ملتان کے قریب مقام تلمبا پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیا شہر والوں پر دو لاکھ روپیہ جرمانہ کیا۔ جب جرمانہ پورا وصول نہ ہوا تو شہر کو اچھی طرح سے لوٹا۔ اس لوٹ سے فارغ ہونیکے بعد تیمور نے شاہ پور پر حملہ کر دیا۔ شاہ پور کا امیر نصرت مقابلہ کی تاب نہ لا کر اور زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ تیمور نے شاہ پور کو لوٹ کر مکانوں میں آگ لگا دی یہ تھی تیمور کی "پہلی اسلامی خدمت"!

اب تیمور پاک پٹن شریف کی طرف بڑھا تاکہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے مزارِ مبارک پر حاضری دینے کے بعد جدید فتوحات کا سلسلہ شروع کرے جیسے ہی تیمور پاک پٹن میں آیا تو پاک پٹن اور دیپالپور کے باشندوں نے اس کے خوف کی وجہ سے بھاگنا شروع کر دیا اور بھاگ کر بیکانیر اور بھٹنیر میں پناہ لی۔ تیمور نے

پاکپٹن کے بعد بھٹنیر پر حملہ کردیا۔ یہاں کے راجہ رائے دلی چند نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دئیے۔ یہاں تیمور کے لشکر نے دس ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کیا۔ سارے شہر کو خوب لوٹا۔ اور عمارتوں کو آگ لگاکر چلتا بنا۔ اسکے بعد سرستی۔ فتح آباد۔ ٹوہانہ، سامانہ کیتھل اور راہراوتی میں تیمور اور اسکے لشکر نے اچھی طرح سے غارتگری برپا کی اور ان تمام مقامات کو لوٹ کر برباد کردیا۔ شہر کے باشندوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ تہ تیغ کیا۔ دو ہزار کے قریب مسلمانوں کو اور جاٹوں کو قتل کیا۔ مکانوں کو آگ لگادی اور ہزاروں کو غلام بنالیا۔ غرضکہ تیموری لشکر اسی طرح تباہی مچاتا ہوا دہلی پر حملہ کی غرض سے پانی پت پہنچ گیا۔ تیمور اور اس کے سپاہیوں کے ظلم وستم نے شمالی ہند کے باشندوں کو اس قدر خوفزدہ کردیا تھا کہ سارے شمالی ہند میں ایک قیامت برپا تھی۔ تمام بڑے بڑے شہروں کے باشندے چھکڑوں پر اپنا سامان لادھ لادھ کر دیہاتوں کی جانب بھاگے جارہے تھے اور شہر ویران نظر آتے تھے۔

امیر تیمور کا دہلی کے مضافات پر حملہ

پانی پت کو لوٹنے اور تباہ کرنے کے بعد امیر تیمور اور اس کا لشکر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جب لشکر جہاں نما کے قریب آیا تو حکم دیا گیا کہ جہاں نما کو تاخت وتاراج کردیا جائے۔ جہاں نما فیروز تغلق کی بنائی ہوئی ایک نہایت ہی خوشنما عمارت تھی جو دہلی سے ۵ میل کے فاصلہ پر تھی۔ چنانچہ امیر کے حکم کے مطابق جہاں نما کے علاقہ کو تاخت وتاراج کردیا گیا۔ اور جو لوگ وہاں موجود تھے ان کو ٹھکانے لگادیا۔ اس کے بعد تیمور قلعہ لونی کی جانب بڑھا۔ اس قلعہ کا حاکم میمون نامی ایک راجپوت تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی عورتوں اور بچوں کو ایک مکان میں بند کرکے اسمیں آگ لگائی۔ پھر تیمور کا مقابلہ کیا اور

اسی مقابلہ میں وہ مارا گیا۔ جب لونی کا قلعہ فتح ہو گیا تو لونی کے تمام مکانات کو لوٹنے کے بعد آگ لگا دی گئی۔ اور وہاں کے باشندوں کو قتل کر دیا گیا۔ لونی کی تباہی سے فارغ ہو کر تیمور اور اس کا لشکر دہلی کے قرب وجوار کے گاؤوں اور قصبوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اور ان سب کو لوٹ کر اور آگ لگا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا۔

خاص دہلی پر تیمور کا حملہ

دہلی کے قرب وجوار کے تمام علاقوں کو برباد کرنے کے بعد جب امیر تیمور اور اس کا لشکر خاص دہلی پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا تو ایک جاسوس نے تیمور کو اطلاع دی۔ کہ دہلی کی حکومت کا وزیر اقبال ملّو چار ہزار سوار پانچ ہزار پیادے اور ۲۷ جنگی ہاتھی لیکر جہاں نما کی طرف آرہا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی امیر تیمور کا لشکر مقابلے کے لئے آگے بڑھا۔ دونوں لشکروں میں جنگ چھڑ گئی۔ لیکن سلطانی لشکر کو جو تیمور کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا شکست ہو گئی اور اقبال ملّو فرار ہو کر دہلی کی فصیل کے اندر چلا گیا۔

اب جبکہ امیر تیمور اور دہلی کے بادشاہ میں جنگ چھڑ چکی تھی تو تیموری کیمپ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ان ایک لاکھ ہندوستانی غلاموں کا کیا کیا جائے جو تیموری لشکر کے ہمراہ ہیں کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر ذرا بھی تیموری لشکر میں کمزوری پیدا ہوئی تو یہ ایک لاکھ غلام اپنے ہم وطن ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر بڑی تباہی مچا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ ان ایک لاکھ غلاموں کو فوراً تہہ تیغ کر دیا جائے۔ اس فیصلہ کے بعد آن کی آن میں ایک لاکھ بے گناہ ہندوستانیوں کا خون بہا دیا گیا۔

امیر تیمور نے ہندوستانی غلاموں کے قتل عام کے بعد اپنے بے اندازہ لشکر کو دہلی پر حملہ کے لئے ترتیب دیا۔ اُدھر سلطانی لشکر بھی مقابلے کے لئے آگے

بڑا سلطانی لشکر میں ۱۲۵ ہاتھی دس ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے تھے۔ اسکے مقابلے میں تیموری لشکر تقریباً اسی ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ جب یہ دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو تیمور نے اپنے لشکر کے سرداروں کو حملہ کا حکم دیدیا اور اس طرح دونوں لشکروں میں دہلی کے تخت کے لئے فیصلہ کن جنگ چھڑ گئی۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ سلطانی لشکر نے قلتِ تعداد کے باوجود بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن ایسی حالت میں جبکہ تغلق حکومت کی خانہ جنگی اور زوال کی وجہ سے سلطانی لشکر کی ہمت پہلے ہی سے پست تھی، وہ تیمور کے بے انداز لشکر کا کہاں تک مقابلہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ سلطانی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے اور تغلق خاندان کے آخری بادشاہ محمود شاہ کو اس معرکہ میں بڑی طرح شکست ہو گئی بادشاہ گجرات بھاگ گیا۔ اور اقبال ملّو نے برن (بلند شہر) میں جا کر پناہ لی، دہلی پر امیر تیمور کا قبضہ ہو گیا۔

دہلی میں لوٹ مار اور غارتگری

دوسرے دن امیر تیمور نے عیدگاہ میں اپنی فتح کی خوشی میں بہت بڑا جشن کیا جسمیں نائب وزیر فضل اللہ بلخی دہلی کے عمالِ حکومت علما مشائخ اور عمائدین شہر نے بھی شرکت کی اور انھوں نے تیمور سے وعدہ لے لیا کہ شہر کے باشندوں کی جان اور مال محفوظ رہے گا۔ لیکن اس وعدہ کے باوجود تیمور کے لشکر نے شہر میں لوٹ مار اور غارتگری شروع کر دی۔ چنانچہ خود امیر تیمور نے ظفر نامہ تیموری میں اس چیز کا اعتراف کیا ہے کہ دہلی میں فوج اس کے قابو سے باہر ہو گئی تھی اور فوج نے بڑی طرح سے لوٹ مار اور قتلِ عام کا بازار گرم کر دیا تھا۔

دہلی کی تباہی اور بربادی کی داستان بیان کرتے ہوئے امیر تیمور ظفر نامہ تیموری میں لکھتا ہے کہ "جب یہ معلوم ہوا کہ ہندوستانی مع اپنے زن و فرزند

بیش قیمت مال واسباب کے دہلی میں جمع ہیں تو سرداروں کو فوج دیکر شہر کے اندر بھیجا گیا اور حکم دیا گیا کہ ان لوگوں کی داد فریاد کچھ نہ سنیں سب کو گرفتار کرکے میرے روبرو لائیں جب سپاہیوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کیا تو وہ تلوار ہاتھ میں لیکر لڑنے کو تیار ہو گئے۔ انھوں نے عورتوں اور بچوں کو گھروں میں بند کرکے جلادیا۔ اور پھر جان پر کھیل کر لڑے۔ اور ہنگامہ کارزار خوب گرم ہوگیا۔ اس ہنگامہ کے دوران میں سیری جہاں پناہ اور دہلی میں سب جگہ آگ لگ رہی تھی"
امیر تیمور کے ان الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود امیر تیمور کس طرح اس لوٹ اور غارت گری کا سب سے بڑا محرک تھا۔

اسی ظفر نامہ تیموری میں آگے چل کر تیمور لکھتا ہے کہ "امیروں نے شہر کے دروازے اس لئے بند کردئے تھے کہ باہر کا لشکر اندر نہ آئے لیکن جمعرات کے دن اور شب جمعہ کو شہر میں پندرہ ہزار سپاہ داخل ہوگئی تھی جس کو قتل و غارتگری آتش زنی اور غلام بنانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ جمعہ کے روز تو سارا لشکر شہر میں گھس کر لوٹ پر پل پڑا۔ اور اس لشکر کے ہر شخص کا کام قتل اور آتش زنی کے سوا کچھ نہ تھا جمعہ کے دن لوٹ بالکل عام تھی۔ جہاں پناہ اور سیری کے اکثر محلے بالکل ویران ہوگئے اور ہفتہ کو بھی یہی حال رہا"

تیمور کی فوج نے صرف قتل و خون لوٹ اور غارتگری ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ دہلی کے لاکھوں نوجوانوں اور عورتوں کو لونڈی اور غلام بنالیا تھا۔ چنانچہ تیمور اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ "لوٹ کا حال یہ تھا کہ لشکر میں سے کوئی سپاہی ڈیڑھ سو مرد و زن اور لڑکوں سے کم پکڑ کر اور غلام بنا کر نہیں لایا۔ بہت سے ادنی آدمیوں کے پاس بھی بیس سے زیادہ ہی غلام موجود ہونگے۔ اسکے علاوہ لوٹ کے مال میں طرح طرح کے جواہرات موتی۔ یاقوت۔ الماس قیمتی کپڑے۔

سونے چاندی کے برتن اور طلائی اشرفیاں بے حد وبے حساب تھیں۔ لوٹ میں جو عورتیں ہاتھ لگی تھیں اُنکے ہاتھ پاؤں سونے چاندی کے کنگنوں اور پازیبوں سے آراستہ تھے۔ اور انکی اُنگلیاں بیش قیمت انگوٹھی چھلّوں سے لدھی ہوئی تھیں۔"

شہر کی عام عمارتوں سے قطع نظر خود تیمور کے حکم سے مسجدوں میں کس طرح قتل عام کیا گیا اس کی سرگذشت بھی خود تیمور ہی سے سُن لیجیئے۔ لکھتا ہے کہ

"اتوار کے دن جب یہ خبر ہوئی کہ پُرانی دہلی کی جامع مسجد میں بہت سے ہندوستانی بھاگ کر جمع ہو گئے ہیں اور اپنے ساتھ ہتھیار اور کھانے پینے کا سامان بھی لے گئے ہیں اور اس کو اپنی پناہ گاہ بنانا چاہتے ہیں تو امیر شاہ ملک اور علی سلطان تواچی کو پانچسو آدمیوں کے ساتھ بھیجا گیا کہ خدا کے گھر کو ان سے پاک صاف کریں"۔ یعنی مسجد میں پناہ لینے والوں کے لئے بھی قتل عام کا حکم دیدیا گیا تھا۔

چار پانچ روز تک اس قتل و خون اور غارتگری کے بعد امیر تیمور محل سے باہر نکلا اور اس نے شہر کا گشت کیا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ شہر میں امن وامان ہوگیا اور ساری غارتگری بند ہوگئی، لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب دہلی اُجڑ چکی تھی۔ دہلی کی عورتوں کی آبرو برباد کی جا چکی تھی۔ لاکھوں پُرامن باشندوں کو لونڈی اور غلام بنایا جا چکا تھا۔ شہر کو لوٹ کر اور آگ لگا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ امیر تیمور کی مرضی کے خلاف ہوا تھا تو وہ اس سے قبل گشت کے لئے کیوں نہیں آیا۔ تا کہ اس کے آتے ہی پانچ چھ دن کے بعد جو آگ بجھ گئی وہ پہلے ہی روز بجھ جاتی۔

امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ سے قبل یہ کہا تھا کہ وہ بت پرستی اور بے دینی کو مٹانے کیلئے ہندوستان جا رہا ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں بُت پرستوں کی حکومت نہیں تھی۔ بلکہ اسی کے ہم مذہبوں کی حکومت تھی چنانچہ ہندوستان کی

سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد اس نے مسلم حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور اس کی شمشیر خارا شگاف سے ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ خصّہ دہلی جو مسلم اُمرا کا سب سے بڑا مرکز تھا وہاں سب سے زیادہ مسلمان ہی لٹے اور خانہ خراب ہوئے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تیمور کا ہندوستان پر حملہ کرنے کا اصل مقصد کیا تھا۔

دہلی کے بعد دوسرے شہروں کی باری

دہلی میں پندرہ دن تک حکومت کرنے کے بعد امیر تیمور شمالی ہند کے دوسرے شہروں کی جانب متوجہ ہوا۔ چنانچہ یکم جنوری ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) کو وہ دہلی سے کوچ کرنے کے بعد میرٹھ پہنچا اور میرٹھ کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔

الیاس افغان جو قلعہ میرٹھ کا حاکم تھا اس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن اسے شکست ہو گئی۔ قلعہ میرٹھ کی فتح کے بعد حسبِ دستور شہر کو لوٹا گیا اور قتلِ عام کیا گیا۔ اسکے بعد امیر تیمور دریائے گنگ کی جانب بڑھا۔ راستہ میں مبارک خاں سے مقابلہ ہوا، پھر درہ کوپلہ (ہردوار) پہنچا تو ملک شیخہ نے تیمور پر قاتلانہ حملہ کر دیا مگر تیمور بچ گیا اور ملک شیخہ جان سے مارا گیا۔ درہ کوپلہ یعنی ہردوار کو بھی خوب لوٹا گیا۔ شہر کو آگ لگا دی گئی اور بُری طرح قتلِ عام برپا کیا گیا۔ یہاں سے تیموری لشکر سوالک کی جانب روانہ ہوا۔ اور سوالک میں بھی خوب غارتگری مچائی۔ پھر نگرکوٹ کی جانب رُخ کیا۔ اور اس شہر کو بھی اچھی طرح لوٹا۔ نگرکوٹ سے فارغ ہونیکے بعد تیمور جموں پہنچا لیکن جموں اور کشمیر کے راجاؤں نے لڑے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ یہاں سے بھی تیمور اور اس کے لشکر کے ہاتھ بہت سا مال لگا۔

امیر تیمور کی ہندوستان سے روانگی

دہلی کو لوٹنے اور برباد کرنے کے بعد ہی امیر تیمور نے ہندوستان سے مراجعت کا

فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ جس مقصد کے لئے وہ ہندوستان آیا تھا وہ مقصد پورا ہو چکا
تھا اگر امیر تیمور کا ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کرنے کا ارادہ ہوتا تو دہلی
کی فتح کے بعد اسکے امکانات پیدا ہو چکے تھے لیکن اس کا مقصد تو صرف
ہندوستان سے مال و زر جمع کرنا تھا اور اس مقصد میں اسے اُمید سے زیادہ
کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ لہذا اس نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا لیکن واپس
جاتے جاتے بھی اس نے بہت سے شہروں پر ہاتھ صاف کر دیا۔ تاکہ اس کی
واپسی بھی نفع بخش ثابت ہو۔

امیر تیمور جب کشمیر سے سندھ کی جانب روانہ ہو رہا تھا تو اسے یہ مزید خوشخبری
سُنائی گئی کہ تیموری سرداروں نے لاہور کو بھی تسخیر کر لیا ہے اور وہ لاہور میں تحصیل
وصول کے کام میں مصروف ہیں۔ یعنی لاہور بھی تیموری لشکر کی دستبرد سے محفوظ نہ
رہ سکا۔ غرضکہ امیر تیمور کشمیر سے سندھ ہوتا ہوا ۱۹ مارچ ۱۳۹۹ء (۸۰۱ھ) کو
ہندوستان کے تمام شمالی علاقوں کو ویران کر کے اپنے وطن کو واپس چلا گیا۔

تیمور کا ہندوستانی وائسرائے خضر خاں

تیمور جب ہندوستان سے جانے لگا تو اس نے خضر
خاں کو ملتان۔ لاہور اور دیپالپور کے لئے اپنا نائب یعنی وائسرائے مقرر کر دیا
تھا خضر خاں وہی ملتان کا سابق حاکم تھا جس پر حملہ کر کے سارنگ خاں نے ملتان پر
قبضہ جما لیا تھا۔ اور وہ ملتان سے نکلنے کے بعد سرگرداں پھر رہا تھا۔ اتفاق سے
اسی دوران میں تیمور آ گیا۔ خضر خاں تیمور سے دہلی آکر ملا۔ اور تیمور
کے ساتھ اپنی اطاعت کا اظہار کیا جس پر تیمور نے اسے لاہور دیپالپور اور
ملتان کا حاکم مقرر کر دیا۔

یہ چیز بڑی عجیب ہے کہ تیمور نے دہلی کے لئے جو ہندوستان کا دارالسلطنت

تھا کسی کو اپنا نائب مقرر نہیں کیا۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ تیمور نے خضر خاں کو ملتان، دیپالپور اور پنجاب میں اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔ لیکن اس نے تمام زندگی ان صوبوں کے بارے میں کبھی خضر خاں سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ اس کا مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کو ہندوستان کے کسی حصہ پر بھی حکومت کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ صرف بطور احتیاط خضر خاں کو اپنا نائب نامزد کر گیا تھا۔ تاکہ اگر پھر کبھی ہندوستان میں لوٹ اور غارتگری کی ضرورت ہو تو خضر خاں اس کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔

تیمور کے حملہ کے بعد حکومت دہلی کی حالت

یوں تو تیمور کے حملہ سے قبل ہی دہلی کی حکومت پاش پاش ہو چکی تھی لیکن تیمور کے حملے نے اس گرتی ہوئی حکومت کو بالکل مٹا کر رکھ دیا۔ اس زمانہ میں دہلی کی حکومت کی بے کسی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو مہینے تک دہلی کا تخت بالکل خالی پڑا رہا اور کسی کو اس تخت پر بیٹھنے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ تیمور کے جانے کے بعد دہلی کی کیفیت یہ تھی کہ یہاں قحط اور وباؤں کا دور دورا تھا۔ نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی منتظم۔ غرضکہ دہلی ایک ویران اور اجاڑ خطہ بنکر رہ گئی تھی اور دہلی کے ماتحت صوبے سب کے سب خود مختار بن چکے تھے

خواجہ جہاں سلطان الشرق قنوج۔ اودھ۔ کڑہ سندیلہ۔ جونپور۔ بہرائچ اور بہار کا مالک بنا ہوا تھا۔ دلاور خاں نے مالوہ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ خضر خاں کو تیمور پنجاب ملتان اور دیپالپور کا مختار مطلق بنا گیا تھا۔ گجرات میں ظفر خاں کا دور دورا تھا۔ سامانہ پر غالب خاں کی حکومت تھی بیانہ میں شمس خاں اوحدی اپنا سکہ چلا رہے تھے۔ کالپی اور مہوبہ پر محمود خاں حکمرانی کر رہا تھا۔ گوالیار، مارواڑ اور میواڑ خود مختار بن چکے تھے۔ یہاں راجپوتوں کا

دور دور انھا۔ جو علاقے باقی رہ گئے تھے ان میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔
غرضکہ دہلی کی حکومت بے شمار ٹکڑوں میں تقسیم ہونیکے بعد پارہ پارہ ہو چکی تھی۔

نصرت شاہ کا دہلی کے تخت پر دوبارہ قبضہ

دہلی کا بادشاہ نمبر ۲ نصرت شاہ جس کی تخت نشینی فیروز آباد میں ہوئی تھی اور جو اقبال ملّو کے خوف کی وجہ سے تخت چھوڑ کر تیمور کے حملہ سے قبل ہی بھاگ گیا تھا۔ اس نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے دوبارہ دہلی کے خالی تخت پر ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں قبضہ جمالیا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے پرانے دشمن اقبال خاں ملّو کی سرکوبی کے لئے شہباز خاں کو برن (بلند شہر) روانہ کیا لیکن اقبال خاں ملّو نے زمینداروں سے ساز باز کر کے شہباز خاں کو راستہ ہی میں ختم کرادیا۔ شہباز خاں کو ختم کرانے کے بعد اقبال خاں ملّو کو بھی دہلی کی حکومت پر دوبارہ قبضہ جمانے کی فکر ہوئی۔ چنانچہ اس نے برن (بلند شہر) میں ایک بہت بڑا لشکر جمع کرنے کے بعد دہلی پر یورش کردی۔ نصرت شاہ جس کو کہ فرار ہونے کی پرانی عادت تھی۔ اقبال خاں ملّو کے مقابلے کی تاب نہ لاکر میوات بھاگ گیا۔
نصرت شاہ کے فرار ہونیکے بعد اقبال ملّو کا پھر ایک مرتبہ دہلی کی حکومت پر قبضہ ہو گیا۔

دہلی کا بے تاج بادشاہ اقبال ملّو

اقبال خاں ملّو نے ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں دہلی کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے دہلی کے ان باشندوں کو دہلی واپس لانے کا کام شروع کیا جو تیمور کے مظالم سے تنگ آکر دہلی سے بھاگ گئے تھے چنانچہ اقبال ملّو کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی میں پھر رونق دکھائی دینے لگی اسکے بعد اقبال ملّو نے ان عمال حکومت کی جانب توجہ کی جو خود مختار ہو گئے تھے۔

اور ان پر فوجی یورش بھی شروع کر دی ان فوجی حملوں میں کبھی تو اقبال ملو کو فتح ہو جاتی تھی اور کبھی خود مختار عمال فتحیاب ہو جاتے تھے۔ غرضکہ یہ تماشہ اسی طرح جاری رہا اس کے علاوہ خود مختار عمال حکومت میں بھی آپسمیں برابر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ غرضکہ ایک بے تاج بادشاہ کی حکومت میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

ناصر الدین محمود شاہ دوبارہ دہلی کا بادشاہ

اقبال ملو دو تین سال تو دہلی کے بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے اس لئے کام چلاتا رہا کہ شاید اس کا اقتدار قائم ہو جائے اور وہ ہندوستان کا مستقل بادشاہ بنکر ملو خاندان کی ایک نئی حکومت قائم کر سکے۔ لیکن جب اُس نے یہ دیکھا کہ اس کی سلطنت دہلی اور دوآبہ سے آگے ہی نہیں بڑھتی تو پھر اسے ایک کٹ پتلی بادشاہ کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ وہ دہلی کے سابق بادشاہ نمبر ۱ یعنی ناصر الدین محمود شاہ کو خوشامد درآمد کر کے مالوہ سے دہلی لے آیا اور اسے ۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) میں دہلی کے تخت پر بٹھاتے ہی خود مختار عمال کے خلاف محمود شاہ کے نام پر لشکر کشی شروع کر دی مگر پھر بھی اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اُس نے خواجہ جہاں سلطان الشرق کے جانشین ابراہیم شرقی کو جو خود مختار ہو چکا تھا شکست دینے کے لئے بڑی تیاری کے بعد حملہ کیا مگر اقبال ملو کو شکست ہو گئی اس کے ساتھ ہی اقبال ملو کے لئے یہ اور پریشانی پیدا ہو گئی کہ ناصر الدین محمود شاہ اقبال خاں ملو کی خود سری سے تنگ آ کر اور دہلی کی حکومت سے کنارہ کش ہو کر ابراہیم شرقی کی پناہ میں قنوج جا کر بیٹھ گیا۔ اب اقبال ملو کے لئے یہ صورت بھی باقی نہ رہی تھی کہ وہ کٹ پتلی بادشاہ کے نام پر کارروائیاں کر سکے۔

اقبال خاں ملو کا قتل

اقبال خاں ملو سلطان محمود شاہ کے قنوج چلے

جانے کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھا اس نے ۸۰۵ھ (۱۴۰۳ء) میں گوالیار پر حملہ کر دیا مگر شکست ہو گئی ۸۰۶ھ (۱۴۰۴ء) میں اٹاوہ پر حملہ کیا مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اسی سال ملّو نے سلطان محمود شاہ کو زیر کرنے کے لئے قنوج پر حملہ کیا۔ مگر ناکام ہو کر دہلی واپس آگیا۔ اسکے بعد اقبال ملّو نے فوج جمع کر کے ۸۰۸ھ میں دیبال پور اور ملتان کے حاکم خضر خاں پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں اقبال ملّو شکست کھا کر بھاگا۔ خضر خاں نے اس کا تعاقب کیا تو اقبال ملّو کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اقبال ملّو زخمی ہو گیا اور اسلام خاں لودھی نے اس کا سر کاٹ کر خضر خاں کے سامنے پیش کر دیا۔ غرضیکہ اس طرح اُس ابن الوقت ملّو کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کی شخصیت ہندوستان کی تاریخ میں عجیب و غریب ہے۔

ناصر الدین محمود شاہ تیسری مرتبہ دہلی کے تخت پر

اقبال ملّو کے قتل کی خبر جب دہلی پہنچی تو دولت خاں لودھی اور دوسرے اُمرائے سلطنت نے سلطان محمود شاہ کو قنوج سے بُلا کر ۸۰۸ھ (۱۴۰۵ء) میں تیسری مرتبہ دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد محمود شاہ قنوج پر قبضہ جمانے کے لئے قنوج گیا۔ جہاں ابراہیم شرقی سے اس کی جنگ ہوئی مگر اُمرا نے صلح کرا دی اور سلطان دہلی واپس چلا آیا۔ سلطان نے دولت خاں کو سامانہ کی تسخیر کے لئے بھیج رکھا تھا۔ سامانہ پر بیرم خاں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ بیرم خاں دولت خاں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سرہند چلا گیا۔ بیرم خاں کو حاکم ملتان خضر خاں کی حمایت حاصل تھی جب اسے بیرم خاں کی شکست کا حال معلوم ہوا تو اس نے ایک بڑا لشکر لیکر دولت خاں پر حملہ کر دیا۔ دولت خاں فرار ہو گیا۔

خضر خاں نے سامانہ کا علاقہ توزبرک خاں کو دیدیا اور سرہند کی حکومت

بیرم خاں کی سپرد کر دی۔ ۸۱۴ھ (۱۴۱۲ء) میں خضر خاں رہتک نارنول میوات تجارہ فتح کرتا ہوا دہلی آیا اور سیری کا محاصرہ کر لیا جہاں سلطان محمود موجود تھا لیکن قحط کی پریشانی کی وجہ سے خضر خاں اس محاصرہ کو اٹھانے کے بعد ۸۱۵ھ (۱۴۱۳ء) میں پانی پت کی راہ سے فیروز پور چلا گیا۔ خضر خاں کے جانے کے بعد سلطان محمود شاہ بیمار ہو گیا۔ اور اس نے وفات پائی اور اس طرح تغلق خاندان کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔ سلطان محمود شاہ اگرچہ روز اول ہی سے برائے نام بادشاہ تھا لیکن پھر بھی اس نے بیس برس اور دو مہینے حکومت کی۔

دولت خاں لودھی کی چند روزہ حکومت

سلطان محمود کے مرنے کے بعد امرائے سلطنت نے دولت خاں لودھی سے بیعت کر لی اور اس طرح دولت خاں لودھی دہلی کا بے تاج بادشاہ بن گیا مگر دولت خاں نے کبھی کوئی بادشاہی خطاب اختیار نہیں کیا۔ اور نہ کبھی تخت شاہی پر بیٹھا، اس کے زمانہ کے سکوں میں یا تو فیروز شاہ کا یا فیروز شاہ کی اولاد کا نام ہوتا تھا۔ اس کی حکومت کو مشکل سے سوا سال ہوا تھا کہ خضر خاں نے ساٹھ ہزار کی جمعیت سے دہلی پر حملہ کر دیا۔ اور سیری کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جہاں دولت خاں لودھی موجود تھا۔ دولت خاں چار مہینے تک تو اس محاصرہ کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر چار ماہ کے بعد نوبت خانہ کے دروازے پر خضر خاں کا قبضہ ہو گیا۔ دولت خاں نے جب سمجھ لیا کہ خضر خاں سے کسی طرح مفر نہیں تو اس نے خضر خاں سے امان چاہی۔ خضر خاں نے اس کی جان بخش دی اور حصار فیروزہ میں اسے قید کر دیا۔ اور اس طرح دہلی کی حکومت پر ۸۱۷ ہجری (۱۴۱۴ء) میں خضر خاں حاکم پنجاب ملتان و دیبال پور کا قبضہ ہو گیا۔

دسواں باب

ہندوستان پر سیدوں کی حکومت

۸۱۷ھ تا ۸۵۵ھ

۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۱ء

سیّدوں کی حکومت

خضر خاں جس نے کہ دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے بعد ہندوستان میں خاندان سادات کی حکومت کی بنیاد رکھی اسکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آل رسول ﷺ تھا اور اس کی تصدیق سید السادات حضرت جلال بخاری نے بھی کی ہے۔

سلطان فیروز شاہ کے دورِ حکومت میں اس خاندان سادات کو سب سے پہلے عروج حاصل ہوا چنانچہ ملک مردان حاکم ملتان کا شمار فیروز شاہ کے امرائے کبار میں تھا۔ ملک مردان کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ملک شیخ جانشین ہوا۔ لیکن وہ جلد ہی مر گیا۔ ملک شیخ کے مرنے کے بعد اس کا بھائی ملک سلیمان جانشین قرار دیا گیا لیکن اس کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور اس کے مرنے پر فیروز شاہ تغلق نے ملک سلیمان کے بیٹے خضر خاں کو ملتان کا حاکم بنا دیا۔

خضر خاں ایک نہایت ہی لائق سپہ سالار تھا جس نے متعدد لڑائیوں میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے تھے جنکی تفصیل اس سے قبل بیان کی جا چکی ہے لیکن ۷۹۸ھ (۱۳۹۶ء) میں جب اقبال لتو کے بھائی سارنگ خاں نے ملتان پر حملہ کر کے اسے ملتان کی حکومت سے محروم کر دیا۔ تو یہ سرگرداں اور پریشان پھرنے کے بعد دہلی میں امیر تیمور کے پاس چلا گیا جس نے کہ پنجاب، دیبالپور اور ملتان کی حکومت دیکر خضر خاں کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔ امیر تیمور کی بابت یہ مشہور ہے کہ وہ خاندانِ سادات کا بڑا قدردان تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اسی لئے اس نے دوسروں کے مقابلہ میں ایک سید زادہ کو ترجیح دینا زیادہ پسند کیا ہو۔

خضر خاں کا دورِ حکومت

جہاں تک تعلق خاندان کا تعلق ہے۔ وہ خضر خاں کی تخت نشینی سے ڈیڑھ سال قبل ہی

سلطان محمود شاہ کی موت کے بعد ختم ہو گیا تھا لیکن سلطان محمود شاہ کے بعد چونکہ حکومت کا انتظام دولت خاں لودھی نے سنبھال لیا تھا۔ اسلیئے وہ ڈیڑھ سال تک دہلی کی حکومت پر قابض رہا۔ خضر خاں نے ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں دہلی پر حملہ کر کے اور دولت خاں کو شکست دیکر قید کر دیا۔ اور اس کے بعد خود دہلی کا فرماں روا بن گیا۔

خضر خاں دہلی کے تخت پر بیٹھ تو گیا لیکن وہ امیر تیمور سے ایسا خوفزدہ تھا کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ نہ تو بادشاہ کا لقب شامل کیا اور نہ سکوں ہی پر اپنا نام مسکوک کرایا۔ بلکہ اپنے نام کی جگہ سکہ و خطبہ میں امیر تیمور ہی کا نام دیتا رہا لیکن جب خضر خاں کو امیر تیمور کا اندیشہ کم ہو گیا۔ تو اس کے آخری دورِ حکومت میں خطبوں میں خضر خاں کا نام پڑھا جانے لگا تھا۔

خضر خاں کا سارا کا سارا دورِ حکومت اندرونی بغاوتوں سے بھرا پڑا ہے۔ خضر خاں کی حالت یہ تھی کہ وہ بغاوتوں کو دبانے کے لئے ادہر سے ادہر مارا مارا پھرتا تھا لیکن اگر ایک جگہ کی بغاوت دبتی تھی تو دوسری جگہ بغاوت کھڑی ہو جاتی تھی۔ الغرض دہلی کے سوا کوئی ضلع یا صوبہ بادشاہ کے تصرف میں نہ تھا۔ یہاں تک کہ صوبہ پنجاب دیپال پور اور ملتان جس پر کہ خضر خاں کا سب سے زیادہ اقتدار تھا۔ وہاں بھی شورشیں کھڑی ہو گئی تھیں۔

خضر خاں نے تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی ملک الشرق۔ ملک تحفہ کو تاج الملک کا خطاب دیکر وزارت عظمیٰ کا عہدہ تفویض کیا۔ سید سالم سید سادات کو سہارنپور کا حاکم۔ ملک سلیمان کو ملتان اور فتحپور کا حاکم اور ملک سردار کو شہر کا کوتوال بنایا اور اپنی غیر حاضری کی صورت میں ملک خیرالدین کو اپنا قائم مقام تجویز کیا اور ان انتظامات سے فارغ ہونیکے بعد خضر خاں ملک کی

اندرونی بغاوتوں کو دبانے کی جانب متوجہ ہوا۔

خضر خاں ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) سے لیکر ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) تک برابر ملک کی اندرونی بغاوتوں کے دبانے میں مصروف رہا۔ اس دوران میں خضر خاں برابر بدایوں۔ کٹھیر۔ کمپلہ۔ گوالیار۔ آوری۔ چندوار۔ کہور۔ اٹاوہ۔ بیانہ۔ سرہند قلعہ ناگور۔ سمبھل۔ سورت اور دوسرے علاقوں کے باغیوں کی سرکوبی میں مصروف رہا۔ لیکن حالت یہ تھی کہ جو علاقہ آج اطاعت قبول کرتا تھا۔ وہی دوسرے دن باغی ہوجاتا تھا۔ بغاوت برپا کرنے والے یا تو پرانے شاہی عمال اور ان کی اولاد تھی یا راجپوت اور ہندو زمیندار تھے جو کسی طرح قابو میں نہیں آتے تھے۔

حکومت کے کام میں خضر خاں کا سب سے بڑا معاون وزیر اعظم ملک تاج الملک تھا۔ جو ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں مر گیا جس کے مرنے سے خضر خاں کی رہی سہی طاقت بھی ٹوٹ گئی۔ خضر خاں نے ملک تاج الملک کی جگہ اسکے بیٹے ملک الشرق ملک سکندر کو وزیر اعظم مقرر کردیا۔ لیکن وہ کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوسکا۔ حکومت کی الجھنوں اور پریشانیوں کی وجہ سے خضر خاں کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ لیکن پھر بھی وہ حکومت کے کاموں میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف رہا۔ اسی سال جب وہ گوالیار اور اٹاوہ کی بغاوتوں کو دبانے گیا تو دورانِ سفر ہی میں بیمار ہوگیا۔ چنانچہ جب وہ دہلی پہنچا تو بے حد بیمار تھا۔ اسی بیماری میں ۱۷ جمادی الاول ۸۲۴ھ (۱۵ مئی ۱۴۲۱ء) کو اس کا انتقال ہوگیا۔ خضر خاں نے سات سال دو مہینے اور دو دن حکومت کی لیکن اسے ایک دن بھی چین میسر نہ آیا۔

سلطان مبارک شاہ کی تخت نشینی

خضر خاں نے اپنے بیٹے مبارک خاں کو پہلے ہی فیروزپور اور

سرہند کی حکومت سپرد کر دی تھی۔ جب خضر خاں زیادہ بیمار رہا تو اس نے اپنے اسی بیٹے کو ولیعہد مقرر کر دیا۔ چنانچہ خضر خاں کے مرنے کے بعد ۱۹ جمادی الاول ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) کو امرائے سلطنت نے مبارک خاں کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے تخت پر بیٹھنے کے بعد معز الدین ابو الفتح مبارک شاہ کا لقب اختیار کیا۔

خضر خاں کی زندگی ہی میں پنجاب میں شورش شروع ہو گئی تھی۔ لیکن خضر خاں کے مرنے کے بعد اس شورش نے باقاعدہ بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ پنجاب میں باغیوں کا سرغنہ شیخا گھکڑ کا بھائی جسرت گھکڑ تھا۔ جو دہلی کی حکومت پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ خضر خاں کے مرنے کے ساتھ اس نے پنجاب میں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ شاہی کاروان کو یہ لوٹ لیتا تھا۔ لاہور اور لاہور کے مضافات کے علاقوں کو اس نے لوٹ کر تباہ اور برباد کر دیا تھا۔ لاہور اور شرقی پنجاب کے شہروں کے باشندے اسکے خوف سے شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مبارک شاہ کو جب اس کی تباہ کاریوں کا علم ہوا تو اس نے اسکی سرکوبی کے لئے فوجی سرداروں کو بھیجا مگر جسرت گھکڑ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ مقابلہ کئے بغیر بھاگ کر پہاڑوں میں چھپ جاتا تھا بادشاہ خود اس کی سرکوبی کے لئے لاہور تک گیا۔ لاہور کو دیکھا تو ویران پڑا تھا۔ بادشاہ نے اسے دوبارہ آباد کیا۔ مگر جسرت گھکڑ کا فتنہ بادشاہ کی کوشش کے باوجود زمانۂ دراز تک نہ دب سکا۔ جسرت کو جب بھی موقعہ ملتا تھا وہ لوٹ مار شروع کر دیتا تھا۔

خضر خاں کی طرح مبارک شاہ کی بھی ساری زندگی ملک کی اندرونی بغاوتوں کو فرو کرنے میں مصروف رہی ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) سے لیکر ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) تک وہ برابر باغیوں کی سرکوبی کے لئے مارا مارا پھرا۔ اس مدت میں اس نے کھیٹرہ اور اٹاوہ کی مہمات میں حصہ لیا جسرت گھکڑ کی بغاوت کو دبانیکی دوبارہ کوشش کی

گو الیار سوات اور بیانہ کی جنگ میں حصہ لیا جسرت گھکڑ کی تیسری بغاوت کو دبانے کی
جد و جہد کی۔ اسی دوران میں تازہ مصیبت یہ نازل ہو گئی کہ امیر شیخ علی حاکم کابل نے
تیمور کی سنت پر عمل کرتے ہوئے پنجاب اور ملتان کے علاقہ کو لوٹ کر تباہ اور برباد
کر دیا جسرت گھکڑ اور باغیوں نے اس لوٹ مار میں حاکم کابل کا ساتھ دیا لیکن
عماد الملک نے ملتان کے علاقہ میں امیر شیخ علی کا اس جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا کہ حاکم
کابل کو سارا مال غنیمت چھوڑ کر کابل بھاگنا پڑا لیکن جسرت گھکڑ کی ترغیب پر حاکم کابل
امیر شیخ علی نے دوبارہ ہندوستان پر فوج کشی کر دی۔ پہلے جسرت نے پنجاب کے بعض علاقوں
کو لوٹا۔ اسکے بعد حاکم کابل نے ملتان اور پنجاب میں آکر تباہی اور غارت گری برپا کی۔ اس
مرتبہ بادشاہ خود حاکم کابل کے مقابلے کے لئے گیا اور سلطانی لشکر نے پھر ایک بار حاکم کابل
امیر شیخ علی کو ہندوستان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

مبارک شاہ جب سے تخت پر بیٹھا تھا۔ برابر اسی قسم کی الجھنوں اور پریشانیوں میں
مبتلا تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی بادشاہی کا کوئی لطف نہیں اٹھا سکا۔ اپنی حکومت
کے آخری دور میں اس نے جمنا کے کنارے اپنے نام پر شہر مبارک آباد کی بنیاد رکھی
تھی وہ اس شہر کی عمارتوں کے معائنہ کے بعد جمعہ کی نماز پڑھ رہا تھا کہ ملک سرور الملک
وزیر کے اشارہ پر اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا سب سے پہلے سدھ پال نامی ایک شخص نے
بادشاہ کی پیشانی پر تلوار ماری اسکے بعد اسکے تمام ساتھی بادشاہ پر پل پڑے۔ اور
اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ دردناک واقعہ ۹ رجب ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) کو پیش آیا تھا۔ اس
بادشاہ نے تیرہ سال تین مہینے اور سولہ روز حکومت کی۔ یہ اپنے دور کا نہایت ہی
نیک دل بادشاہ تھا جس نے کرشمے تدبر اور دانشمندی کے ساتھ حکومت کی لیکن
حکومت کی بنیادیں اس قدر متزلزل ہو چکی تھیں کہ انتہائی جد و جہد کے باوجود بادشاہ
انکو مضبوط تر نہ بنا سکا۔ یہ پاکباز ہونے کے ساتھ بے حد انصاف پسند بھی تھا اگر کوئی مضبوط

حکومت اسے مل ہوتی تو یہ بڑا نام پیدا کرتا تاریخ مبارک شاہی اسی بادشاہ کے نام پر لکھی گئی تھی۔

سلطان محمد شاہ کی تخت نشینی

مبارک شاہ کے قتل کے بعد اسی روز یعنی ۹ رجب ۸۳۷ھ (دسمبر ۱۴۳۳ء) کو امرائے سلطنت نے محمد شاہ، کو تخت پر بٹھا دیا۔ محمد شاہ مبارک شاہ مرحوم کا متبنٰی تھا جو فرید خاں کا بیٹا اور خضر خاں کا پوتا تھا۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کا سب سے بڑا محرک مبارک شاہ کا قاتل سرور الملک وزیر تھا۔ اس نے محمد شاہ کو یہ سوچ کر تخت پر بٹھایا تھا کہ وہ اس کٹ پتلی بادشاہ کے پردہ میں بے دھڑک خود حکومت کر سکے گا چنانچہ سرور الملک نے خزانہ اور سارے اہم محکمے اپنے قبضے میں لے لئے تاکہ وہ بادشاہ کو اپنے اشاروں پر نچا سکے۔

محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد وزیر سرور الملک نے پرانے امرائے سلطنت کی بیخ کنی شروع کر دی اور ان لوگوں کو خوب نوازا جنہوں نے کہ بادشاہ مبارک شاہ کے قتل میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ بادشاہ کے قاتل نمبر اول سدھ پال اور قاتل نمبر دوم سدا رن کھتری اور ان کے قرابتداروں کو بادشاہ کے قتل کے صلہ میں بیانہ، امروہہ، نارنول، کہرام اور دوآبے کے علاقے عطا ہوئے۔ اسی طرح میراں صدر اور سید السادات کے بیٹے کو بادشاہ کے قتل میں معاونت کرنیکی بنا پر خطابات اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ مقتول بادشاہ کے حامی تھے۔ ان کو دھوکہ سے بلا کر یا تو قتل کر دیا گیا یا قید میں ڈال دیا گیا۔

وفا شعار امرائے سلطنت کمال الملک۔ ملک اہار میاں۔ ملک اللہ داد کاکا ملک چمن۔ ملک کہون راج۔ امیر علی گجراتی۔ ابتدا میں تو خاموشی کے ساتھ غدار وزیر سرور الملک کی حرکتوں کو دیکھتے رہے۔ آخر انھوں نے سرور الملک کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ کمال الملک نے اس بغاوت میں نمایاں حصہ لیتے ہوئے

دوسرے تمام اُمراء کی مدد سے ایک بڑی فوج برن (بلند شہر) میں جمع کر کے سرورالملک کے خلاف دہلی پر حملہ کر دیا۔ سرورالملک مقابلے کی تاب نہ لا کر دہلی کے قلعہ سیری میں محصور ہو گیا۔ اور تین مہینے تک لڑتا رہا۔ سرورالملک کو بادشاہ سے بھی اندیشہ تھا چونکہ بادشاہ بھی کمال الملک اور دوسرے وفا شعار اُمراء کی جانب جھکا ہوا تھا اس لئے سرورالملک نے سوچا کہ کیوں نہ سب سے پہلے بادشاہ ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ قلعہ سیری میں اپنے آدمیوں کو ساتھ لیکر بادشاہ کے قتل کیلئے محل سرا میں گھس گیا۔ بادشاہ کے محافظتی دستوں نے سرورالملک کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں غدار وزیر سرورالملک مارا گیا۔

غدار سرورالملک کے قتل کے بعد بادشاہ نے کمال الملک کو کمال خاں کا خطاب دیکر وزارتِ عظمٰی کا عہدہ سپرد کیا۔ ملک جے من۔ ملک اللہ داد لمک۔ کھون راج۔ خان اعظم سید خاں جیسے وفا شعار اُمراء کو خطابات اور جاگیریں عطا کی گئیں۔ دہلی کے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ بغرض تفریح ملتان گیا۔ اور چند روز ملتان میں قیام کرنے کے بعد پھر دہلی واپس آ گیا۔ بادشاہ نے ابتدا میں تو سلطنت کے کاموں سے دلچسپی کا اظہار کیا لیکن بعد میں سلطنت کا تمام کام امیروں اور وزیروں کے سپرد کرنے کے بعد عیش و عشرت میں ایسا مبتلا ہوا کہ اس نے مرتے دم تک حکومت کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہ لی۔

اس بادشاہ کی بے عقلیوں اور حماقتوں کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ سرہند کا حاکم ملک بہلول بغاوت کرنے کے بعد دیبالپور اور لاہور پر قابض ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کے مقابلے کے لئے حسام خان کو بھیجا تو اسے شکست ہو گئی۔ بادشاہ نے ملک بہلول سے صلح کرنا چاہی تو بہلول نے مطالبہ کیا کہ حسام خاں کو قتل کر دیا جائے اور

حمید خاں کو وزیر بنا دیا جائے چنانچہ باغی بہلول کے مطالبہ پر وفا شعار حسام خاں بغیر جرم کے قتل کر دیا گیا - اور بہلول کا پٹھو حمید خاں وزیر بن گیا - اسی طرح مالوہ کے حکمراں سلطان محمود خلجی نے جب ۸۴۴ھ ہجری (۱۴۴۰ء) میں حملہ کر کے دہلی کے نواحی علاقہ پر قبضہ جما لیا تو بادشاہ نے بہلول خاں کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ محمود خلجی اور بہلول خاں میں جنگ چھڑ گئی - تو بادشاہ نے چپکے سے اپنا قاصد بھیج کر محمود خلجی سے صلح کر لی۔ جس سے بہلول خاں اور دہلی کی حکومت کی بے حد تذلیل ہوئی۔ مگر بہلول خاں نے بادشاہ کی صلح کی پروانہ کرتے ہوئے محمود خلجی کی فوجوں پر حملہ کر کے اُسے بُری طرح نقصان پہنچایا۔

بادشاہ ۸۴۵ھ (۱۴۴۱ء) میں جب سامانہ میں آیا ہوا تھا تو اُس نے ملک بہلول کا لاہور اور دیبال پور کی حکومت پر قبضہ محض اسلئے تسلیم کر لیا۔ تا کہ ملک بہلول جسرت گھکڑ کا دماغ درست کر سکے لیکن جسرت گھکڑ جو بے حد چالاک تھا۔ اُس نے ملک بہلول سے فوراً صلح کر لی - اور بہلول کو مشورہ دیا کہ وہ بادشاہ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر دہلی پر حملہ کر کے خود بادشاہ بن جائے۔ چنانچہ جسرت گھکڑ کے مشورہ کے مطابق ملک بہلول نے دہلی پر حملہ کر دیا مگر ناکام رہا۔ ملک بہلول کی اس جسارت کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بادشاہ چوکنا ہو جاتا لیکن وہ بدستور عیش پرستیوں میں ڈوبا رہا اور حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد بادشاہ بیمار ہو کر ۸۴۹ھ (۱۴۴۵ء) میں اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس بادشاہ نے بارہ برس اور چند مہینے حکومت کی۔

سلطان علاء الدین کی تخت نشینی

سلطان محمد شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین ۸۴۹ھ (۱۴۴۵ء)

میں تخت پر بیٹھا۔ جو نہایت ہی بزدل اور حکومت کے کاموں سے قطعی ناآشنا تھا۔ اس بادشاہ کی بزدلی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۸۵۰ھ (۱۴۴۶ء) میں جب یہ بیانہ کی تسخیر کیلئے روانہ ہوا تو کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ جونپور کا حاکم دہلی فتح کرنے آرہا ہے۔ یہ سنتے ہی اسکے دل پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ یہ راستہ ہی سے بھاگ کر دہلی واپس آگیا۔

اس بادشاہ کو بدایوں بے حد پسند تھا۔ چنانچہ ۸۵۱ھ (۱۴۴۷ء) میں جب یہ بدایوں گیا تو وہیں رہ پڑا اور بڑی مدت کے بعد دہلی واپس آیا۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں سارے ملک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ دہلی کے اکثر علاقے بھی اسکی حکومت سے نکل گئے تھے۔ بس اس بادشاہ کی حکومت دہلی میں بارہ میل کے اندر اندر تھی۔ گجرات۔ سندھ۔ مالوہ۔ ملتان۔ پنجاب، دکن، بنگال جونپور، گوالیار، دھولپور۔ بھدوریا۔ سمبھل۔ نارنول، بیانہ، اودھ۔ بہار غرضکہ ہندوستان کے ہر کونے اور ہر شہر میں بے شمار خود مختار بادشاہ اور راجہ حکومت کر رہے تھے۔ اور یہ بادشاہ دہلی کی صرف بارہ میل کی حکومت پر قانع تھا۔ بادشاہ کی اس کمزوری کو دیکھتے ہوئے ملک بہلول نے ۸۵۱ھ (۱۴۴۷ء) میں دوبارہ دہلی پر حملہ کیا۔ مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

بادشاہ کا ایک منہ چڑھا امیر رائے پرتاب وزیر حمید خاں کا اسلئے مخالف تھا کہ حمید خاں کا باپ اس کے ملک کو تاراج کر کے اسکی بیوی پر قابض ہو گیا تھا۔ چنانچہ رائے پرتاب نے اور اسکے چند ہمنوا امرا نے بادشاہ سے کہا کہ "ملک میں یہ بغاوتیں اسوقت تک بند نہیں ہونگی جب تک کہ حمید خاں کو وزارت کے عہدہ سے نہ ہٹایا جائیگا۔ اگر حضور اسکو معزول کر کے قید کر دیں تو سب مطیع ہو جائینگے اور بہت سے علاقے دہلی کی حکومت کے ساتھ مل جائیں گے"۔ اس

احمق بادشاہ نے فوراً وزیر حمید خاں کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

بادشاہ کو چونکہ بدایوں بے حد پسند تھا۔ اس لئے اس نے دہلی کی بجائے بدایوں کو دارالسلطنت بنانے کا ارادہ کیا۔ جب اُمراء نے اسکی مخالفت کی تو بادشاہ خفا ہو گیا اور ۸۵۲ھ (۱۴۴۸ء) میں اپنی بیوی کو لیکر بدایوں چلا گیا اور وہیں رہنے لگا۔ بادشاہ کے بدایوں جانے کے بعد دہلی میں آئے دن قتل و خون ہونے لگے یہانتک کہ بادشاہ کے دو سالے بھی قتل ہو گئے۔ مگر بادشاہ بدستور بدایوں میں رنگرلیاں مناتا رہا۔ بادشاہ کے بدایوں میں قیام کے دوران میں رائے پرتاب نے بادشاہ کو پٹی پڑھائی کہ حمید خاں کے قید کرنے سے تو کام چلا نہیں اگر اسے قتل کر دیا جائے تو کام بنجائے اور سارے باغی علاقے فوراً مطیع ہو جائیں۔ بادشاہ نے فوراً حمید خاں کے قتل کا حکم دیدیا۔

حمید خاں وزیر کے بھائیوں اور ہوا خواہوں کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو انھوں نے حملہ کر کے حمید خاں کو قید سے نکال لیا۔ حمید خاں رہا ہونیکے بعد اپنی جمعیت لیکر حرم شاہی میں گھس گیا۔ بادشاہ کی بہو بیٹیوں کی خوب بے عزتی کی۔ چن چن کر بادشاہ کے بیٹوں، بیٹیوں، بیویوں اور خاندان کی عورتوں کو محل سے برہنہ سر کر کے نکال دیا۔ اور شاہی سامان و خزانہ پر قبضہ جما لیا، اور ملک بہلول حاکم سرہند کو دہلی پر قبضہ کرنیکی دعوت دیدی تاکہ وزیر حمید خاں بہلول جیسے مضبوط آدمی کو تخت پر بٹھانے کے بعد اس کے پردہ میں خود حکومت کر سکے۔

ملک بہلول جو پہلے ہی سے دہلی کی حکومت کی تاک میں تھا بشہ پاتے ہی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دہلی کی جانب بڑھا اور دہلی کی حکومت پر ۸۵۴ھ (۱۴۵۰ء) میں قبضہ جما لیا۔ اسکے بعد اپنے بڑے بیٹے بایزید کو دہلی میں چھوڑ کر پنجاب اور دیپالپور گیا تاکہ اپنی طاقت کو مستحکم کرے اور اس کام سے فارغ ہونے

کے بعد پھر دہلی واپس آ گیا۔ دہلی میں اسے بادشاہ کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ "میرے باپ نے تمہیں بیٹا بنایا تھا۔ اس رشتہ سے تم میرے بڑے بھائی ہو میں سلطنت تم کو دیتا ہوں اور آپ بدایوں پر قناعت کرتا ہوں۔" اس خط کے ملنے پر ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) میں ملک بہلول نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ علاء الدین بدایوں میں پڑا رہا۔ اور زمانہ دراز تک زندہ رہا۔ ۸۸۳ھ (۱۴۷۸ء) میں بدایوں ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ خاندان سادات کا آخری بادشاہ تھا جس نے کہ دہلی میں سات سال اور چند ماہ بادشاہی کی اور بدایوں میں اٹھائیس سال زندہ رہا۔

سیدوں کی حکومت پر ایک نظر

سیدوں کے خاندان نے ہندوستان میں تقریباً چھتیس سال حکومت کی ہے لیکن سیدوں کی حکومت ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں کی تاریخ میں کمزور ترین حکومت شمار کی جاتی ہے۔ سید خاندان کی حکومت کا بانی خضر خاں جب تخت پر بیٹھا تھا اس وقت بھی یہ حکومت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن آخر میں جا کر تو یہ حکومت صرف چند میل کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس حکومت کے پہلے دو بادشاہ خضر خاں اور مبارک شاہ ساری عمر اندرونی بغاوتوں کے مٹانے میں مصروف رہے۔ ان کے بعد جو دوسرے دو بادشاہ محمد شاہ اور علاء الدین ہوئے۔ وہ برائے نام بادشاہ تھے۔ چنانچہ اس حکومت کے آخری بادشاہ علاء الدین ہی کی زندگی میں سیدوں کی حکومت ختم ہو گئی اور اس پر ملک بہلول نے بڑی آسانی کے ساتھ قبضہ جما لیا۔

گیارھواں باب

ہندوستان پر شاہانِ لودھی کی حکومت

۸۵۵ھ تا ۹۳۳ھ

۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء

شاہانِ لودھی کی حکومت

شاہانِ لودھی جنہوں نے کہ سیدوں کی حکومت کے بعد ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی، ان افغان تاجروں میں سے تھے۔ جو اس ملک میں تجارت کی غرض سے آتے رہتے تھے۔ انمیں سے اکثر نے ہندوستان میں فوجی ملازمت کرنے کے بعد یہیں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ بہلول لودھی جو لودھی خاندان کا سب سے پہلا بادشاہ ہوا ہے۔ اس کا دادا ملک بہرام فیروز تغلق کے عہدِ حکومت میں ملتان میں آکر آباد ہو گیا تھا اور اس نے حاکم ملتان مردان کی ملازمت کر لی تھی۔ ملک بہرام کے پانچ بیٹے تھے۔ جنمیں سے ایک بیٹا اسلام خاں بھی تھا جو حاکم ملتان خضر خاں (سیدوں کی حکومت کا بانی) کے زمانہ میں افغان فوج کا سردار بنا دیا گیا تھا۔ یہ وہی اسلام خاں ہے جس نے اقبال ملّو کا سر کاٹ کر خضر خاں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور خضر خاں نے خوش ہو کر اسے سرہند کی حکومت دیدی تھی۔ اسلام خاں کے علاوہ اسلام خاں کے دوسرے چاروں بھائی ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد اور ملک خواجہ بھی فوج میں افسر تھے۔

بہلول لودھی کا باپ اور اسلام خاں کا بڑا بھائی ملک کالا جو دورالہ میں حاکم تھا۔ اسکی مقامی افغانوں سے چھڑ گئی اور اس لڑائی میں ملک کالا مارا گیا ملک کالا کی شادی اپنے چچا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ جو ملک کالا کی موت کے وقت حاملہ تھی یعنی باپ کے حادثہ قتل کے وقت بہلول لودھی لبطن مادر میں تھا۔ ملک کالا کی موت کے بعد ملک کالا کی بیوہ پر ایک نئی مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اسکے مکان کی چھت اچانک اس پر گر پڑی جس سے کہ وہ ہلاک ہو گئی مگر اسکے پیٹ

میں بچہ زندہ رہا۔ جسے پیٹ چاک کر کے نکال لیا گیا اور اس کا نام بہلول رکھا گیا ابھی بہلول ایک مہینہ کا ہی تھا کہ لوگوں نے اس بچہ کو اس کے چچا اسلام خان حاکم سرہند کے پاس پہنچا دیا جس نے اسے پالا پوسا اور اس کی پرورش کی۔

بہلول لودھی کی ابتدائی زندگی

بہلول لودھی اپنے چچا اسلام خان کی زیر نگرانی تربیت پانے کے بعد ایک نہایت ہی لائق سپاہی ثابت ہوا۔ چنانچہ ایک لڑائی میں بہلول نے ایسی شجاعت دکھائی کہ اس کے چچا اسلام خاں نے خوش ہو کر اس کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ اسلام خاں کو اپنے اس بھتیجے اور داماد کی فوجی قابلیت پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب اسلام خاں کی رحلت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو محروم کر کے بہلول لودھی ہی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا لیکن اسلام خاں کے مرنے کے ساتھ ہی اسلام خاں کے خاندان میں سرہند کی حکومت کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

بہلول خاں لودھی جسے اسلام خاں نے جانشین مقرر کیا تھا۔ اپنے آپ کو سرہند کی حکومت کا سب سے بڑا مستحق سمجھتا تھا۔ لیکن اسلام خاں کا بیٹا قطب خاں یہ کہتا تھا کہ میں جائز وارث ہوں۔ ان دونوں کے علاوہ اسلام خاں کا بھائی ملک فیروز الگ ہی اس کوشش میں تھا کہ سرہند کی حکومت اسے مل جائے آپس کی اس خانہ جنگی سے اسلام خاں کے خاندان کو بے حد نقصان پہنچا چنانچہ بہلول خاں کو پہاڑوں کی خاک چھاننی پڑی۔ ملک فیروز کو جسرت گھکڑ نے دھوکہ دیکر اس کے تمام ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ قطب خاں جسے بادشاہ کی حمایت حاصل تھی وہ بھی سرگرداں ہی رہا۔ آخر بہلول لودھی نے نئے سرے سے افغانوں کی ایک جمعیت فراہم کرنے کے بعد سرہند پر قبضہ جما لیا۔ اب قطب خاں اور ملک فیروز بھی اس سے آن ملے۔

دہلی کے بادشاہ سلطان محمد کو جب معلوم ہوا کہ بہلول سرہند پر قابض ہوگیا ہے تو بادشاہ نے بہلول کی سرکوبی کے لئے وزیر حسام خاں کو بھیجا حسام خاں کو بہلول کے مقابلہ میں شکست ہوگئی۔ بہلول لودھی کی شاہی فوج کے مقابلہ میں یہ پہلی فتح تھی جس کو دہلی پر بہلول لودھی کی دوسری فتح اس کو سمجھنا چاہیے۔ جب بادشاہ کو مجبوراً بہلول سے بہلول کی پیش کردہ شرائط پر صلح کرنی پڑی۔ اس کے بعد بہلول لودھی سلطان محمد شاہ اور سلطان علاء الدین کے عہدِ حکومت میں بار بار دہلی کی حکومت پر حملے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سنہ ۸۵۴ھ (۱۴۵۰ء) میں وزیر حمید خاں کی ترغیب پر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دہلی پر حملہ کرکے حکومت پر قابض ہوگیا۔

سلطان بہلول لودھی کی تخت نشینی

بہلول لودھی نے دہلی کی حکومت پر قبضہ تو جما لیا لیکن اس کا ایک دوسرا حریف وزیر حمید خاں بھی موجود تھا۔ جو دہلی کی حکومت میں برابر کا شریک بنا ہوا تھا۔ اس لئے بہلول کے لئے یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے تخت نشین ہوجائے۔ چنانچہ دہلی پر بہلول لودھی کا قبضہ ہوجانے کے باوجود اس وقت تک دہلی کا تخت خالی رہا جب تک کہ بہلول لودھی نے موقعہ پاکر وزیر حمید خان کو قید نہیں کرلیا۔ وزیر حمید خاں کو قید کرنے کے بعد بہلول سلطان کا لقب اختیار کرنے کے بعد ۱۷ ربیع اوّل سنہ ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) کو تخت پر بیٹھا اپنے نام کا سکہ چلایا اور خطبہ جاری کیا۔

بہلول لودھی پر شاہ جونپور کا حملہ

یہ بتایا جاچکا ہے کہ دہلی کی مرکزی حکومت کے کمزور ہونیکے بعد ہندوستان کے کونے کونے میں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ان ہی خود مختار حکومتوں میں سے ایک جونپور کی حکومت بھی تھی جو بڑی طاقتور حکو

شمار کی جاتی تھی۔ اس حکومت کا بادشاہ سلطان علاء الدین کا داماد محمود شاہ شرقی تھا یہ بادشاہ اوّل تو سلطان علاء الدین کا داماد ہونے کی وجہ سے دہلی کی حکومت پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ دوسرے دہلی کے وہ اُمرائے سلطنت جو لودھی خاندان کے مخالف تھے انھوں نے محمود شاہ شرقی کو دہلی پر حملہ کرنے اور دہلی کی حکومت پر قبضہ جمانے کے لئے اُبھارا تھا۔ چنانچہ محمود شاہ شرقی نے ایک ہزار ہاتھی اور ایک بہت بڑا لشکر لیکر دہلی پر اس نازک وقت میں حملہ کردیا۔ جب کہ بہلول لودھی دیبالپور میں تھا۔ اس حملہ کی تاب نہ لاکر بہلول لودھی کا بیٹا خواجہ بایزید اور لودھی خاندان کی عورتیں اور تمام افراد دہلی کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ چونکہ قلعہ میں مرد کم تھے۔ اس لئے عورتوں نے مردانہ لباس پہن کر قلعہ کے اندر سے محمود شاہ کا مقابلہ کیا۔ جب بہلول لودھی کو دیبالپور میں اس حملہ کا علم ہوا۔ تو وہ افغانوں کی ایک بڑی جمعیت فراہم کرکے دہلی کی طرف دوڑا۔ محمود شاہ کو جب علم ہوا۔ کہ بہلول لودھی ایک بڑے لشکر کے ساتھ دہلی کی جانب آرہا ہے تو اس نے سلطان بہلول لودھی کو راستہ ہی میں روکنے کے لئے پانی پت کی جانب ایک بہت بڑا لشکر بھیجدیا۔ مگر اس جنگ میں محمود شاہ کو شکست ہوگئی اور وہ جونپور واپس چلا گیا۔

محمود شاہ شرقی اور بہلول لودھی میں جنگ

کچھ روز کے بعد محمود شاہ شرقی اٹاوہ کے نواح میں بہلول لودھی کے ساتھ لڑنے کے لئے پھر آموجود ہوا۔ لیکن معمولی سی جھڑپ کے بعد دونوں میں صلح ہوگئی۔ اور محمود شاہ جونپور لوٹ گیا۔ لیکن چندہی روز کے بعد جب سلطان بہلول لودھی نے شمس آباد کا شہر اور قلعہ جونا خاں سے لیکر رائے کرن کو دیدیا تو محمود شاہ کو سخت ناگواری پیدا ہوئی اور وہ بہلول لودھی سے مقابلے کے لئے شمس آباد پہنچ گیا۔ دونوں لشکروں میں لڑائی چھڑ گئی۔

بہلول لودھی کا سالہ قطب خاں گرفتار ہوگیا۔ اسی لڑائی کے دوران میں محمود شاہ بیمار ہو کر مرگیا اور اس کا بیٹا محمد شاہ شرقی تخت پر بیٹھا۔

محمد شاہ کی ماں جو بے حد عقلمند عورت تھی اس نے دونوں لشکروں میں صلح کرادی۔ دونوں لشکر اپنی اپنی حکومتوں کو واپس لوٹ رہے تھے کہ سلطان بہلول کی ملکہ نے اپنے شوہر کو پیغام بھیجا کہ اگر میرے بھائی قطب خاں کو رہا کرائے بغیر دہلی واپس آؤ گے تو مجھ کو زندہ نہ پاؤ گے۔ سلطان نے اس پیغام کے پاتے ہی محمد شاہ سے لڑنے کے لئے اپنے لشکر کا رخ پھیر دیا۔ محمد شاہ کو جب اس کی خبر ملی تو وہ بھی سلطان کے مقابلہ کے لئے آگیا۔ اور پھر دوبارہ دونوں لشکروں کا مقابلہ پرگنہ راپری میں ہوا کئی دن تک جنگ ہوتی رہی لیکن بہلول لودھی کی خوش قسمتی سے محمد شاہ شرقی اور اس کے بھائیوں میں جونپور کے تخت کے لئے شکر رنجی شروع ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد شاہ شرقی نے اپنے بھائی حسن شاہ کو قتل کرادیا۔ اسکے علاوہ محمد شاہ شرقی کا دوسرا بھائی شہزادہ جلال لودھیوں کے ہاتھ پڑ کر گرفتار ہوگیا۔ اور محمد شاہ شرقی کا تیسرا بھائی شہزادہ حسین خاں تخت پر قبضہ جمانے کے لئے جونپور بھاگ گیا۔ اب محمد شاہ شرقی کو اپنی بادشاہت کی فکر ہوئی۔ غرضکہ وہ مورچہ کو ناتمام چھوڑ کر اور فوج ساتھ لیکر بھائی کے تعاقب میں دوڑا لیکن محمد شاہ شرقی جب جونپور پہنچا تو حسین خاں جونپور کا بادشاہ بن چکا تھا چنانچہ اس نے محمد شاہ شرقی کا کام تمام کردیا حسین خاں نے جونپور کے تخت پر بیٹھتے ہی سلطان بہلول لودھی سے تین سال کے لئے صلح کرلی قطب خاں کو رہا کر کے عزت کے ساتھ بھجدیا۔ اس کے جواب میں بہلول لودھی نے بھی حسین خاں کے بھائی شہزادہ جلال کو رہا کردیا۔

حسین شاہ اور بہلول لودھی کی لڑائیاں

جونپور کے نئے بادشاہ

حسین شاہ اور بہلول لودھی میں حسب وعدہ تین سال تک تو صلح رہی لیکن تین سال کے بعد ان دونوں میں پھر جنگ چھڑ گئی چنانچہ جس زمانہ میں کہ بہلول لودھی پنجاب اور ملتان کی بدنظمیوں کے دُور کرنے میں مصروف تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ حسین شاہ ایک بڑا لشکر لیکر دہلی کی جانب آرہا ہے۔ سلطان بہلول لودھی مقابلہ کے لئے فوج لیکر پنجاب سے دہلی کی جانب چلا اور موضع چندوار میں حسین شاہ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ سات دن لڑائی ہوتی رہی لیکن بعد میں تین سال کیلئے دوبارہ صلح ہوگئی۔ مگر تین سال گذرنے کے بعد ان دونوں میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ پہلے تو حسین شاہ نے اٹاوہ پر حملہ کیا۔ اسکے بعد اٹاوہ سے دہلی کی تسخیر کے لئے ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ ہوگیا لیکن اُمرائے سلطنت نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی مگر انکی لڑائیوں کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا چنانچہ ایک لڑائی دہلی کے قریب سنکرہ میں ہوئی جو صلح پر ختم ہوگئی۔

۸۸۳ھ میں حسین شاہ نے پھر دہلی پر حملہ کر دیا مگر ناکامی ہوئی اور بہلول لودھی نے آگے بڑھ کر حسین شاہ کے اکثر علاقے دبا لئے اسکے بعد تقریباً ہر لڑائی میں حسین شاہ کو بہلول لودھی کے مقابلے میں شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہلول لودھی نے سلطنت جونپور پر حملہ کر کے ۸۸۳ھ (۱۴۷۸ء) میں اسے فتح کر لیا۔ اور جونپور کی حکومت جو یوپی کے بیشتر حصہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ پھر زمانہ درا کے بعد حکومت دہلی کے ساتھ شامل ہوگئی۔ سلطان بہلول لودھی اور شاہ جونپور کی یہ لڑائیاں برابر ۲۶ سال تک جاری رہیں۔

بہلول لودھی کے بیٹوں میں حکومت کی تقسیم

جونپور کی فتح کے بعد بہلول لودھی کو خیال پیدا ہوا کہ سلطنت کو اپنے تمام بیٹوں اور عزیزوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ ان میں سے کوئی بھی حکومت سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ جونپور کا علاقہ

بڑے بیٹے شہزادہ باربک کو دیدیا۔ شہزادہ عالم خاں کو کڑہ مانک پور عطا کر دیا اور اپنے بھانجے شیخ محمد فرملی کو بہرائچ اور اپنے پوتے اعظم ہمایوں بن خواجہ بایزید کو لکھنؤ و کالپی اور خان جہاں جو معتمد اُمراء میں سے تھا۔ اس کو بدایوں عطا ہوا۔ اور شہزادہ نظام خاں (سکندر لودھی) کو دہلی اور دوآبہ کا بہت سا علاقہ دینے کے بعد اسے ولی عہد سلطنت مقرر کر دیا۔

سلطان کی صحت برابر کئی سال سے گرتی جا رہی تھی۔ چنانچہ ۸۹۴ھ (۱۴۸۸ء) میں جب وہ اٹاوہ سے دہلی آ رہا تھا۔ تو راستہ میں بیمار ہو گیا۔ اس موقعہ پر اُمرائے سلطنت نے سلطان پر زور دیا کہ وہ سکندر لودھی کی بجائے جو ایک سُنار ن کا لڑکا ہے۔ اپنے پوتے اعظم ہمایوں کو ولیعہد نامزد کر دے۔ بادشاہ جو اُمرائے سلطنت کے ہاتھوں میں تھا راضی ہو گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ بادشاہ اعظم ہمایوں کی ولیعہدی کا اعلان کرے۔ اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ چنانچہ ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء میں بھدالی کے قریب ضلع سکیت میں بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔

سلطان بہلول لودھی نے ۳۸ برس ۸ مہینے ۷ دن حکومت کی۔ جب وہ مرا ہے تو اس کی حکومت شمال میں جمنا سے کوہ ہمالیہ تک مشرق میں صوبہ بہار تک اور مغرب میں پنجاب اور ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔

بہلول لودھی ایک نہایت ہی فیاض طبع اور وسیع نظر بادشاہ تھا وہ شریعتِ اسلامیہ کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا سلوک برادرانہ تھا۔ چنانچہ رائے کرن اور ہندو اُمرا کو اس نے مسلمان اُمرا کے مقابلہ ہمیشہ ترجیح دی۔ اور ہندو اُمرا کو شاہانِ جونپور کی دستبرد سے بچانے کے لئے اس نے کئی لڑائیاں لڑیں اس نے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بادشاہ نہیں سمجھا۔ جب بعض اُمرائے سلطنت اس سے خفا ہو جاتے تھے تو وہ انکے

گھر جا کر ان کو منا لاتا تھا۔ پٹھان اُمرائے سلطنت جو زیادہ تر ہم وطن اور رشتہ دار تھے جب اس کے پاس آتے تھے تو وہ تخت چھوڑ کر ان کی برابر آن بیٹھتا تھا تاکہ چھوٹے بڑے کا امتیاز مٹ جائے۔ وہ بڑا ہی منکسر المزاج بادشاہ ہوا ہے۔ حتی المقدور لڑائی سے بچتا تھا لیکن جب لڑائی میں کود پڑتا تھا۔ تو دشمن کو شکست دئے بغیر کبھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں دہلی کی گرتی ہوئی حکومت کو سنبھالنے کے بعد اسے ایک مضبوط حکومت کی شکل دیدی تھی۔

سلطان سکندر لودھی

اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ اُمرائے سلطنت نظام خاں (سکندر لودھی) کی بجائے سلطان بہلول کے پوتے اعظم ہمایوں کو دہلی کے تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ نظام خاں (سکندر لودھی) کی ماں بی بی زیبا جو سُنار کی بیٹی تھی۔ سلطان کی موت کے وقت سلطان کے پاس ہی موجود تھی۔ اس نے یہ رنگ دیکھا تو فوراً اپنے بیٹے کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر جلد آؤ گے تو باپ کے تخت پر بیٹھ جاؤ گے۔ اور اگر دیر کرو گے تو رہ جاؤ گے۔ ماں کا پیغام پاتے ہی نظام خاں فوراً روانہ ہو گیا۔

سلطان کے مرنے کے بعد اُمرائے سلطنت تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے ایک گروہ تو وہ تھا جو نظام خاں (سکندر لودھی) کے حق میں تھا۔ کیونکہ بادشاہ اسے ولیعہد بنا چکا تھا۔ دوسرا گروہ بادشاہ کے بڑے بیٹے باربک شاہ کا حامی تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ پٹھانوں کے تخت پر ایک معمولی سُنار کی لڑکی کا بیٹا یعنی سکندر لودھی نہیں بیٹھ سکتا۔ اس تخت پر تو باربک شاہ ہی بیٹھے گا جو ایک معزز پٹھانی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ اُمرا کا تیسرا گروہ بہلول لودھی کے پوتے اعظم ہمایوں کے حق میں تھا۔ غرضکہ اُمرائے سلطنت میں یہ رسہ کشی جاری ہی تھی کہ نظام خاں (سکندر لودھی) پہنچ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی اس کے حامی اُمرا کی طاقت بڑھ گئی اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ نظام خاں ہی دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ چنانچہ جمعہ کے دن ۷ شعبان ۸۹۴ھ (۱۴۸۸ء) کو کالی ندی کے کنارے نظام خاں کی تخت نشینی کی رسم انجام دی گئی۔ نظام خاں نے سکندر لودھی کے خطاب کے ساتھ اپنے دورِ حکومت کی ابتدا کی سکندر لودھی جب تخت پر بیٹھا تو اس کی

عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔

سکندر لودھی کی جنگی سرگرمیاں

سکندر لودھی ایک لائق سپہ سالار تھا جس نے تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی ایک طرف تو ملک کی اندرونی بغاوتوں کو دبا دیا اور دوسری جانب نئی فتوحات سے اپنے ملک کو ترقی دی۔ سکندر لودھی کو اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں سب سے زیادہ اپنے بھائیوں کی مخالفت اور فوجی یورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ۸۹۵ھ (۱۴۸۹ء) میں اس کو اپنے بھائی باربک شاہ سے جو شاہ جونپور بن چکا تھا۔ جنگ کرنی پڑی۔ اس جنگ میں باربک شاہ کو شکست ہوئی اور جونپور کی حکومت بھی دہلی کے ساتھ ملحق ہو گئی۔ لیکن سلطان نے اپنے بھائی باربک شاہ کو بدستور جونپور کا حاکم رہنے دیا۔ صرف فرق اتنا ہو گیا کہ اب باربک شاہ سلطان کا مطیع بن گیا۔ اسکے بعد سکندر لودھی نے اپنے ان دوسرے بھائیوں اور عزیزوں کو اطاعت کے لئے مجبور کیا۔ جو بہلول لودھی کی سلطنت کے بعض حصوں پر خود مختارانہ حیثیت سے قابض ہو گئے تھے۔ سکندر لودھی نے بیانہ اور بیدر پر حملہ کر کے ان کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ سلطان حسین شرقی سے بھی سکندر لودھی کی کئی لڑائیاں ہوئیں جنمیں کہ شرقی کو شکست ہوئی۔ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں سلطان بیمار رہا۔ اور ۷ ذیقعد ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) کو آگرہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے دہلی کے تخت پر ۸ سال اور ۵ مہینے حکومت کی۔

سکندر لودھی کی زندگی پر ایک نظر

سکندر لودھی کی سب سے بڑی یادگار شہر آگرہ ہے جسکی بُنیاد اس بادشاہ نے ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں رکھی تھی۔ آگرہ کی تعمیر کے لئے جمنا کے کنارے دو برابر کے ٹیلوں میں سے ایک اونچا ٹیلہ تجویز کیا گیا تھا۔ جب بادشاہ

اس ٹیلے کو دیکھنے گیا اور اس نے تعمیرات کے مہتمم سے پوچھا کہ شہر کی تعمیر کے لیے کونسا ٹیلہ تجویز کیا گیا ہے تو اس نے کہا کہ "آگرا" یعنی اگلا۔ سلطان نے کہا کہ اس شہر کا نام بھی "آگرا" ہی رکھا جائے۔ یہ ہے اس شہر کے نام کی وجہ تسمیہ۔

سکندر لودھی جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے گناہوں کے کفارے کے لئے سیکڑوں من سونا علما اور غربا میں تقسیم کرایا۔ وہ عاقبت کے خوف سے بے حد ڈرتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ کو عاقبت میں شراب نوشی اور ان گناہوں کی سزا ضرور بھگتنی ہوگی جو میں نے اپنی بادشاہی کے زمانہ میں کئے ہیں یہ بادشاہ عدل و انصاف کا بیحد دلدادہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا کے کسی فرد کے ساتھ بھی ناانصافی نہ ہو وہ اُمرائے سلطنت کا سچا دوست تھا۔ اور ان کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا تھا۔ باپ کی طرح اسمیں بھی انکسار کی خوبی نمایاں تھی۔ مساکین اور غربا کی امداد کے لئے اس نے ایک خاص محکمہ قائم رکھا تھا جس سے محتاجوں کو ہر قسم کی مالی امداد دی جاتی تھی۔ وہ مساجد بنانے کا بے حد شایق تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار مسجدیں تعمیر کرائیں۔

وہ توہمات اور بدعتوں کا شدید مخالف تھا۔ اس نے سالارِ مسعود کی چھڑیاں حکماً بند کر دی تھیں۔ تعزیہ داری کا بھی وہ مخالف تھا۔ اور اس نے عورتوں کی مزارات پر حاضری کو ممنوع قرار دیدیا تھا۔ سکندر لودھی نے ان ہندوؤں کو بھی سنگین سزائیں دیں جو اس کے دورِ حکومت میں شدھی کی تحریک لیکر اُٹھے تھے۔

سکندر کے دور میں ہندوؤں نے فارسی پڑھنی شروع کی

سلطان سکندر ہی وہ مسلمان بادشاہ ہے جس کے عہد حکومت میں ہندوؤں نے فارسی پڑھنا شروع کی اسی بادشاہ کے زمانہ میں سنسکرت کی کتابوں کے تراجم فارسی زبان میں کئے گئے۔ سکندر لودھی کی خواہش

تھی کہ سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی اہم عہدے دئے جائیں لیکن ہندو کیونکہ فارسی زبان سے ناآشنا تھے۔ اس لیئے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی آخراس نے ہندوؤں کے نمائندوں کو بلاکر زور دیا کہ وہ فارسی پڑھیں برہمنوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم کو دھرم کرم کے کام سے فرصت نہیں چھتریوں نے کہا کہ ہم سپاہی ہیں ہم کو علم وفن سے کیا غرض۔ ویشیوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی تجارت کے کاموں میں اس قدر منہمک ہیں کہ ادہر توجہ ہی نہیں کر سکتے۔ صرف کایت یعنی کایست جو پہلے سے سنسکرت کی کتابت کا علمی کام کرتے تھے۔ فارسی پڑھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ کایستوں میں عربی فارسی کے بہت بڑے بڑے علما ہوئے ہیں اور ان کو اپنی فارسی دانی کی بنا پر اسلامی حکومتوں میں بڑا عروج حاصل ہوا ہے۔ سکندر فن طب کا بھی بہت بڑا سرپرست تھا۔ اس نے ہندوستان اور یونان کے لائق اطبا سے "طب سکندری" کے نام سے ایک کتاب مرتب کرائی تھی جو فن طب میں ایک نہایت ہی مستند تالیف شمار کی جاتی تھی۔

سلطان ابراہیم لودھی

آگرہ میں سلطان سکندر لودھی کے انتقال کے بعد اُمرائے سلطنت اور افغانوں نے یہ طے کیا کہ سکندر لودھی کی حکومت کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی بڑا بیٹا ابراہیم لودھی دہلی کے تخت پر بیٹھے اور جونپور کی حکومت ابراہیم لودھی کے بھائی جلال خاں کی سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق ۷ ذی الحجہ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) کو سلطان ابراہیم لودھی کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ آگرہ میں تخت نشین کیا گیا۔ اور اس کے بعد اُمرائے سلطنت نے ابراہیم لودھی کے بھائی جلال خاں کو سلطان جلال الدین کا خطاب دیکر ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ جونپور روانہ کر دیا۔ تاکہ وہ جونپور پہنچنے کے بعد وہاں کی مسندِ حکومت کو سنبھالے۔ یعنی وہ اُمرائے سلطنت جو ابراہیم لودھی سے خوش نہیں تھے۔ انھوں نے اس طرح نہایت ہوشیاری کے ساتھ حکومت کے دو ٹکڑے کر کے ابراہیم لودھی کی طاقت کو ابتدا ہی میں تقسیم کر دیا۔

ابراہیم لودھی کی بھائی کے خلاف سازشیں سلطنت کی یہ تقسیم اگرچہ ابراہیم لودھی کو ناپسند تھی لیکن ابتدا میں اس نے اس لئے مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں اُمرائے سلطنت اور افغان سردار اسے ایک سرے ہی سے حکومت سے محروم کر کے جلال الدین کو دہلی کے تخت پر نہ بٹھا دیں لیکن جُوں ہی وہ تخت نشین ہو گیا۔ اس نے ایک منٹ ضائع کئے بغیر اپنے بھائی جلال الدین کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور نہایت ہی ہوشیاری سے اُمرائے جونپور کو

اپنے ساتھ ملانے کے بعد ان سب کو جلال الدین کی مخالفت کے لئے کھڑا کر دیا۔
چنانچہ اُمرائے جونپور کھلم کھلا جلال الدین کے خلاف آمادۂ پیکار ہو گئے۔ جلال الدین
نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے سب سے پہلے تو سلطنت جونپور کی خود مختاری کا اعلان
کیا۔ اس کے بعد اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کرایا۔ اور پھر اپنے ساتھ اعظم
ہمایوں کو ملا کر یہ طے کیا کہ پہلے تو جونپور کے ان اُمرائے سلطنت کو کچلا جائے۔
جو سلطان ابراہیم لودھی کے حامی ہیں اور اس کے بعد آگرہ کی جانب رُخ کیا جائے۔
سلطان ابراہیم لودھی کو جب اپنے بھائی جلال الدین کے ان ارادوں کا
علم ہوا تو وہ ایک بڑا لشکر لیکر قنوج جا پہنچا۔ ابراہیم لودھی کی خوش قسمتی سے اعظم
ہمایوں جلال الدین سے برگشتہ ہو کر ابراہیم لودھی کے پاس چلا آیا جس سے کہ سلطان کی
طاقت اور بھی بڑھ گئی۔ سلطانی لشکر نے سب سے پہلے کالپی پر حملہ کر کے اسے فتح کیا ادھر
جلال الدین ایک بڑا لشکر لیکر آگرہ کی طرف بڑھا لیکن سلطانی لشکر سے مقابلے کی ہمت
نہ ہوئی۔ اور نہایت ہی ذلت آمیز شرائط کے ساتھ سلطانی لشکر کے سپہ سالار ملک
آدم سے صلح کر لی۔ اور واپس لوٹ گیا جب اس صلح کا علم ابراہیم لودھی کو ہوا۔ تو
اس نے اس صلح کو تسلیم نہیں کیا۔ اور جلال الدین کے مقابلہ کے لئے خود بڑھا لیکن
جلال الدین نے بھاگ کر راجہ گوالیار کے پاس پناہ لیلی۔ ابراہیم لودھی نے
گوالیار پر بھی حملہ کر دیا۔ گوالیار فتح ہو گیا اور جلال الدین گرفتار ہونے کے بعد
قید ہوا۔ اور قید خانے میں اسے قتل کرا دیا گیا۔ جلال الدین کے علاوہ ابراہیم
لودھی نے اپنے دوسرے بھائیوں یعنی اسمٰعیل خاں حسین خاں۔ محمود خاں اور
دولت خاں کو اس سے قبل ہی ہانسی کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ غرضکہ اسی
طرح ابراہیم لودھی کا کوئی مدِ مقابل میدان میں باقی نہیں رہا۔

ابراہیم لودھی کی رعونت اور غرور | باپ کی پوری سلطنت پر قابض

ہونے کے بعد ابراہیم لودھی کی رعونت اور غرور میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ افغان سرداروں کے ساتھ اس نے ادنیٰ نوکروں جیسا سلوک کرنا شروع کردیا۔ وہ افغان امیر جو بہلول لودھی اور سکندر لودھی کی مجلس میں ان بادشاہوں کی برابر بیٹھتے تھے۔ ان کو حکم ہوا کہ وہ دربار میں دست بستہ کھڑے ہوا کریں سکندر لودھی کے زمانہ کے جو اُمرائے سلطنت تھے ان کو ایک مکان میں دھوکے سے بُلا کر بارود سے اُڑا دیا گیا۔ اعظم ہمایوں جس کی وجہ سے ابراہیم لودھی کو جلال الدین پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اسے دہلی بلا کر پہلے تو قید کردیا۔ پھر قتل کرا دیا۔

بادشاہ کی ان ظالمانہ حرکتوں کی بدولت وہ افغان جن کے بل پر بہلول لودھی نے ہندوستان میں لودھی خاندان کی بُنیاد رکھی تھی سب کے سب ابراہیم لودھی کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے اور انھوں نے سلطان کے خلاف بغاوتیں شروع کردیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود افغان ہی اپنے دوسرے افغان بھائیوں کا خون بہانے لگے۔ بعض افغان سرداروں نے سلطان کے دشمن رانا سنگا والئی چتوڑ سے بھی ساز باز کرلی رانا سنگا نے افغانوں کی حمایت حاصل ہونے کے بعد سلطانی لشکر پر چڑھائی شروع کردی۔ پہلے تو سلطانی لشکر کو شکست ہوئی مگر بعد سلطانی لشکر رانا سنگا کی فوج پر غالب آگیا۔ رانا سنگا کو بُری طرح شکست ہوئی۔ اور وہ میدان سے فرار ہوگیا۔

اسی دوران میں بادشاہ کو اطلاع ملی کہ بہادر خاں نے بہار میں بغاوت برپا کردی ہے۔ بادشاہ نے ہر چند اس بغاوت کو دبانا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی اور صوبہ بہار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت

اُمرائے سلطنت پر سلطان کے مظالم انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ جن اُمرا سے

بادشاہ ناراض ہو جاتا تھا۔ ان کو قید کر کے طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا تھا۔
چنانچہ بادشاہ دولت خاں لودھی حاکم پنجاب سے بھی ناراض ہو گیا اور اسکے بیٹے
دلاور خاں سے کہا کہ اگر تیرا باپ میرے پاس فوراً دہلی نہ پہنچ گیا تو اس کا بھی
وہی انجام ہو گا جو دوسرے اُمرائے سلطنت کا ہوا ہے۔ دلاور خاں کسی طرح
دہلی سے بھاگ کر باپ کے پاس پنجاب پہنچ گیا اور بادشاہ کے مظالم کے
تمام واقعات بیان کرنیکے بعد باپ سے کہا کہ اپنی حفاظت کا انتظام کرو ورنہ بادشاہ
کے ہاتھوں بڑی ذلت کے ساتھ مارے جاؤ گے۔ دولت خاں لودھی کیلئے اب
اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ ابراہیم لودھی کے خلاف علم بغاوت
بلند کر دے چنانچہ بادشاہ کے خلاف اس نے پنجاب میں بغاوت برپا کر دی اور اپنے
بیٹے دلاور خاں کو کابل بھیجنے کے بعد ظہیر الدین بابر شاہ سے التجا کی کہ وہ ہندوستان
پر حملہ کر کے ہندوستان کے باشندوں کو ابراہیم لودھی کے مظالم سے نجات دلائیے۔

بعض موزخوں کا بیان ہے کہ صرف دولت خاں لودھی ہی نے بابر کو
ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت نہیں دی تھی بلکہ ابراہیم لودھی کا چچازاد بھائی
عالم خاں جس کو علاالدین بھی کہتے ہیں وہ بھی اس حملہ کا بہت بڑا محرک تھا بیان
کیا جاتا ہے کہ یہ ابراہیم لودھی کی قید سے بھاگ کر بابر کے پاس پہنچ گیا۔ اور اس
نے بابر کو بتایا کہ "ابراہیم لودھی کے مظالم حد سے بڑھ چکے ہیں۔ اس نے تیئس اُمرا
سلطنت کو بلاوجہ قتل کرا دیا ہے۔ اور اُن کے خاندانوں کو تباہ کر ڈالا ہے۔ اس
بادشاہ کی حالت یہ ہے کہ یہ امیروں کو لٹکا دیتا ہے اور ان کو زندہ جلا دیتا ہے۔
ان مظالم سے تنگ آ کر اُمرائے سلطنت نے مجھ کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ سب
آپ کی تشریف آوری کے منتظر بیٹھے ہیں۔"

حاکم پنجاب دولت خاں اور ابراہیم لودھی کے چچازاد بھائی علاالدین کے

علاوہ چتوڑ کے راجہ رانا سنگا نے بھی بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی اور بابر کو یقین دلایا تھا کہ اگر بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ فوج اور روپے سے اس حملہ میں بابر کی زیادہ سے زیادہ امداد کریگا۔ رانا سنگا نے یہ بھی یقین دلایا تھا کہ ہندوستان کا ہر راجپوت بچہ اس معرکہ میں بابر کے ساتھ اپنی جان قربان کرنے کے لئے آمادہ اور تیار رہے۔

بابر کا ہندوستان پر حملہ

بابر جو پہلے ہی سے ہندوستان کی فتح کا جذبہ اپنے دل میں لئے ہوئے تھا۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ہندوستان پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہندوستان پر حملہ آور ہوتے سے قبل علاالدین (عالم خاں) کے ساتھ اپنے سرداروں کو لشکر لیکر روانہ کر دیا تاکہ وہ پہلے ہی سے ہندوستان کی تسخیر کا کام شروع کر دیں چنانچہ یہ لشکر امرائے سلطنت کو تابع بناتا ہوا لاہور جا پہنچا اور اس کے بعد دولت خاں لودھی اور علاالدین نے دہلی پر حملہ کے لئے اہتمام شروع کر دیا۔ لیکن مغل لشکر بابر کے آنے سے قبل دہلی کی فتح کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ آخر علاءالدین مغل لشکر سے علحدہ ہو کر خود ہی دہلی پر حملے کے لئے بڑھا ابراہیم لودھی بھی مقابلے پر آ گیا۔ دہلی سے چھ میل کے فاصلہ پر ان دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ لیکن اس معرکہ میں علاالدین کو شکست ہوئی اور وہ پنجاب بھاگ گیا۔

اسی دوران میں بابر بھی مزید لشکر کے ساتھ ہندوستان پہنچ چکا تھا چنانچہ ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں وہ خود ابراہیم لودھی کے مقابلہ کے لئے لشکر لیکر پانی پت کے میدان میں آ ڈٹا۔ دونوں لشکروں میں زبردست معرکہ ہوا۔ اس معرکہ میں بابر کو فتح نصیب ہوئی اور سلطان ابراہیم لودھی مارا گیا اور اس طرح بابر کے ہاتھوں اس لودھی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جسکی بنیاد بہلول لودھی

نے رکھی تھی۔ ابراہیم لودھی نے ہندوستان میں بیس سال حکومت کی۔ اور شاید خاندان لودھی کی حکومت کا چراغ ابھی گل نہ ہوتا اگر اس خاندان میں ابراہیم لودھی جیسا ظالم مغرور اور نا عاقبت اندیش بادشاہ پیدا نہ ہوا ہوتا۔

لودھیوں کی حکومت پر ایک نظر

لودھی خاندان نے ہندوستان پر تقریباً ۶۸ سال حکومت کی ہے، اس خاندان کا پہلا بادشاہ بہلول لودھی تھا جس کی تقریباً ساری عمر شاہانِ جونپور سے لڑنے میں گذری۔ جونپور کی فتح کے بعد بہلول لودھی کی حکومت ایک مضبوط حکومت بن گئی تھی جس کو اس خاندان کے دوسرے بادشاہ سکندر لودھی نے اور بھی زیادہ وسیع کر لیا تھا۔ بہلول لودھی اور سکندر لودھی نہایت ہی نیک دل اور منکسر المزاج بادشاہ تھے۔ جنہوں نے اپنے ہم قوم افغانوں کی خوب سرپرستی کی اور ان افغانوں کے بل پر برابر ترقی کرتے رہے لیکن اس خاندان کے آخری بادشاہ ابراہیم لودھی نے اپنی رعونت اور ظالمانہ کارروائیوں سے خود اپنی ہی قوم کو یعنی افغانوں کو اپنا دشمن بنا لیا چنانچہ ان افغانوں نے مغلوں کو ہندوستان آنیکی دعوت دیکر ہمیشہ کے لئے لودھی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کرا دیا۔

شاہانِ لودھی کے دورِ حکومت کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ سلطان بہلول لودھی کے زمانہ سے لیکر ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت تک ضروریاتِ زندگی نہایت ہی ارزاں تھیں۔ اناج ایک روپیہ کا دس من ملتا تھا۔ گھی روپے کا پانچ سیر تھا اور کپڑا چھ پیسے گز تھا۔ ان چیزوں کے علاوہ دیگر اشیاء کی ارزانی کا بھی یہی حال تھا۔ رعایا خوش حال اور فارغ البال تھی۔ مورخوں کی رائے ہے کہ اگر اس خاندان میں ابراہیم لودھی جیسا ظالم اور نا عاقبت اندیش بادشاہ نہ پیدا ہوتا تو لودھی حکومت جس سے کہ رعایا بے حد خوش تھی۔ شائد کئی صدی

تک قائم رہتی لیکن ابراہیم لودھی کی بے عقلیوں نے ان مغلوں کو ہندوستان میں اپنی حکومت جمانے کا موقعہ دیدیا۔ جو قطب الدین ایبک کے زمانے سے لیکر تیمور کے حملے تک بار بار ہندوستان پر حملے کر کے لوٹ مار کرتے رہے تھے

بارھواں باب

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا پہلا دور

۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء تا ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء

مغلیہ حکومت کا پہلا دور

ظہیر الدین بابر نے ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے بعد ہندوستان سے ان بہادر پٹھانوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جو ہندوستان میں صدیوں سے فرمانروائی کر رہے تھے اور جنہوں نے کسی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی اپنے مقابلہ پر جمنے نہیں دیا تھا ظہیر الدین بابر کی اس تاریخی فتح کے بعد سے ہندوستان میں ان روسی ترکوں کی حکومت کا دور شروع ہو گیا جو مغلوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ حالانکہ ظہیر الدین بابر اور اسکی اولاد مغل سے کہیں زیادہ ترک کہلانے کی مستحق تھی۔ کیونکہ ظہیر الدین بابر دوھیال کی طرف سے روسی ترک تھا اور ننھیال کی طرف سے مغل تھا۔ لیکن شاید ان روسی ترکوں کو اس لئے مغل کہا گیا کیونکہ صدیوں سے ان میں آپس میں شتے ہونے کے بعد ان کا خون مخلوط ہو چکا تھا۔

ظہیر الدین بابر کی ابتدائی زندگی

قبل اس کے کہ ہم ظہیر الدین بابر کی فتوحات پر روشنی ڈالیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حوصلہ مند اور مصیبتوں سے نہ گھبرانے والے سپاہی کی ابتدائی زندگی کے کچھ حالات پیش کر دیں۔ تاکہ ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس لائق سپہ سالار نے کتنی مصیبتوں اور ٹھوکروں کے بعد ہندوستان کا تخت حاصل کیا تھا۔

ظہیر الدین بابر کا باپ عمر شیخ مرزا امیر تیمور کا پوتا تھا۔ امیر تیمور کے مرنے کے بعد کیونکہ اسکی وسیع سلطنت اسکے بے شمار بیٹوں اور پوتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

اس لئے بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کو صرف فرغانہ کی چھوٹی سی حکومت مل سکی۔ جس کا پایۂ تخت اندجان تھا۔ اور جسمیں تاشقند۔ شاہرخیہ۔ بیر دم۔ احسنی کاشان۔ اور چند دوسرے چھوٹے چھوٹے علاقے شامل تھے اور یہ علاقے بھی محفوظ نہ تھے کیونکہ آئے دن امیر تیمور کی اولاد میں آپسمیں ملک گیری کے لئے جنگ ہوتی رہتی تھی۔

بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کی عمر ۳۵ سال کی تھی کہ وہ اچانک ایک بلند عمارت سے گر کر مر گیا۔ اسکے مرنیکے بعد ۸۹۹ھ (۱۴۹۳ء) میں ظہیر الدین بابر بارہ برس کی عمر میں بمقام اندجان حکومت فرغانہ کے تخت پر بیٹھا، ابھی اسے تخت پر بیٹھے دیر نہیں ہوئی تھی کہ معلوم ہوا کہ بابر کے چچا سلطان احمد میرزا نے حکومتِ فرغانہ پر فوج کشی کر دی ہے۔ اور اکثر مقامات کو فتح کرنے کے بعد چچا کی فوجیں دارالسلطنت اندجان کی جانب بڑھ رہی ہیں لیکن بابر کی خوش قسمتی کہ اس کے چچا کی فوج میں بیماری پھیل گئی اور چچا کو بھتیجے سے صلح کرنیکے بعد سمرقندی واپس جانا پڑا سمرقند جاتے ہوئے سلطان مرزا راستہ ہی میں فوت ہو گیا، بابر کو ابھی اس مصیبت سے بمشکل نجات ملی تھی کہ معلوم ہوا کہ بابر کے ماموں محمود خاں نے احسنی کے علاقہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اور کاشان پر قبضہ جما لیا ہے لیکن محمود خاں چونکہ قلعہ احسنی کو فتح نہ کر سکا۔ اس لئے وہ بھی واپس چلا گیا۔

بابر کو چچا اور ماموں سے فرصت ملی تو عمال حکومت نے بغاوتیں شروع کر دیں، بابر نے باغیوں کو شکست دیدی اور ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں اپنے چچا کے علاقہ پر حملہ کر کے سمرقند کو بھی فتح کر لیا لیکن بابر نے چونکہ سمرقند کی فتح کے بعد فوج کو شہر لوٹنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اسلئے فوج بگڑ کر گھروں کو واپس چلی گئی۔ اسی دوران میں سمرقند میں بابر بیمار ہو گیا۔ اور اسے مجبوراً سمرقند

چھوڑ کر اندجان کے لئے روانہ ہونا پڑا۔لیکن اسے راستہ میں معلوم ہوا کہ اسکے بھائی جہانگیر خاں نے اسکی غیر موجودگی میں فرغانہ کی حکومت پر قبضہ جما لیا ہے اور اندجان کا محاصرہ کر رکھا ہے یعنی بابر کو سمرقند بھی چھوڑنا پڑا، اور اپنی حکومت بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ صرف ڈیڑھ سو سپاہی اس کے پاس رہ گئے۔ غرضکہ بابر بے یار و مددگار رہ گیا۔

بابر ٹھوکریں کھاتا ہوا اپنے ماموں کے پاس خجند چلا گیا جہاں اسکی ماں اور نانی بھی اندجان سے جان بچاکر پہنچ گئی تھیں۔ چند روز تو وہ اپنے عزیزوں میں رہا لیکن اسکے بعد پھر قسمت آزمائی کے لئے وہ نکل کھڑا ہوا۔ اور انتہائی بے سروسامانی کے باوجود محض اپنی فطری شجاعت کی بنا پر فرغانہ کے علاقہ مرغینان پر قبضہ جما لیا۔ فرغانہ کی رعایا چونکہ بابر کے بھائی جہانگیر مرزا اور اس کے ساتھی اوزون حسن اور احمد تنبل کے ظلم و ستم سے بیزار تھی۔ اس لئے جب اس نے بابر کے آنے کی خبر سُنی تو بابر کی ساتھی ہو گئی۔ رعایا کی امداد سے بابر نے دوبارہ فرغانہ کی حکومت حاصل کر لی لیکن بابر مغل سپاہیوں سے بدظن تھا۔ جب اس نے چاہا کہ مغلوں کو فرغانہ سے نکال دے تو پانچ ہزار مغل سپاہیوں نے بغاوت برپا کرا دی۔ سخت خونریزی ہوئی اور بابر کی حکومت پھر اسکے ہاتھ سے نکل کر اسکے بھائی جہانگیر اور احمد تنبل کے قبضہ میں چلی گئی۔

بابر نے اب بھی ہمت نہیں ہاری اس نے صرف ڈھائی سو سپاہیوں کی مدد سے سمرقند کا قلعہ فتح کر لیا لیکن جب شیبان خان نے سمرقند پر حملہ کیا تو بابر اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور گرفتار کر لیا گیا۔ آخر بابر کو اس شرط پر رہائی ملی کہ وہ اپنی بہن خانزادہ بیگم کا شیبان خاں سے نکاح کر دے اور اپنی جان بچا کر جدھر سینگ سمائے نکل جائے۔ بابر سمرقند اور اپنی بہن کو ہاتھ سے کھونے کے بعد

آدھی رات کو سمرقند سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ نہ اسکے پاس کھانے کو تھا۔ نہ بدن پر کپڑا تھا۔ اور نہ پاؤں میں جوتی۔ مدتوں برہنہ پا رہنے سے بابر کو ننگے پاؤں پھرنے کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ وہ پہاڑیوں اور پتھروں پر بلا تکلف سیکڑوں میل برہنہ پا سفر کر لیتا تھا۔ ان مصائب کے باوجود بابر نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے پھر ایک بار محض اپنی جرات کی بنا پر فرغانہ کے بعض علاقوں کو فتح کر لیا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ فوج نہیں تھی۔ اس لئے ان علاقوں کو بھی چھوڑنا پڑا۔ اور وہ پھر جنگلوں کی خاک اڑانے لگا۔ کبھی کبھی تو حالت یہ ہوتی تھی کہ بابر اپنی بے بسی پر بے اختیار رو پڑتا تھا۔

بابر کا بلخ اور کابل پر قبضہ

بابر جس زمانہ میں حیران و پریشان پھر رہا تھا۔ تو اس کے بعض ہمدردوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ترکستان کو خیرباد کہہ کر افغانستان میں قسمت آزمائی کرے۔ چنانچہ بابر بلخ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جہاں بابر کے چچا کا ایک دوست خسرو شاہ فرمانروائی کر رہا تھا۔ خسرو شاہ ایک ظالم بادشاہ تھا۔ رعایا اور فوج اس سے متنفر تھی۔ جونہی بلخ والوں کو معلوم ہوا کہ بابر آیا ہوا ہے۔ بلخ کے امراء اور بلخ کی آٹھ ہزار فوج بابر کے ساتھ آن ملی۔ بابر کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ بابر نے بلخ پر قبضہ جما لیا۔ اور خسرو شاہ بھاگ گیا۔ وہی بابر جس کے پاس جوتی تک نہ تھی۔ اب اسے فوج قلعہ اور حکومت سب کچھ مل گیا۔

بلخ کا انتظام مکمل کرنے کے بعد بلخ کی فوج لیکر بابر کابل پر حملہ آور ہوا کابل میں الغ خاں کی نالائقی سے بڑی بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ بابر کو کابل پر فتح حاصل ہو گئی غرضکہ محض اپنی ہمت اور شجاعت کے بل پر بابر نے افغانستان میں اپنی ایک نئی حکومت قائم کر لی۔

کابل اور بلخ کی حکومت ملنے کے باوجود بھی بابر کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بابر کی شامت جو آئی تو وہ اپنے مخالفوں سے انتقام لینے کے لئے پھر ترکستان چلا گیا۔ بابر کے ترکستان جانے کے بعد افواہ پھیل گئی کہ بابر مر گیا۔ بس پھر کیا تھا بابر کے ایک رشتہ کے بھائی نے کابل پر قبضہ جما لیا۔ بلخ بھی بابر کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب بابر حیران و پریشان تھا کہ کیا کرے۔ کبھی وہ ہندوستان پر حملہ کا ارادہ کرتا تھا۔ اور کبھی کابل کی تسخیر کیلئے سوچتا تھا۔ آخر ۱۴ ۱۹ ھ (۱۵۰۸ء) میں اس نے مٹھی بھر سپاہیوں کے ذریعہ محض اپنی فطری جرأت کی بنا پر کابل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور اپنی طاقت بڑھانے کے بعد ایرانیوں سے مدد لیکر بابر نے پھر ایک بار سمرقند فتح کر لیا۔ بابر نے صرف آٹھ مہینے حکومت کی تھی کہ ازبکوں نے حملہ کر کے اسے پھر سمرقند سے نکال دیا۔ بیچارہ بابر پریشان حال کابل پہنچا۔ یہ غنیمت تھا کہ ابھی تک کابل اس کے قبضہ میں تھا۔ لیکن کابل میں افغانی اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ بابر نے انکی اچھی طرح سے سرکوبی کی اور یہ سمجھتے ہوئے کہ افغانستان میں حکومت کا مستحکم ہونا دشوار ہے بابر نے خواجہ جہاں کو کابل میں چھوڑا اور خود ہندوستان کی جانب متوجہ ہوا۔

بابر کا ہندوستان پر حملہ بابر جس کو وطن سے نکالا جا چکا تھا۔ اور کابل میں بھی جس کی حکومت متزلزل تھی۔ اسکے پاس نہ فوج کے لئے روپیہ تھا۔ اور نہ خوراک کے لئے غلہ ایسی حالت میں بابر کیلئے اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بعد فوج کا پیٹ بھرنے کا کوئی بندوبست کرے۔ بابر کے ساتھیوں نے اگرچہ لاکھ سمجھایا کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں ہندوستان جیسے وسیع ملک پر حملہ کرنا مناسب نہیں لیکن بابر نہ مانا وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی فوج کو جمع کر کے ۹۲۵ھ

۱۵۱۹ء) میں ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ اور دریائے سندھ تک جا پہنچا
بابر کو اس حملے میں اس لئے کوئی خاص پریشانی اُٹھانی نہیں پڑی۔ کیونکہ ابھی
تک سندھ ملتان اور پنجاب میں امیر تیمور کے عمال موجود تھے۔ ان میں سے
بعض تو لودھی خاندان کے مطیع ہو گئے تھے۔ اور بعض ابھی تک تیموری خاندان
کی نمک خواری کا دم بھرتے تھے۔ حالانکہ وہ پٹھان بادشاہوں کے ملازم تھے۔
اس کے علاوہ بعض تیموری عمال چھوٹے چھوٹے علاقوں میں خود مختار بن بیٹھے
تھے۔ غرضکہ بابر جدھر بھی گیا۔ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کو روپیہ بھی ملا اور
خوب خاطر و مدارات بھی ہوئی۔

بابر عیش کرتا ہوا اور شراب و معجون سے دل بہلاتا ہوا برابر آگے بڑھتا
چلا گیا۔ وہ کلدہ کہار پہنچا۔ پھر بہرہ آیا۔ اسی زمانہ میں بابر کو کابل سے اطلاع ملی
کہ اس کو خدا نے ایک فرزند عطا کیا ہے۔ بابر نے ہند کی رعایت سے اس
لڑکے کا نام مرزا ہندال رکھا۔ اس کے بعد بابر نے جاٹوں گوجروں اور
گکھڑوں کی خوب سرکوبی کی۔ اسی زمانہ میں بابر بیمار ہو گیا۔ اور ہندوستان سے
ہی بدخشاں واپس چلا گیا۔ اس حملہ کے بعد بابر متعدد بار ہندوستان پر تھوڑی تھوڑی
مدت کے بعد حملے کرتا رہا لیکن بابر نے اپنے ان حملوں میں لوٹ مار قطعی نہیں کی
بلکہ اس نے صرف نذرانوں اور محصولوں پر اکتفا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے
دادا تیمور کی طرح ہندوستان کو لوٹنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ وہ ہندوستان میں
اپنی مستقل حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ بابر کے اس رویہ کا ہندوستان
کے عوام پر بہت اچھا اثر پڑا۔ بابر نے چار مرتبہ ہندوستان پر یورش کی اور
ہر مرتبہ ہندوستان میں اس کی خوب خاطر و مدارات ہوئی۔

بابر کی ہندوستان میں فاتحانہ پیش قدمی

بابر جو اپنے سابقہ چار

حملوں میں ہندوستان میں اپنی حکومت کے لئے زمین تیار کر چکا تھا جب اس کو حاکم پنجاب دولت خاں - ابراہیم لودھی کے بھائی علاء الدین اور چتوڑ کے راجہ رانا سنگا کی جانب سے ہندوستان آنے کا بلاوا ملا تو وہ فوراً ہندوستان کی فتح کیلئے ۹۳۲ھ (۱۵۲۵ء) میں روانہ ہو گیا۔ لیکن اتنے بڑے ملک کی فتح کے لئے اسکے پاس جو لشکر تھا۔ اس کی مجموعی تعداد بمشکل سے دس بارہ ہزار تھی۔

بابر پشاور سے ہوتا ہوا دریائے سندھ پر آیا۔ سندھ سے روانہ ہونے کے بعد کوہ جود پر پہنچا۔ یہاں غلہ جمع کرنے کے بعد جہلم کو عبور کیا۔ لاہور اور پنجاب کے عمال کو ہموار کرنے کے لئے اس نے پہلے تو قاصد روانہ کئے۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دریائے چناب کے کنارے خیمے ڈال کر محفل عیش آراستہ کی اور ایک دن کے آرام کے بعد سیالکوٹ پہنچ گیا۔ جاٹ اور گوجر جب مقابلہ پر آئے تو انکی خوب سرکوبی کی۔ بابر کو سیالکوٹ میں اطلاع ملی کہ ابراہیم لودھی کا بھائی علاء الدین ابراہیم لودھی سے شکست کھانے کے بعد لاہور بھاگ آیا ہے۔ یہ وہی علاء الدین ہے جو بابر کو بلانے کے لئے کابل گیا تھا اور بابر نے اس کو پہلے ہی سے ایک مختصر فوج دیکر ہندوستان بھیج دیا تھا تاکہ وہ بابر کی حکومت کے لئے یہاں زمین ہموار کرے۔ بابر نے سیالکوٹ سے نکل کر ملوٹ کو فتح کیا۔ اور دولت خاں لودھی حاکم پنجاب کو جو کہ بابر سے منحرف ہو گیا تھا پکڑ بلوایا۔ پھر اپنی فوج کو آراستہ کرنے کے بعد دہلی کے بادشاہ ابراہیم لودھی سے جنگ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں دولت خاں لودھی کا بیٹا دلاور خاں بھی بابر کے ہمراہ تھا۔ علاء الدین عرف عالم خاں بھی بابر کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندوستانی امرائے سلطنت بابر کے ہمرکاب ہو گئے۔

بابر روپڑ اور سرہند سے ہوتا ہوا کرنال پہنچا۔ ہمایوں نے حصار فیروزہ

کی جانب رُخ کر کے اسے فتح کر لیا۔ بابر نے حصار فیروزہ کی فتح سے خوش ہو کر حصار فیروزہ کا محصول جو ایک کروڑ تھا اور ایک کروڑ زرِ نقد ہمایوں کو دیدیا اس فتح کے بعد بہت سارو پیہ اور قیمتی تحائف کابل روانہ کئے گئے۔

پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست

جب بابر کو یہ معلوم ہوا کہ ابراہیم لودھی کی بے اندازہ فوج مقابلہ کے لئے پانی پت میں جمع ہو رہی ہے تو بابر اور اس کی فوج کے سردار پانی پت کی جانب بڑھے۔ بابر کے پاس اس وقت کل دس ہزار فوج تھی۔ پانی پت کے قریب پہنچنے کے بعد بابر نے اپنے توپ خانہ کو ترتیب دیا۔ بندوقچیوں کو توپوں کے پیچھے کھڑا کیا اور سواروں کو علحدہ علحدہ ٹکریوں میں تقسیم کیا۔ پھر اس لشکر نے آگے بڑھ کر ابراہیم لودھی کی فوج پر جو ایک لاکھ سواروں اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ تیر اندازی شروع کردی اور اس طرح پانی پت کی اس تاریخی جنگ کی ابتدا ہو گئی۔ جس کے بعد ہندوستان کی قسمت کا آخری فیصلہ ہونے والا تھا۔

ابراہیم لودھی کی فوج اگرچہ بابر کی فوج کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی لیکن اس کا بیشتر حصہ غیر تربیت یافتہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں ابراہیم لودھی کو شکست ہو گئی۔ خود ابراہیم لودھی اس جنگ میں مارا گیا۔ بابر نے اس فتح کے بعد فوراً سجدۂ شکر ادا کیا۔ بابر ابراہیم لودھی کے لشکر کی زیب و زینت کی تعریف کرتے ہوئے اپنی سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ " ابراہیم کے لشکر کے خیمے ایسے نظر آتے تھے جیسے کسی کھیت میں زربفت کے تھانوں کو پھاڑ کر سونے کے درخت لگادئے گئے ہوں لیکن یہ سب ظاہری ٹیپ ٹاپ تھی۔ حقیقت میں یہ لشکر فن سپہ گری

سے قطعی ناآشنا تھا۔" غرضکہ بابر کو پانی پت کے میدان میں وہ تاریخی فتح حاصل ہوگئی جس کے بعد ہندوستان میں مغلوں کا ستارۂ اقبال خوب چمکا۔

پانی پت کی فتح کے بعد بابر نے شہزادہ ہمایوں کو تو آگرہ کی فتح کیلئے روانہ کر دیا۔ اور خود دہلی کی جانب بڑھا اور دہلی کے قلعہ پر قبضہ جمانیکے بعد سب سے پہلے شاہی خزانہ کو محفوظ کیا۔ پھر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء پر حاضری دیکر درگاہ کا طواف کیا۔ اسکے بعد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار مبارک پر حاضر ہوا۔ اور دہلی کے تمام مشہور مقامات کی سیر سے فارغ ہو کر دہلی کے انتظام کی طرف متوجہ ہوا۔ دولت بیگ کو دہلی کا دیوان مقرر کر کے بابر تغلق آباد چلا گیا۔ اور وہاں جمنا کے کنارے قیام کیا۔ اور پھر لشکر لیکر آگرہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

دہلی کے بعد آگرہ کی فتح

دہلی کی تسخیر کے بعد بابر آگرہ پہنچا۔ شہزادہ ہمایوں یہاں پہلے سے موجود تھا۔ اور قلعہ کی فتح کے لئے باپ کی آمد کا منتظر تھا۔ بابر کے آتے ہی قلعہ آگرہ پر حملہ ہوگیا۔ گوالیار کا راجہ بکرماجیت ابراہیم لودھی کی جانب سے بابر سے لڑا۔ اور جنگ میں مارا گیا۔ ہمایوں کی فوج نے بکرماجیت کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا لیکن ان کے ساتھ بڑی نرمی کا سلوک کیا۔ بکرماجیت کے جانشین نے ہمایوں کی خدمت میں بہت سے قیمتی جواہرات بطور نذر پیش کئے جنمیں کوہِ نور نامی مشہور ہیرہ بھی تھا۔ اس ہیرہ کا وزن آٹھ مشقال تھا۔ ہمایوں نے یہ ہیرہ باپ کی خدمت میں پیش کیا تو بابر نے ہمایوں ہی کو واپس دیدیا۔ آج کل یہ ہیرہ شاہ انگلستان کے تاج کی زینت بنا ہوا ہے آگرہ کا قلعہ کئی دن تک محصور رہا۔ آخر محصورین نے اطاعت قبول کر لی اور اس طرح آگرہ بھی فتح ہوگیا۔ بابر نے آگرہ کی فتح کے بعد ابراہیم لودھی کی ماں کو سات لاکھ روپے کی جاگیر دی۔ اور آگرہ کے قریب ایک محل میں اسے منتقل کر دیا

ابراہیم لودھی کے دوسرے اُمراء کو بھی پرگنے اور جاگیریں عطا کی گئیں۔ بابر ہندوستان کا پہلا حملہ آور ہے جو صرف دس بارہ ہزار کے لشکر سے ہندوستان کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ورنہ اس سے قبل محمود غزنوی یا محمد غوری نے جب بھی ہندوستان پر حملہ کیا تو انکے ساتھ بے اندازہ لشکر تھا۔ بابر کی جنگی قابلیت مسلمہ ہے کہ اس نے ایک ایسے غنیم کو زیر کر لیا جو اگر اپنی تمام فوج کو مجتمع کر لیتا تو کسی صورت میں بھی وہ پانچ لاکھ سے کم نہ تھی حقیقت یہ ہے کہ اسکی قسمت میں ہندوستان کی حکومت لکھی ہوئی تھی۔ ورنہ بابر کے حالات ہرگز ایسے نہ تھے کہ وہ ہندوستان کے برِ عظیم کا بادشاہ بن سکتا۔

بابر نے سارا خزانہ لٹا دیا دہلی اور آگرہ کی فتح کے بعد بابر ایسا خوش ہوا کہ اس نے سلطان ابراہیم لودھی کا وہ سارا خزانہ لُٹا دیا جو اس بادشاہ نے جمع کیا تھا۔ اس خزانہ میں سے ستر لاکھ روپیہ شہزادۂ ہمایوں کو عطا ہوا۔ اور ایک دوسرا پورا کا پورا خزانہ جسمیں بے اندازہ زر و جواہر تھے ہمایوں کو بخشدیا۔ اس کے بعد اُمرائے بابری میں خزانہ کی تقسیم شروع ہوئی۔ کسی کو دس لاکھ، کسی کو آٹھ لاکھ، کسی کو سات لاکھ، کسی کو چھ لاکھ اور کسی کو پانچ لاکھ روپے ملے۔ فوج کے ہر ایک سپاہی کو خزانہ سے نقد انعام دیا گیا اس کے علاوہ کامران کو ۱۷ لاکھ محمد زماں مرزا کو ۱۵ لاکھ عسکری اور ہندال کو لاکھوں روپیہ ملا۔ نیز تمام چھوٹے بڑے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بے اندازہ نقد روپیہ، جواہرات اور تحائف روانہ کئے گئے۔ خراسان اور سمرقند کے اُمرا اور مشائخ کو لاکھوں روپیہ بھیجا گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ کابل میں عوام میں اس قدر اشرفیاں لُٹائی گئیں کہ کوئی فرد محروم نہیں رہا۔ غرضکہ ابراہیم لودھی اور اسکے آباؤ اجداد نے سالہا سال میں جو خزانہ جمع کیا تھا۔ بابر نے ایک دن

کے اندر وہ سب کا سب لٹا دیا۔

ہندوستانیوں کو مغلوں سے نفرت

بابر اپنی خود نوشت سوانحعمری میں لکھتا ہے کہ "جب میں آگرہ میں آیا تو میرے آدمیوں میں اور ہندوستانیوں میں عجب مغائرت اور منافرت تھی ہندوستانیوں کی حالت یہ تھی کہ وہ میرے آدمیوں کی صورت دیکھ کر بھاگتے تھے۔ ان دنوں گرمی کا موسم تھا۔ خلقت میرے آنے سے ایسی گھبرائی کہ شہر چھوڑ کر بھاگ گئی۔ حالت یہ تھی کہ نہ تو سپاہیوں کو سامان خوراک ملتا تھا۔ اور نہ گھوڑوں کے لیے دانہ ہی میسر آتا تھا۔ اور ایک تازہ مصیبت یہ اور پیش آئی کہ میرے بہت سے آدمی جو گرمی کے عادی نہیں تھے لُو لگنے سے مر گئے۔ ہندوستانیوں کی یہ مغائرت اور موسم کی خرابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے تمام اُمرا کے دل چھوٹ گئے وہ کسی طرح ہندوستان میں رہنے کے لیے راضی نہ ہوتے تھے بلکہ وطن واپس جانے کے لئے بالکل تیار ہو گئے میں نے چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اپنے ساتھ ہندوستان لا کر دولتمند بنا دیا تھا لیکن یہ سب کے سب منحرف نظر آنے لگے۔ میں نے انکو جمع کر کے بہت کچھ سمجھایا لیکن یہ بدستور واپس جانے کیلئے آمادہ تھے۔ آخر میں نے سختی اختیار کی اور ان لوگوں کو بمشکل تمام ہندوستان میں رہنے کے لئے آمادہ کیا۔"

بابر کے اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان فتح کر لینے کے باوجود بھی بابر کو کس قدر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس سے وہ لوگ بھی منحرف ہو گئے تھے جن کو کہ اس نے ان کی اوقات سے زیادہ نوازا تھا۔ اس کے علاوہ بابر کو ایک دقت یہ بھی پیش آئی کہ ابراہیم لودھی کے زمانہ کے بیشتر اُمرا نے بابر کی اطاعت قبول نہیں کی بلکہ اس موقعہ سے ناجائز

فائدہ اُٹھاتے ہوئے نئے نئے علاقوں پر قبضہ جمالیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اُمرائے سلطنت یہ سمجھ رہے تھے کہ بابر اپنے دادا تیمور کی طرح محض ہندوستان سے روپیہ سمیٹنے کے لئے آیا ہے۔ جو چند روز کے بعد چلا جائیگا۔ اسلئے ہم اس چند روزہ بادشاہ کی اطاعت کرکے اپنی پوزیشن کیوں خراب کریں۔ بلکہ ان میں سے بعض اُمرا تو اس بات کے انتظار میں تھے کہ بابر کے ہندوستان سے رخصت ہوتے ہی وہ یا تو دہلی کے تخت پر قبضہ جمالیں یا اپنے علاقوں میں بادشاہی کا اعلان کردیں۔

اُمرائے سلطنت کی مایوسی اور اطاعت

اُمرائے سلطنت کو جب اپنی توقع اور اُمید کے خلاف یہ معلوم ہوا کہ بابر ہندوستان میں اپنی حکومت کی بُنیادیں مضبوط کر رہا ہے اور اسکے سامنے سارے ہندوستان کو فتح کرنے اور اُمرائے سلطنت کو مغلوب کرنیکی تجاویز زیرِ غور ہیں تو اُمرائے سلطنت کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اور اب انکے پاس اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ مغلوں کی اطاعت قبول کرکے اپنے آپکو آنیوالے خطرات سے بچالیں۔ چنانچہ اُمرائے سلطنت نے مغل بادشاہ سے مصالحت کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کردی اور اُمرائے سلطنت کے مطیع ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اُمرائے سلطنت اور راجگان میں سے بعض راجہ سنگا جیسے بھی سردار تھے۔ جو یہ جاننے کے باوجود کہ بابر ہندوستان کا بادشاہ بن گیا ہے مطیع ہونیکی بجائے اور زیادہ بابر کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ غرضکہ اکثر اُمرائے سلطنت نے تو اطاعت قبول کرلی لیکن بعض نے علم بغاوت بلند کردیا۔

بابر کی جدید فتوحات کا سلسلہ

دہلی اور آگرہ کی فتح کے بعد بابر نے اگرچہ ملک کے کسی حصہ میں باقاعدہ لشکر کشی نہیں شروع کی تھی لیکن پھر بھی شہزادہ ہمایوں اور دوسرے مغل سرداروں

کی کوششوں سے چند ماہ کے اندر اندر مندرجہ ذیل مقامات زیر ہو گئے۔ قلعہ سنبھل اٹاوہ، قنوج، دھولپور، جلیسر، جاج مئو۔ جونپور۔ کالپی۔ بیانہ اور قلعہ گوالیار چین امرائے سلطنت نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ بابر نے ان کو لاکھوں روپے سالانہ کی جاگیریں عطا کیں۔ اعظم ہمایوں کے بیٹے فتح خاں شروانی کو خانجہاں کا خطاب عطا ہوا۔ اور ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی جاگیر اس کو دی گئی۔

بابر کو زہر دیدیا گیا بابر ہندوستان میں اپنی حکومت کو مستحکم بھی نہ کر سکا تھا۔ کہ ابراہیم لودھی کی ماں نے شاہی باورچیوں سے ساز باز کر کے بابر کو کھانے میں زہر دلوا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابر کو قے پر قے آنی شروع ہو گئیں بابر کے علاوہ دوسرے جن مصاحبین نے یہ کھانا کھایا تھا۔ انکی بھی یہی حالت ہوئی۔ باورچی کو پہرہ داروں کے سپرد کیا گیا۔ زہر دینے کی اس سازش میں دو باورچی اور دو عورتیں شامل تھیں۔ بابر نے ایک باورچی کو توپ سے اڑوا دیا دوسرے کی کھال کھنچوادی۔ ایک عورت کو گولی مار کر ختم کر دیا اور دوسری عورت کو آگ میں ڈال کر جلوا دیا۔ ابراہیم لودھی کی ماں جو قتل کی اس سازش کی محرک تھی۔ اسکی جاگیر اور روپیہ ضبط کر کے اسے قید میں ڈال دیا گیا۔ اور ابراہیم لودھی کے لڑکے کو ہندوستان سے کابل مرزا کامران کے پاس بھجوا دیا گیا۔

رانا سنگا سے بابر کی جنگ چتوڑ کا راجہ سنگرام سنگھ عرف رانا سنگا جس نے کہ بابر کو ہندوستان آنیکی دعوت دی تھی اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اسکی فوجیں بابر کی فوجوں کے ساتھ ابراہیم لودھی سے لڑینگی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ بابر نے ہندوستان میں پاؤں جمانے شروع کر دئیے ہیں۔ تو وہ بابر کے خلاف لڑنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ رانا سنگا یہ چاہتا تھا کہ بابر ہندوستان آنیکے بعد ابراہیم لودھی کی حکومت کو ختم کر دے اور کابل

چلا جائے اور اسکے بعد رانا سنگا ہندوستان میں راجپوتوں کی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دے۔ لیکن جب رانا سنگا نے دیکھا کہ مغلوں کا وجود راجپوتوں کے لئے پٹھانوں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے تو وہ بابر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے قندھار فتح کر لیا۔ اور بابر کے مقابلہ کے لئے زبردست فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اس نے تمام راجپوت حکمرانوں سے استدعا کی کہ وہ ہندوستان سے مغلوں کو نکالنے میں اسکی مدد کریں۔ چنانچہ تمام راجپوت رانا سنگا کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ راجپوتوں کے علاوہ سکندر لودھی کا بیٹا محمود لودھی بھی مع دس ہزار فوج کے رانا سنگا کے ساتھ آن ملا۔ اسکے علاوہ دوسرے وہ لودھی سردار بھی جو بابر سے شکست کھا چکے تھے۔ اس معرکہ میں رانا سنگا کے ساتھ شامل ہو گئے۔

رانا سنگا کی فوجی تیاریوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب سیکری کے قریب اس کا لشکر آیا تو کسی طرح بھی ابراہیم لودھی کے اس لشکر سے کم نہ تھا جس سے کہ بابر کو پانی پت میں مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رانا سنگا کی فوج کی کثرت نے بابر کے سپاہیوں کو سراسیمہ کر دیا تھا۔ لیکن بابر نے اس خوبی کے ساتھ اپنے لشکر کو رانا سنگا کی بے اندازہ فوج کے ساتھ لڑایا کہ رانا سنگا کے تقریباً تمام بڑے بڑے فوجی افسر مارے گئے اور رانا سنگا میدان سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد پانی پت کی فتح کے بعد بابر کی یہ دوسری قابل ذکر فتح تھی۔ بابر کو یہ فتح ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں حاصل ہوئی تھی۔

میوات اور چندیری کی فتح

الیاس خاں میواتی جس کی کہ ہندو راجاؤں سے سازباز تھی۔ اس نے سارے میوات میں بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ بابر نے اس فتنہ پرداز کی سرکوبی کیلئے ایک

بہت بڑا لشکر روانہ کیا۔ الیاس خاں گرفتار ہو گیا۔ اور اس کی زندہ کھال کھنچوا دی گئی۔ اسکے بعد بابر خود میوات گیا۔ الور جو فتنہ پردازوں کا سب سے بڑا مرکز تھا بابر نے اسے فتنہ پردازوں سے پاک کیا۔ تجارہ کا انتظام تیمور سلطان کے حوالے کیا۔ اسکے بعد مغل لشکر نے دوآبے اور قنوج کے ان باغیوں کی سرکوبی کی جو رانا سنگا کی لڑائی کے زمانہ میں بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ غرضکہ ایک سال کے اندر اندر سوائے اودھ کے گنگا پار کے سارے علاقے پر بابر کی سلطنت قائم ہو گئی۔ صرف صوبہ اودھ میں پٹھانوں کا ایک گروہ باقی تھا۔ اسکی سرکوبی کیلئے بھی فوج روانہ کر دی گئی۔ سنہ ۹۳۴ھ (۱۵۲۷ء) میں بابر نے چندیری کو فتح کرنے کے بعد سلطان ناصر الدین کے پوتے احمد شاہ کے سپرد کر دیا۔ اسی سال رانا سنگا کے بیٹے بکرماجیت نے رنتھنبور کا قلعہ بابر کو دیدیا اور بابر نے اسے شمس آباد عطا کر دیا۔

بابر کا بہار اور بنگال پہ حملہ

سنہ ۹۳۵ھ (۱۵۲۸ء) میں بابر کو اطلاع ملی کہ سکندر لودھی کے بیٹے محمود لودھی نے بہار فتح کر لیا ہے محمود رانا سنگا کی لڑائی میں بھی رانا سنگا کا معاون بن کر بابر سے لڑ چکا تھا۔ اس اطلاع کے ملتے ہی بابر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود تمام مشرقی صوبوں کو فتح کریگا۔ چنانچہ بابر ایک بڑی فوج لیکر محمود لودھی کے مقابلے کے لئے روانہ ہو گیا۔ محمود کو جب بابر کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ گیا۔ بابر بہار کے علاقوں کو فتح کرتا ہوا بنگال میں جا پہنچا، بابر اس سے قبل شاہ بنگال کو اطاعت کیلئے لکھ چکا تھا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چنانچہ بابر نے بنگال میں داخل ہونیکے بعد بنگالیوں کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔ بنگالیوں کو شکست ہوئی اور انھوں نے بابر کے ساتھ صلح کر لی۔

ہمایوں کی خطرناک بیماری

بابر کو ہمایوں سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ ہمایوں ۹۳۶ھ (۱۵۲۹ء) کے آخر میں بدخشاں سے ہندوستان آنیکے بعد ایسا بیمار ہوا کہ اسکے بچنے کی کوئی اُمید نہ رہی امیر ابو البقاجو اپنے زمانے کے بہت بڑے فاضل تھے انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ ایسی حالت میں جبکہ ظاہری علاج ناکام ثابت ہو تو آخری علاج یہ ہے کہ مریض پر سے اسکی سب سے عزیز چیز صدقہ کردی جائے اور خدا سے اسکی صحت کیلئے دُعا مانگی جائے۔ بابر نے کہا کہ میرے لختِ جگر ہمایوں کیلئے سب سے بہتر اور عزیز شے خود میں ہوں۔ میں اپنے آپ کو اس پر سے صدقہ کرنے کو تیار ہوں۔ اُمرائے سلطنت نے بابر کو اس ارادے سے روکنا چاہا مگر وہ نہ مانا اور خلوت میں چلا گیا۔ خدا سے بیٹے کی صحت کیلئے گڑگڑا گڑگڑا کر دُعا مانگی اور تین مرتبہ اسکے بستر کے گرد پھر کر اپنے آپ کو صدقہ میں دیدیا۔ بابر کی دُعا قبول ہوگئی۔ اسی روز سے ہمایوں تندرست ہونے لگا۔ اور بابر بخار میں مبتلا ہونے کے بعد ایسا پڑا کہ پھر اُٹھ ہی نہ سکا۔

ظہیر الدین بابر کی وفات

خدا نے چند روز کے اندر اندر ہمایوں کو تو بالکل تندرست کردیا لیکن بابر کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اسکے چہرہ سے موت کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں جب بابر نے یہ سمجھ لیا کہ اس کا آخری وقت ہے تو اس نے ارکان حکومت کو جمع کرنیکے بعد ہمایوں کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرائی اور ہمایوں کو اپنا جانشین اور ولیعہد مقرر کیا اور اپنی بجائے اسے تختِ شاہی پر بٹھایا اور مرنے سے قبل ہمایوں کو نصیحت کی کہ جود و داد و دہش میں کمی نہ کرنا۔ عدل و احسان اور رضائے الٰہی کو اپنا اصول بنانا، رعایا کے ساتھ نگہبانی اور رعایت کا سلوک کرنا۔ قصورواروں اور مجرموں کو بخش دینا، سرکشوں اور ستمگاروں کو پامال کرنا اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال

رکھنا کہ بھائیوں کے ساتھ کبھی سختی نہ ہونے پائے خواہ ان کا جرم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو" بیٹے کو یہ نصیحتیں کرنیکے بعد بابر ۵ جمادی الاول ۹۳۷ھ (۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) کو جمنا کے کنارے آگرہ کے باغ میں رحلت کر گیا۔ بابر کا جنازہ آگرہ سے کابل لایا گیا اور کابل میں دفن ہوا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے عہد حکومت میں بابر کی قبر پر ایک نہایت ہی شاندار مقبرہ بنوا دیا تھا۔ جو دنیا کی بے نظیر عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

ظہیر الدین بابر کا دور حکومت

بابر کا دور حکومت جو فرغانہ کی تخت نشینی سے شروع ہو کر ہندوستان کی بادشاہت پر ختم ہوتا ہے۔ بڑا ہی عجیب ہے وہ بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کے تخت پر بیٹھا تو مصیبتوں کا پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑا۔ کبھی بادشاہ بنا اور کبھی بوریہ نشین کبھی شاہانہ عظمت حاصل ہوئی اور کبھی یہ کیفیت تھی کہ نہ بدن پر کپڑا تھا اور نہ پاؤں میں جوتی۔ وہ سنبھل سنبھل کر گرا۔ اور گر گر کر سنبھلا۔ اسکی زندگی ہمت استقلال اور شجاعت کا غیر فانی نقش ہے فرغانہ کی چھوٹی سی حکومت اسے ورثہ میں ملی تھی لیکن وہ چھن گئی۔ وطن سے بھی نکالا گیا لیکن اس نے اپنی حوصلہ مندی سے نہ صرف کھوئی ہوئی حکومت حاصل کر لی بلکہ ہندوستان جیسے برعظیم کا وہ بادشاہ بن گیا۔ جب وہ فرغانہ سے نکلا تھا تو گدا گر سے بدتر تھا۔ لیکن جب وہ مرا ہے تو اسکی حکومت بدخشاں اور قندھار تک اور دریائے جیحون کے تمام جنوبی اضلاع سے لیکر بلخ تک اور افغانستان میں کابل غزنی اور قندھار تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسکے علاوہ ہندوستان کا بھی وہ بادشاہ بن چکا تھا۔ جہاں وہ تقریباً سارے شمالی ہند پر فرمانروائی کر رہا تھا۔

بابر ہی کی یہ ہمت تھی کہ اس نے دس بارہ ہزار آدمیوں سے ہندوستان کے برعظیم کو فتح کر لیا اور بابر ہی کا یہ حوصلہ تھا کہ اس نے اپنے مخالفوں کو فوج کی کمی کے باوجود دھیر میں شکست دی۔ وہ اپنے دور کا سب سے بڑا سپہ سالار اور نہایت

ہی مشقت پسند سپاہی تھا۔ سیکڑوں میل بغیر رُکے ہوئے شہسواری کر لیتا تھا۔ دریا اگر راستہ میں پڑتا تھا تو ایک ماہر تیراک کی طرح پانی میں کود کر دریا پار کر لیتا تھا۔ وہ انتہا درجہ کا نرم دل اور پرلے درجہ کا سخت دل تھا۔ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو مہر و مروّت سے زیر کرنے میں وہ ایک لُطف محسوس کرتا تھا۔ لیکن جب اس کے مزاج میں درشتی پیدا ہو جاتی تھی تو وہ انسانی خون بہانے میں بھی ایک لذت محسوس کرتا تھا چنانچہ اس نے رانا سنگا پر فتح پانے کے بعد کھوپڑیوں کا مینار بنانے میں ایک لُطف محسوس کیا اور ایک دفعہ اتنا قتلِ عام کرایا کہ بادشاہی خیمہ محض اسلئے اکھڑوا دیا گیا کیونکہ انسانی خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور خیمہ کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا وہ انتہا درجہ کا منصف مزاج تھا۔ انصاف کے مقابلے میں اس نے غیر اور اپنے میں کبھی کوئی تمیز نہیں کی۔ وہ رعایا کو اولاد سمجھتا تھا اور رعایا اس کو باپ تصور کرتی تھی۔ غرضیکہ اس بادشاہ میں جہانبانی کی جتنی خوبیاں یکجا تھیں وہ کسی ایک بادشاہ میں کبھی نہیں پائی گئیں۔

وطن اور عزیزوں سے بابر کا عشق

بابر کو اپنے وطن سے اپنے دوستوں سے اپنے عزیزوں سے اور اپنی اولاد سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ اس نے محض حب الوطنی کی خاطر کئی مرتبہ حکومت کھونے کے بعد سخت سے سخت تکلیفیں برداشت کیں۔ وہ ایک بہت بڑی حکومت کا بادشاہ بننے کے باوجود بھی پرانی صحبتوں دوستوں اور عزیزوں کو فراموش نہ کر سکا بلکہ فرغانہ اور کابل کے زمانہ کو ہمیشہ یاد کرتا رہا وہ اپنے لڑکپن کے دوستوں کی یاد میں پہروں رویا کرتا تھا۔ ماں بہنوں اور عزیز و اقارب کا تذکرہ کرکے آہیں بھرا کرتا تھا۔ خواجہ کلاں جو کابل میں اس کا نائب اور دوست تھا۔ اسکی یاد میں بابر ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ بابر نے اپنے ایک خط میں اسے لکھا کہ "میں نے

شراب سے توبہ کرلی ہے۔ اب تم بھی توبہ کرلو۔ شراب پینے کا جب ہی تک لطف تھا کہ ہم سب پُرانے یار ایک جگہ بیٹھ کر پیتے تھے۔ تنہا شراب پینے میں کیا خاک مزہ دو قدیمی دوست حیدر قلی اور شبیر احمد تمہارے پاس موجود ہیں۔ ہائے مجھے کیسا رشک آتا ہے کہ تم کابل کے مزے اُڑاتے ہو اور میں ہندوستان میں پڑا ہوں اتفاق سے ایک تربوز میرے پاس آیا اسے جب تراشا تو مجھے اپنی تنہائی پر کیسا افسوس ہوا، تربوز کے قتلے منہ میں رکھتا جاتا تھا۔ اور روتا جاتا تھا۔ کبھی ہم ساتھ کھاتے تھے اور ساتھ پیتے تھے۔ اب نہ کھانے کا لطف ہے نہ پینے کا مزہ ہے" بابر کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ان الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر حساس دل دُنیا میں لیکر آیا تھا۔ ایک مرتبہ بابر کا دوست اچانک گر کر مر گیا۔ وہ اس کے غم میں آٹھ دن تک روتا رہا۔ اسکو متعلقین اور اولاد سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بیٹے پر قربان ہو گیا اور مرتے مرتے بیٹے کو وصیت کر گیا کہ بھائیوں کا خیال رکھنا۔

علم وادب سے بابر کی دلچسپی

بابر ایک بے نظیر سپہ سالار ہونیکے ساتھ ادیب اور شاعر بھی تھا۔ بابر کی خود نوشت سوانح حیات اسکی قلمکاری کا شاہکار ہے۔ اس کا انداز بیان اگرچہ سادہ ہے لیکن اسمیں افسانہ کا سا لطف آتا ہے اپنی سوانح حیات میں بابر نے جہاں بھی منظر نگاری کی ہے وہ اس قدر دلکش ہے کہ شاید ایک بڑے سے بڑا ادیب بھی اتنی ہی دلکشی پیدا کر سکتا ہے۔ پہاڑوں کا بیان۔ برف باری کا منظر دریا کی روانی کی کیفیات سبزہ زاروں کا لہلہاتا جنگل میں پیڑوں کا شائیں شائیں کرنا غرضکہ اس نے الفاظ میں مناظر کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے۔ بزم کا بیان اور رزم کی کیفیت غرضکہ وہ جو کچھ لکھتا ہے خوب لکھتا ہے۔ اسکی تحریر تعلی اور بناوٹ سے پاک اور حقیقتوں

سے لبریز ہے جب وہ شراب کی محفلوں کا ذکر کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے نشہ میں جھوم رہا ہو۔ ایک جگہ اپنی شراب نوشی کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ہرات میں چچازاد بھائیوں نے بڑی منت سے شراب پلائی پھر ایسا چسکا لگا کہ کوئی ایسی جگہ باقی نہ رہی جہاں اس کا لطف نہ اٹھایا ہو بس یہی مشغلہ تھا کہ جلسے ہوں شراب کا دور چلے یہانتک کہ ایک سنگ مرمر کا حوض بنوایا۔ اسکو لبالب شراب سے بھر دیا اور اس پر یہ شعر کندہ کرایا ؎

نوروز نوبہار و مئے و دلبرا خوش است   بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

پھر لکھتا ہے کہ "وہ بھی کیا زمانہ تھا جب دوستوں کو ساتھ لیکر کبھی باغوں کی سیر کرتا کبھی شاداب پہاڑوں پر چڑھتا کبھی کشتی میں بیٹھ کر دریا کا لطف اٹھاتا۔ کشتیوں کو دوڑاتا، آپ گاتا اوروں کو گواتا، رباب پر ترکی تانیں اڑاتا۔ خود پیتا اور منتیں کرکے دوسروں کو پلانا بہت یاد آتا ہے۔ غرضکہ بابر جہاں بھی شراب کا ذکر کرتا ہے تو اس ذکر میں مدہوش سا ہو جاتا ہے۔ بابر کا شمار بلند پایہ شاعروں میں بھی ہے چنانچہ اس کا ترکی زبان کا دیوان فصاحت اور بلاغت کیلئے مشہور ہے۔ "مثنوی مبین" اسکی ایسی مثنوی ہے جس کو نہایت مستند خیال کیا جاتا ہے۔ اسکی تصنیفات و تالیفات میں "ترجمہ رسالہ والدیہ" کو علمی دنیا میں ایک اچھا اضافہ شمار کیا جاتا ہے۔ بابر کی تصنیفات و تالیفات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی فارسی اور ترکی زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ علم جغرافیہ اور علم تاریخ سے بھی اسے گہری دلچسپی تھی۔ غرضکہ بابر ایک سپاہی ہونے کے ساتھ مایۂ ناز ادیب اور شاعر بھی تھا۔

بابر کی ملکی اور سیاسی پالیسی

بابر اگرچہ مسلمان تھا۔ اور اس نے کٹر مسلم گھرانے میں پرورش پائی تھی لیکن اسکی ملکی اور سیاسی پالیسی کو مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بابر ایک ایسے ملک سے آیا تھا جہاں سو فی صدی کٹر مسلمان رہتے تھے وہاں غیر مسلموں کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن

ہندوستان آنیکے بعد اس نے کبھی بھی مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز نہیں کی۔ وہ جس طرح مسجدوں کی حفاظت ضروری سمجھتا تھا اسی طرح مندروں کی حفاظت کو بھی پوری اہمیت دیتا تھا۔ اس نے ہندوستان کے باشندوں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ اسکی حکومت میں ہر شخص مذہبی اعتبار سے بالکل آزاد اور خود مختار تھا۔ اسکی اسی وسیع نظری کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں ہندوستان کے تمام باشندوں کے دلوں میں بلا اختلاف مذہب و ملت یکساں جگہ حاصل کر لی تھی۔ بابر نے اپنی حکومت کی بنیاد جس رواداری پر رکھی تھی۔ اسی پر اس کے جانشینوں نے بھی عمل کیا بلکہ بابر کے بعض جانشین تو رواداری کے معاملہ میں بابر سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ثابت ہوئے۔

بابر کا ذاتی کردار

بابر کا ذاتی کردار ہمیشہ نہایت بلند رہا ہے صرف اسے شراب پینے کی عادت تھی جس کو ساری عمر وہ بُرا خیال کرتا رہا۔ یہانتک کہ آخر عمر میں شراب نوشی سے بھی اس نے توبہ کر لی تھی۔ بادشاہوں کی عامیانہ عشرت پسندی سے اسے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ وہ اخلاق صداقت اور انسانیت کا ایک پیکر تھا۔ اس نے قدرت رکھنے کے باوجود دشمنوں سے انتقام لینے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ اور دوستوں پر نوازشیں کرنے سے کبھی نہیں تھکا۔ وہ بادشاہ ہونیکے باوجود اپنے ساتھیوں کی سخت سے سخت باتیں برداشت کر لیتا تھا۔ رحم، مروت اور شرافت کا وہ زندہ نمونہ تھا۔ وہ عیش میں کبھی خدا کو نہیں بھولا۔ اور معیبت نے کبھی اس کے چلن کو نہیں بگڑنے دیا۔ اسکے اندر بے انتہا اخلاقی جرات بھی تھی چنانچہ اس نے اپنی سوانح حیات میں بڑی آزادی کے ساتھ اپنی کمزوریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ صرف ایک ہی چیز اسکے چلن اور کردار کی بلندی کا بہترین ثبوت ہے۔ اس کو سب سے زیادہ باغ لگانے اور نہریں بنانے کا شوق تھا +

شاہ نصیر الدین محمد ہمایوں

بابر جب زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا تو حکومتِ مغلیہ کا ایک امیر خلیفہ نظام الدین جو ہمایوں سے خوش نہ تھا۔ اس جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا کہ مغلیہ حکومت کے تخت پر ہمایوں کی بجائے بابر کے داماد خواجہ مہدی کو بٹھا دیا جائے لیکن خواجہ مہدی سے کچھ ایسی حرکات سرزد ہوگئیں جس نے کہ خلیفہ نظام الدین کو اُس سے بدظن کر دیا۔ چنانچہ جب بابر مرا تو ہمایوں بغیر کسی اختلاف کے تخت پر بیٹھ گیا۔ تخت نشینی کے وقت ہمایوں کی عمر ۲۴ برس کی تھی اور اس کی تخت نشینی کی رسم ۹ جمادی الاول ۹۳۷ھ (۲۹ جنوری ۱۵۳۰ء) کو آگرہ میں عمل میں آئی۔ تخت نشینی کے کئی روز بعد تک خوب جشن منایا گیا۔

ہمایوں نے بھائیوں میں حکومت تقسیم کر دی

ہمایوں کے تین بھائی تھے مرزا کامران مرزا ہندال اور مرزا عسکری ہمایوں نے باپ کی وصیت کے مُطابق تخت پر بیٹھتے ہی سارے ملک کو اپنے بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ کابل و قندھار مرزا کامران کو دیدیا سنبھل کے علاقہ کی حکومت مرزا عسکری کے سپرد کر دی۔ الور اور میوات کا تمام علاقہ مرزا ہندال کو عنایت کر دیا اور بدخشاں مرزا سلیمان کو مرحمت ہوا حکومت کی اس تقسیم کے بعد گویا بابر کی وسیع حکومت کا ایک بڑا حصّہ ہمایوں کے قبضہ سے نکل گیا تھا۔ اور ہمایوں ایک محدود اور چھوٹے سے علاقہ کا بادشاہ بن کر رہ گیا تھا لیکن پھر بھی ہمایوں خوش تھا۔

ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کا پنجاب پر قبضہ

ہمایوں کی

اس برادر نوازی اور وسیع نظری کے باوجود ہمایوں کا بھائی مرزا کامران جس کے دل میں مدت سے ہندوستان پر بادشاہی کرنے کا جذبہ پرورش پا رہا تھا۔ قندہار کو مرزا عسکری کے حوالے کرنے کے بعد اور ایک بڑا لشکر لیکر ہندوستان کی جانب قسمت آزمائی کے لئے روانہ ہوگیا۔ کامران کا لشکر کسی مزاحمت کے بغیر پشاور سے ہوتا ہوا پنجاب کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس زمانہ میں پنجاب میں مرزا یونس ہمایوں کی جانب سے گورنری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یونس مرزا کو کامران کے ایک ساتھی نے پہلے ہی سے لاہور پہنچ کر اور فریب دیکر لاہور کے قلعہ میں نظر بند کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا کامران کی فوج جب لاہور پہنچی تو یہاں بھی کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور کامران پشاور سے لیکر لاہور تک کے علاقہ پر آسانی سے قابض ہو گیا۔

مرزا کامران نے اس طرح بالجبر پنجاب پر قبضہ جمانے کے بعد پنجاب کے گورنر مرزا یونس کو رہا کر دیا۔ جو آگرہ چلا گیا۔ اس کے بعد کامران نے جا بجا اپنے عمال مقرر کر دئے۔ اور ہمایوں کے پاس ایلچی بھیجکر یہ خواہش کی کہ پنجاب بھی اسے عنایت کر دیا جائے۔ مرزا کامران کا معاندانہ رویہ اگرچہ بے حد قابل اعتراض تھا لیکن ہمایوں تو بھائیوں کے معاملہ میں اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بھائی کی اس غدارانہ روش کے باوجود پنجاب اور صوبہ سرحد کا تمام علاقہ کامران کو دیدیا۔ ہمایوں کی اس نوازش پر جب کامران نے خوش ہو کر ہمایوں کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر روانہ کیا تو ہمایوں نے حصار فیروزہ بھی کامران کو عطا کر دیا اور اس طرح شمالی ہند کا بہترین علاقہ ہمایوں کی حکومت سے نکل کر مرزا کامران کے تسلط میں چلا گیا۔

ہمایوں کی سب سے بڑی سیاسی غلطی

ہمایوں نے خواہ کیسے ہی نیک اور شریفانہ جذبے کے ماتحت ملک کی یہ تقسیم کی ہو۔ اور بھائیوں کی مخالفانہ روش کا نرمی سے کیوں نہ جواب دیا ہو۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہمایوں کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ جس کا خمیازہ اس کو بعد میں بھگتنا پڑا۔ ہمایوں کے ہاتھ سے کابل و قندہار کے نکل جانے کے معنی یہ تھے کہ وہ اس اہم ترین خطہ سے محروم ہو گیا۔ جہاں کے دس بارہ ہزار جوانمرد اور بہادر سپاہیوں کے ذریعہ اس کے باپ نے ہندوستان جیسے برِ عظیم کو تسخیر کیا تھا۔ اور جب پشاور اور پنجاب بھی ہمایوں سے چھن گیا۔ تو ہمایوں کے لئے اچھے اور مضبوط سپاہیوں کے حصول کے تمام راستے سے مسدود ہو گئے۔ ہمایوں کو ابتدا میں تو اس لئے اپنی اس غلطی کا احساس نہیں ہوا۔ کیونکہ باپ کے زمانہ کے پرانے بہادر سپاہی اس کی فوج میں موجود تھے لیکن جب پرانے سپاہی ختم ہونے لگے۔ اور انکی جگہ نئے خیر خواہ اور بہادر سپاہی میسر نہ آسکے تو ہمایوں کی آنکھیں کھلیں لیکن اب اس غلطی کی تلافی ہمایوں کے قبضہ سے باہر تھی۔

کالنجر چنار گڈھ اور جونپور کی فتح

مغلیہ حکومت کو بھائیوں میں تقسیم کرنے کے بعد ہمایوں جدید فتوحات کی جانب متوجہ ہوا۔ ہمایوں نے ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) میں کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا حاکم کالنجر نے اس محاصرہ سے تنگ آکر اطاعت قبول کر لی۔ اور بارہ من سونا اور بہت سے تحائف دے کر ہمایوں سے اس کی صلح ہو گئی۔

جس زمانہ میں کہ ہمایوں کالنجر کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ سکندر لودھی کے بیٹے محمود لودھی نے افغانوں کو اپنے ساتھ ملا کر جونپور پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہمایوں راجہ کالنجر سے مصالحت کے بعد جونپور آیا اور افغانوں پر حملہ کر دیا افغانوں کو شکست ہو گئی۔ محمود پٹنہ بھاگ گیا۔ اور دس سال کے بعد وہیں مر گیا۔ الغرض جونپور پر ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔

ہمایوں نے جونپور کو دوبارہ جنید برلاس کے سپرد کر دیا اور خود آگرہ روانہ

ہو گیا۔ آگرہ آنیکے بعد ہمایوں قلعہ چنار گڈھ کی جانب متوجہ ہوا اس قلعہ پر شیر خاں نے قبضہ جما رکھا تھا (یہ شیر خاں وہی شیر شاہ ہے جس نے کہ ہمایوں کو ہندوستان سے نکالنے کے بعد سوری حکومت قائم کی تھی) ہمایوں نے شیر شاہ سے مطالبہ کیا کہ قلعہ فوراً مغلوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ شیر خاں نے انکار کر دیا جس پر ہمایوں کی فوجوں نے قلعہ چنار گڈھ پر چڑھائی کر دی مگر ان شرائط پر صلح ہو گئی کہ شیر خاں اطاعت قبول کرلے قلعہ بدستور شیر خاں کے قبضہ میں رہے۔ اور شیر خاں کا بیٹا قطب خاں ہمیشہ بادشاہ کی خدمت میں رہے۔ اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے دہلی میں جمنا کے کنارے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام دین پناہ تجویز ہوا۔

ہمایوں کا گجرات پر حملہ

محمد زماں مرزا۔ سلطان مرزا اور رفیع مرزا نے بھوجپور میں گنگا کے کنارے بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ بادشاہ نے لشکر بھیج کر انکی خوب سرکوبی کی۔ سلطان مرزا اور رفیع مرزا کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اندھا کرنے کا حکم دیدیا۔ اور محمد زماں مرزا کو بیانہ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ مگر زماں مرزا کسی طرح قید سے نکل کر گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ کے پاس چلا گیا۔

ہمایوں کو اگرچہ یہ معلوم تھا کہ گجرات جہاں مدت سے شاہانِ گجرات خود مختارانہ حیثیت سے حکومت کر رہے تھے۔ وہاں اُس کے خلاف زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن وہ گجرات سے قبل بنگال اور بہار کو زیر کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہاں پٹھان سرکش ہوتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ ہمایوں بنگال و بہار کی تسخیر کے لئے روانہ ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ کالپی ہی میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ نے حملہ کر کے چتوڑ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اور محمد زماں مرزا ابھی بہادر شاہ سے مل گیا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی ہمایوں نے

بنگال بہار کی مہم کو ملتوی کر دیا۔ اور گجرات پر حملہ کی غرض سے آگرہ واپس آ گیا۔
آگرہ آنے کے بعد سب سے پہلے ہمایوں نے بہادر شاہ والی گجرات سے مطالبہ کیا کہ محمد زماں خاں کو جو ہماری حکومت کا باغی ہے یا تو ہمارے حوالے کر دیا جائے یا اس کو اپنی حکومت سے نکال دیا جائے لیکن شاہ گجرات بہادر شاہ تو مغلیہ حکومت کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ ہمایوں سے کب دبنے والا تھا۔ اس نے محمد زماں خاں کے معاملہ میں ہمایوں کو کورا جواب دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں حکومتوں میں اور بھی کشیدگی بڑھ گئی اور دونوں طرف جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

بہادر شاہ کسی طرح بھی ہمایوں کے مقابلہ میں کمزور نہ تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ گجرات کی حکومت کو بہت زیادہ وسیع اور مضبوط بنا لیا تھا۔ خاندیش احمد نگر اور برار کے بادشاہ اس کے ہوا خواہ بن چکے تھے۔ مالوہ کی سلطنت پر بہادر شاہ قبضہ جما چکا تھا۔ اسکے علاوہ لودھی خاندان کے وہ تمام شہزادے اور اُمرا بھی اسکے ساتھ مل گئے تھے۔ جو بابر سے شکست کھانے کے بعد مغلیہ حکومت سے انتقام کے درپے تھے۔ اس پر مزید یہ کہ بہادر شاہ کے پاس ایک بہت بڑا توپ خانہ تھا جس کو قسطنطنیہ کے ایک عثمانی ترک رومی خاں نے مرتب کیا تھا۔ اس توپ خانہ میں تین سو ترکی اور اتنی پرتگیزی اور فرانسیسی گولہ انداز ملازم تھے۔

بہادر شاہ کو زعم تھا کہ وہ اس توپ خانہ کے ذریعہ دُنیا کی بڑی سے بڑی حکومت کو فتح کر سکتا ہے۔ غرضکہ بہادر شاہ کے حوصلے بے حد بڑھے ہوئے تھے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ کسی طرح بھی دولت اور طاقت میں ہمایوں سے کم نہ تھا۔ بہادر شاہ نے ہمایوں سے جنگ شروع کرنے سے قبل یہ جنگی چال چلی کہ اپنی فوج کے تین ٹکڑے کر دیئے ایک ٹکڑا تو ہمایوں کی فوج سے مقابلہ کیلئے

محفوظ رکھا، فوج کے دوسرے حصہ کو سلطان علاء الدین کے حوالے کر دیا، کہ وہ کالنجر میں جاکر فتنہ برپا کر دے اور فوج کے تیسرے حصہ کو برہان الملک کی سرکردگی میں پنجاب روانہ کر دیا تاکہ پنجاب میں جاکر طوفان برپا کرے۔ بہادر شاہ نے یہ طریقہ کار اس لئے اختیار کیا تھا تاکہ ایک ہی وقت میں کئی مورچوں پر جنگ چھڑ جانے سے ہمایوں اور اس کی فوج سراسیمہ ہو جائے لیکن بہادر شاہ کی بدقسمتی کہ فوج کی تقسیم اس کے لئے بجائے مفید ہونے کے کمزوری کا سبب بن گئی۔

بہادر شاہ ان تیاریوں کے بعد حکومتِ مغلیہ کو فتح کرنے کے لئے خود دہلی کی جانب بڑھا، ادھر تاتار خاں نے بیانہ پر حملہ کر کے بیانہ کو فتح کر لیا۔ ہمایوں نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے بھی مرزا عسکری مرزا ہندال اور ناصر مرزا کو اٹھارہ ہزار سپاہ دیکر بہادر شاہ کی اُس فوج کے مقابلہ کے لئے بھیجدیا جو دہلی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ہمایوں جانتا تھا کہ اگر دہلی پر حملہ کرنے والی اصل فوج کو شکست دیدی تو باقی دو فوجیں خود ہی منتشر ہو جائیں گی۔ چنانچہ ہمایوں کی فوج کی بہادر شاہ کے لشکر سے جوں ہی ٹکر ہوئی تو بہادر شاہ کے سپاہیوں پر مغل فوج کا کچھ ایسا رعب چھا گیا کہ وہ بغیر لڑے ہی بھاگنے شروع ہو گئے۔ بہادر شاہ کو ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں شکست ہو گئی۔ اس کے دوسرے دو لشکر بھی منتشر ہو گئے جس کے بعد بیانہ اور اس کے مضافات پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

مغل لشکر کے مقابلہ میں ناکام ہونے کے بعد بہادر شاہ چتوڑ کے محاصرہ میں ہمہ تن مصروف ہو گیا اور چتوڑ کے قلعہ کو فتح کر لیا لیکن اسے فوراً ہی مغل فوج سے لڑنے کے لئے تیاریاں کرنی پڑیں۔ کیونکہ مغل فوج مالوہ میں داخل ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ نے اس مرتبہ اپنے توپ خانے کے افسر رومی خاں کے مشورے

سے یہ طے کیا کہ مغل فوج کا مقابلہ شمشیر زن اور تیر انداز سپاہیوں سے کرنے کی بجائے صرف توپ خانہ سے کیا جائے اور گولہ باری سے مغل فوج چیتھڑے اڑا دئے جائیں لیکن بہادر شاہ کی بدقسمتی کہ جب مقابلہ ہوا تو یہ توپ خانہ بیکار ثابت ہوا۔ غرضکہ اس مرتبہ بھی بہادر شاہ کو بُری طرح شکست کھانے کے بعد منڈو بھاگنا پڑا۔ ہمایوں کا لشکر اس کے تعاقب میں منڈو گیا تو وہ چمپانیر فرار ہو گیا۔

بہادر شاہ کے توپ خانہ کا افسر رومی خاں بھی فرار ہو کر ہمایوں کے پاس چلا آیا اور ہمایوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ مغل فوج فتح اور کامرانی کے ساتھ منڈو سے گجرات روانہ ہوئی تو بہادر شاہ چمپانیر میں آگ لگانے کا حکم دے کر کھمبات کی طرف بھاگ گیا۔ ہمایوں نے چمپانیر میں آتے ہی آگ بجھوائی اور ایک جماعت کو چمپانیر کی حدود میں انتظام کے لئے چھوڑ دیا اور خود بہادر شاہ کے تعاقب میں فوج لے کر کھمبات جا پہنچا۔ بہادر شاہ کو یہاں سے بھی بھاگنا پڑا اور وہ بھاگ کر دیو چلا گیا۔ ہمایوں خود تو کھمبات میں سمندر کے کنارے ٹھہر گیا لیکن لشکر کو بہادر شاہ کے تعاقب میں دیو روانہ کر دیا۔ غرضکہ بہادر شاہ کے اس فرار اور شکست کے بعد ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں مانڈو اور گجرات پر بھی ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔

ہمایوں کی بے موقع آرام طلبی

گجرات کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ہمایوں کو چاہیئے تھا کہ وہ سیدھا دارالسلطنت جاتا کیونکہ اس کے دارالسلطنت سے دُور ہونے کی وجہ سے نئے نئے فتنے کھڑے ہونے شروع ہو گئے تھے لیکن ہمایوں کھمبات سے لوٹنے کے بعد قلعہ چمپانیر میں ٹھہر گیا۔ یہاں اتفاق سے اس قلعہ میں سے

بہادر شاہ کا ایک بہت بڑا خزانہ بھی ہمایوں کے ہاتھ لگ گیا بس پھر کیا تھا۔ عیش کی محفلیں روزانہ گرم ہونے لگیں عیش پرستی پر زر و جواہر نچھاور کئے جانے لگے۔ غرضکہ ہمایوں اور ہمایوں کے ساتھی کچھ ایسے مدہوش ہوگئے کہ نہ تو ان کو دارالسلطنت کی کوئی خبر رہی اور نہ اُنھوں نے اس گجرات کے انتظام کی جانب توجہ کی جسے انھوں نے بڑی مشکل اور بڑی دشواری سے بہادر شاہ جیسے مضبوط بادشاہ کے قبضہ سے نکالا تھا۔

بہادر شاہ نے مغل بادشاہ کی یہ لاپرواہی اور بدانتظامی دیکھی تو اس نے عماد الملک کو گجرات کی تحصیل وصول کے لئے مقرر کردیا اور اسے اختیار دیدیا کہ وہ جس طرح چاہے گجرات کا انتظام کرے۔ چنانچہ عماد الملک جب احمد آباد کے لئے روانہ ہوا تو راستہ میں تحصیل مال کے لئے محصل مقرر کرتا جاتا تھا وہ جدھر بھی جاتا لوگوں کو انعام اور بخشش سے مالا مال کر دیتا معتمدوں کو اس نے جاگیریں دینی شروع کردیں۔ اور اپنی اس فیاضی اور دریا دلی سے اس نے گجرات کے باشندوں کو پھر بہادر شاہ کا اطاعت شعار بنالیا عماد الملک نے مختصر سی مدت میں کس قدر ہر دلعزیزی حاصل کرلی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ احمد آباد پہنچا ہے تو اس کے پاس سورت اور کاٹھیاواڑ کے زمینداروں کے علاوہ تیس ہزار فوج جمع ہوگئی تھی۔ مزید یہ کہ جوناگڈھ کا حاکم مجاہد خاں بھی دس ہزار فوج کے ساتھ عماد الملک سے آن ملا۔

ہمایوں اور عماد الملک کی جنگ

ہمایوں کو جب اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ وہ تو عیش پرستی میں مبتلا ہے اور گجرات ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو وہ لشکر لے کر احمد آباد

آیا۔ عماد الملک بھی مقابلہ پر صف آرا ہو گیا۔ اس جنگ میں پہلے تو مغلوں کو شکست ہوئی لیکن مغلوں نے سنبھل کر جب دوسرا حملہ کیا تو عماد الملک کے پچاس ہزار کے لشکر میں ہلچل برپا ہو گئی۔ عماد الملک فرار ہو گیا اور گجراتیوں کو شکست ہو گئی۔ اس معرکہ سے فارغ ہونے کے بعد ہمایوں نے گجرات میں عمال مقرر کیے۔ ہمایوں کے معتمدِ خاص ہندو بیگ کی یہ رائے تھی کہ چونکہ گجرات دُور دراز صوبہ ہے۔ اس لئے یہاں کے انتظام کی بہترین صورت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے اقرار اطاعت لیکر یہ سارا صوبہ اسی کے حوالے کر دیا جائے لیکن ہمایوں بہادر شاہ سے اس قدر خفا تھا کہ وہ اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے کسی طرح بھی آمادہ نہ ہوا۔ اور گجرات کو اپنے بھائی مرزا عسکری اور چند دوسرے اُمرائے سلطنت کی نگرانی میں دیدیا۔ اور خود مالوہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ تاکہ مالوہ میں بیٹھ کر مالوہ کے فتنہ پردازوں کی بھی سرکوبی کر سکے اور گجرات سے بھی قریب رہے۔

ملک میں جابجا شورشیں ہمایوں کے دار السلطنت سے دُور رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے مختلف حصوں میں جا بجا بغاوتیں کھڑی ہو گئیں۔ بہار میں افغانوں نے بُری طرح فتنہ برپا کر دیا۔ محمد سلطان مرزا نے اپنے بیٹے الغ خاں اور شاہ مرزا کی مدد سے قنوج سے لیکر جونپور تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اور اپنے نام کا خطبہ تک پڑھوا دیا۔ صوبہ آگرہ میں اور جمنا کے کنارے کے اضلاع میں بھی سرکشی کے آثار پیدا ہو گئے۔ سکندر خاں اور ملو خاں نے مالوہ میں بغاوت برپا کر دی۔ اور اجین کے حاکم کو قتل کر دیا ان شورشوں اور بغاوتوں کی اطلاع پانے کے بعد جب ہمایوں ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں گجرات سے مالوہ پہنچا تو یہاں کے فتنہ پرداز اس طرح کوتوں

میں چھپ گئے۔ جیسے کبھی انھوں نے بغاوت برپا ہی ہنیں کی تھی۔ ان بغاوتوں کے دبنے کے بعد ہمایوں بڑی حد تک مطمئن ہو گیا اور اس نے مالوہ میں ڈیرے ڈال دیئے اور یہاں بھی عشرت پسندی کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ حالانکہ ہمایوں کو چاہیئے تھا کہ وہ مالوہ کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے بعد ایک منٹ ضائع کیئے بغیر سیدھا آگرہ جاتا تاکہ اس کے دارالسلطنت میں موجود نہ ہونے سے جو فتنے زور پکڑتے جا رہے تھے وہ دب جاتے۔

گجرات ہاتھ سے نکل گیا

گجرات جسے مغل فوج نے بڑی دشواریوں کے بعد دوبارہ فتح کیا تھا۔ وہاں ہمایوں کے نکلتے ہی پھر بغاوتیں برپا ہوتی شروع ہو گئیں۔ ان بغاوتوں کے دو سبب تھے پہلا سبب تو یہ تھا کہ گجراتی جو دو سو برس تک شاہانِ گجرات کے زیراثر رہے تھے۔ ان کو قدرتی طور پر مغلوں سے نفرت اور گجراتی بادشاہوں سے محبت تھی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ ہمایوں نے وہاں جو نظام حکومت قائم کیا تھا۔ وہ چست نہ تھا۔ ان اسباب کی بنا پر سارے گجرات میں عام بغاوت پھیل گئی۔ بہادر شاہ والی گجرات نے پرتگیزوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ادھر شاہان گجرات کے پرانے اُمرا اور اعمال نے ایک ایک کر کے مغل عمال کو نکالنا شروع کر دیا تو ساری کا قلعہ سورت کا شہر۔ بڑوچ کی بندرگاہ پٹن کا شہر غرضکہ ایک ایک کر کے تمام مقامات مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ مرزا عسکری نے شراب کے نشہ میں جب مغل فوج کے افسر غضنفر کو قید کرنے کا حکم دیدیا تو وہ بھاگ کر بہادر شاہ سے جا ملا اور اس گھر کے بھیدی نے احمد آباد پر بھی بہادر شاہ کا قبضہ کرا دیا۔ غرضکہ مرزا عسکری ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں شکست کھا کر گجرات سے ایسا بھاگا کہ فوج کو سامان سمیٹنے کی بھی مہلت نہ ملی۔

مرزا عسکری اُمرائے سلطنت اور بچی کھچی فوج کے سپاہی اس شکست کے بعد بھاگ کر چمپانیر میں جمع ہو گئے اور سارا ملک بہادر شاہ کے قبضہ میں دوبارہ چلا گیا۔ چمپانیر آنے کے بعد مرزا عسکری نے مغل حاکم تردی بیگ پر جبر کرنا شروع کیا کہ وہ اپنا سارا خزانہ نکال کر اُسے دیدے۔ اسکے علاوہ یہ رائے قرار پائی کہ مرزا عسکری اپنی بادشاہی کا اعلان کر دے اور آگرہ کے تخت پر جا کر قبضہ جما لے۔ تردی بیگ نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہ بھی مرزا عسکری کا مخالف ہو گیا۔ اور اس کو کہلا بھیجا کہ وہ فوراً چمپانیر سے چلا جائے۔ جب اس پر بھی یہ لوگ نہ گئے تو تردی بیگ نے ان کو دھمکانے کے لئے توپیں چلائیں۔ توپوں کا چلنا تھا کہ یہ بھاگ کھڑے ہوئے اور بہادر شاہ نے حملہ کر کے چمپانیر پر قبضہ جما لیا۔

تردی بیگ بغیر لڑے مال و زر لیکر نکل گیا۔ ہمایوں کے پاس منڈو پہنچا اور اسے مرزا عسکری کے ناپاک ارادوں سے مطلع کیا۔ ہمایوں کو اندیشہ ہوا کہ کہیں مرزا عسکری پہلے سے آگرہ پہنچ کر اپنی بادشاہی کا اعلان نہ کر دے چنانچہ وہ آگرہ کی طرف دوڑا لیکن حسنِ اتفاق سے چتوڑ کے نواح میں مرزا عسکری ہمایوں کو مل گیا۔ ہمایوں کی صورت دیکھتے ہی اس کے بادشاہ بننے کے سارے منصوبے ختم ہو گئے۔ ہمایوں نے بھی مصلحتاً کوئی باز پرس نہیں کی اور یہ دونوں بھائی آگرہ آ گئے۔

مالوہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا ہمایوں کے گجرات سے نکلنے کے بعد جو کچھ گجرات میں ہوا تھا وہی صورت مالوہ سے جانے کے بعد مالوہ میں بھی پیش آئی جب تک ہمایوں مالوہ میں رہا۔ باغی منہ چھپائے کونے میں بیٹھے رہے لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ بادشاہ آگرہ کیلئے روانہ ہو گیا

ہے تو سارے مالوہ میں بغاوتیں کھڑی ہوگئیں۔ بھوپال رائے نے فوراً منڈو کے خالی قلعہ پر قبضہ جمالیا۔ ملوخاں اور میراں محمد فاروقی مالوہ کے اکثر علاقوں پر قابض ہوگئے۔ خلاصہ یہ کہ ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں بہادر شاہ کو گجرات کے بعد اپنا ملک مالوہ بھی مل گیا اور یہ دونوں صوبے جن کو کہ ہمایوں نے بڑی جاں فشانی سے فتح کیا تھا آن کی آن میں ہاتھ سے نکل گئے۔

ہمایوں کی مایوسی اور نا اُمیدی

مالوہ سے آگرہ واپس آنے کے بعد جب ہمایوں کو یہ معلوم ہوا کہ گجرات کے بعد مالوہ پر بھی دشمنوں نے قبضہ جمالیا ہے تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کے علاوہ اس نے حکومت کی اندرونی حالت دیکھی تو وہ اور بھی مایوس ہوگیا۔ امرا سلطنت جو اسکی خیر خواہی کا دم بھرتے تھے۔ انکی وفاشعاری متزلزل ہوچکی تھی مرزا ہندال جس کو کہ وہ اپنا جانشین بناکر آگرہ میں چھوڑ گیا تھا وہ آگرہ اور آگرہ کے گرد و نواح کی بغاوتوں کو دبانے میں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوسکا۔ سلطان مرزا اور اسی کے بیٹے کو قنوج اور جونپور سے مرزا ہندال نے نکال تو دیا تھا لیکن وہ بہار پہنچ جانے کے بعد وہاں شورشیں پھیلا رہے تھے۔ پٹھانوں نے علحدہ ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ دہلی کی حکومت چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہوچکی تھی۔ ہر جگہ لاقانونی اور بدنظمی کا دور دورا تھا جن ممالک کو اس نے بڑی جانفشانی کے ساتھ جان کی بازی لگا کر فتح کیا تھا وہ ایک ایک کرکے سب اسکے ہاتھ سے نکلے چلے جارہے تھے۔ ان حالات و واقعات کا ہمایوں کے دل و دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے سیاسیات اور جہانبانی سے کنارہ کشی اختیار کرلی ملک کی بدنظمی اور بدانتظامی کے معاملہ میں اس نے سوچنا اور غور کرنا بھی چھوڑ دیا۔ بس اس کا مشغلہ یہ تھا کہ افیون کھاتا رہے اور محل کے اندر مست پڑا رہے دیر بار میں

آنا اس نے قطعی بند کردیا۔ غرضکہ ہمایوں وہ ہمایوں ہی نہیں رہا جسکی شمشیر خارا شگاف آن کی آن میں دشمنوں کی صفوں کو چیر کر رکھ دیتی تھی۔ نہ اسمیں وہ ولولہ رہا اور نہ ہمت۔

شیر خاں کا بہار جونپور اور چنار پر قبضہ

ہمایوں کے دل و دماغ پر توہم پرستی اور ناامیدی چھائی ہوئی تھی اور شیر خاں افغان دن بدن ہمایوں کے لئے خطرہ بنتا چلا جارہا تھا۔ چنانچہ ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں حاکم جونپور امیر جنید برلاس کے مرتے ہی شیر خاں نے بہار اور جونپور پر قبضہ جمالیا قلعہ چنار پر وہ پہلے سے قابض تھا۔ غرضکہ اس نے اپنی فوجی طاقت اچھی طرح بڑھالی یہاں تک کہ اس نے بنارس اور گورکھپور کو بھی تاراج کرڈالا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو ہمایوں کی آنکھ کھلی اور اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا تو ایک دن حکومت کھو بیٹھے گا۔ مگر ہمایوں ابھی تک یہ طے نہ کرسکا کہ اسے پہلے شیر خاں کی سرکوبی کے لئے جانا چاہیئے یا گجرات کو بہادر شاہ کے پنجہ سے نکالنا چاہیئے۔

احمد نگر کے بادشاہ نظام شاہ نے ہمایوں کی خدمت میں پیشکش کی تھی کہ اگر وہ گجرات پر حملہ کرے تو وہ گجرات کی فتح میں اسکی پوری مدد کریگا۔ خود ہمایوں کا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ گجرات پر حملہ کرکے اپنے سب سے بڑے دشمن بہادر شاہ سے انتقام لے لیکن شیر خاں کی دراز دستیوں سے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بڑھتا بڑھتا آگرہ تک نہ پہنچ جائے۔ آخر ہمایوں نے یہ طے کیا کہ وہ سب سے پہلے شیر خاں کی سرکوبی کریگا۔ چنانچہ ہمایوں نے آگرہ کی حکومت تو اپنے معتمد میر محمد بخشی کے حوالے کی۔ اپنے چچازاد بھائی محمد یادگار ناصر مرزا کو اسکی جاگیر کالپی کا انتظام سپرد کیا اور اپنے بہنوئی نورالدین محمد مرزا کو قنوج اور اس کے نواح کا حاکم مقرر کیا۔ اس انتظام کے بعد ہمایوں نے مرزا عسکری، مرزا ہندال، بیرم خاں اور دیگر امرائے سلطنت

کو اپنے ساتھ لیا اور ایک بہت بڑے لشکر کے ہمراہ شیر خاں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو گیا چنانچہ چند ہی روز میں وہ چنار گڈھ پہنچ گیا۔

قلعہ چنار گڈھ کی فتح

شیر خاں ایک نہایت ہی شاطر سپہ سالار تھا۔ اس نے ہمایوں کی آمد کی اطلاع سنتے ہی ایسا خوبصورت جنگی نقشہ تیار کیا، جسمیں پھنسنے کے بعد ہمایوں کبھی نکل ہی نہ سکے۔ اسکی سب سے پہلی چال یہ تھی کہ ہمایوں اور اسکے لشکر کو کئی مہینے تک قلعہ چنار گڈھ کے معرکہ میں اُلجھا لینا چاہیئے۔ چنانچہ شیر خاں قلعہ چنار گڈھ کو اپنے بیٹے قطب خاں اور سرداروں کے سپرد کر کے ہمایوں کے آنے سے قبل ہی چلتا بنا اور ہمایوں اس قلعہ کی فتح میں ایسا اُلجھا کر پورے چھ مہینے لگ گئے۔ آخر چھ مہینے کی جدوجہد کے بعد ہمایوں بمشکل تمام سنہ ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) میں قلعہ چنار گڈھ کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔

ہمایوں تو اس طویل مدت میں صرف ایک قلعہ سے سر مارتا رہا لیکن شیر خاں نے ہمایوں اور اس کے سارے لشکر کو چنار گڈھ میں اُلجھانے کے بعد اس دوران میں سارا بنگال فتح کر کے شاہانِ بنگال کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا چنار گڈھ فتح کر کے ہمایوں جب بنارس آیا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ شیر خاں نے پورا بنگال لے لیا ہے تو اس نے یہ طے کیا کہ شیر خاں سے صلح کر لی جائے لیکن بعض نا عاقبت اندیش اُمرائے سلطنت نے اور بنگال کے شکست خوردہ بادشاہ کے وکیل نے جب ہمایوں پر بنگال کی فتح کیلئے زور دیا تو ہمایوں انکے غلط مشورہ پر عمل کرنیکے لئے تیار ہو گیا۔

ہمایوں کی بنگال کو روانگی

ہمایوں نے چنار گڈھ کا انتظام تو بیگ بیرگ کے سپرد کیا اور اپنے لشکر کو لیکر ۹۴۴ھ ہجری (۱۵۳۷ء) میں ویناپور کے قریب جا پہنچا یہیں بنگال کا معزول اور زخمی بادشاہ محمود شاہ بھی ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنی مظلومی اور شیر خاں کے مظالم کی

بادشاہ سے فریاد کی۔ ہمایوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے یقین دلایا کہ بہت جلد اس کا ملک اسے واپس دلا دیا جائے گا۔

شیر خاں کو جب معلوم ہوا کہ ہمایوں بنگال آرہا ہے تو اس نے یہ طے کیا کہ برسات کے موسم میں بادشاہ اور اسکی فوج کو بنگال میں پھنسا دیا جائے اور اس سے لڑائی نہ کی جائے لیکن برسات ختم ہوجائے تو بادشاہ کی واپسی اور کمک کے راستہ بند کر کے اس پر حملہ کر دیا جائے چنانچہ شیر خاں نے اپنے بیٹے جلال خاں کو ہدایت کی کہ "فی الحال ہمایوں سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں میں بہار جاکر شورش برپا کرتا ہوں۔ تم ہمایوں کے لشکر کا انتظار کرو جب میں رہتاس پہنچ جاؤں تو ہمایوں کو بنگال میں چھوڑ کر میرے پاس چلے آنا۔"

بیٹے کو یہ ہدایت کر کے شیر خاں فوراً بنگال سے چلا گیا۔ اور چند ہی روز کے بعد ہمایوں کا لشکر بنگال میں داخل ہو گیا۔ جب یہ لشکر نواحی گڈھی میں پہنچا تو جلال خاں نے باپ کی ہدایت کے خلاف جوش میں آکر ہمایوں کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر سخت تھا کہ ہمایوں کو خلاف توقع شکست کے بعد بے اندازہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ ہمایوں نے دوبارہ لشکر کو ترتیب دیا لیکن اس مرتبہ جب لشکر جلال خاں پر حملہ کیلئے آگے بڑھا تو جلال خاں غائب تھا۔ ہمایوں حیران تھا کہ جلال خاں خود بخود کہیں چلا گیا لیکن اسے تو باپ کی ہدایت کے مطابق ہمایوں کے لئے دیدہ و دانستہ میدان صاف کرنا تھا۔ نواحی گڈھی پر بھی جلال خاں نے محض اسلئے ہمایوں کے لشکر پر حملہ کیا تھا تاکہ شیر خاں کو اتنی فرصت مل جائے کہ وہ اطمینان کے ساتھ بنگال کے مالِ غنیمت کو رہتاس لے جا سکے جب شیر خاں رہتاس جا پہنچا تو جلال خاں بھی بنگال میں ہمایوں کو آزاد چھوڑ کر باپ کے پاس چلا گیا۔

بنگال پر ہمایوں کا قبضہ | جلال خاں کے چلے جانے کے بعد ہمایوں

بغیر کسی مقابلہ کے بنگال کے دار السلطنت گور پر قابض ہو گیا۔ بنگال افغانوں کے ظلم و ستم سے تباہ اور برباد ہو چکا تھا۔ دار السلطنت گور پر ہر طرف لاشوں کا ڈھیر تھا۔ گلی اور کوچے سڑ رہے تھے۔ ہمایوں نے یہاں کی صفائی کرائی اور چند ماہ کے اندر اندر ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں پورے بنگال پر ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہمایوں جس طرح گجرات اور مالوہ میں رہ پڑا تھا اسی طرح بنگال میں بھی اس بادشاہ نے ڈیرے ڈال دیئے یہ ملک بادشاہ کو ایسا پسند آیا کہ نو مہینے تک یہاں سے ہلنے کا نام تک نہ لیا۔ روزانہ عیش و عشرت کی محفلیں گرم رہتیں۔ مرزا ہندال نے بادشاہ کی یہ مدہوشی دیکھی تو وہ بنگال سے سیدھا آگرہ پہنچا اور تخت و تاج حاصل کرنے کیلئے آگرہ میں جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ برسات کی وجہ سے سارے راستے مسدود تھے۔ بادشاہ دار السلطنت سے دور بنگال میں پڑا تھا۔ نہ یہاں کی خبر وہاں جا سکتی تھی اور نہ وہاں کی خبر یہاں آ سکتی تھی اور اگر کسی نہ کسی طرح کوئی پریشان کن خبر بنگال پہنچ بھی جاتی تھی تو اسے ہمایوں سے اس لئے چھپایا جاتا تھا۔ تاکہ اس کی محفل عیش میں اس خبر سے تلخی نہ پیدا ہو جائے۔

شیر خاں نے واپسی کے تمام راستے بند کر دیئے

ہمایوں تو دار السلطنت سے دور اور ملکی حالات سے بے خبر بنگال میں پڑا ہوا عیش کی گھڑیاں گزار رہا تھا۔ اور شیر خاں اسکے راستے میں کانٹے بچھانے میں مصروف تھا شیر خاں نے سب سے پہلے بہار فتح کر کے ہمایوں کے لئے بنگال سے واپس آنے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ اور اس کے بعد اس نے بنارس کا محاصرہ کر لیا اور پھر جونپور کی تسخیر کے لئے جدوجہد شروع کر دی ہمایوں کے وفا شعار اُمرائے سلطنت جو آگرہ میں تھے انہوں نے مرزا ہندال اور ہمایوں کے بہنوئی نور الدین کو توجہ دلائی کہ وہ شیر خاں کے

اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکیں لیکن مرزا ہندال جو تخت و تاج کی فکر میں تھا اسے ملکی معاملات سے کہیں زیادہ خود اپنی فکر تھی۔

مرزا ہندال کی آگرہ میں تخت نشینی

مرزا ہندال نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمایوں بنگال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اور یہ موقعہ بادشاہی کے اعلان کے لئے بہترین ہے۔ فوراً چند باغی اُمرائے سلطنت کی معاونت کے بعد آگرہ کے تخت پر قبضہ جمالیا۔ اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ جب ہمایوں کے دوسرے بھائی مرزا کامران کو یہ اطلاع ملی کہ ہندال بادشاہ بن بیٹھا ہے تو وہ بھی تخت حاصل کرنے کے لئے آگرہ کی جانب چل دیا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو مغلیہ حکومت کے تخت کا زیادہ حقدار سمجھتا تھا۔

مرزا ہندال کو جب معلوم ہوا کہ بھائی آگرہ کے پاس پہنچ چکا ہے تو وہ اسکے مقابلہ کی تاب نہ لاکر پانچ ہزار سواروں کے ساتھ الور چلا گیا۔ لیکن بعض اُمرائے سلطنت نے مرزا ہندال کو الور سے بُلاکر دونوں بھائیوں میں صلح کرادی اور یہ مشورہ دیا کہ دونوں بھائی مل کر اُس شیر خاں کا مقابلہ کریں جو مغلیہ حکومت کو غصب کر جانا چاہتا ہے لیکن ان دونوں بھائیوں نے محض خود غرضی کی بنا پر اس لئے شیر خاں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ کیونکہ یہ جانتے تھے کہ اگر شیر خاں کو زیر کر لیا تو ہمایوں کو بنگال سے رہائی مل جائے گی اور اس کے بنگال سے آنے کے بعد ہماری بادشاہت کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

ہمایوں کی بنگال سے روانگی

جب ہمایوں کو بنگال میں ان واقعات کا علم ہوا کہ مرزا ہندال نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا ہے۔ مرزا کامران بھی تخت حاصل کرنے کی فکر میں ہے اور شیر خاں کی بغاوت بنارس اور جونپور تک پھیل چکی ہے تو وہ موسم کی خرابی اور راستے کے خطرات

کے باوجود بنگال میں جہانگیر قلی کو حاکم مقرر کرنے کے بعد خود آگرہ کے لئے روانہ ہو گیا وہ بشکل تمام مونگیر ہوتا ہوا پٹنہ سے موینہ پہنچا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دریائے گنگا دریائے سون سے ملتا ہے۔ شیر خاں نے جب سُنا کہ ہمایوں آگرہ جا رہا ہے۔ اور اس کا لشکر نہایت ہی پراگندہ حالت میں ہے تو شیر خاں نے ہمایوں کا تعاقب شروع کر دیا اور چوسہ میں ہمایوں کے لشکر کو آن کر گھیر لیا۔ ہمایوں کا لشکر ڈھائی مہینہ تک گھرا پڑا رہا۔ اس مدت میں صرف چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمایوں کے لشکر میں اتنی طاقت ہی نہ تھی کہ وہ شیر خاں سے کوئی بڑی لڑائی لڑ سکتا۔ آخر ہمایوں عاجز ہو گیا اور اس نے یہی مناسب سمجھا کہ صلح کر کے شیر خاں جیسے قوی دشمن سے پیچھا چھڑائے۔ چنانچہ ان شرائط پر صلح ہو گئی کہ بنگال اور بہار کا سارا ملک شیر خاں کو دیدیا جائے۔ شیر خاں ہمایوں کو اپنا بادشاہ مان لے اور اپنے ملک میں اس کے نام کا خطبہ پڑھوائے۔ اسکے علاوہ چنار کا قلعہ بھی شیر خاں کو دیدیا جائے۔

صلح کے بعد شیر خاں کا ہمایوں پر حملہ

شیر خاں نے بظاہر تو صلح کر لی تھی لیکن حقیقت میں یہ بھی اس کی ایک جنگی چال تھی صلح کے بعد اُس نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہدایت کر دی کہ جب ہمایوں کا لشکر جنگ کی طرف سے بے فکر ہو جائے تو اچانک اس پر حملہ کر دیا جائے چنانچہ شیر خاں نے اس تجویز کے مطابق محرم ۹۴۶ھ (۱۵۳۹ء) میں خود دریائے گنگا کے کنارے چوسہ کے مقام پر بے خبری کے عالم میں ہمایوں کے لشکر پر پوری طاقت سے حملہ کر دیا اور افغان سپاہی آنکھیں بند کر کے مغلوں کے قتلِ عام میں مصروف ہو گئے اس حملہ میں ہمایوں کی فوج کے تمام بڑے بڑے افسر اور امرائے سلطنت مارے گئے۔ مغل بیگمات شیر خاں کے ہاتھوں اسیر ہوئیں۔ ہمایوں چاروں طرف سے گھر گیا۔ اس نے بڑی بہادری کے ساتھ

افغانوں کا مقابلہ کیا، اور بُری طرح زخمی ہوا۔ اس نازک وقت میں خود اس کے آدمیوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

ہمایوں کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح گنگا پار کرکے دریا کے دوسری طرف چلا جائے لیکن دریا پر پہنچا تو پُل ٹوٹا ہوا تھا۔ آخر اس نے دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ پانی زیادہ تھا۔ گھوڑا ران کے نیچے سے نکل گیا۔ بادشاہ ڈبکیاں کھانے لگا۔ تو بادشاہی لشکر کے ایک سقے نے ہوا بھری ہوئی مشک پر بادشاہ کو سوار کرکے بادشاہ کی جان بچائی اور اسے دریا کے پار پہنچا دیا۔ دریا پار اُتر کر بادشاہ نے سقہ سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے۔ اس نے کہا کہ نظام" ہمایوں نے کہا "تو نظام نہیں ہے"۔ بلکہ میرے لئے نظام اولیا ہے۔ تو نے میری جان بچائی ہے۔ جب میں تخت پر بیٹھوں گا تو تجھے ایک دن کی بادشاہت دونگا"۔ ہمایوں کے ساتھ یہ تاریخی واقعہ ۹ صفر ۹۴۶ھ (۲۷ جون ۱۵۳۹ء) کو پیش آیا تھا۔

ہمایوں اس طرح بمشکل جان بچانے کے بعد گنگا پار پہنچا۔ اور لشکر کے بچے ہوئے آدمیوں کی ایک جمعیت تیار کرکے آگرہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ مرزا عسکری اور بعض دوسرے اُمرائے سلطنت بھی ہمایوں سے آن ملے۔ غرضکہ شیر خاں نے ہمایوں کو دھوکہ دیکر ایک ایسی شکست دی کہ ہمایوں اس کے بعد مدتوں سنبھلنے کے قابل نہ ہوسکا لیکن شیر خاں نے اتنا ضرور کیا کہ ملکہ اور مغل بیگمات جو گرفتار ہوگئی تھیں ان کی بڑی عزت کی۔ نیز تباہ شدہ مغل سپاہیوں کے بیوی بچوں کا بھی بڑا خیال رکھا۔ اور ان سب کو بحفاظت آگرہ پہنچا دیا۔

ہمایوں کی آگرہ میں واپسی

ہمایوں جب گنگا پار کرنے کے بعد آگرہ کی جانب روانہ ہوا تو افغانوں نے پھر اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ افغانی افسر میر فرید غور نے اس کا تعاقب کیا اور

شاہ محمد افغان آگے راہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہمایوں کو ہر طرف سے گھیر کر ختم کر دیا جائے لیکن اس نازک وقت میں ایک راجپوت سردار راجہ پربھان نے میر فرید غور کے مقابلہ پر آ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ادھر ہمایوں محمد افغان سے لڑتا ہوا کالپی کی طرف نکل گیا۔ اور سخت دشواریاں اٹھانیکے بعد آگرہ پہنچ گیا۔

ہمایوں جب آگرہ پہنچا تو اس کے ساتھ مرزا عسکری دو تین امرا اور صرف مٹھی بھر سپاہی تھے۔ ہمایوں کے آنے کے بعد سب سے پہلے اس کا بھائی مرزا کامران قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ مرزا کامران اور اس کی والدہ کی سفارش سے مرزا ہندال کا قصور بھی ہمایوں نے معاف کر دیا۔ اس نے بھی بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی۔

نظام سقے کی ایک دن کی بادشاہی

نظام سقہ جس نے کہ ہمایوں کی جان بچائی تھی اور بادشاہ نے اس سے ایک دن کی بادشاہت عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا بادشاہ نے وعدہ کے مطابق ایک دن کے لئے اسے آگرہ کے تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کو حکمرانی کے پورے اختیارات دیدیئے۔ نظام سقے نے تخت پر بیٹھنے کے بعد فرمان جاری کئے۔ اپنی برادری کے آدمیوں کو انعام و اکرام دیئے اور مشکیں کترو اکر چمڑے کا سکہ چلا دیا۔ اس سکہ پر اپنا اور اپنی سلطنت کا نام نقش کرایا لیکن امرائے سلطنت نے ہمایوں کے اس رویہ کو سخت ناپسند کیا اور مرزا کامران تو ہمایوں کی اس عجیب و غریب فیاضی سے ایسا ناراض ہوا کہ اس نے عوام کو بادشاہ کے خلاف بھڑکانے تک سے گریز نہیں کیا۔

شیر شاہ کی بادشاہی کا اعلان

ہمایوں کے آگرہ واپس آنے کے بعد سے ہمایوں مرزا کامران۔ مرزا ہندال

اور امرائے سلطنت میں روزانہ شیر خاں کو زیر کرنے کے لئے مشورے تو ہوتے رہے لیکن بھائیوں کی کدورت کی وجہ سے کوئی بھی عملی قدم نہ اُٹھایا جا سکا۔ اُدھر شیر خاں کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ اس نے بنگال پر حملہ کر کے جہانگیر قلی کو مار بھگایا۔ مغلوں کے ایک ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اور اس کے بعد شیر شاہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد بنگال میں اپنی بادشاہی کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

بنگال پر قبضہ جمانے کے بعد شیر شاہ بہار آیا۔ بہار کا بیشتر حصہ وہ پہلے ہی فتح کر چکا تھا۔ اس لئے اس نے بہار میں بھی اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اب بنگال اور بہار کے دو بڑے صوبوں پر شیر شاہ کی حکومت تھی۔ اسکے بعد شیر شاہ نے جونپور سے لیکر قنوج تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا۔ شیر شاہ نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ بہت سا لشکر دیکر اپنے بیٹے قطب خاں کو کالپی اور اٹاوہ کی فتح کے لئے بھیج دیا۔ یعنی شیر شاہ نے ہمایوں کی تقریباً ساری سلطنت پر قبضہ جما لیا اور ہمایوں کی حکومت صرف آگرہ اور دہلی کی فصیلوں کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔

شیر شاہ اور ہمایوں کی فیصلہ کن جنگ

ہمایوں کو جب معلوم ہوا کہ شیر شاہ کا لشکر دوآبے تک آ گیا ہے تو اس نے اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ بھائیوں کے دلوں میں جو کدورت پیدا ہو گئی ہے وہ دُور ہو جائے تاکہ تینوں بھائی متحد ہو کر اپنے سب سے بڑے دشمن کا مقابلہ کر سکیں لیکن مرزا کامران کی حالت یہ تھی کہ وہ زبان سے تو ہمایوں کا حامی اور مددگار تھا۔ لیکن دل سے یہ چاہتا تھا کہ ہمایوں کا اقتدار ختم ہو جائے۔ چنانچہ وہ بیماری کا بہانہ کر کے پنجاب چلا گیا۔ اور اپنے سارے لشکر کو بھی ساتھ لے گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمایوں کی فوجی حیثیت بے حد کمزور ہو گئی۔ ہمایوں کو کامران کے جانے سے بڑی مایوسی ہوئی لیکن اس نے پھر بھی جوں توں

کر کے چالیس ہزار فوج جمع کر لی لیکن اس چالیس ہزار کے لشکر میں زیادہ تر ایسے آدمی تھے جنہوں نے ساری عمر کبھی لڑائی کا میدان نہیں دیکھا تھا۔ ہمایوں کو چونکہ کابل اور قندھار سے بہادر اور تربیت یافتہ سپاہی نہیں مل سکتے تھے اس لئے وہ ان غیر تربیت یافتہ سپاہیوں پر انحصار کرنے پر مجبور تھا۔

ہمایوں نے سب سے پہلے اپنے منتخب لشکر کو شیر شاہ کے بیٹے قطب خاں کی سرکوبی کیلئے بھیجا جس نے کہ کالپی اور اٹاوہ میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ دونوں لشکروں میں جنگ چھڑ گئی۔ شیر شاہ کا بیٹا قطب خاں اس لڑائی میں مارا گیا۔ اور شیر شاہ کے لشکر کو شکست ہو گئی۔ اس فتح کے بعد ہمایوں کا حوصلہ کچھ بڑھا اور وہ ذیقعد ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں اپنے لشکر کو لیکر دریائے گنگا کے پار اتر گیا۔ اور شیر شاہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شیر شاہ بھی مقابلہ پر آ گیا۔ شیر شاہ کے لشکر میں مشکل سے پندرہ ہزار سپاہی تھے اس کے برخلاف ہمایوں کا لشکر چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا لیکن ان چالیس ہزار میں بیشتر سپاہی ایسے ناکارہ تھے کہ یہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ شیر شاہ کے پہلے ہی حملہ میں میدان نہ چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جنگ کے چھڑتے ہی ہمایوں کے لشکر میں ایسی بھگدڑ مچی کہ ان بھاگنے والوں نے نہ تو دوسرے تربیت یافتہ سپاہیوں کو لڑنے کا موقعہ دیا اور نہ توپ خانہ ہی اپنا کام کر سکا۔ حالت یہ تھی کہ ہمایوں کے اپنے ہی آدمی توپوں پر گرے پڑتے تھے اور سپاہیوں کو کچلے ڈال رہے تھے۔ ہمایوں نے کئی مرتبہ قلب لشکر میں جا کر خود نبرد آزمائی کی تا کہ بھاگنے والوں کی ہمت بندھے لیکن ان کو تو محض اپنی جان کی سلامتی کی فکر تھی۔ مگر یہ جان بھی نہ بچا سکے۔ کیونکہ بھاگنے والوں کا بیشتر حصہ بدحواسی میں دریا میں کود کر جو کہ ان کے راستہ میں حائل تھا غرق ہو گیا یہاں تک کہ امرا اور جاگیردار بھی عالم بدحواسی میں دریا کی لہروں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ہمایوں کا میدانِ جنگ سے فرار

ہمایوں شکست کھانے کے بعد ہاتھی پر بیٹھ کر بمشکل دریا سے پار ہوا اور آگرہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستہ میں مرزا ہندال، مرزا عسکری اور بچی کھچی فوج بھی ہمایوں کے ساتھ آن ملی۔ ہمایوں کی اس شکست کا رعایا کے دل و دماغ پر یہ اثر پڑا کہ راستہ میں دیہاتیوں نے جمع ہو ہو کر ہمایوں کے لشکر کو لوٹنا چاہا یعنی ہمایوں کا اقتدار اس جنگ کے بعد بالکل ہی ختم ہو گیا۔

ہمایوں آگرہ پہنچا تو یہاں سب کی نگاہیں بدلی ہوئی تھیں۔ شہر میں ایک ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ہمایوں نے لوگوں کی یہ روش دیکھی تو وہ آگرہ کے قلعہ میں بھی نہیں گیا بلکہ سیکری میں ٹھہر گیا اور اس نے مرزا ہندال کو آگرہ بھیج دیا۔ تاکہ وہ تمام شاہی خاندان کو نکال لائے اور جتنا بھی خزانہ لا سکتا ہے لے آئے۔ ہمایوں کی جان سیکری میں بھی محفوظ نہ تھی۔ چنانچہ ایک روز کسی نامعلوم شخص نے اس کے تیر مارا جو اس کے قریب ہی آن کر گرا، غرضکہ بادشاہ یہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور دہلی کے لئے روانہ ہو گیا خزانہ اور شاہی خاندان اس کے ہمراہ تھا۔ ۱۸ محرم ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) کو وہ دہلی پہنچ گیا۔ مرزا ہندال اور مرزا عسکری اور دوسرے اُمرائے سلطنت دہلی میں اس سے جُدا ہونے کے بعد اپنی جاگیروں اور ریاستوں میں چلے گئے۔

ہمایوں نے صرف دو دن دہلی میں قیام کیا۔ ۲۰ محرم ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) کو دہلی سے روانہ ہو کر وہ رہتک پہنچا، یہاں مرزا ہندال بھی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ رہتک کے بعد بادشاہ سرہند کے لئے روانہ ہوا۔ سرہند سے جالندھر اور جالندھر سے لاہور اپنے بھائی کامران کے پاس چلا گیا۔

شیر شاہ کی فوج ہمایوں کے تعاقب میں

ہمایوں قنوج کے قریب شکست کھانے کے

بعد جب فرار ہوا تو شیر شاہ نے آگے بڑھ کر شہر آگرہ، قلعہ آگرہ اور تمام نواحی علاقہ پر قبضہ جما لیا، اسکے بعد شیر شاہ ہمایوں کے تعاقب میں دہلی روانہ ہو گیا۔ جب شیر شاہ دہلی پہنچا تو ہمایوں دہلی سے جا چکا تھا۔ شیر شاہ نے دہلی کے شہر اور قلعہ پر قبضہ جما لیا۔ اس نے خود تو یہیں قیام کیا اور اپنی فوج کو ہمایوں کا پیچھا کرنے کے لئے بھیجدیا۔ چنانچہ شیر شاہ کی فوج نے ہمایوں کا سرہند تک پیچھا کیا۔ لیکن یہ فوج سرہند سے آگے اس لئے نہیں بڑھی کیونکہ شیر شاہ اور اس کے فوجی افسروں کو یہ اندیشہ تھا کہ پنجاب جہاں مرزا کامران کی حکومت ہے کہیں وہاں ان کو کسی نئی مصیبت کا سامنا کرنا نہ پڑ جائے۔ اسکے علاوہ شیر شاہ دہلی فتح کرنے کے بعد قطعی مطمئن ہو گیا تھا اور وہ آگے قدم بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

شاہی خاندان کو لاہور بھی چھوڑنا پڑا

شیر شاہ اگرچہ دہلی تک قابض ہو گیا تھا۔ لیکن مغلوں کی حکومت جو لاہور سے کابل اور قندھار تک پھیلی ہوئی تھی ابھی باقی تھی اگر ہمایوں اور اس کے بھائیوں میں اتحاد ہوتا تو وہ کابل اور قندھار سے نئی فوج لاکر شیر شاہ کو شکست دے سکتے تھے لیکن ان بھائیوں میں عناد اور دشمنی کا یہ عالم تھا کہ کامران نے درپردہ شیر شاہ سے نامہ و پیام شروع کر دیئے۔ اور شیر شاہ کو لکھا کہ "اگر پنجاب بدستور میرے قبضہ میں رہنے دیا جائے تو میں ہر خدمت کیلئے آمادہ ہوں"۔ مرزا کامران کا جو قاصد یہ پیغام لیکر شیر شاہ کے پاس گیا تھا اس سے شیر شاہ نے تمام پوست کندہ اندرونی حالات معلوم کر لئے۔ قاصد کی زبانی مرزا کامران کو تو تسلی دیدی لیکن مرزا کامران اور اس کے بھائیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانیکی غرض سے شیر شاہ خود لشکر لیکر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

بعض مؤرخوں کا کہنا ہے کہ مرزا کامران نے شیر شاہ سے پنجاب کو بچانے

کیلئے دربردہ کوئی معاہدہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے خود شیر شاہ کو پنجاب پر حملہ کی دعوت دی تھی کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اگر پنجاب باقی رہ گیا تو اسے ہمایوں ضرور واپس لے لیگا۔ خیر یہ تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا مرزا کامران نے شیر شاہ کو پنجاب پر حملے کی دعوت دی تھی یا شیر شاہ نے پنجاب پر خود حملہ کیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرزا کامران نے جب سُنا کہ شیر شاہ کی فوج لاہور آرہی ہے تو اس نے بغیر لڑے پنجاب چھوڑ دیا۔ حالانکہ اسکے پاس کافی تعداد میں فوج تھی۔ غرضکہ ہمایوں اسکے بھائی اور شاہی خاندان بغیر لڑے لاہور سے چناب کی طرف روانہ ہوگیا۔ مرزا کامران کی اس مشتبہ روش نے مرزا ہندال کو کامران سے اس قدر متنفر کردیا تھا کہ وہ مرزا کامران کو قتل تک کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا تھا لیکن ہمایوں نے باپ کی وصیت کا اعادہ کرتے ہوئے اسے اس فعل سے روک دیا تھا۔

مرزا کامران کی کابل کو روانگی

ہمایوں کوچ پر کوچ کرتا ہوا ہزارہ آیا یہاں مرزا کامران بھی مع اپنے لشکر کے بادشاہ کے پاس آگیا۔ اور بادشاہ سے کہا کہ "جب سے بندہ کابل سے ہندوستان آیا ہے تو مشاغل کی کثرت کی وجہ سے آرام کرنے کی کبھی فرصت نہیں ملی۔ میں اور میرے ملازم سب تھک گئے ہیں اسلئے میں چاہتا ہوں کہ کابل جاکر کچھ دن آرام کروں اور اس کے بعد نئی فوج کی تیاری کا کام شروع کروں۔ مجھ کو کابل جانے کی اجازت دی جائے"۔ ہمایوں سمجھ گیا کہ مرزا کامران اس لئے پہلے سے کابل پہنچ جانا چاہتا ہے تاکہ کہیں بڑا بھائی کابل پر قبضہ نہ جالے۔ ہمایوں نے اجازت دیدی اور کامران کابل کے لئے روانہ ہوگیا۔

ہمایوں کی دربدر ٹھوکریں

ہمایوں نے ہزارہ سے کشمیر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن مرزا ہندال اُسے اصرار کرکے

سندھ کی طرف لے گیا۔ اس کے بعد ہمایوں بہرہ پہنچا، پھر خوشاب آیا، اور اسکے بعد ہندال اور یادگار مرزا کے ہمراہ بھکر چلا گیا۔ وہاں سے گل بلوچ آیا۔ جہاں ہمایوں کو راستہ بھول جانے کی وجہ سے اور پانی کی کمی کی بنا پر سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ گل بلوچ کے علاقہ سے نکل کر بادشاہ تجستو لنکا آیا۔ جہاں کے راجہ نے بادشاہ کی خوب خاطر داری کی۔ یہاں سے چل کر ہمایوں نے دریائے سندھ کے کنارے اور بھکر کے سامنے قصبہ لہری کے ایک باغ میں قیام کیا۔ اور یہاں پر قلعہ بھکر اور سیہوان کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد ہمایوں پاتر میں آیا جو دریائے سندھ سے بیس میل کے فاصلہ پر تھا اور اپنے بھائی مرزا ہندال سے ملا۔

ہمایوں کی حمیدہ بیگم سے شادی

ہمایوں جب پاتر میں آیا تو مرزا ہندال کی والدہ دلدار بیگم نے بادشاہ کی دعوت کی۔ بہت سی بیگمات بھی اس دعوت میں شریک تھیں انہی شرکا میں سے ہندال کے استاد شیخ علی اکبر جامی کی بیٹی حمیدہ بیگم بھی تھی۔ جو بلا کی حسین تھی۔ بادشاہ اسکی صورت دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گیا، اس نے پوچھا کہ وہ کسی جگہ نامزد تو نہیں ہے جواب ملا کہ اسکی منگنی تو ہو گئی ہے مگر ابھی نکاح نہیں ہوا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ میں اس سے نکاح کروں گا چنانچہ ہمایوں کے ساتھ مریم مکانی حمیدہ بیگم کا نکاح کر دیا گیا۔ حمیدہ بیگم وہی قابل فخر خاتون ہے جس کے بطن سے امرکوٹ میں اکبر جیسا بادشاہ پیدا ہوا۔

ہمایوں کی وہی دشت نوردی

ہمایوں کو جب علاقہ بھکر میں رہتے ہوئے زیادہ دن ہو گئے تو وہ اپنی بیوی حمیدہ بیگم کو ساتھ لیکر ٹھٹھ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور یادگار مرزا کو بھکر کے محاصرہ کے لئے چھوڑ گیا۔ یہاں شاہ حسین نے یادگار مرزا پر ڈورے ڈال کر اپنا حامی اور

ہمایوں کا مخالف بنا لیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ یادگار مرزا اور شاہ حسین کی سازش سے بادشاہ کی رسد کی کشتیوں کو لوٹا گیا۔ اس کے آدمیوں کو قتل کیا گیا اور اس کے راستہ میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کی گئیں۔ یہاں تک کہ ہمایوں کو دریا پار کرنے کے لئے کشتیاں تک نہ دی گئیں آخر ہمایوں نے مویشی پکڑوا کر منگوائے ان کی کھال کی مشکیں بنوائیں اور ان پر بیٹھ کر دریا پار ہمایوں کے لشکر میں غلہ کی اس قدر کمی ہوگئی کہ اس کے سپاہی بھوکے مرنے لگے۔ کچھ بھاگ بھاگ کر دشمنوں سے جا ملے۔ غرضکہ ہمایوں کی مصیبتیں دن بدن بڑھتی ہی چلی گئیں۔ یادگار ناصر مرزا جو ہمایوں کا عزیز اور قوت بازو تھا۔ وہ بھی اس کی جان کا دشمن بن گیا۔ قاسم حسین بادشاہ سے کنارہ کرکے یادگار ناصر مرزا کے پاس چلا گیا۔ تردی بیگ اور منعم بیگ جیسے پرانے خدا کار بھی بھاگے جا رہے تھے کہ ہمایوں نے ان کو بڑی مشکل سے روکا غرضکہ سارا زمانہ ہی ہمایوں سے پلٹ چکا تھا۔

ہمایوں کی قدم قدم پر مخالفت

ہمایوں کو اس مصیبت میں راجہ مالدیو کا عریضہ ملا جس میں ہمایوں کو مالدیو آنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن بادشاہ نے مالدیو جانے سے قبل تحقیق حال کرایا تو پتہ چلا کہ راجہ مالدیو اس لئے بادشاہ کو بلا رہا ہے تاکہ بادشاہ کا سر کاٹ کر شیر شاہ کو بھیجنے کے بعد شیر شاہ کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ بادشاہ نے اس سازش کے انکشاف کے بعد مالدیو جانے کی بجائے جیسلمیر کے راستہ امر کوٹ جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب بادشاہ جیسلمیر پہنچا تو وہاں کا راجہ بھی بادشاہ کا دشمن ہو گیا۔ راجہ نے جیسلمیر کے تمام کنوؤں میں ریت بھروا دیا اور تالابوں پر پہرہ بٹھا دیا۔ تاکہ بادشاہ اور اس کے ساتھی پیاسے مر جائیں۔ چنانچہ جیسلمیر میں بادشاہ

کے بہت سے آدمی اور سواری کے جانور پیاس سے مر گئے۔

امرکوٹ میں اکبر کی پیدائش

بادشاہ جیسلمیر میں سخت تکلیف اور مصیبت اٹھانے کے بعد جب امرکوٹ آیا تو امرکوٹ کے راجہ نے اس کا شاہانہ استقبال کیا۔ اپنی فوج بادشاہ کی خدمت کے لئے پیش کر دی۔ بادشاہ کے پاس روپیہ نہیں رہا تھا۔ اس لئے اس نے ان تمام امرا کے روپیہ میں سے ایک حصہ لے لیا۔ جو اس کے ساتھ تھے۔ امرکوٹ کے قیام کے دوران میں ۵ رجب ۹۴۹ھ (۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء) کو حمیدہ بیگم کے بطن سے خدا نے ہمایوں کو بیٹا عطا کیا تو ہمایوں کو اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ اپنی ساری مصیبتوں کو بھول گیا۔

اُمرا مبارکباد پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تو ہمایوں کے پاس ان کو انعام و اکرام دینے کیلئے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اس وقت بالکل مفلوک الحال تھا۔ لیکن اسے یاد آیا کہ اسکے پاس ایک نافہ مشک ابھی باقی ہے۔ ہمایوں نے فوراً نافہ منگایا۔ اسکو توڑا اور چینی کی رکابی میں مشک کو نکال کر رکھا۔ اور اسکی ایک ایک چٹکی امیروں میں تقسیم کر دی اور دعا مانگی کہ اس مشک کی خوشبو کی طرح اس لڑکے کی شہرت بھی دنیا کے کونے کونے میں پھیل جائے اور اسکے بعد بیٹے کا نام جلال الدین محمد اکبر تجویز کیا۔

امرکوٹ میں ہمایوں کو زمانہ دراز کے بعد آرام و آسائش حاصل ہوئی تھی۔ اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ امرکوٹ کا راجہ ہمایوں کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ اس نے اپنا روپیہ پیسہ اور آدمی ہمایوں کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ امرکوٹ کے راجہ کی کوشش سے ہمایوں کے پاس پندرہ سولہ ہزار آدمیوں کا لشکر بھی جمع ہو گیا تھا لیکن خواجہ غازی نے ایک روز راجہ امرکوٹ سے کچھ ایسی بدتمیزی کی گفتگو کی جس سے یہ راجہ ناراض ہو گیا۔ اور اس نے ہمایوں سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ راجہ کے

جانیکے بعد دوسرے اُمرا بھی کھسک گئے اور ہمایوں بدستور بے یارو مددگار رہ گیا۔

بیرم خاں ہمایوں کے پاس

ہمایوں کا پُرانا رفیق بیرم خاں جو پندرہ سال کی عمر میں ہمایوں کی فوج میں بھرتی ہوا تھا کچھ مدت سے ہمایوں کی فوج سے الگ ہو گیا تھا بیرم خاں کی وفا شعاری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شیر شاہ نے اسے بڑے سے بڑا لالچ دیا لیکن اس نے اپنے پُرانے آقا کی مخالفت گوارا نہ کی اور جب اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ سخت مصیبت میں دن گزار رہا ہے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ بادشاہ کے پاس چلا آیا۔ ہمایوں کو اسکے آنے سے بہت خوشی ہوئی اور اس کے پست حوصلوں میں بیرم خاں کی وجہ سے ایک جان سی پڑ گئی۔

شاہ حسین اور ہمایوں کی صلح

ہمایوں اگرچہ بے تاج بادشاہ تھا اس کے ساتھی اور سپاہی بھی اس سے علحدہ ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ لائق سپہ سالار تھا۔ اس نے صوبہ سندھ میں قدم رکھنے کے بعد سے شاہ حسین کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ کبھی ہمایوں نے بھکر کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ کبھی سیہوان پر حملہ کیا۔ غرضکہ شاہ حسین اپنے ملک میں ہمایوں کے قیام کو ایک مستقل خطرہ سمجھ رہا تھا۔ اس لئے اس نے مجبور ہونیکے بعد ہمایوں سے ان شرائط پر صلح کر لی کہ بادشاہ شاہ حسین کے ملک کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ شاہ حسین دریا پار کرنے کیلئے بادشاہ کو تیس کشتیاں دیگا۔ اور ایک لاکھ مثقال نقد، دو ہزار خروار غلہ اور تین سو اونٹ نذر کریگا۔ ان شرائط کے مطابق ہمایوں نے ربیع الاول ۹۵۰ھ ۱۰ جولائی ۱۵۴۳ء کو دریا پار کر کے شاہ حسین کی حکومت سے چلا گیا۔ سندھ اور اسکے نواح میں ہمایوں ڈھائی برس تک رہا اور اس ساری مدت میں اس نے سخت سے سخت تکلیفیں برداشت کیں۔

ہمایوں کے قتل کیلئے بھائیوں کی سازش

شیر شاہ سے شکست کھانیکے

بعد ہمایوں چاہتا تھا کہ ہندوستان کے کسی نہ کسی حصہ میں مغلوں کی حکومت دوبارہ قائم ہو جائے۔ تاکہ وہ شیر شاہ سے انتقام لے سکے لیکن اسکے بھائیوں نے اور عزیزوں نے اسے کہیں بھی پاؤں جمانے کا موقعہ نہ دیا۔ وہ پنجاب کو مغلیہ حکومت کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ مگر کامران نے اسکے پاؤں پنجاب سے اکھاڑ دیئے وہ سندھ میں حکومت کے قیام کی کوششوں میں برابر لگا رہا۔ مگر یادگار ناصر مرزا نے شاہ سندھ سے سازش کر کے اسے وہاں بھی نہ جمنے دیا۔ ہندوستان میں ہر جگہ ناکام ہونیکے بعد آخر اس نے قندھار جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ قندھار سے نئی فوج بھرتی کرنے کے بعد وہ ہندوستان کو دوبارہ فتح کر سکے لیکن اسے یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس کا بھائی مرزا کامران جو کابل اور قندھار کا بادشاہ بنا ہوا ہے اس نے ہمایوں کی گرفتاری اور قتل کی تجاویز پہلے ہی سے تیار کر رکھی ہیں۔ لہٰذا ہمایوں نے مجبوراً یہ طے کیا کہ وہ مستنگ سے ہوتا ہوا عراق اور حجاز چلا جائے۔

مرزا عسکری کی ہمایوں کو گرفتار کرنیکی کوشش

ہمایوں نے خورد سال اکبر کو جس کی عمر صرف ایک سال تھی نوکروں کے سپرد کیا۔ حمیدہ بیگم کو گھوڑے پر بٹھایا۔ اور چالیس آدمیوں کو ساتھ لیکر جنگل کی طرف نکل گیا۔ ابھی تھوڑے ہی فاصلہ پر پہنچا تھا کہ اس کو اطلاع ملی کہ مرزا عسکری ایک بڑے لشکر کے ساتھ اسے گرفتار کرنے آ رہا ہے۔ ہمایوں نے محفوظ علاقہ کی جانب اپنے مختصر سے قافلہ کا رُخ موڑ دیا چنانچہ جب مرزا عسکری پہنچا تو ہمایوں بہت دُور نکل چکا تھا۔ مرزا عسکری کو بادشاہ کے نکل جانے کا بڑا افسوس ہوا۔

میر غزنوی جو شہزادہ اکبر کا محافظ تھا۔ جب مرزا عسکری کے پاس آیا تو مرزا نے کہا کہ میں تو صرف بھائی سے ملنے آیا تھا۔ وہ شاید کچھ اور سمجھ کر یہاں سے چل دیئے۔

دوسرے دن مرزا عسکری نے ہمایوں کے خیموں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ کچھ آدمیوں کو قید کر لیا۔ اور کچھ کو شکنجہ میں کس کر جان سے مار ڈالا۔ تردی بیگ سے اس کا روپیہ چھین لیا اور شہزادہ اکبر کو طلب کیا۔ میر غزنوی اور ماہم آغا (آنگہ) جب شہزادہ اکبر کو لے کر آئے تو مرزا عسکری نے اسے خوب پیار کیا۔ اور شہزادہ کو مع اس کے پرورش کرنے والوں کے ۱۸ رمضان ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) قندھار لے گیا اور اپنی بیوی سلطان بیگم کے سپرد کر دیا جس نے اکبر کی اولاد کی طرح پرورش کی۔

ہمایوں کی ایران کو روانگی

ہمایوں جب بلوچوں کے علاقہ سے گزرا تو بلوچ ڈاکوؤں اور چوروں کا مہمان ہوا جنہوں نے ہمایوں کی بے حد عزت اور خاطر داری کی۔ اس علاقے سے نکلنے کے بعد وہ گرم سیر پہنچا جو قندھار کا علاقہ تھا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ مرزا کامران کا لشکر اسے گرفتار کرنے آرہا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ جلدی سے سیستان میں جو شاہِ ایران کا علاقہ تھا داخل ہو گیا اور ایک جھیل کے کنارے مقیم ہو گیا۔ اس زمانہ میں ایران کا بادشاہ طہماسپ شاہ تھا۔ جو خاندان تیموریہ کا موروثی اور بہت پرانا دوست تھا۔ سیستان میں شاہ کی جانب سے احمد سلطان حاکم تھا جس نے شاہانہ طریقہ پر ہمایوں کی مہمانداری کی۔

ہمایوں کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ اس کے باپ کی وسیع حکومت کے ایک حصہ پر تو شیر شاہ نے قبضہ جما لیا۔ اسکے علاوہ کابل غزنی قندھار بدخشاں اور دوسرے ممالک جو باقی رہ گئے تھے۔ وہ ان بھائیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ جو اسکی جان کے دشمن تھے یعنی باپ کی اتنی بڑی حکومت میں اس کیلئے سر چھپانے کے لئے بھی جگہ نہ مل سکی اور اسے غیروں کی حکومت میں اپنے لئے پناہ ڈھونڈھنی پڑی۔ غرضکہ ہمایوں ہندوستان سے ترکِ وطن کرنے کے بعد ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں ایران چلا گیا +

تیرھواں باب

ہندوستان پر دوبارہ پٹھانوں کی حکومت

۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء تا ۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء

سوری پٹھانوں کی حکومت

ظہیر الدین بابر نے ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں لودھی پٹھانوں کو پانی پت کے میدان میں شکست دینے کے بعد ہندوستان میں مغلوں کی ایک نہایت ہی مستحکم حکومت قائم کردی تھی لیکن بابر کے مرنے کے بعد بابر کی اولاد محض خانہ جنگی کی بنا پر اس حکومت کو نہ سنبھال سکی۔ چنانچہ مغلوں کی یہ حکومت شیر شاہ کی فتح اور ہمایوں کی شکست کے بعد مغلوں کے ہاتھ سے نکل کر سوری پٹھانوں کے ہاتھ میں دوبارہ چلی گئی۔

جدید پٹھان حکومت کا بانی شیر شاہ سوری

شیر شاہ سوری جس نے کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال کر اس ملک میں پٹھانوں کی حکومت کی از سرِ نو بُنیاد رکھی۔ اس کی ابتدائی زندگی بڑی عجیب اور نہایت دلچسپ ہے۔ شیر شاہ کا دادا ابراہیم خاں سوری ان افغانی پٹھانوں کی نسل سے تھا جو سوری کہلاتے تھے اور کوہ سلیمان کے گردونواح میں آباد تھے۔ شیر شاہ کا دادا ابراہیم خاں سوری اور شیر شاہ کا باپ حسن خاں سوری سلطان بہلول لودھی کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آئے تھے۔ شیر شاہ سوری سلطان بہلول ہی کے دورِ حکومت میں حصار فیروزہ میں پیدا ہوا تھا۔

شیر شاہ کے دادا ابراہیم خاں سور نے ہندوستان آنے کے بعد سب سے پہلے پرگنہ ہریانہ اور بہکل کے جاگیردار مہابت خاں سور کی ملازمت اختیار کرلی تھی اس کے بعد حصار فیروزہ میں جمال سارنگ خاں کا ملازم ہوگیا تھا جس نے پرگنہ نارنول کے چند گاؤں ابراہیم خاں کو عنایت کردئے تھے۔ اسی طرح شیر شاہ کے باپ حسن خاں نے بھی ایک افغانی امیر خان اعظم مسندِ عالی عمر خاں سروانی حاکم لاہور

کی ملازمت اختیار کرلی تھی جس نے حسن خاں کی خدمات سے خوش ہوکر اسے پرگنہ شاہ آباد میں موضع بھادنی اور کئی گاؤں بطور جاگیر دیدئے تھے۔ ابراہیم خاں کے مرنے کے بعد حسن خاں کو اپنی جاگیر کے علاوہ نہ صرف باپ کی ساری جاگیر مل گئی بلکہ جمال سارنگ خاں نے اسے اور بھی چند دیہات عطا کر دئے تھے۔ اور اسکے بعد جب جمال سارنگ جونپور کا حاکم ہوا تو اس نے حسن خاں کو پرگنہ سہسرام حاجی پور۔ خاص پور اور ٹانڈہ دیکر پانچسو سوار کا جاگیردار مقرر کر دیا تھا غرضکہ اس طرح شیر شاہ کے باپ حسن خاں کو اچھی خاصی بڑی جاگیر مل گئی تھی۔

شیر شاہ عالم و فاضل تھا

شیر شاہ کے باپ حسن خاں کے آٹھ بیٹے تھے جنمیں سے فرید خاں (جو شیر شاہ کا اصلی نام تھا) اور نظام خاں تو پٹھان بیوی سے تھے اور دو بیٹے سلیمان اور احمد اس لونڈی سے تھے جس پر حسن خاں بُری طرح فریفتہ تھا۔ باقی چار بیٹے علی یوسف۔ خرم خاں اور شادی خاں دوسری دو بیویوں سے تھے۔ شیر شاہ کا باپ چونکہ لونڈی کی محبت میں بُری طرح گرفتار تھا۔ اس لئے نہ تو فرید خاں یعنی شیر شاہ کو پوچھتا تھا اور نہ اسکی ماں کو بس حسن خاں کے گھر پر اسکی محبوب لونڈی اور اسکے لڑکوں کی حکومت تھی۔ چنانچہ حسن خاں نے جاگیر کی تقسیم کے وقت بھی فرید خاں (شیر شاہ) کا کچھ خیال نہ کیا۔ اسی وجہ سے شیر شاہ باپ سے ناراض ہو کر جمال خاں حاکم جونپور کے پاس چلا گیا اور تحصیل علم میں مصروف ہو گیا۔ اس نے چند روز کے اندر اندر فارسی اور عربی میں بڑی قابلیت پیدا کرلی فلسفہ منطق اور تاریخ پر بھی اُسے اچھا خاصہ عبور حاصل ہو گیا اور اسے پٹھانوں میں ایک عالم و فاضل تصور کیا جانے لگا۔

پٹھانوں کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ حسن خاں نے ایک لونڈی کی محبت میں مبتلا ہونیکے بعد فرید خاں (شیر شاہ) جیسے لائق بیٹے کو جاگیر سے محروم

کر دیا ہے۔ حالانکہ بڑا بیٹا ہونے کے اعتبار سے وہی حسن خاں کا جائز جانشین تھا
چنانچہ ایک روز حسن خاں جب جونپور میں جمال خاں کے پاس آیا تو اس کے
بھائی بندوں اور عزیزوں نے جمع ہو کر اس بات پر بڑی لعنت ملامت کی
کہ اس نے لونڈی کے پھندے میں پھنس کر فرید خاں (شیر شاہ) جیسے لائق بیٹے
کو گھر سے نکال دیا ہے۔ حالانکہ قوم سور میں ایک آدمی بھی علم و فہم اور فراست
میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ برادری کے آدمیوں نے حسن خاں کو اس بات
کیلئے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے دونوں پرگنوں کی حکومت فرید خاں (شیر شاہ) کے سپرد
کر دے۔ برادری کے آدمیوں کے زور دینے پر حسن خاں اس کے لئے راضی ہو گیا
اور اس طرح باپ کے دو پرگنوں کی حکومت فرید خاں (شیر شاہ) کو مل گئی۔

شیر شاہ بہترین منتظم ثابت ہوا

ان پرگنوں کی حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد فرید خاں (شیر شاہ) نے
سب سے پہلے تو ان مفسدوں کو ان پرگنوں سے نکالا جو پرگنوں کے باشندوں کے
لئے مصیبت بنے ہوئے تھے اور اسکے بعد نیا انتظام قائم کر کے ان پرگنوں کی
آمدنی کو اتنا بڑھایا کہ ساری رعایا اور سپاہ مالا مال ہو گئی۔ ان پرگنوں کی خوش انتظامی
کی وجہ سے سارے صوبہ بہار میں فرید خاں (شیر شاہ) کی شہرت پھیل گئی لیکن تھوڑے ہی
عرصہ کے بعد دونوں پرگنے فرید خاں (شیر شاہ) کے قبضے سے نکل گئے اسکی وجہ یہ تھی
کہ فرید خاں (شیر شاہ) کے باپ کی چہیتی لونڈی نے اس پر زور دینا شروع کر دیا تھا
کہ یہ پرگنے اسکے بیٹے سلیمان کو دیدئے جائیں۔ اس پر گھر میں روزانہ جھگڑے رہنے
لگے اور معاملہ اتنا بڑھا کہ حسن خاں نے تنگ آ کر فرید خاں (شیر شاہ) کو لکھا کہ
میں جانتا ہوں کہ تو ہی ان پرگنوں کا جائز مستحق ہے اور تجھ سے بہتر ان پرگنوں کا انتظام
کوئی نہیں کر سکتا لیکن سلیمان کی ماں نے ان پرگنوں کی خاطر میری زندگی خراب کر رکھی

ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تو ان پرگنوں کو سلیمان کے حوالے کر دے تاکہ مجھ کو رات دن کے جھگڑوں سے نجات مل جائے۔ تیرے لئے روزگار کی کمی نہیں تو لائق ہے تجھ کو سب کچھ مل جائیگا۔" چنانچہ فرید خاں (شیر شاہ) نے باپ کے حکم کے مطابق یہ دونوں پرگنے سلیمان کے حوالے کر دئے اور خود تلاش روزگار میں آگرہ آ کر دولت خاں کا ملازم ہو گیا۔ دولت خاں بارہ ہزار سواروں کا سردار تھا۔ اور سلطان ابراہیم لودھی کے خاص آدمیوں میں سے تھا۔

باپ کے پرگنوں پر شیر شاہ کا قبضہ

(شیر شاہ) بڑا ہی سعادت مند بیٹا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو باپ کی زندگی ہی میں باپ کی جاگیر پر قبضہ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے محض باپ کے سکونِ قلب کی خاطر گھر کی جاگیر چھوڑ کر دوسروں کی نوکریاں کیں لیکن جب باپ مر گیا تو اس نے دولت خاں کے ذریعے سلطان ابراہیم لودھی سے ان پرگنوں کے لئے اپنے حق میں فرمان حاصل کر لیا اور باپ کے پرگنوں پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ فرید خاں (شیر شاہ) کا بھائی سلیمان پرگنوں کی حکومت سے محروم ہونیکے بعد محمد خاں شاہ خیل حاکم چونڈہ کے پاس فرید خاں (شیر شاہ) کی فریاد لیکر گیا۔ اور اسکو اپنا ہمنوا بنا لیا چنانچہ محمد خاں شاہ خیل نے ہر چند فرید خاں (شیر شاہ) پر زور دیا کہ پرگنوں کی حکومت میں سلیمان کو بھی شریک کر لے مگر وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔

فرید خاں (شیر شاہ) اس کیلئے تو تیار تھا کہ وہ پرگنوں کی آمدنی میں سے واجب حصہ سلیمان کو دیتا رہے لیکن وہ اس چیز کے حق میں نہ تھا کہ ایک علاقہ میں دو حاکم رہیں۔ فرید خاں (شیر شاہ) کے اس انکار پر محمد خاں حاکم چونڈہ اس کا مخالف ہو گیا اور اسے نیچا دکھانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ فرید خاں (شیر شاہ) جانتا تھا کہ حاکم چونڈہ اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اسلئے شیر خاں نے بہار خاں

پسر دریا خاں لوحانی کی ملازمت اختیار کر لی تاکہ وہ حاکم جونڈہ کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بابر دہلی کے تخت پر بیٹھ چکا تھا اور بہار خاں سلطان محمد خاں کا لقب اختیار کرنے کے بعد بہار کا بادشاہ بن گیا تھا۔

فرید خاں (شیر شاہ) چند روز کے اندر اندر حسن خدمات کی وجہ سے سلطان محمد کے مقربوں میں شمار ہونے لگا۔ فرید خاں (شیر شاہ) کے حسن انتظام کی وجہ سے سارے بہار میں اسکی شہرت ہو گئی سلطان محمد ہی نے شیر شاہ کو جس کا اصلی نام فرید خاں تھا۔ تلوار سے شیر مارنے پر شیر خاں کا خطاب دیا تھا۔ جسکے بعد وہ شیر خاں کے نام سے مشہور ہوا شیر شاہ کافی مدت تک سلطان محمد کی خدمت میں رہا لیکن اسے اپنے پرگنوں کے انتظام کے لئے رخصت لیکر جانا پڑا اور وہاں وہ ایسا الجھا کہ نکل ہی نہ سکا۔

شیر شاہ کے پرگنوں پر تلوار کے زور سے قبضہ

محمد خاں حاکم جونڈہ جو مدت سے شیر شاہ کی تاک میں تھا جب اس نے دیکھا کہ شیر شاہ سلطان محمد والیٔ بہار کی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر اپنے پرگنوں میں جا بیٹھا ہے تو اس نے سلطان محمد کو شیر شاہ کے پرگنوں کی ضبطی کے لئے ابھارا اور مشورہ دیا کہ یہ پرگنے اس سے نکال کر اسکے بھائی سلیمان خاں کو دیدئے جائیں جو شیر شاہ کے مقابلے میں بہت زیادہ لائق فائق ہے سلطان محمد نے جواب دیا کہ " بلا وجہ پرگنوں کی ضبطی یا منتقلی تو مناسب نہیں معلوم ہوتی لیکن بہتر یہ ہے کہ تم کسی طرح ان بھائیوں میں تصفیہ کرا دو۔ یہ معاملہ میں تمہارے ہی فیصلہ پر چھوڑتا ہوں" محمد خاں حاکم جونڈہ کو جب سلطان محمد کی طرف سے اتنا سہارا مل گیا تو اس نے فوراً فوج کشی کر کے شیر شاہ کے پرگنوں پر حملہ کر دیا شیر شاہ نے مردانہ وار مقابلہ کیا مگر اسے شکست ہو گئی اور یہ دونوں

پرگنے بزور شمشیر شیر شاہ کے بھائی سلیمان کو حاکم جونڈہ کی عنایت سے مل گئے۔ یہ شیر شاہ پر پہلی کاری ضرب تھی جس نے کہ اس کی سپاہیانہ غیرت کو بیدار کیا۔

شیر شاہ کا حاکم جونڈہ پر حملہ

پرگنوں سے محروم ہونے کے بعد شیر شاہ کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ بہار کے بادشاہ سلطان محمد کے پاس جائے اور اس سے مدد لے۔ مگر شیر شاہ جانتا تھا کہ سلطان محمد ذرا سی بات کے لئے محمد خاں حاکم جونڈہ سے لڑنا پسند نہیں کریگا، لہٰذا اس نے مغلوں سے ساز باز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ کے بعد وہ پٹنہ میں آیا اور سلطان جنید برلاس کے پاس اپنا وکیل بھیج کر عرض کیا کہ "اگر سلطان قول دیں کہ مجھے آزار نہ پہنچائیں گے تو میں دل و جان سے آپ کی خدمت کیلئے تیار رہوں"۔ شیر شاہ کی شہرت کیونکہ اس علاقہ میں کافی پھیل چکی تھی۔ اس لئے سلطان جنید برلاس نے اسے اپنے لئے مفید سمجھتے ہوئے ملازمت میں لے لیا اور اپنا لشکر اس کے سپرد کر دیا۔ شیر شاہ نے اس لشکر کے ذریعے نہ صرف اپنے پرگنے واپس لے لئے۔ بلکہ محمد خاں حاکم جونڈہ پر حملہ کرکے جونڈہ اور چند دوسرے علاقوں کو بھی فتح کر لیا اور اس کے بعد افغانوں کو لشکر میں زیادہ سے زیادہ بھرتی کرکے اپنی طاقت کو خوب بڑھا لیا۔ شیر شاہ نے یہ مہربانی کی کہ جونڈہ کا علاقہ محمد خاں کو پھر واپس کر دیا۔ جس کی وجہ سے محمد خاں ہمیشہ شیر شاہ کا ممنون احسان رہا۔

شیر شاہ کو مغلوں سے نفرت

حالات و واقعات سے مجبور ہو کر شیر شاہ اگرچہ مغلوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا اور وہ چندیری کی مہم میں، اور چند دوسری لڑائیوں میں بابر کے دوش بدوش لڑ بھی چکا تھا لیکن اس کو فطری طور پر مغلوں سے نفرت تھی۔ وہ مغلوں

کے طریق جنگ کو ہمیشہ ناقص خیال کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ "اگر قسمت ساتھ دے تو میں مغلوں کو بڑی آسانی کے ساتھ ہندوستان سے نکال سکتا ہوں" جب افغان اس کی یہ باتیں سنتے تھے تو مذاق اڑاتے تھے۔

عباس خاں مولف تاریخ شیر شاہی لکھتا ہے کہ "شیر شاہ نے میرے چچا شیخ محمد سے پٹھانوں کے ایک مجمع میں کہا کہ "تم اس بات کے گواہ رہنا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر قسمت نے یاوری کی تو میں بہت جلد مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افغان جنگ اور شمشیر زنی میں مغلوں سے بہت بہتر ہیں افغانوں نے ہندوستان کی سلطنت محض خانہ جنگی کی وجہ سے کھو دی ہے۔ حالانکہ وہ مغلوں سے کہیں زیادہ اپنے اندر حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں نے مغلوں میں رہ کر انکی جنگی روش کو بغور دیکھا ہے۔ مغل میدانِ جنگ میں استقلال کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے۔ انکے بادشاہ ملکی معاملات میں حصہ لینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور ملکی امور ان ارکان حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں جو زر کے بندے ہیں۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو آپ دیکھ لیں گے کہ میں کس طرح افغانوں کو متحد کرتا ہوں۔ انشاء اللہ پھر ان میں نفاق پیدا کرنا ناممکن ہو جائے گا" یہ تھے مغلوں کے بارے میں شیر شاہ کے خیالات۔

شیر شاہ شہنشاہ بابر کی دعوت میں

شیر شاہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں کہ وہ مغلوں کی فوج میں سردار تھا۔ اسے بابر بادشاہ کی ایک دعوت میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ اس دعوت میں جب اس نے بھنی ہوئی مرغی کو بے تکلف چھری سے کاٹ کاٹ کر کھانا شروع کیا اور بابر کی نظر اس پر پڑی تو اسی وقت

بابر نے اپنے وزیر میر خلیفہ کے کان میں کہا کہ "تم کو اس شیر خاں سے بے خبر نہیں رہنا چاہیئے۔ ہر وقت اس پر نگاہ رکھو اس کے بشرہ پر بادشاہی کے آثار مجھے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے بہت بڑے بڑے افغان رئیس اور امیر دیکھے ہیں مگر جو شوکت و حشمت شیر خاں کے چہرے سے عیاں ہے وہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھی جب سے میری نظر اس پر پڑی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے فوراً گرفتار کر لوں" میر خلیفہ جو سلطان جنید کا بھائی تھا۔ اس نے یہ کہہ کر معاملہ کو ٹال دیا کہ "اس کے پاس نہ سپاہ ہے اور نہ زر پھر اس سے کس بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے اس جیسے بے حقیقت آدمی کو بلا وجہ گرفتار کر کے پٹھانوں میں بد ظنی پیدا کرنا کوئی دانشمندی نہیں" بادشاہ یہ سن کر خاموش ہو گیا لیکن شیر شاہ نے بابر کی نظروں سے سب کچھ سمجھ لیا۔ وہ کھانے کے دوران ہی میں موقع پا کر باہر آ گیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر چلتا بنا۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے دیکھا تو وہ مجلس سے غائب تھا۔ بادشاہ نے اسے تلاش کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ جا چکا ہے۔ بادشاہ نے خلیفہ سے کہا کہ "اگر تم منع نہ کرتے تو میں ضرور اس کو گرفتار کر لیتا۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور کوئی اہم حیثیت حاصل کر کے رہے گا۔

شیر شاہ ملک بہار کا مالک و مختار

شیر شاہ بابر کی دعوت سے فرار ہونے کے بعد سیدھا اپنی جاگیر میں آیا۔ اور سب سے پہلے سلطان جنید برلاس کے تزکیہ قلب کے لئے قیمتی تحائف بھیجے اور عریضہ ارسال کیا کہ "میں اپنے بھائی نظام خاں کے بلانے سے اچانک بادشاہ سے رخصت لئے بغیر اپنی جاگیر میں آ گیا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا مخالف سلیمان۔ بہار کے بادشاہ سلطان محمد کو میرے خلاف بھڑکا رہا ہے اور بادشاہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میں نے مغلوں کی ملازمت کر لی ہے چونکہ مجھ کو اپنی

جاگیر کے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں یہاں آگیا ہوں میں آپ کا ہر وقت خادم ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے بجالاؤں گا۔"

سلطان جنید برلاس کو اس طرح بھٹکنے کے بعد شیر شاہ اپنے پرانے "آقا" سلطان محمد شاہ بہار کے پاس چلا گیا۔ جو اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ اور اسے فوراً اپنے خورد سال بیٹے جلال خاں کا اتالیق اور نگران بنا دیا جب سلطان محمد کا انتقال ہوا تو جلال خاں اس کا جانشین ہوا۔ جلال خاں کی عمر چونکہ کم تھی اس لئے جلال خاں کی ماں ملکہ دودو اس کی بجائے بہار پر حکمرانی کرتی تھی۔ شیر شاہ بدستور جلال خاں کا نگراں اور اتالیق رہا۔ ملکہ دودو کے مرنے کے بعد شیر شاہ نائب سلطنت بن گیا اب وہ سارے بہار کا مالک و مختار تھا۔

اسی زمانہ میں بنگال اور گور کے بادشاہ سلطان محمود نے یہ دیکھتے ہوئے کہ بہار کے تخت پر ایک خورد سال لڑکا بیٹھا ہوا ہے۔ بہار پر حملہ کر کے اسے فتح کرنے کا ارادہ کیا شیر شاہ نے ہر چند کوشش کی کہ جنگ ٹل جائے۔ مگر بنگالیوں نے قطب خاں کی سرکردگی میں بہار پر حملہ کر دیا شیر شاہ اور دوسرے افغانوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے شاہ بنگال کے لشکر کو شکست دیدی۔ اس لڑائی میں بہت سے ہاتھی گھوڑے اور بے اندازہ خزانہ شیر شاہ کے ہاتھ لگا۔ جس سے کہ وہ بے حد دولتمند ہو گیا۔

لوحانی پٹھانوں نے شیر شاہ کو نکال دیا

بہار کا خورد سال بادشاہ جلال خاں چونکہ لوحانی پٹھانوں کی نسل سے تھا۔ اس لئے اس کی حکومت میں لوحانی پٹھانوں کو بہت زیادہ دخل تھا۔ یہ سب کے سب لوحانی پٹھان شیر شاہ سے جو کہ سوری پٹھان تھا عناد رکھنے لگے اور شیر شاہ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ شیر شاہ کی خوش قسمتی کہ ان لوحانی پٹھانوں ہی کی ایک جماعت اپنی قوم کے پٹھانوں سے الگ ہو کر شیر شاہ سے مل گئی۔ اور شیر شاہ کو لوحانی پٹھانوں کے

خوفناک ارادوں سے قبل از وقت مطلع کر دیا۔ شیر شاہ نے یہ رنگ دیکھا تو بادشاہ سے کہا کہ مجھ میں اور لوحانی پٹھانوں میں کشیدگی حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اب اس حکومت میں یا تو میں ہی رہ سکتا ہوں یا لوحانی پٹھان ہی رہ سکتے ہیں۔ اس لئے آپ اس معاملہ میں فیصلہ کر دیجئے۔ بادشاہ جو کہ خود بھی لوحانی پٹھان تھا۔ اور اپنے ہم قوموں سے ڈرتا تھا۔ اس نے شیر شاہ کو اس کی خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ اور خلعت دے کر اسے رخصت کر دیا۔ شیر شاہ اپنی جاگیر سہسرام میں چلا آیا۔ اور افغانوں کا ایک بڑا لشکر جمع کر لیا۔

شیر شاہ اور شاہ بنگال کی جنگ

لوحانی پٹھانوں نے شیر شاہ کو بہار کے پاس سے نکلوا تو دیا۔ مگر ان سب کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں شیر شاہ حملہ کر کے بہار کو فتح نہ کر لے۔ اس لئے انھوں نے بہار کے خورد سال بادشاہ جلال خاں کو یہ مشورہ دیا کہ قبل اس کے کہ شیر شاہ بہار پر حملہ کرے بادشاہ کو چاہئے کہ وہ بنگال جا کر خود ہی اپنے ملک بہار کو شاہ بنگال کی نذر کر دے۔ اور شاہ بنگال کی اطاعت اختیار کرنے کے بعد بہار واپس آجائے تاکہ اس طرح ایک طرف تو شاہ بنگال کے حملہ کا خوف جاتا رہے اور دوسری جانب شیر شاہ یا مغل اگر بہار پر حملہ کریں تو شاہ بنگال کی مدد سے ان کو شکست دی جا سکے چنانچہ اس مشورہ کے مطابق خورد سال بادشاہ جلال خاں نے شاہ بنگال کے پاس جا کر ملک بہار کو شاہ بنگال کے حوالے کر دیا۔ اور شاہ بنگال کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی فوج فوراً بہار روانہ کر دے تاکہ شیر شاہ کے ارادوں کا پتہ چل جائے اگر شیر شاہ مقابلہ پر آئے تو اس سے جنگ کی جائے۔

اس تجویز کے مطابق شاہِ بنگال کی فوج بہار پر قبضہ جمانے کے لئے روانہ ہو گئی جب شیر شاہ کو معلوم ہوا کہ لوحانی پٹھان اور بادشاہ بنگال پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے

شاہ بنگال سے ملک بہار کا سودا کر لیا ہے تو وہ اپنے لشکر کو لے کر بنگالی فوج کے
مقابلے کے لئے آ گیا۔ شیر شاہ پہلے تو اپنے خام قلعہ کے اندر محصور ہو کر لڑتا رہا لیکن
اس کے بعد قلعہ سے نکل کر اس نے بنگالی لشکر پر ایسا سخت حملہ کیا کہ بنگالی لشکر
کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شیر شاہ کو فتح ہوئی۔ بہار کا خزانہ جواہرات ہاتھی گھوڑے
توپخانہ اور بے اندازہ سامان شیر شاہ کے ہاتھ آیا۔ شیر شاہ کا اگرچہ پوری طرح بہار پر تسلط
نہیں ہوا تھا لیکن اس نے فوراً ملک میں امن وامان اور تجارت کو بحال کرنے کے
انتظامات شروع کر دئے۔

شیر شاہ کا چنار کے قلعہ پر قبضہ

بہار کے اس معرکہ کے فوراً ہی بعد شیر شاہ کے ہاتھ چنار کا اہم ترین
قلعہ بھی آ گیا۔ یہ قلعہ تاج خاں سارنگ کی بیوہ لاڈو بیگم کے قبضہ میں تھا۔ لاڈو بیگم کے
سوتیلے بیٹے جب اس کے مخالف ہو گئے تو اس نے شیر شاہ سے سلسلہ جنبانی شروع
کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیر شاہ اور لاڈو بیگم کا نکاح ہو گیا۔ اور اس طرح یہ قلعہ اور قلعہ
کے گردو نواح کا تمام علاقہ اور اس کی تمام فوج شیر شاہ کے قبضے میں آ گئی اور اس
کے ساتھ ہی بیگم نے شیر شاہ کو ڈیڑھ سو قیمتی جواہرات سات من موتی، ڈیڑھ سو من سونا
اور بہت سی قیمتی اشیاء بھی دیں، غرضکہ شیر شاہ کو اپنی حکمتِ علمی سے بغیر کسی مشقت
کے مستحکم ترین قلعہ مل گیا، بہت بڑا خزانہ بھی ہاتھ آ گیا۔ اور اس کی فوجی طاقت میں بھی
نمایاں اضافہ ہو گیا۔

بہار میں شیر شاہ کا ایک دوسرا رقیب

شیر شاہ جس نے کہ بہار کو شاہ بنگال کی فوجوں سے
لڑ کر فتح کیا تھا۔ ابھی پوری طرح بہار پر قبضہ بھی نہیں جمانے پایا تھا کہ بہار میں اس کا
ایک دوسرا رقیب سلطان محمود کود پڑا۔ جسے حال ہی میں بابر کے مقابلے میں

فتحپور سیکری میں شکست ہوئی تھی۔ سلطان محمد کا خسر مسند عالی اعظم ہمایوں ثانی، مسند عالی عیسیٰ خاں نبیرہ مسند عالی عمر خاں سابق حاکم لاہور اور دوسرے پٹھان اُمراء جو بہار میں تھے انھوں نے سلطان محمود کو پٹنہ بلا کر بادشاہ بنا دیا تھا۔ شیر شاہ کو سلطان محمود کی آمد اگرچہ بے حد ناگوار گذری لیکن وہ سیاست ملکی کے اعتبار سے یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس نازک وقت میں تمام پٹھان اُمراء سے مخالفت مول لے کر اپنے لئے نئی مشکلات پیدا کر لے۔ اور نہ اس وقت شیر شاہ سلطان محمود کے لشکر سے لڑنے کے لئے تیار تھا۔ اس لئے مصلحتِ وقت دیکھ کر شیر شاہ بھی سلطان محمود کے پاس چلا آیا۔ سلطان محمود نے شیر شاہ کو دیکھ کر کہا "تم کو میرے آنے سے کسی تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ میں عارضی طور پر بہار آگیا ہوں۔ جب میرا جونپور پر قبضہ ہو جائے گا تو بہار تم کو دیدوں گا۔ بہار تمہارا ہی حق ہے۔ تم نے اپنی تلوار کے زور سے شاہِ بنگال کو شکست دے کر اسے فتح کیا ہے۔" اور یہ کہنے کے بعد بہار کی واپسی کے لئے ایک فرمان لکھ کر شیر شاہ کو دیدیا۔

سلطان محمود کچھ دن کے توقف کے بعد اپنے لشکر کو لیکر آگے بڑھا۔ اس نے لکھنؤ اور کٹرہ مانک پور پر قبضہ جما لیا۔ ہمایوں بھی اس کے مقابلہ پر لکھنؤ کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ شیر شاہ جو پہلے ہی سلطان محمود کے آنے سے بددل تھا۔ اس نے ہمایوں سے کہلوا بھیجا کہ سلطان محمود مجھے زبردستی پکڑ لایا ہے جس روز جنگ ہوگی میں نہیں لڑوں گا۔ بغیر لڑائی کے چلا جاؤں گا اور اس طرح سلطان محمود کو شکست ہو جائے گی۔" ہمایوں نے جواب دیا کہ "جو کچھ تم نے کہا ہے اگر وہ سچ ہوا تو ہماری جانب سے تمہاری ہر قسم کی سرفرازی ہوگی۔" چنانچہ جب دونوں لشکروں میں جنگ ہوئی تو شیر شاہ اپنے وعدہ کے بموجب مع اپنے لشکر کے لڑے بغیر چلا گیا اور سلطان محمود کو شکست ہو گئی۔ اس طرح شیر شاہ نے اپنے رقیب کو بھی مغلوب

سے ختم کرا دیا اور مغلوں پر اپنا احسان بھی رکھ دیا۔

ہمایوں نے قلعہ چنار کا محاصرہ کرلیا

سلطان محمود کو شکست دینے کے بعد ہمایوں نے ہندو بیگ کے ذریعہ قلعہ چنار کا مطالبہ کیا۔ شیر شاہ نے انکار کر دیا۔ اور اپنے بیٹے جلال خاں کو قلعہ میں چھوڑ دیا، اور اہل و عیال کو لے کر کوہستان بہار کنڈہ میں چلا گیا۔ شیر شاہ کے جانے کے بعد ہمایوں نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ جلال خاں بڑی بہادری کے ساتھ ہمایوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

شیر شاہ کو اس بات کا علم تھا کہ گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ نے منڈو پر قبضہ کرلیا ہے اور وہ دہلی کے فتح کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ اس لئے ہمایوں زیادہ مدت تک یہاں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ چنانچہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیر شاہ نے اپنے وکیل کو ہمایوں کے پاس بھیج کر کہلوایا کہ "آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں جنید برلاس کا تربیت یافتہ ہوں، اس کے علاوہ جنگ لکھنؤ میں میں نے جو خدمت انجام دی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے مجھ کو امید ہے کہ آپ اپنے اس خادم قدیم ہی کے پاس قلعہ چنار رہنے دینگے۔ میں ضمانت میں اپنے بیٹے قطب خاں کو آپ کی خدمت میں چھوڑنے کے لئے تیار ہوں"۔ ہمایوں جو خود دہلی واپس جانے کے لئے مضطرب تھا۔ اس نے شیر شاہ کی یہ شرط قبول کرلی اور قلعہ چنار کے محاصرہ سے دستکش ہونے کے بعد آگرہ چلا گیا۔ اور پھر سلطان بہادر شاہ کے خلاف گجرات کی لڑائیوں میں مصروف ہو گیا۔ غرضکہ شیر شاہ کو فرصت مل گئی۔ اس نے بہار میں اپنے مخالفوں میں سے کسی ایک کو بھی باقی نہیں چھوڑا۔ اور افغانوں کو جمع کرنے کے بعد اپنی فوجی طاقت کو خوب بڑھا لیا۔

شیر شاہ بڑا ہی خوش قسمت انسان تھا۔ بہار کا خزانہ اسے پہلے ہی مل چکا

تھا۔ لاڈو بیگم سے نکاح کے بعد ایک دوسرا خزانہ اس کے ہاتھ اور لگ گیا تھا۔ اسکے علاوہ تیسرا خزانہ اس طرح اسے ملا کہ سلطان بہلول لودھی کے بھانجے کالا پہاڑ کی بیٹی بی بی فتح ملکہ جس کے پاس بے اندازہ زر و جواہر تھا۔ اپنا سارا خزانہ لیکر شیر شاہ کی پناہ میں آگئی۔ شیر شاہ نے اس سے خزانہ کا بیشتر حصہ لیکر معقول جاگیر دیدی اور اس خزانہ سے اپنے لشکر کو اور بھی بڑھا لیا۔

شیر شاہ اور ہمایوں کی عارضی صلح

گجرات کے معرکہ کے بعد جب ہمایوں آگرہ آیا تو اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ سب سے پہلے شیر شاہ کی جانب متوجہ ہو کیونکہ اس کی طاقت دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہمایوں نے شیر شاہ کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں اس نے ہندو بیگ کو جونپور کی طرف بھیجا تا کہ وہ شیر شاہ کے حالات معلوم کرنیکے بعد اسے لکھے شیر شاہ کو جب معلوم ہوا کہ ہمایوں اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور اس نے ہندو بیگ حاکم جونپور کو تحقیق حال کے لئے مقرر کیا ہے تو شیر شاہ نے ہندو بیگ کو قیمتی تحائف بھیجنے کے بعد کہلوایا کہ "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ ہمایوں بادشاہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں لیکن مجھ کو اس ناراضگی کا سبب کچھ نہیں معلوم ہو سکا حالانکہ میں نے ہمایوں بادشاہ سے جتنے بھی وعدے کیے تھے ان میں آج تک سر مو فرق نہیں آیا۔ میں نے آج تک ان کے ملک کے کسی حصہ میں دخل نہیں دیا۔ آپ مہربانی فرما کر میری خیر خواہی کا اظہار بادشاہ سے کر کے ان کو اس طرف آنے سے باز رکھیے اور ان سے کہہ دیجئے کہ میں بھی ان کے خادموں اور دولت خواہوں ہی میں سے ہوں۔" ہندو بیگ نے شیر شاہ کے وکیل سے کہدیا کہ "جب تک میں موجود ہوں شیر شاہ کسی قسم کا تردد نہ کرے۔"

شیر شاہ کے وکیل ہی کے سامنے ہندو بیگ نے بادشاہ کو عرضداشت

لکھی کہ "میں نے یہاں آکر حالات معلوم کئے تو پتہ چلا کہ حضور کے دولت خواہوں میں سے شیر شاہ بھی ہے وہ حضرت کے نام کا خطبہ پڑھواتا ہے اور سکہ چلاتا ہے اس نے حضور کے ملک کی حدود میں کبھی دست اندازی نہیں کی اور نہ کوئی ایسا کام کیا، جو حضور کی برہمی کا باعث ہو۔ اس لئے اسکی جانب حضور کا قدم رنجہ فرمانا بے ضرورت ہوگا، اور اس سے خواہ مخواہ حضور ہی کو تکلیف ہوگی" ہندو بیگ کی اس عرضداشت کے بعد ہمایوں نے ایک سال تک شیر شاہ کی جانب توجہ نہیں کی۔

شیر شاہ نے اس مدت میں اپنے بیٹے جلال خاں اور افسر اعلیٰ خواص خاں اور دوسرے امیروں کو بنگال کی فتح کے لئے روانہ کر دیا۔ شاہِ بنگال سلطان محمود جس میں کہ شیر شاہ کے مقابلے کی تاب نہ تھی۔ بھاگ کر شہر گور چلا گیا۔ افغانوں نے پہلے تو گرد و نواح کا سارا ملک فتح کیا۔ اس کے بعد قلعہ گور کا محاصرہ کر لیا۔

ہمایوں کا شیر شاہ پر حملہ

شیر شاہ کو اگرچہ مغلوں سے ایک قسم کا بغض و عناد ضرور تھا، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے بار بار ہمایوں سے صلح کرنے کی کوشش کی لیکن مغل کیونکہ شیر شاہ کو کمزور سمجھتے تھے اور ان کو یہ زعم تھا کہ وہ جب چاہیں گے شیر شاہ اور افغانوں کو دبا لیں گے۔ اس لئے یہ صلح زیادہ مدت تک برقرار نہ رہ سکی۔ چنانچہ ایک سال قبل ہندو بیگ کے ذریعہ شیر شاہ نے بادشاہ ہمایوں کو صلح اور اطاعت کا جو پیغام بھیجا تھا اسے اگرچہ ہمایوں نے منظور کر لیا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی ہمایوں شیر شاہ کے مقابلے کے لئے روانہ ہو گیا اور قلعہ چنار کا محاصرہ کر لیا۔ شیر شاہ کو چونکہ یہ یقین تھا کہ وہ قلعہ چنار کو ہمایوں سے محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ اس لئے وہ اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کو لیکر قلعہ چنار سے نکل گیا۔ اور قلعہ کو اپنے

بیٹے جلال خاں کے سپرد کر گیا جس نے کہ ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) میں چھ مہینے تک ہمایوں کو اس قلعہ کی جنگ میں اُلجھائے رکھا۔

شیر شاہ کو قلعہ چنار سے محروم ہونے کے بعد ایسے ہی کسی دوسرے قلعہ کی ضرورت تھی لہٰذا اس نے نہایت چالاکی کے ساتھ راجہ رہتاس سے قلعہ رہتاس حاصل کر لیا۔ اور راجہ کو اس قلعہ سے نکال دیا۔ قلعہ رہتاس ملنے کے بعد شیر شاہ نے اپنا مال و خزانہ اور اہل و عیال کو اس قلعہ میں رکھا۔ کچھ لوگوں کو قلعہ بہرہ کندہ میں بھیج دیا۔ اور خود بنگال کی فتح میں مصروف ہو گیا۔ ہمایوں اور اس کے لشکر کی جانب سے وہ اس لئے بے فکر تھا کیونکہ اس کے بیٹے جلال خان نے ہمایوں کو قلعہ چنار میں اُلجھا رکھا تھا۔ چنانچہ ہمایوں تو قلعہ چنار کے چکر میں پھنسا رہا اور شیر شاہ نے بڑی بے فکری کے ساتھ سارے بنگال پر قبضہ جما لیا۔ بنگال کا بادشاہ شیر شاہ کے مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ گیا۔

شیر شاہ اور ہمایوں میں صلح کی گفتگو

ہمایوں قلعہ چنار فتح کرنے کے بعد جب بنارس آیا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ شیر شاہ سارے بنگال پر قابض ہو چکا ہے تو اس نے یہی مناسب سمجھا کہ شیر شاہ جیسے مضبوط دشمن سے صلح کرنے کے بعد اسے دوست بنا لیا جائے۔ چنانچہ ہمایوں کا وکیل صلح کی بات چیت کے لئے شیر شاہ کے پاس پہنچا۔ شیر شاہ نے اس کی بڑی عزت کی۔ اور صلح پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ہمایوں کے وکیل سے کہا کہ وہ اگر بادشاہ بنگال سے دستبردار ہو جائے تو میں اس کے لئے بھی آمادہ ہوں کہ بہار بادشاہ کے سپرد کر دوں اور بنگال سے بھی بادشاہ کو دس لاکھ روپے سالانہ بھیجتا رہوں گا بشرطیکہ بادشاہ آگرہ واپس چلا جائے۔ ہمایوں کے وکیل نے واپس آنے کے بعد جب ہمایوں کو شیر شاہ کی شرائط بتائیں تو

ہمایوں بے حد خوش ہوا کیونکہ ہمایوں بنگال سے زیادہ بہار لینے کے لئے مضطرب تھا۔ اور شیر شاہ نے خود ہی اس علاقہ کی پیش کش کی تھی۔ چنانچہ بادشاہ نے شیر شاہ کی شرائط کو قبول کر لیا۔ اور شیر شاہ کے پاس شرائط صلح کی منظوری اور خلعت بھی روانہ کر دی لیکن دو تین دن ہی کے بعد بنگال کے بادشاہ سلطان محمود کا وکیل جب ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے شیر شاہ کو مغلوں کے مقابلے میں بے حقیقت ظاہر کرتے ہوئے بنگال کے فتح کرنیکی ترغیب دی تو ہمایوں نے اپنے وعدے اور نتائج کی پروا کئے بغیر بنگال پر لشکر کشی کا حکم دیدیا۔ ہمایوں کا یہ غلط اقدام ہی آگے چل کر اس کی تباہی اور بربادی کا باعث بنا۔

بنگال پر حملہ اور شیر شاہ سے جنگ

جب شیر شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ ہمایوں اپنے وعدے اور صلح کا پاس نہ کرتے ہوئے بنگال کی طرف آرہا ہے تو اس نے ہمایوں کو بنگال میں گھیر کر ختم کرنے کی وہ اسکیم بنائی جس کا تذکرہ ہم ہمایوں کے حالات کے سلسلہ میں کر چکے ہیں یعنی شیر شاہ نے یہ طے کیا کہ بغیر لڑے ہوئے ہمایوں کو بنگال میں آنے دیا جائے۔ اور کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے لیکن جب ہمایوں اور اس کا سارا لشکر بنگال میں آجائے تو بہار پر پوری طرح قبضہ جمانے کے بعد اس کی واپسی کا راستہ روک دیا جائے اور اس طرح ہمایوں اور مغلوں کے سارے لشکر کو گھیر کر ختم کر دیا جائے۔

شیر شاہ لاجواب سپہ سالار اور بہترین جنگی شاطر ہونے کے علاوہ بلا کا فطرت شناس تھا۔ اس کو اس بات کا علم تھا کہ ہمایوں بے حد عشرت پسند واقع ہوا ہے چنانچہ دارالسلطنت بنگال کے قلعہ گور کو اس نے بنگال سے جاتے ہوئے خوب آراستہ کیا۔ اسمیں عشرت کا تمام سامان فراہم کر دیا۔ تاکہ ہمایوں جب اس قلعہ

میں آئے تو قلعہ کی دلچسپیوں میں پھنس کر رہ جائے۔ غرضکہ یہ انتظام کرنے کے بعد وہ بنگال کے چوہے دان کو ہمایوں کے پھنسانے کے لئے خالی چھوڑ کر اس ملک سے بالکل نکل گیا۔ اور اپنے بیٹے جلال خان کو بھی ہدایت کردی کہ وہ فوراً قلعہ رہتاس میں آجائے۔ اور مغلوں کا بالکل مقابلہ نہ کرے۔

ہمایوں جس کی فوجیں بنگال کی سرحدوں میں داخل ہو چکی تھیں۔ ان کا مقابلہ گڈھی کے مقام پر بھی محض اس لئے کیا گیا تاکہ شیر شاہ اور اس کے ساتھیوں کو بنگال سے نکل جانے کا موقعہ مل جائے لیکن اس معمولی سے مقابلہ کے علاوہ کسی نے ہمایوں اور اس کے لشکر کی مزاحمت نہیں کی اور ہمایوں بغیر لڑے ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں بنگال پر قابض ہو گیا۔ بنگال کی بے مشقت فتح کے بعد جب وہ قلعہ گور میں آیا۔ اور اسے سامان عشرت سے آراستہ پایا تو پوری طرح شیر شاہ کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ روزانہ عشرت پسندی کی محفلیں گرم ہونے لگیں اور اس قلعہ میں ہمایوں کا دل ایسا لگا کہ اس نے نو مہینے تک یہاں سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیا۔

شیر شاہ کو اپنے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق فتوحات کے لئے کافی وقت مل گیا تھا۔ اس نے بہار پر پورا تسلط جما لیا تھا۔ اودھ، لکھنؤ اور بہرائچ سے اس نے مغل افسروں کو بزور شمشیر نکال دیا تھا۔ سنبھل کو تسخیر کر لیا تھا۔ جونپور پر قبضہ جما لیا تھا قنوج اور مانک پور فتح کر لیا تھا۔ گویا شیر شاہ نے ایک بنگال کو چھوڑ کر اس سے کہیں بڑے علاقہ پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کے بعض ساتھیوں نے تو یہاں تک مشورہ دیا کہ وہ آگے بڑھ کر آگرہ کو بھی فتح کرلے لیکن وہ تو یہ چاہتا تھا کہ پہلے بنگال میں گھرے ہوئے مغلوں کے لشکر کو ختم کر دے تاکہ آگرہ اسے بغیر لڑے آسانی کے ساتھ مل جائے۔

شیر شاہ کے مقابلہ میں ہمایوں کو پہلی شکست | شیر شاہ نے موقعہ سے

فائدہ اُٹھا کر آگرہ اور بنگال کے تمام درمیانی علاقہ کو فتح کر لیا۔ ادھر ہمایوں کے بھائی ہندال نے آگرہ پہنچ کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا جب ہمایوں کو ان واقعات کا علم ہوا تو اس کی آنکھیں کھلیں اور وہ بنگال سے آگرہ کی جانب دوڑا لیکن راستہ میں شیر شاہ کا عظیم الشان لشکر حائل تھا۔ کیونکہ شیر شاہ اس کی واپسی کی اطلاع پاتے ہی فوراً مقابلہ کے لئے پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ چونسہ کے مقام پر شیر شاہ کی فوج نے ہمایوں کے لشکر کو گھیر لیا۔ اب پھر ہمایوں مجبوراً صلح کے لئے آمادہ ہو گیا اور صلح کی شرائط بھی طے ہو گئیں لیکن شیر شاہ جس کو ہمایوں کے وعدوں کے سلسلہ میں تلخ تجربے ہو چکے تھے اس نے یہ صلح صرف جنگی چال کی غرض سے کی تھی۔ چنانچہ اس صلح کے بعد جب ہمایوں اور اس کا سارا لشکر شیر شاہ کی جانب سے بے فکر ہو گیا تو افغانوں نے اچانک مغلوں کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ مغل جو جنگ کے لئے تیار نہ تھے۔ اس حملہ سے بوکھلا گئے۔ ان کو شکست ہو گئی۔ مغل بیگمات اور مغل لشکر کی بے شمار عورتیں گرفتار ہو گئیں۔ ہمایوں بمشکل تمام نظام سقہ کی مدد سے جان بچا کر آگرہ پہنچا۔ اور آگرہ آنے کے بعد شیر شاہ کے مقابلہ کے لئے از سر نو تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

شیر شاہ ہمایوں کو شکست دینے کے بعد اپنے لشکر کے ایک حصہ کو تو ہمایوں کے مقابلے کے لئے چھوڑ گیا۔ اور دوسرے کو لیکر بنگال جا پہنچا۔ بنگال ہمایوں کی واپسی کے بعد خالی پڑا تھا شیر شاہ کا جاتے ہی تسلط ہو گیا۔ شیر شاہ جو اس سے قبل شیر خان کہلاتا تھا۔ اس نے شیر شاہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد بنگال میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، اپنا سکہ چلایا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور اس کے بعد بہار آیا، اور بہار میں بھی اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے سکہ اور خطبہ جاری کیا اور اس کے بعد ہمایوں کے مقابلے کے لئے میدان میں آگیا۔

شیر شاہ کے مقابلہ میں ہمایوں کو دوسری شکست | ہمایوں اور شیر شاہ

کی دوسری فیصلہ کن جنگ قنوج کے قریب دریائے گنگا کے کنارے۔ ۱۰ محرم ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) کو ہوئی تھی۔ اس جنگ میں ابتدا میں تو مغلوں کو کامیابی ہوئی لیکن اس کے بعد شیر شاہ کے مقابلہ میں ہمایوں اور اس کے لشکر کو بڑی طرح شکست ہو گئی۔ ہمایوں کے لشکر کے ہزاروں آدمی بھاگنے کی کوشش میں دریائے گنگا میں ڈوب گئے۔ خود ہمایوں بڑی مشکل سے ہاتھی کے ذریعہ دریائے گنگا پار کر سکا۔ اور فرار ہو کر فتح پور سیکری پہنچا اور آگرہ سے اہل وعیال اور خزانہ کو لیکر دہلی گیا، جب دہلی میں ہمایوں کو یہ پتہ چلا کہ شیر شاہ اس کے تعاقب میں آرہا ہے۔ تو وہ رہتک ہوتا ہوا سرہند پہنچا۔ اور سرہند سے لاہور چلا گیا۔ جب لاہور میں اسے یہ اطلاع ملی کہ شیر شاہ ایک بڑا لشکر لے کر آرہا ہے۔ تو ہمایوں اور اسکے بھائیوں کو اور اسکے اہل وعیال کو لاہور بھی چھوڑنا پڑا۔ اسکے بعد ہمایوں کئی سال تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ جس کی تفصیل ہم اس سے قبل ہمایوں کے حالات میں بیان کر چکے ہیں غرضکہ ہمایوں کو شیر شاہ کے مقابلہ میں اس بُری طرح شکست ہوئی کہ اسے نہ صرف حکومت چھوڑنی پڑی بلکہ ہندوستان چھوڑ کر ایران میں جا کر پناہ لینی پڑی۔

شیر شاہ ہندوستان کا بادشاہ

ہمایوں کی شکست اور فرار کے بعد شیر شاہ ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ہندوستان کا بادشاہ بن گیا اور اس نے فوراً ہی نواحی علاقوں کا انتظام شروع کر دیا۔ شجاعت خاں کو حکم بھیجا کہ وہ فوراً گوالیار کے قلعہ پر قبضہ جمالے۔ ناصر خاں کو ایک لشکر دیکر سنبھل روانہ کیا اور مزید گور کو آگرہ میں انتظام کرنے کے لئے بھیجا جس نے آگرہ آنے کے ساتھ ہی ان مغلوں کو قتل کرنا شروع کر دیا جو آگرہ میں رہ گئے تھے شیر شاہ جب خود آگرہ آیا اور کئی دن قیام کیا اور آگرہ آنے پر جب اسے معلوم ہوا کہ مزید گور نے مغلوں کو بُری طرح قتل کیا ہے تو مزید گور کو بُلا کر بے حد لعنت ملامت

کی اور کوشش کی کہ آگرہ کی رعایا میں حکومت کی تبدیلی سے جو گھبراہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ دُور ہو جائے چنانچہ اس نے معززین شہر کو جمع کر کے یقین دلایا کہ رعایا کے ساتھ بلا امتیاز قوم و ملت انصاف اور رواداری کے ساتھ سلوک کیا جائے گا۔

شیر شاہ نے آگرہ میں امن قائم کرنے کے بعد اپنے افسر اعلیٰ خواص خاں اور مزید گور کو ہمایوں کے تعاقب میں دہلی کی طرف روانہ کیا۔ اور یہ ہدایت کر دی کہ اُس سے پچاس کوس کے فاصلہ پر رہیں کیونکہ اس تعاقب کا مقصد ہمایوں سے مزید جنگ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ خوفزدہ کر کے بغیر لڑے ہوئے اسے ہندوستان سے نکال دینا ہے شیر شاہ جب آگرہ میں تھا تو سنبھل کے معززین نے شیر شاہ سے شکایت کی کہ نصیر خاں جس کو سنبھل میں انتظام قائم کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ اس نے وہاں کی رعایا پر بے پناہ مظالم کئے ہیں شیر شاہ نے مسند عالی عیسےٰ خاں کو سنبھل کا حاکم بنا دیا، اور نصیر خاں کو اس کی ماتحتی میں دیدیا۔

دہلی لاہور اور گوالیار پر قبضہ آگرہ کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد شیر شاہ گوالیار گیا شیر شاہ کے پہنچنے سے پہلے ہی شجاعت خاں گوالیار اور اجین کو فتح کر چکا تھا۔ اجین میں شیر شاہ کے سامنے بیرم خاں کو پیش کیا گیا۔ تو شیر شاہ نے اسکی بڑی عزت کی اُسے خلعت دی اور اسے محمد قاسم خاں سابق حاکم گوالیار کے خیمہ میں بھجوا دیا لیکن شیر شاہ گوالیار اور اجین کا انتظام کرنے کے بعد جب دہلی کے لئے روانہ ہوا تو بیرم خاں اور محمد قاسم دونوں گجرات کی طرف بھاگ گئے۔ شیر شاہ گوالیار کے بعد دہلی آیا۔ اور دہلی میں اپنی حکومت کے نظام کو مستحکم کرنے کے بعد میوات گیا میوات کو حاجی خاں کے سپرد کیا۔ اسکے بعد سرہند پہنچا۔ اور سرہند کا علاقہ اپنے افسر اعلیٰ خواص خاں کو عطا کر دیا۔ خواص خاں

اس علاقہ کو اپنے غلام ملک بھگونت کو دیدیا۔

شیر شاہ جب لاہور آیا تو اس کے آنے سے قبل ہی ہمایوں اور اس کے بھائی لاہور سے فرار ہو چکے تھے۔ اس لئے شیر شاہ لاہور پر بھی قابض ہو گیا۔ مگر یہاں قیام نہیں کیا۔ یہاں سے سیدھا ہمایوں کے تعاقب میں خوشاب گیا۔ خوشاب پہنچنے کے بعد جب شیر شاہ کو معلوم ہوا کہ ہمایوں ملتان کی طرف گیا ہے تو اس نے اپنے لشکر کو ہمایوں کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اور دوبارہ ہدایت کی کہ "ہمایوں سے لڑنا نہیں بلکہ اسے ملک سے باہر نکال کر واپس چلے آنا" اس کے بعد شیر شاہ دہلی اور آگرہ ہوتا ہوا بنگال چلا گیا۔ بنگال کے انتظام کو اور زیادہ مستحکم کیا اور قاضی فضیلت کو بنگال کا حاکم مقرر کر کے آگرہ واپس آ گیا۔

پنجاب اور گجرات پر شیر شاہ کا تسلط

جب شیر شاہ کو بنگال۔ بہار۔ جونپور (یوپی) آگرہ اور دہلی وغیرہ کی طرف سے پورا اطمینان حاصل ہو گیا۔ تو وہ ۹۴۸ ہجری (۱۵۴۱ء) میں پنجاب کے ان علاقوں کی جانب متوجہ ہوا، جہاں وہ اب تک نہیں جا سکا تھا چنانچہ اس نے رفتہ رفتہ پنجاب کے بیشتر علاقہ پر تسلط جما لیا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ شیر شاہ نے کابل اور ہندوستان کی سرحد پر ایک قلعہ تعمیر کیا تھا جس کا نام اس نے قلعہ رہتاس رکھا تھا لیکن یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ قلعہ کس خاص مقام پر بنایا گیا تھا لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ شیر شاہ کی حکومت پشاور تک پھیل چکی تھی۔ اس کے بعد شیر شاہ نے ملتان اور گجرات پر بھی کسی دشواری کے بغیر قبضہ حاصل کر لیا۔ پنجاب ملتان گجرات اور ملحقہ علاقوں کا انتظام عمال کے سپرد کرنے کے بعد اسی سال شیر شاہ آگرہ واپس آ گیا۔

مالوہ کی فتح اور پورن مل کی سرکوبی

۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) میں شیر شاہ

مالوہ کی فتح کی جانب متوجہ ہوا۔ مالوہ میں سب سے زیادہ خودسر اور فتنہ پرداز ملوخاں تھا جس کے قبضہ میں شادم آباد یعنی قلعہ منڈو۔ اجین۔ سارنگ پور اور قلعہ رنتھمبور تھا ملوخاں نے لڑے بغیر اطاعت قبول کر لی اور موقعہ پا کر فرار ہو گیا۔ سیواس اور ہنڈیا میں سکندر خاں حکمرانی کر رہا تھا۔ وہ بھی شیرشاہ کا مطیع ہو گیا۔ مالوہ کا تیسرا حکمران راجہ پرتاب پسر بھوپت تھا۔ یہ ابھی خوردسال تھا۔ بھیا پورن مل اس کا نائب تھا۔ اضلاع چندیری اور رائے سین پر اسی کی حکومت تھی۔ بھیا پورن مل ایک نہایت ہی تنگ نظر اور بدباطن حاکم تھا۔ اس سے ہندو اور مسلم رعایا دونوں ہی نالاں تھے خصوصیت کے ساتھ اس نے معزز گھرانوں اور خاندانِ سادات کے مسلمانوں پر بڑے مظالم کئے تھے۔ اس نے ان کو غلام بنا لیا تھا۔ اور ان کی بہو بیٹیوں کو سربازار نچوایا تھا۔ شیرشاہ نے اپنے بیٹے جلال خاں کو حکم دیا کہ وہ لشکر لے کر آگے جائے۔ اس کے بعد خود شیرشاہ بھی آ گیا۔ اور قلعہ رائے سین کا محاصرہ کر لیا۔ بھیا پورن مل نے شیرشاہ کو چھ سو ہاتھی نذریں بھیجے۔ مگر شیرشاہ نے بدستور محاصرہ کو قائم رکھا۔ آخر اس نے قلعہ شیرشاہ کے حوالے کر دیا اور خود قلعہ سے نکل گیا۔ لیکن چندیری کے معزز خاندان کی عورتوں نے جب شیرشاہ سے فریاد کی کہ تو ایک ایسے شخص کو چھوڑے دیتا ہے جس نے کہ شریف خاندان کی عورتوں کی آبرو کو برباد کیا ہے تو شیرشاہ نے بھیا پورن مل پر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ پورن مل اور اس کے آدمی بڑی بہادری کے ساتھ لڑے۔ بھیا پورن مل مارا گیا۔ اور اس طرح چندیری اور رائے سین پر بھی شیرشاہ کا قبضہ ہو گیا

مارواڑ چتوڑ اور کالنجر کی فتح

مالوہ کی تسخیر سے فارغ ہونے کے بعد شیرشاہ مارواڑ کی جانب متوجہ ہوا۔ مارواڑ کا راجہ مالدیو اصل راجہ کو قتل کرنے کے بعد ناگور اور اجمیر پر قابض ہو گیا تھا۔ شیرشاہ

نے سنہ ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں اس پر حملہ کر دیا۔ وہ بہت سے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملا کر لڑا۔ اور ایسی بہادری دکھائی کہ شیر شاہ کے لشکر میں پریشانی پیدا ہو گئی۔ لیکن شیر شاہ کا لشکر جما رہا۔ آخر راجہ کو شکست ہو گئی۔ ناگور اجمیر قلعہ جودھپور اور مارواڑ کے اضلاع پر شیر شاہ کا قبضہ ہو گیا شیر شاہ نے سارا مارواڑ خواص خاں کے تصرف میں دیدیا۔

اب شیر شاہ قلعہ چتوڑ کی جانب متوجہ ہوا۔ جب اس کا لشکر قلعہ چتوڑ سے بارہ کوس کے فاصلہ پر رہ گیا تو رانا چتوڑ نے اس کے پاس قلعہ کی کنجیاں بھجوا دیں شیر شاہ نے قلعہ چتوڑ کے انتظام کے لئے خواص خاں کے بھائی میاں احمد سروانی اور حسین خاں کو چھوڑ دیا۔ اور اس کے بعد کچھ واڑہ کی طرف آیا۔ اور وہاں سے فارغ ہونیکے بعد اس نے قلعہ کالنجر کی فتح کا ارادہ کیا۔

کالنجر کے راجہ کرت سنگھ سے شیر شاہ کو اس لئے عداوت تھی کیونکہ اس نے شیر شاہ کے باغی۔ بیر سنگھ دیو بندیلہ کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی اور شیر شاہ کے مطالبہ کے باوجود اسے واپس نہیں کیا تھا۔ شیر شاہ نے راجہ سے انتقام لینے کے لئے کالنجر کا محاصرہ کر لیا اور اس کے گرد اتنے اونچے اونچے مورچے بنائے کہ قلعہ کے آدمی وہاں سے صاف دکھائی دیتے تھے۔ ۸ ربیع الاول سنہ ۹۵۲ ہجری (۱۵۴۵ء) کو شیر شاہ نے حکم دیا کہ قلعہ کی دیوار میں آتشیں گولے مارے جائیں لوگوں نے گولے مارنے شروع کئے۔ اتفاق سے ایک جلتا ہوا گولہ قلعہ کی دیوار سے ٹکرا کر الٹا آ کر وہاں گرا۔ جہاں دوسرے آتشیں گولے رکھے تھے۔ اور ان سب میں آگ لگ گئی۔ بہت سے آدمی جل گئے۔ اور شیر شاہ بھی جل گیا شیر شاہ کو خیمہ میں لایا گیا۔ اسکی حالت بڑی نازک تھی لیکن وہ اس حالت میں بھی برابر قلعہ کی فتح کے لئے بلا بلا کر افسروں کو ہدایتیں دیتا رہا۔ آخر شام تک قلعہ فتح ہو گیا۔ اور راجہ گرفتار کر لیا

گیا۔ شیر شاہ کو یہ خوشخبری سُنائی گئی تو وہ بے حد خوش ہوا۔

شیر شاہ کی موت

شیر شاہ بُری طرح جھلس گیا تھا۔ اس کے زخموں کی تکلیف برابر بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ اطبا نے ہرچند علاج کیا مگر کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا۔ اور وہ زخموں کی اس تکلیف سے ۱۰ ربیع الاوّل ۹۵۲ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ وصیت کے مطابق اس کو اسکی پرانی جاگیر سہسرام میں دفن کیا گیا۔ اس کا مقبرہ ایک تالاب کے اندر بنا ہوا ہے جسے عجیب و غریب عمارت شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے پندرہ سال تو امارت کی اور پانچ سال سلطنت۔

شیر شاہ کی حکومت پر ایک نظر

شیر شاہ ہندوستان کا ایک ایسا بلند پایہ بادشاہ ہوا ہے جس پر ہندوستان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ جہاں بانی اور فرماں روائی کی جو صفات شیر شاہ میں موجود تھیں۔ وہ ہندوستان کے کسی دوسرے بادشاہ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہیں۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور لائق ترین جرنیل تھا جس نے چھوٹی سی حیثیت سے ترقی کر کے بلند ترین درجہ حاصل کیا۔ جنگ کا نقشہ بنانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ وہ اگرچہ ایک صادق القول اور مضبوط کیرکٹر کا انسان تھا لیکن جنگ میں اپنے دشمن کو دھوکہ اور فریب دینا کوئی گناہ نہیں خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی بے نظیر جنگی قابلیت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے مغلیہ حکومت کو مٹا کر اس کے کھنڈروں پر نئے سرے سے پٹھان حکومت کی بنیاد رکھدی۔ وہ فوجوں کی کمان خود کرتا تھا۔ اور خطرناک سے خطرناک مورچوں پر ایک معمولی سپاہی کی طرح لڑتا تھا۔ اس کا طریق جنگ یہ تھا کہ ہر مورچہ پر کچا قلعہ یا حصار

بنا کر جنگ کرتا تھا۔ ریت کی بوریوں سے حصار بنانا اسی کے زمانہ کی ایجاد ہے وہ جنگ میں صرف تیر اور تلوار کا قائل نہ تھا۔ بلکہ توڑے دار بندوقوں سے اور توپ خانے سے اس نے اپنے تمام لشکر کو آراستہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس کا لشکر اپنے زمانہ کے لحاظ سے جدید ترین خطرناک ہتھیاروں سے مسلح تھا۔

شیر شاہ نے اپنی حکومت کو مختلف ضلعوں اور پرگنوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جس کے لئے ذمہ دار اور جوابدہ حکام مقرر تھے۔ وہ کسی حاکم کو زیادہ مدت تک کسی ایک جگہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے بدنظمی اور رشوت ستانی بڑھتی ہے۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں انتظام ملکی اور عوام کی فلاح کے لئے بے شمار قوانین نافذ کئے۔ اور ان قوانین کے نفاذ میں بڑی سختی سے کام لیا۔ اس کی منصف مزاجی کا یہ عالم تھا کہ اس کی حکومت میں اس کا بیٹا اور ایک معمولی شہری دونوں برابر تھے۔ ارتکاب جرم کی صورت میں وہ نہ اولاد کے ساتھ رعایت کرتا تھا۔ نہ عزیزوں کے ساتھ اور نہ امرا کے ساتھ اس کے دورِ حکومت میں زمین کے ایک ایک حصہ کی پیمائش کی جاتی تھی۔ اور اسی پیمائش کے پیش نظر محصول وصول کیا جاتا تھا۔ زمینداروں سے وہ خوش نہیں تھا مگر کاشتکاروں پر اس قدر مہربان تھا کہ اگر کوئی بڑے سے بڑا عمال حکومت بھی کھیتی کو نقصان پہنچاتا تھا تو اسے سخت سزا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ایک کسان کی کھیتی میں سے گیہوں کی چند بالیں توڑ لیں۔ اس نے اس سپاہی کے کان میں روزن کرا کے یہ بالیں اسمیں لٹکا دیں اور ساری فوج میں گشت کرایا۔

جرائم کے انسداد میں وہ سب سے زیادہ سرگرم عمل تھا۔ اگر کسی علاقہ میں چوری ہوتی اور چور نہ پکڑا جاتا تو علاقہ کے مقدم اور باشندوں پر جرمانہ کر کے لٹنے والے کے نقصان کی تلافی کر دیتا تھا۔ اسی طرح اگر کسی علاقہ میں قتل ہوتا اور قاتل فرار

ہو جاتا تو علاقے کے مقدم کو گرفتار کر لیا جاتا اور اس وقت تک یہ مقدم رہا نہیں کیا جاتا تھا جب تک کہ قاتل کا سراغ نہ مل جاتا تھا۔ اکثر مقدموں کو اس نے انتظام میں کوتاہی کرنے کے سلسلے میں سزائے موت بھی دی ہے۔ اس کے زمانہ میں عدالت کا سارے ملک میں بہت اچھا انتظام تھا۔ ڈاک اس قدر باقاعدہ تھی کہ دور سے دور مقامات کے خطوط چند روز میں پہنچ جاتے تھے شیر شاہ کی حکومت میں تاجروں سے ٹیکس برائے نام لیا جاتا تھا لیکن گراں فروشی کو اس نے جرم قرار دے رکھا تھا ہر چیز کی قیمت حکومت نے مقرر کر رکھی تھی۔ جو تاجر اس سے زیادہ وصول کرتا تھا اس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

سڑکوں۔ سراؤں اور قلعوں کی تعمیر میں اس نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس نے ملک کے مختلف گوشوں میں بے شمار قلعے تعمیر کرائے تاکہ اگر ملک میں کوئی ہنگامہ ہو تو ان قلعوں میں عوام کو پناہ دی جا سکے۔ اور ان قلعوں کے ذریعہ مفسدین کو کچلا جا سکے۔ اس نے اپنے زمانہ میں جو خاص خاص سڑکیں بنوائیں وہ یہ ہیں۔ ایک سڑک پشاور سے لیکر سنار گاؤں (بنگال) تک، دوسری سڑک آگرہ سے لے کر برہان پور تک جو سرحد دکن پر واقع ہے تیسری سڑک آگرہ سے جودھپور اور چتوڑ گڑھ تک۔ چوتھی سڑک لاہور سے ملتان تک اس کے علاوہ اور بھی بہت سی سڑکیں اس نے تیار کرائی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف پھل دار درخت لگوائے جن سے سایہ بھی ہوا اور مسافروں کو زادِ راہ بھی ملتا رہے۔ ہر دو کوس کے بعد کنوئیں اور سرائیں تعمیر کروائیں۔ ہر سرائے میں ہندو اور مسلمانوں کے ٹھہرنے کے لئے مکانات تھے۔ دروازہ پر پانی کی سبیل لگی رہتی تھی۔ ہر سرائے میں سرکاری ملازم خدمت کیلئے رہتے تھے ہندوؤں کیلئے سرائے میں برہمن رکھا جاتا تھا۔ جو رسوئی بناتا۔ بچھونا بچھاتا۔ نہانے کیلئے پانی گرم کرتا۔ گھوڑوں کو دانہ ڈالتا سرائے میں قیام کرنیوالے مسافروں

کے لئے کھانے اور قیام کا مفت انتظام تھا۔ گھوڑوں کے لئے چارہ اور دانہ مفت دیا جاتا تھا۔ ہر سرائے کے پاس ایک مسجد ہوتی تھی جسمیں مؤذن رہتا تھا۔ سرائے کے انتظام کے لئے منتظم اور چوکیداروں کا پورا عملہ رہتا تھا۔ شیر شاہ نے شہر دہلی کو جو اس زمانہ میں جمنا سے دور تھا جمنا کے بالکل متصل نئے سرے سے آباد کیا۔ ایک قلعہ بھی بنوایا۔ "جو شیر شاہ کے کوٹلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ شہر کے گرد فصیل تعمیر کرائی لیکن ابھی یہ نامکمل ہی تھی کہ شیر شاہ کا انتقال ہوگیا۔ قنوج کو بھی اس نے نئے سرے سے تعمیر کرایا تھا۔

شیر شاہ اپنی رعایا کے لئے بڑا ہی فیاض دل واقع ہوا تھا۔ اس نے صرف اُمرائے سلطنت ہی کو جاگیروں سے نہیں نوازا بلکہ رعایا کے ہر فرد کو فائدہ پہنچانے کی پوری کوشش کی۔ بیوہ عورتوں، یتیموں، اپاہجوں اور محتاجوں کے لئے شاہی خزانے سے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ اس کا لنگر خانہ محتاجوں اور بھوکوں کے لئے برابر کھلا رہتا تھا۔ چنانچہ اس کے لنگر خانہ سے روزانہ ہزاروں آدمیوں کو کھانا ملتا تھا۔ ہر شخص کو اس بات کی پوری آزادی تھی کہ وہ اس کے لنگر خانہ میں جا کر کھانا کھالے غرضکہ شیر شاہ کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے باشندوں نے بڑے اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی بسر کی ہے۔

شیر شاہ کی ملکی پالیسی

شیر شاہ مفسدوں کے لئے بڑا سخت گیر تھا لیکن جب کوئی بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کے سامنے آجاتا تو اس کے ساتھ نرمی اور مروت کا سلوک کرتا تھا۔ وہ تلوار اور مروت دونوں چیزوں سے حکومت کرنا جانتا تھا۔ افغانوں پر وہ بے حد مہربان تھا۔ اس نے ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے افغان کو اتنی دولت دی تھی کہ تقریباً سب کے سب مالا مال ہوگئے۔ یہاں تک کہ افغانستان کے بے شمار

باشندوں کو یہ افغانستان وظیفے روانہ کرتا تھا۔ غیر افغانیوں کے ساتھ بھی اس
نے ہمیشہ محبت اور مروت کا سلوک کیا ہے۔ بفرقہ پرستی سے وہ ہمیشہ بلند رہا
ہے۔ اگر اس نے پورن مل جیسے مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ سخت ترین سلوک
کیا تھا تو اس نے خود اپنے بیٹے عادل خاں کو بھی سخت ترین سزا دی تھی جس نے کہ
ایک ہندو عورت کی توہین کی تھی۔ اس کی رعایا میں تمام باشندے بلا امتیاز مذہب و
ملت یکساں حیثیت رکھتے تھے۔

شیر شاہ کا ذاتی کردار

شیر شاہ کا ذاتی کردار نہایت بلند تھا۔ جنگی معاملات
کے علاوہ اس نے کبھی اپنے قول و فعل میں ذرہ برابر
بھی انحراف نہیں ہونے دیا۔ چونکہ شیر شاہ خود بہت بڑا عالم تھا۔ اس لئے وہ علما
کی بڑی قدر کرتا تھا۔ روزہ نماز کا بڑا پابند تھا۔ تہجد کے وقت اُٹھتا تھا۔ پانچوں
وقت کی نماز کے علاوہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی پڑھتا تھا۔ قرآن مجید کی تلاوت
روزانہ بلاناغہ پابندی کے ساتھ کرتا تھا۔ اوقات کا نہایت پابند تھا۔ تہجد کی
نماز کے بعد عمال حکومت اس کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوتے۔ سرکاری
کاموں کی رپورٹ سناتے۔ شیر شاہ ان کو مشورے دیتا۔ اور صبح کی نماز سے قبل
حکومت کے انتظام کا سارا کام ختم کر دیتا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد
فوج کا معائنہ کرتا۔ سپاہیوں سے خود جاکر باتیں کرتا۔ نئے سپاہی بھرتی کراتا۔ اس
کے بعد دربار میں آتا۔ اُمرا اور عمال کو انعامات دیتا۔ اور مظلوموں کی فریاد بذات خود
سنتا۔ غرضکہ تہجد سے لیکر رات تک اس کا سارا وقت باقاعدہ منقسم تھا۔ وہ بڑا ہی
مشقت پسند اور محنتی انسان تھا۔ عیش پرستی سے اسے نفرت تھی۔ بدچلنی کا وہ دشمن تھا۔
چنانچہ اس نے بدچلنی کے مٹانے کے لئے سخت ترین قوانین نافذ کر رکھے تھے۔

شیر شاہ کے زمانے کے چند خاص واقعات

کہتے ہیں کہ شاہزادہ

عادل خاں ہاتھی پر سوار ہو کر آگرہ کے کسی کوچہ سے گذرا۔ اس کوچہ میں ایک بقال کا
مکان تھا جس کی دیواریں بہت نیچی تھیں۔ اس مکان میں بقال کی بیوی برہنہ
نہا رہی تھی۔ جب شہزادہ عادل کی نظر اس پر پڑی تو شہزادہ نے اس برہنہ عورت
کے پان کا بیڑا کھینچکر مارا اور اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ بقال
جب گھر آیا اور اس کو اس افسوسناک واقعہ کا علم ہوا تو وہ پان کا بیڑا لیکر فریاد
کیلئے شیر شاہ کے دربار میں جا پہنچا۔ اور ساری حقیقت عرض کر دی۔ شیر شاہ
نے فوراً حکم دیدیا کہ عادل کی بیوی بقال کے مکان میں جائے اور اسی طرح نہائے
جس طرح کہ بقال کی بیوی نہا رہی تھی۔ اور بقال ہاتھی پر سوار ہو کر گزرے۔ اور اسی
طرح عادل کی بیوی کے بیڑا پھینک کر مارے جس طرح کہ عادل نے بقال کی برہنہ
بیوی کے مارا تھا۔ وزرا اور امرا نے ہر چند کوشش کی کہ شیر شاہ شہزادہ کا قصور
معاف کر دے لیکن شیر شاہ نے صاف جواب دیتے ہوئے کہہ دیا کہ میری عدالت
میں امیر و غریب سب برابر ہیں۔ آخر بقال کی سفارش پر عادل خاں کو معافی ملی۔
شیر شاہ کے بھانجے مبارز خاں نے محض اپنی نفس پرستی کی بنا پر نیازی
پٹھانوں کے ساتھ زیادتی کی۔ ان پٹھانوں نے مبارز خاں کو قتل کر دیا۔ شیر شاہ کو
خبر ہوئی تو اس نے اعظم ہمایوں کو اس معاملہ کی جانب توجہ دلائی۔ اعظم ہمایوں
نے شیر شاہ کو خوش کرنے کے لئے نیازی پٹھانوں کو دھوکہ سے بلا کر قتل کر دیا جب
شیر شاہ کو اعظم ہمایوں کے اس ظلم اور زیادتی کی اطلاع ہوئی تو اعظم ہمایوں کو بہت برا
بھلا کہا۔

مندرجہ بالا حالات و واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیر شاہ کس قدر
بلند پایہ انسان تھا۔ اور اس نے صرف پانچ سال کے دورِ حکومت میں وہ کر کے
دکھا دیا جو دوسرے بادشاہ صدیوں میں بھی نہ کر سکے +

شیر شاہ سوری کی حکومت کا زوال

شیر شاہ نے مختصر سے عرصہ میں مغلوں کو نکال کر ہندوستان میں ایک نہایت مضبوط اور باقاعدہ پٹھان حکومت از سرِ نو قائم کر دی تھی لیکن اس پٹھان حکومت کو سنبھالنے میں اُس کے جانشین کس طرح ناکام رہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہو سکتا ہے۔

سلیم شاہ سوری کی تخت نشینی

جس وقت شیر شاہ فوت ہوا تو ولیعہد سلطنت عادل خاں اور چھوٹا بیٹا جلال خاں دونوں اس سے دُور تھے۔ عادل رنتھنبور میں تھا۔ اور جلال خاں قصبہ ریواں ضلع بھٹہ میں تھا۔ اُمرا نے اس خیال سے کہ عادل خاں دور ہے اور کسی نہ کسی کی تخت نشینی ضروری ہے۔ جلال خاں کو بُلوا لیا اور اسے ۱۵ ربیع الاول ۹۵۲ھ (۲۵ مئی ۱۵۴۵ء) کو قلعہ کالنجر میں تخت پر بٹھا دیا۔ جلال خاں نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنا لقب سلیم شاہ اختیار کیا۔

سلیم شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے راجہ کالنجر کو قید سے نکلوا کر قتل کیا، اس کے بعد فوج کو انعامات دیئے۔ باپ کے بعض قوانین میں ترمیم کی اور بعض کو بالکل منسوخ کر دیا یعنی اس نے تقریباً اس سارے نظام حکومت کو بدل کر رکھ دیا جس کو کہ اس کے باپ نے بڑی مشکل سے قائم کیا تھا۔ سلیم شاہ کی شہزادگی کے زمانہ میں اس کے پاس چھ ہزار سوار تھے۔ اس نے تخت نشینی کے بعد ان ذاتی چھ ہزار سواروں میں سے ہر ایک کی حسبِ حیثیت ترقی کر دی۔ اور ان کو بحال دیا جسکی وجہ سے شیر شاہ کی بقیہ افغانی فوج میں ناگواری پھیل گئی اور

اس طرح فوج بھی سلیم شاہ سے خوش نہ رہی۔

سلیم شاہ جب کالنجر سے آگرہ واپس آیا تو پھر دوبارہ اس کی تخت نشینی آگرہ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آئی۔ آگرہ آنے کے بعد اس نے اپنے بڑے بھائی عادل شاہ کو دم دلاسا دیکر بلایا۔ اس لئے کہ وہ اسے قید کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن عادل شاہ اکیلا نہیں بلکہ پورا لشکر لیکر آیا جس کی وجہ سے سلیم شاہ کو بھائی پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر سلیم شاہ نے بیانہ میں بھائی کو جاگیر دیکر رخصت کر دیا۔

سلیم شاہ کا طرز عمل اُمرائے سلطنت کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا بعض اُمرائے سلطنت پر تو اسے شبہ تھا کہ وہ عادل خاں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور بعض اُمرائے سلطنت سے اس لئے ناراض تھا کہ وہ شیر شاہ کے زمانہ کے تھے چنانچہ اُمرائے سلطنت کے ساتھ اس بے اعتمادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اُمرائے سلطنت سلیم شاہ کے مخالف ہو گئے۔ اور انھوں نے عادل خاں کو آگرہ پر حملہ کرنے کے لئے اُبھارا۔ چنانچہ عادل خاں اپنا لشکر لیکر آگرہ کے قریب سیکری میں آ گیا۔ سلیم شاہ بھی فوج لیکر نکل آیا۔ دونوں لشکروں کا مقابلہ آگرہ کے قریب ہوا۔ عادل خاں شکست کھانے کے بعد بھٹہ کے پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ اور اس کے بعد یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ مر گیا۔ یا کس طرف نکل گیا۔ اس کے بعد سلیم شاہ کے لشکر کا مقابلہ اُمرائے سلطنت خواص خاں اور عیسٰی خاں کے لشکروں سے ہوا۔ ان دونوں اُمرائے سلطنت کو بھی شکست ہو گئی۔ اُمرائے سلطنت کی اس کھلی بغاوت کے بعد سلیم شاہ اُمرائے سلطنت کا جانی دشمن ہو گیا بعض کو قتل کرا دیا۔ اور بعض کو قید میں ڈال دیا۔

شجاعت خاں حاکم مالوہ اور اعظم ہمایوں حاکم پنجاب بھی سلیم شاہ کے مخالف ہو گئے تھے۔ سلیم شاہ نے ہر چند کوشش کی کہ ان دونوں کو آگرہ بلا کر گرفتار کرلے۔

مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ سلیم شاہ کو آگرہ میں یہ اطلاع ملی کہ خواص خاں، اعظم ہمایوں اور دوسرے امرائے سلطنت لاہور میں بیٹھ کر اس پر حملہ کرنے کی تجاویز مرتب کر رہے ہیں تو یہ ایک بڑا لشکر لیکر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ خواص خاں تو مقابلہ پر نہیں آیا۔ مگر دوسرے امرائے سلطنت کو سلیم شاہ کے مقابلے میں شکست ہو گئی۔ سلیم شاہ نے نیازی پٹھانوں کو بری طرح قتل کیا۔ اسکے بعد گوالیار چلا گیا۔ گوالیار سلیم شاہ کو بے حد پسند تھا۔ اس کا زیادہ وقت گوالیار ہی میں گزرتا تھا بادشاہ گوالیار ہی میں تھا کہ تاج خاں نے خواص خاں کا سر کاٹ کر اس کے پاس بھیجدیا۔ خواص خاں شیر شاہ کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا شیر شاہ کی حکومت کے قیام میں سب سے زیادہ خواص خاں ہی کا حصہ تھا لیکن سلیم شاہ نے اسے بھی ختم کرا دیا۔

امرائے سلطنت کے ساتھ سلیم شاہ کے اس سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلیم شاہ کے خلاف پٹھانوں میں نفرت بڑھتی چلی گئی۔ شجاعت خاں جس پر کہ بظاہر ابھی تک بادشاہ مہربان تھا، اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اور عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ حملہ بادشاہ ہی نے کرایا تھا۔ بادشاہ نے مالوہ کا علاقہ بھی شجاعت خاں سے چھین لیا تھا لیکن بعد میں یہ علاقہ اسے واپس کر دیا تھا۔ ہمایوں اعظم نے پنجاب میں بادشاہ کے خلاف شدید بغاوت کھڑی کر دی تھی لیکن سلیم شاہ نے پنجاب جا کر اس بغاوت کو دبا دیا۔ نیازی پٹھانوں کو پنجاب میں اندھا دھند قتل کیا گیا۔ اور پٹھانوں کی عورتوں کو بھی بے آبرو کیا گیا جس سے پٹھان سلیم شاہ کے دشمن ہو گئے اور یہ دشمنی اتنی بڑھی کہ کئی مرتبہ پٹھانوں نے سلیم شاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر خوش قسمتی سے وہ ہر مرتبہ بچ گیا۔ اسکے بعد سلیم شاہ نے نیازی پٹھانوں کو بری طرح کچلا۔ یہاں تک کہ ان کی طاقت ختم کر کے رکھ دی لیکن اسکے ساتھ ہی اس کی مخالفت ملک کے ہر کونے میں بڑھتی ہی چلی گئی یہ وہ زمانہ تھا جب ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) میں ہمایوں طاقت پکڑ چکا تھا۔

اور اس نے اپنے بھائی مرزا کامران کو کابل میں شکست دیکر ہندوستان کی طرف
بھگا دیا تھا۔ مرزا کامران کابل سے فرار ہونیکے بعد سیدھا سلیم شاہ کے پاس آیا
لیکن سلیم شاہ نے اس کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ بلکہ اسے ایک حد تک
نظر بند کر دیا۔ کامران آیا تو اس اُمید میں تھا کہ وہ سلیم شاہ کی مدد سے دوبارہ کابل کا
تخت حاصل کریگا لیکن جب اس نے سلیم شاہ کی یہ بے رُخی دیکھی تو فرار ہونیکی تدبیریں
سوچنے لگا۔ آخر ایک رات کو بُرقعہ اوڑھ کر نکل گیا اور فرار ہو گیا۔ کامران کے
فرار ہونیکے بعد سلیم شاہ کو اطلاع ملی کہ ہمایوں لشکر لیکر ہندوستان آرہا ہے۔ سلیم شاہ نے
لشکر لیکر اسکے مقابلہ کیلئے بڑھا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ ہمایوں اٹک تک آنیکے بعد واپس چلا گیا۔

اپنی حکومت کے آخری زمانہ میں تو سلیم شاہ کی امرائے سلطنت سے بدگمانی
اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اگر ذرا بھی کسی امیر پر مخالفت یا سازش کا شبہ ہوتا تو اس
کو قتل کرا دیتا یا قید کر دیتا تھا۔ یہانتک کہ وہ اپنے سالے کو بھی قتل کرنے کے
لئے تیار ہو گیا تھا۔ مگر بیوی کے کہنے پر چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بیوی کو
اس نے بتا دیا تھا کہ اگر بھائی کو زندہ رکھنا چاہتی ہے تو اپنے بیٹے فیروز سے ہاتھ
دھولے۔ یہ اسے قتل کئے بغیر نہیں رہے گا۔

سلیم شاہ مدتوں اس فکر میں رہا کہ کسی طرح اگر تمام اُمرا سلطنت ایک جگہ
جمع ہو جائیں تو ان کو قتل کرا دے لیکن اُمرائے سلطنت نے بھی آپس میں یہ
طے کر لیا تھا کہ وہ سب ملکر کبھی دربار میں نہیں جائینگے۔ وہ ایک ایک کرکے بادشاہ
سے ملتے رہتے تھے جس کی وجہ سے سلیم شاہ کو ایک ساتھ تمام اُمرا کو قتل کرنے
کا ساری زندگی موقعہ ہاتھ نہ آسکا۔ یہاں تک کہ سلیم شاہ سنہ ۹٦٠ھ (سنہ ۱۵۵۳ء)
میں پیشاب بند ہونے کی بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد مر گیا۔ سلیم شاہ ایک اچھا
سپاہی ضرور تھا۔ اسی لئے وہ پٹھانوں کی مخالفت کے باوجود تخت پر جما رہا۔ لیکن

وہ سیاستداں نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ہر طرف اپنے دشمن پیدا کر لئے تھے۔ اگر بہادر سپاہی ہونے کے ساتھ یہ سیاستداں بھی ہوتا تو شیر شاہ کی مضبوط حکومت اسکے زمانہ میں خوب ترقی کرتی لیکن اس کی ساری طاقت عمر بھر اپنے ہی ہم قوم پٹھانوں کو کچلنے پر صرف ہوتی رہی جس سے شیر شاہ کی قائم کردہ پٹھان حکومت میں ضعف پیدا ہو گیا۔

فیروز شاہ کی تین دن کی بادشاہت

سلیم شاہ کے مرنے کے بعد امرائے سلطنت نے سلیم شاہ کے کم سن لڑکے فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا تو سلیم شاہ کے سالے اور چچا زاد بھائی محمد شاہ (مبارز خاں) نے اس معصوم بچہ کو ماں کی گود میں قتل کر دیا۔ سلیم شاہ کو چونکہ محمد شاہ (مبارز خاں) سے پہلے ہی خطرہ تھا۔ اسی لیئے اس نے اپنی بیوی سے کہدیا تھا کہ اگر تیرا بھائی زندہ رہے گا تو بیٹا جان سے مارا جائیگا۔ بیوی نے محمد شاہ (مبارز خاں) کو جو کہ اس کا سگا بھائی تھا یہ کہہ کر بچا لیا تھا کہ اس کو تخت و تاج کے جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں وہ تو عیش و عشرت میں مست رہتا ہے۔ لیکن سلیم شاہ کے مرنے کے بعد جب فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا تو ہزار منتوں کے باوجود محمد شاہ (مبارز خاں) نے اپنی چہیتی بہن کے اکلوتے لختِ جگر کو بہن ہی کی گود میں ذبح کر دیا۔ حالانکہ بہن رو رو کر بھائی سے یہ کہتی رہی کہ میں اپنے بچہ کو لیکر کہیں دور نکل جاؤنگی تو تخت پر بیٹھ جا مگر میرے بچہ کو نہ مار۔ غرضکہ فیروز شاہ تخت نشینی کے تیسرے دن اپنے سگے ماموں کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔

محمد شاہ عادل کی تخت نشینی

محمد شاہ سور اپنے سگے معصوم بھانجے فیروز شاہ کو قتل کرنے کے بعد محمد شاہ عادل کے لقب کے ساتھ ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) میں تخت پر بیٹھ گیا۔ یہ انتہا درجہ کا عیاش جاہل اور کمینہ پرور شخص تھا۔ چنانچہ اس نے تخت پر بیٹھنے کے چند ہی روز بعد

فضول خرچی اور عیاشی پر سارا خزانہ لٹا دیا۔ خزانہ کے برباد ہونے کے بعد اس نے امرائے سلطنت کی جاگیروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ اسکی حکومت میں تمام بڑے بڑے عہدوں پر ادنیٰ طبقے کے لوگ قابض تھے ہیمو بقال کا عروج اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں ہوا۔ عادل نے ہیمو بقال کو وزارتِ عظمےٰ کے ساتھ ساتھ سپہ سالاری کا بھی عہدہ دیدیا تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ ہیمو ہی محمد شاہ عادل کی حکومت کا مختارِ مطلق بنا ہوا تھا۔

عادل کے عہدِ حکومت میں کس قدر بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خاص اس کے دربار میں اکثر اوقات پٹھانوں میں تلواریں چل جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب عادل نے ایک پٹھان کی جاگیر دوسرے پٹھان کو دی تو تلواریں میان سے باہر نکل آئیں۔ آٹھ سات آدمی مارے گئے اور بادشاہ تخت سے اُتر کر حرم سرا میں بھاگ گیا۔

شیر شاہ کی حکومت کے ٹکڑے

محمد شاہ عادل کی نااہلیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیر شاہ نے جس مضبوط اور پٹھان حکومت کی بُنیاد رکھی تھی وہ پاش پاش ہو گئی اور اس مستحکم حکومت کے ٹکڑے ہونے کے بعد مندرجہ ذیل پانچ حکومتیں بن گئیں۔

(۱) محمد شاہ عادل کے بہنوئی ابراہیم خاں نے دہلی اور آگرہ میں بغاوت کر کے دہلی آگرہ اور کالپی میں اپنی حکومت قائم کر لی اور عادل فرار ہو کر چنار چلا گیا۔

(۲) عادل نے بہار، جونپور اور گنگا کے مشرقی علاقے کے بڑے حصے پر اپنی نئی بادشاہی قائم کر لی۔

(۳) عادل کا دوسرا بہنوئی سکندر سور سلطان سکندر شاہ کا لقب اختیار کر کے بعد پنجاب کا بادشاہ بن گیا۔

(۴) عادل کا تیسرا بہنوئی سلطان محمد شاہ سور کا لقب اختیار کرنے کے بعد بنگال میں فرماں روائی کرنے لگا۔

(۵) شجاعت خاں جسے سجاول خاں بھی کہتے تھے۔ وہ مالوہ کا حکمراں بنگیا۔

ان پانچ حکومتوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی بے شمار پٹھانوں کی خود مختار حکومتیں سارے ملک میں قائم ہوگئیں۔ غرضکہ جو پٹھان حاکم جہاں حکمران تھا۔ وہ مرکز کے کمزور ہونے کے بعد خود مختار بن گیا۔ اوران نام نہاد خانہ ساز پٹھان بادشاہوں میں کی طرح خانہ جنگی شروع ہوگئی جس نے کہ شیر شاہ کی قائم کردہ سلطنت کو فنا کرکے رکھ دیا۔

ہمایوں کا آگرہ اور دہلی پر دوبارہ قبضہ

ہمایوں جو کابل کو پہلے ہی فتح کرچکا تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ شیر شاہ کی پٹھان حکومت دم توڑ رہی ہے تو اس نے ہندوستان پر حملہ کردیا اور ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) میں پنجاب تک پہنچ گیا۔ سرہند میں ہمایوں کے لشکر نے سکندر شاہ سور کو شکست دینے کے بعد پہلے تو دہلی کو فتح کیا، اسکے بعد آگرہ پر قبضہ جمالیا۔ اور اس کی فوج نے آگرہ اور دہلی کے نواحی علاقوں کو بھی فتح کرلیا۔

محمد شاہ عادل نے جب یہ دیکھا کہ ہندوستان کی حکومت کا پرانا دعویدار ہمایوں دہلی اور آگرہ پر قابض ہوگیا ہے تو اس نے اپنے وزیر اعظم ہیمو بقال کے مشورہ سے چنار آکر نئے لشکر کی بھرتی شروع کی۔ تاکہ اس لشکر کے ذریعہ ہمایوں کو آگرہ اور دہلی سے نکالا جائے۔ ابھی عادل ہمایوں کے مقابلہ کے لئے جنگی تیاریوں ہی میں مصروف تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ ہمایوں کا انتقال ہوگیا ہے اور اکبر کو اس کا جانشین بنا دیا گیا ہے اس اطلاع کے ملتے ہی محمد شاہ عادل اور ہیمو بقال کے حوصلے بڑھ گئے اور انکو یقین ہوگیا کہ اب مغلوں کو آگرہ اور دہلی سے نکالنا کچھ دشوار نہیں۔

ہیمو بقال کا مغلوں پر حملہ

ہیمو نے احمد شاہ عادل کو تو چنار ہی میں

چھوڑا۔ کیونکہ یہاں پٹھانوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا اور خود ایک ہزار ہاتھی اور پچاس ہزار سوار لیکر مغلوں کے مقابلے کے لئے آگرہ کی جانب بڑھا مغل فوج کے سردار سکندر خاں اُزبک اور دوسرے مغل افسروں نے ہیمو کے عظیم الشان لشکر کو دیکھا تو گھبرا گئے۔ مغلوں کی فوج ہیمو بقال کے لشکر کے مقابلہ میں بہت کم تھی لہذا مغلوں نے یہ سوچا کہ ہیمو بقال سے لڑنا بے سود ہے۔ چنانچہ مغل فوج بغیر لڑے ۹۶۳ھ (۱۵۵۶ء) میں آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی گئی تو ہیمو نے آگرہ تو اپنے ماتحتوں کے حوالہ کیا اور بھاگتے ہوئے دشمن کے تعاقب میں دہلی پہنچا یہاں مغل حاکم مرزا تردی بیگ سے ہیمو کا مقابلہ ہوا۔ تردی بیگ بھی ہیمو سے شکست کھانیکے بعد پنجاب بھاگ گیا ہیمو نے دہلی پر بھی قبضہ جما لیا اسکے بعد ہیمو مغلوں کی سرکوبی کے لئے پنجاب جا رہا تھا کہ راستہ میں پانی پت کے تاریخی میدان میں اس کی فوج کا مغل فوج سے سخت مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں ہیمو کی آنکھ میں تیر لگا اور گرفتار ہو گیا۔ بیرم خاں نے اسے فوراً قتل کر دیا۔

سوری پٹھانوں کی حکومت کا خاتمہ

شیر شاہ نے ہندوستان میں پٹھانوں کی جس حکومت کو از سر نو زندہ کیا تھا۔ وہ اس جنگ کے بعد پانی پت کے میدان میں ختم ہو گئی یہ عجیب اتفاق ہے کہ پٹھانوں کی سابقہ حکومت بھی ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد پانی پت ہی میں ختم ہوئی تھی اور یہ جدید پٹھان حکومت بھی پانی پت ہی کے میدان میں دفن ہو گئی۔ پٹھانوں کی سابقہ حکومت کو بھی مغلوں ہی نے ختم کیا تھا۔ اور جدید پٹھان حکومت کا خاتمہ بھی مغلوں ہی کے ہاتھوں ہوا۔

محمد شاہ عادل کے لشکر کو پانی پت کے میدان میں شکست ہونیکے بعد افغان اس سے برگشتہ ہو گئے۔ اور اب عادل میں اتنی طاقت نہ رہی کہ وہ

پٹھانوں کی حکومت کی بقا کے لئے از سرِ نو جد و جہد کر سکتا. محمد شاہ عادل پر ایک تازہ مصیبت یہ آن پڑی کہ عادل کے پھوپی زاد بھائی خضر خاں نے بنگال سے فوج کشی کر کے محمد شاہ عادل کے علاقہ کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔

خضر خاں محمد شاہ سور شاہ بنگال کا بیٹا تھا جو باپ کے لڑائی میں مارے جانے کے بعد گور کے تخت پر سلطان بہادر کے لقب کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ محمد شاہ عادل گو میدانِ جنگ کا مرد نہیں تھا لیکن اس نے بڑی بہادری کے ساتھ خضر خاں یعنی سلطان بہادر کا مقابلہ کیا۔ اور اسی مقابلہ میں ۹۶۴ھ (۱۵۵۷ء) میں مارا گیا۔ اور اس طرح شیر شاہ کے خاندان کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔ محمد شاہ عادل ایک نہایت ہی ناکارہ اور عیش پسند بادشاہ تھا۔ جس کو حکمرانی اور جہانبانی کے کاموں سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ البتہ وہ اپنے زمانہ کا بہترین گویّا تھا۔ بڑے بڑے ماہرینِ موسیقی اس کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ وہ عورتوں کا ضرور دلدادہ تھا۔ مگر اس نے ساری عمر منشیات سے پرہیز کیا۔

سوری حکومت پر ایک نظر

سوری حکومت پر اگر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ شیر شاہ ہی نے اس کی بُنیاد رکھی تھی اور شیر شاہ کے مرنے کے بعد ہی یہ حکومت ختم ہو گئی۔ شیر شاہ کا بیٹا سلیم شاہ اس وسیع حکومت کو سنبھالنے کے معاملہ میں قطعی نااہل ثابت ہوا۔ اور اس کے بعد جو دو برائے نام حکمران ہوئے۔ ان کا ذکر کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔

شیر شاہ نے ہندوستان میں جس مضبوط اور باقاعدہ حکومت کی بُنیاد رکھی تھی اگر اس کے جانشین اس کو سنبھال سکتے اور اسکے بنائے ہوئے مستحکم نظام کے ماتحت اُسے چلا سکتے تو شاید سوری حکومت کا دور ہندوستان کی تاریخ میں بہترین دور شمار کیا جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ شیر شاہ نے پانچ سال کی مختصر سی مدت

میں مفادِ عامہ کے جو بڑے بڑے کام کئے ہیں وہ دوسرے بادشاہ صدیوں میں بھی نہیں کر سکے۔ اسلئے اگر اسکے جانشین بھی شیرشاہ کے سچے مقلد ثابت ہوتے تو سوری حکومت کو نہ صرف بے حد عروج حاصل ہوتا بلکہ وہ زمانۂ دراز تک ہندوستان میں قائم رہنے کے بعد ہندوستان کی بہت بڑی خدمت انجام دیتی لیکن افسوس کہ اس کے نا اہل جانشینوں نے سوری حکومت کا شیرشاہ کے مرتے ہی گلا گھونٹ دیا۔

چودھواں باب

ہندوستان کی خود مختار اسلامی حکومتیں

سنہ ۷۴۰ھ تا سنہ ۱۰۰۸ھ

۱۳۴۰ء تا ۱۵۹۹ء

خود مختار اسلامی حکومتیں

محمد بن قاسم کے سندھ میں فاتحانہ داخلہ سے لیکر سوری حکومت کے خاتمہ تک تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس طویل مدت میں مسلمانوں کی نئی نئی حکومتیں ہندوستان میں بن بنکر مٹتی رہی ہیں۔ اور مٹ مٹ کر بنتی رہی ہیں لیکن اسکے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ مسلم حکومت ہندوستان میں ختم ہو گئی ہو۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ مسلمان حکمراں بدلتے رہے ہیں یعنی جہاں تک مسلم حکومت کا تعلق ہے وہ برابر کسی نہ کسی صورت میں ہندوستان میں قائم اور برقرار رہی ہے۔

حکومتوں کی اس تبدیلی کا یہ اثر ضرور ہوا کہ کبھی تو دہلی کی مرکزی اسلامی حکومت کی سرحدیں ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک اور گجرات و کاٹھیاواڑ سے لیکر بنگال تک وسیع ہو جاتی تھیں۔ اور کبھی دہلی کی مرکزی حکومت اپنے صوبوں اور علاقوں کے نکل جانے کے بعد صرف دہلی اور اس کے مفصلات تک محدود ہو کر رہ جاتی تھی اور جو صوبے اور علاقے دہلی کی مرکزی حکومت سے نکل جاتے تھے وہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیتے تھے لیکن یہ خود مختار صوبے بھی بجز چند چھوٹے چھوٹے علاقوں کے ہمیشہ ان صوبوں کے مسلمان حکمرانوں ہی کے زیر حکومت رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان صوبوں کے مسلم حاکموں نے مرکز سے اپنا تعلق منقطع کرنے کے بعد اپنے اپنے صوبوں میں خود مختار اسلامی بادشاہتیں الگ الگ قائم کر لی تھیں۔

ہم نے اس وقت تک ہندوستان کی اسلامی حکومت کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ صرف مرکزی اسلامی حکومت کے حالات و واقعات تک محدود

ہے۔ چنانچہ ہم نے ابھی تک ان خودمختار اسلامی حکومتوں پر روشنی نہیں ڈالی ہے جنہوں نے کہ مرکزی اسلامی حکومت سے علیحدہ ہو کر خودمختارانہ حیثیت میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں علیحدہ علیحدہ اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں حالانکہ ان خودمختار اسلامی حکومتوں کی تاریخیں کسی طرح بھی مرکزی کی اسلامی حکومت کی تاریخ سے کم شاندار نہیں ہیں کیونکہ ان خودمختار اسلامی حکومتوں کو مرکزی کی اسلامی حکومت کی طرح ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مرکزی اسلامی حکومت سے قطع تعلق کرنے کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جو نئی نئی خودمختار اسلامی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) بنگال و بہار کی خودمختار اسلامی حکومت۔

(۲) جونپور (موجودہ یوپی) کی خودمختار اسلامی حکومت۔

(۳) کشمیر کی خودمختار اسلامی حکومت۔

(۴) مالوہ کی خودمختار اسلامی حکومت۔

(۵) گجرات کی خودمختار اسلامی حکومت۔

(۶) خاندیش کی خودمختار اسلامی حکومت۔

ان چھ خودمختار حکومتوں کے علاوہ یوں تو اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں ہندوستان میں قائم ہو گئی تھیں لیکن ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں جن خودمختار اسلامی حکومتوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے وہ یہی چھ حکومتیں ہیں۔

اس موقعہ پر یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خودمختار اسلامی حکومتیں صرف نام کی حکومتیں نہیں تھیں بلکہ انہیں سے ہر حکومت کی حیثیت اور علاقہ موجودہ زمانہ کی بڑی سے بڑی یورپین حکومتوں کے ہم پلہ تھا۔ چنانچہ بنگال، جونپور

اور گجرات کی خود مختار اسلامی حکومتوں نے تو اس قدر اہمیت حاصل کر لی تھی کہ ان کے مقابلہ میں مرکز کی اسلامی حکومت بھی ماند دکھائی دینے لگی تھی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ان خود مختار اسلامی حکومتوں میں سے ہر حکومت کی تاریخ اس قدر طویل اور شاندار ہے کہ ہر حکومت پر ایک مستقل تاریخ لکھنے کی ضرورت ہے لیکن اس موقعہ پر ہم صرف اسی پر اکتفا کرینگے کہ ان خود مختار اسلامی حکومتوں کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دیں تاکہ ناظرین کو کسی نہ کسی حد تک ان خود مختار اسلامی حکومتوں کے حالات سے بھی واقفیت ہو جائے۔

سب سے پہلے ہم بنگال کی خود مختار اسلامی حکومت پر روشنی ڈالینگے۔ کیونکہ اسے ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد سلطنت جونپور سلطنت کشمیر سلطنت مالوہ سلطنت گجرات اور سلطنت خاندیش پر ہلکا سا تبصرہ پیش کریں گے۔

بنگال کی خود مختار اسلامی حکومت

مسلمانوں کے حملہ سے قبل زمانۂ دراز تک بنگال ہندو راجاؤں کی حکمرانی کا بہت بڑا مرکز بنا رہا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی فتح سے قبل بنگال پر ۱۶ ہندو راجاؤں نے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال حکومت کی ہے۔

سلطان شہاب الدین غوری پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس کے دورِ حکومت میں شہاب الدین کے وائسرائے قطب الدین ایبک کو بنگال کی تسخیر کا خیال پیدا ہوا چنانچہ قطب الدین ایبک کے مشہور جنرل بختیار خلجی نے ایک مختصر سی جمعیت کے ذریعہ پہلے تو بہار کو فتح کیا اور اس کے بعد سارے بنگال کو فتح کرنے کے بعد بہار اور بنگال کو دہلی کی حکومت کے ساتھ ملحق کر دیا۔

بہار اور بنگال کی فتح کے بعد قطب الدین ایبک نے ان دونوں صوبوں کی حکومت بختیار خلجی کو دیکر اسے بہار اور بنگال کا گورنر بنا دیا تھا لیکن بختیار خلجی کی موت کے بعد بنگال کے گورنر برائے نام دہلی کی حکومت کے مطیع رہے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ دور دراز فاصلہ کی بنا پر دہلی کی مرکزی حکومت بنگال پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے پر ہمیشہ ناکام رہی۔

بنگال کے گورنروں کی اس خود سری کو دیکھتے ہوئے غیاث الدین بلبن کو ان کی سرکوبی کی جانب خاص طور پر توجہ کرنی پڑی تھی۔ چنانچہ بلبن نے طغرل خاں کو جو بنگال کا خود مختار حکمراں بنا ہوا تھا سخت سزا دی تھی اور اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال اور بہار کی حکومت سپرد کر دی تھی۔ بغرا خاں کے بعد بغرا خاں کے بیٹے اور جانشین زمانۂ دراز تک بنگال و بہار پر حکومت کرتے رہے لیکن وہ بھی تقریباً خود مختار رہے۔

سلاطین خلجی اور غیاث الدین تغلق کے دورِ حکومت تک تو بنگال کے گورنروں کا یہ طریقہ کار رہا کہ وہ دہلی کی مرکزی حکومت کے ساتھ برابر اپنی زبانی اطاعت کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن سلطان محمد تغلق کے دورِ حکومت میں قدر خاں حاکم بنگال کے مرنیکے بعد اسکے نائب فخر الدین نے ۷۴۰ھ (۱۳۴۰ء) میں بنگال پر پوری طرح قبضہ جمالیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے سنار گاؤں کو دار السلطنت قرار دیدیا۔

فخر الدین کی خود مختاری کے اس اعلان کے بعد اسکی بدقسمتی سے بنگال میں اسکے دو مضبوط رقیب پیدا ہو گئے۔ ایک مبارک خاں جس نے کہ لکھنوتی (ڈھاکہ) پر قبضہ جماکر اور سلطان علاء الدین کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ دوسرا رقیب ملک الیاس تھا۔ جسکے پاس بہت بڑا لشکر تھا۔ ملک الیاس نے پہلے تو سلطان علاء الدین کو قتل کیا اور اپنا لقب سلطان شمس الدین اختیار کیا اور اسکے بعد سنار گاؤں پر قبضہ کر کے فخر الدین کو بھی گرفتار کر لیا اور سارے بنگال و بہار کا بادشاہ بن بیٹھا۔

بنگال کے خود مختار مسلم بادشاہ

ذیل میں ہم بنگال کے ان خود مختار بادشاہوں کے مختصر حالات درج کرتے ہیں جو زمانہ دراز تک بنگال پر حکومت کرتے رہے ہیں۔

سلطان شمس الدین بھنگرہ:۔ ملک الیاس جس نے کہ بنگال کی حکومت کے دونوں دعویداروں کو ختم کر کے ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) میں سارے بنگال پر قبضہ جمالیا تھا بنگال کا پہلا خود مختار بادشاہ ہوا ہے اس نے سلطان شمس الدین بھنگرہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ سلطان شمس الدین مرتے دم تک بڑی بے فکری کے ساتھ بنگال پر حکومت کرتا رہا کیونکہ شاہانِ دہلی کو اتنا موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اسکی جانب توجہ کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے ایک مرتبہ بنگال پر حملہ کر کے اسے شکست دیدی تھی لیکن فیروز شاہ کے بنگال سے واپس چلے جانیکے بعد پھر یہ بدستور وہاں کا بادشاہ

بن گیا تھا۔ یہ بادشاہ بنگال میں سولہ سال حکومت کرنے کے بعد ۷۵۹ھ (۱۳۵۷ء) میں فوت ہوگیا اور اپنے جانشینوں کے لئے بنگال کی ایک نہایت ہی وسیع اور مضبوط حکومت چھوڑ گیا۔ حاجی پور اسی بادشاہ کا آباد کیا ہوا ہے۔ یہ اپنے زمانہ کا لائق سپہ سالار اور بہت بڑا مدبر شمار کیا جاتا ہے۔

سلطان سکندر شاہ:۔ سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سکندر شاہ بنگال کے تخت پر بیٹھا اس کی حکومت کے زمانہ میں فیروز شاہ تغلق نے دوبارہ بنگال پر حملہ کیا تھا یہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر اکدالہ میں پناہ گزیں ہوگیا تھا۔ لیکن فیروز شاہ کے چلے جانیکے بعد اُس نے پھر بنگال کی حکومت سنبھال لی۔ اس نے ۹ سال اور چند ماہ بڑی قابلیت کے ساتھ بنگال پر حکومت کی ہے۔

شاہ غیاث الدین:۔ سکندر شاہ کے مرنیکے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین تخت پر بیٹھا۔ یہ بادشاہ بڑا نیک دل تھا۔ اسلام کی غیر معمولی تڑپ اس کے دل میں تھی ۷۷۵ھ (۱۳۷۳ء) میں یہ بادشاہ فوت ہوگیا۔

سلطان السلاطین:۔ شاہ غیاث الدین کے بعد اس کا بیٹا سلطان السلاطین بنگال کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بادشاہ بڑا بہادر اور فیاض طبع ہوا ہے اس نے دس سال حکومت کی ہے۔

سلطان شمس الدین ثانی:۔ سلطان السلاطین کے بعد اس کا جانشین اس کا خورد سال بیٹا سلطان شمس الدین قرار دیا گیا لیکن اس خورد سال بادشاہ کے عہد میں کنس نامی ایک ہندو امیر کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ وہی حکومت کا مختار مطلق بنا رہا یعنی جب تک شمس الدین زندہ رہا کنس ہی اس کے پردہ میں بادشاہی کرتا رہا۔

راجہ کنس کی حکومت:۔ سلطان شمس الدین جب ۷۸۷ھ میں مرا تو کنس کا اقتدار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہی بنگال کا راجہ بن گیا۔ اور کسی میں اسکے مقابلہ کی ہمت

نہ ہوئی۔ راجہ کنس اگرچہ کہنے کے لئے ہندو تھا۔ لیکن اس کے عقائد بڑی حد تک اسلامی تھے چنانچہ سات سال حکومت کرنے کے بعد جب یہ راجہ مرا تو مسلمانوں نے اس کو جلانے کی بجائے دفن کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک وہ محض نام کا ہندو تھا مگر درحقیقت مسلمان تھا۔

سلطان جیت مل جلال الدین:۔ راجہ کنس کے مرنے کے بعد جب اس کا بیٹا جیت مل بنگال کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنا اسلامی نام جلال الدین رکھا۔ اس بادشاہ نے بنگال پر تقریباً سترہ سال حکومت کی ہے۔ یہ عدل و انصاف کے لئے غیر فانی شہرت رکھتا ہے۔ (۸۱۲ھ (۱۴۱۰ء) میں یہ بادشاہ فوت ہو گیا۔

سلطان احمد بن جلال الدین:۔ جیت مل جلال الدین کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان احمد بنگال کے تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ نے اٹھارہ سال تک بنگال پر بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کی ہے۔

ناصر الدین غلام کی چند روزہ حکومت:۔ سلطان احمد کے چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی، اسلئے اسکے مرتے ہی حکومت میں ابتری پھیل گئی اور اس ابتری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان کا غلام ناصر الدین بنگال کے تخت پر بیٹھ گیا لیکن امرائے سلطنت نے اس غلام کو قتل کر کے بنگال کے سابق شاہی خاندان کے ایک شہزادہ کو ناصر الدین کا خطاب دیکر بنگال کے تخت پر بٹھا دیا۔

سلطان ناصر الدین بھنگرہ:۔ سلطان ناصر الدین بنگال کے سابق حکمران سلطان شمس الدین بھنگرہ کی اولاد میں سے تھا۔ اس بادشاہ کے بنگال کے تخت پر بیٹھنے کے بعد بنگال کی حکومت پھر سابقہ شاہی خاندان میں چلی گئی۔ سلطان ناصر الدین کسانوں کا بڑا ہمدرد تھا۔ یہ زمینداری کا شدید مخالف تھا۔ اس بادشاہ نے سولہ سال تک بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی ہے۔ اسکے دور حکومت

میں سابق شاہی خاندان کے افراد کو پھر نئے سرے سے بڑے بڑے عہدے حاصل ہو گئے۔ سولہ سال کی حکومت کرنے کے بعد یہ نیک دل بادشاہ ۸۳۲ھ (۱۴۲۸ء) میں فوت ہو گیا۔

باربک شاہ بن ناصرالدین شاہ:۔ ناصرالدین شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا باربک شاہ بادشاہ ہوا۔ اس بادشاہ نے حبشی غلاموں کو اس قدر عروج دیا کہ وزارت اور امارت تک کے عہدے حبشی غلاموں کو ملنے لگے۔ باربک شاہ ۷ سال سلطنت کرنے کے بعد ۸۴۹ھ (۱۴۳۵ء) میں انتقال کر گیا۔

یوسف شاہ بن باربک شاہ:۔ باربک شاہ کے بعد اس کا بیٹا یوسف شاہ بنگال کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بڑا عالم و فاضل اور دیندار بادشاہ تھا۔ اسکے زمانہ میں بنگال میں اسلام کو خوب عروج حاصل ہوا۔ اس بادشاہ کی برابر یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ حکمرانی کے معاملہ میں خلفائے اسلام کی تقلید کرے۔ سات سال چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد یہ بادشاہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

سکندر شاہ کی چند گھنٹوں کی بادشاہی:۔ یوسف شاہ کے مرنے کے بعض اُمرا نے سکندر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ حالانکہ وہ حکومت کا مستحق نہ تھا چنانچہ چند گھنٹوں کے بعد اسے معزول کر کے فتح شاہ کو بنگال کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔

سلطان فتح شاہ:۔ فتح شاہ بنگال کا نامور بادشاہ ہوا ہے۔ یہ بادشاہ اعلیٰ درجہ کا مدبر ہونے کے علاوہ بہت بڑا عالم بھی تھا لیکن یہ حبشی غلاموں اور حبشی خواجہ سراؤں کا شدید مخالف تھا چنانچہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں حبشی غلاموں کے اقتدار کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۷ سال کی حکومت کے بعد ۸۸۷ھ میں یہ بادشاہ خواجہ سراؤں کے سردار کے ہاتھوں بڑی بے دردی سے قتل ہوا۔

باربک شاہ خواجہ سرا کی حکومت :۔ خواجہ سراؤں کا سردار باربک شاہ اپنے آقا فتح شاہ کے قتل کے بعد خود بنگال کے تخت پر بیٹھ گیا اور اُس نے تمام بڑے بڑے عہدے خواجہ سراؤں میں تقسیم کر دئے لیکن ایک دوسرا حبشی سردار ملک اندیل اس کا دشمن ہو گیا۔ ملک اندیل بڑا بااثر حبشی تھا۔ فتح شاہ کے قتل میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ ملک اندیل نے موقع پاکر ایک روز محل میں گھُس کر باربک شاہ خواجہ سرا کو قتل کر دیا۔ باربک شاہ صرف آٹھ مہینے حکومت کر سکا۔

ملک اندیل حبشی کی حکومت :۔ باربک شاہ خواجہ سرا کے قتل کے بعد ملک اندیل حبشی بنگال کے تخت پر بیٹھا اور فیروز شاہ اپنا لقب اختیار کیا۔ اس زمانہ میں بنگال میں یہ رسم سی ہو گئی تھی کہ جو بھی بادشاہ کو قتل کرتا تھا وہی بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا تھا چنانچہ ملک اندیل حبشی کی بادشاہی کو تسلیم کر لیا گیا۔ ملک اندیل حبشی تین سال حکومت کرنے کے بعد ۸۹۹ھ (۱۴۹۴ء) میں فوت ہو گیا۔

محمود شاہ بن فیروز شاہ :۔ ملک اندیل حبشی یعنی فیروز شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ بنگال کا بادشاہ ہوا۔ یہ برائے نام بادشاہ تھا۔ حکومت کے سارے اختیارات غلام حبش خاں کے ہاتھ میں تھے لیکن محمود شاہ اور حبش خاں دونوں شیدی بدر حبشی کے ہاتھ سے مارے گئے۔

شیدی بدر حبشی مظفر شاہ :۔ محمود شاہ کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد بدر حبشی مظفر شاہ کا خطاب اختیار کرنے کے بعد بنگال کا بادشاہ بن گیا۔ یہ بڑا ہی سفاک اور ظالم بادشاہ تھا۔ اسکے خلاف بنگال کے اُمرا نے عام بغاوت برپا کر دی تھی جس میں ایک لاکھ بیس ہزار ہندو مسلمان مارے گئے تھے۔ یہ بادشاہ بھی وزیر سلطنت سید شریف مکی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مظفر شاہ نے تین سال اور پانچ ماہ حکومت کی۔

سلطان علاء الدین شریف مکی:- شیدی بدر حبشی کے قتل کے بعد بنگال سے حبشی غلاموں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اور شریف مکی سلطان علاء الدین کا لقب اختیار کرنے کے بعد بنگال کا بادشاہ بن گیا۔ اس بادشاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی ملک میں لوٹ مار عام ہو گئی۔ جسے بادشاہ نے بڑی سختی کے ساتھ دبایا۔ شریف مکی نے بڑی شان اور دبدبہ کے ساتھ بنگال پر بیس سال حکومت کی ہے۔ بیس سال کی حکومت کے بعد ۹۳۰ھ (۱۵۲۳ء) میں یہ بادشاہ انتقال کر گیا۔

نصیب شاہ بن سلطان علاء الدین:- سلطان علاء الدین کے مرنے کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا نصیب شاہ بنگال کے تخت پر بیٹھا سلطان ابراہیم لودھی جو بابر کے مقابلہ پر قتل ہو چکا تھا جب اس کی بیٹی فرار ہو کر بنگال آئی تو نصیب شاہ نے اُس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ یہ بادشاہ بہت بڑا شاطر تھا چنانچہ اس نے جب یہ دیکھا کہ ہندوستان میں مغلوں کا اقتدار بڑھ رہا ہے۔ تو اس نے مغل بادشاہوں کو تحائف بھیجنے شروع کر دیئے اور ان کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ بنگال کی جانب رُخ کر سکیں۔ نصیب شاہ ۹۴۳ھ (۱۵۵۸ء) میں اچانک فوت ہو گیا۔ بعض مورخین کی رائے ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

سلطان محمود بنگالی:- یہ نصیب شاہ کے اُمرائے سلطنت میں سے تھا نصیب شاہ کے بعد یہ بنگال کا بادشاہ بن گیا۔ اس نے اٹھارہ سال حکومت کی لیکن جب شیر شاہ نے اس پر لشکر کشی کی تو یہ بھاگ کر ہمایوں کے پاس چلا گیا تھا۔

سلطان محمود بنگالی کے فرار ہونے کے بعد شیر شاہ کے اُمرائے سلطنت میں سے سلطان بہادر نے بنگال کے تخت پر قبضہ جما لیا تھا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلیمان کررانی افغان نے سلطان بہادر سے بنگال کی حکومت چھین لی تھی۔ چنانچہ وہ کافی مدت تک حکومت کرتا رہا۔ سلیمان کررانی کے بعد اس کا بیٹا بایزید بنگال

کے تخت پر بیٹھا۔ پھر اس کے چھوٹے بھائی داؤد خاں نے بنگال کی حکومت سنبھالی۔ یہ بنگال کا آخری خود مختار بادشاہ ہوا ہے جسکو اکبری لشکر نے سنہ ۹۸۲ھ (سنہ ۱۵۷۴ء) میں تخت و تاج سے محروم کر کے بنگال کو مغلیہ حکومت میں شامل کر لیا تھا۔

بنگال کے خود مختار بادشاہوں کی اس طویل فہرست سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سنہ ۷۳۷ھ (سنہ ۱۳۳۶ء) سے لیکر ۹۸۲ھ (سنہ ۱۵۷۴ء) تک تقریباً ڈھائی سو برس تک یہ کس آزادی کے ساتھ بنگال کے وسیع علاقہ پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ ان میں لائق بادشاہ بھی ہوئے ہیں اور نا اہل بھی۔

بنگال کے خود مختار بادشاہوں کے دورِ حکومت پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان بادشاہوں میں سے اکثر بادشاہ بڑے دیندار اور پابند شرع تھے۔ چنانچہ ان کے دورِ حکومت میں بنگال میں اسلام کو خوب ترقی حاصل ہوئی، بنگال میں بڑی بڑی اور شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ نئے مدارس کھولے گئے اور بنگالی لٹریچر کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

جونپور کی خود مختار اسلامی حکومت

بنگال کے بعد ہندوستان کی خود مختار اسلامی حکومتوں میں حکومتِ جونپور یعنی موجودہ یوپی کو سب سے اہم تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ جونپور کا شہر سلطان فیروز شاہ تغلق نے "فخر جونا خاں تغلق" کے نام پر آباد کیا تھا۔ ابتدا میں اس شہر کا نام "جونا پور" تھا۔ مگر بعد کو کثرتِ استعمال سے جونپور گیا۔ چنانچہ یہی شہر زمانہ دراز تک ہندوستان کی ایک بہت بڑی خود مختار اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بنا رہا ہے۔ اور اسے ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔

جونپور کی خود مختار حکومت کا بانی حکومتِ دہلی کا وزیر اعظم خواجہ جہاں تھا جس کو سکندر شاہ تغلق کی تخت نشینی کے موقعہ پر عہدہ وزارت پیش کیا گیا تھا۔ سکندر شاہ تغلق کے مرنے کے بعد خواجہ جہاں ناصر الدین محمود شاہ تغلق کے دورِ حکومت میں بھی بدستور وزارتِ عظمیٰ کے فرائض انجام دیتا رہا۔ چنانچہ ناصر الدین محمود شاہ ہی نے اسے جونپور، بہار اور ترہت کا انتظام سپرد کرنے کے بعد "ملک الشرق" کا خطاب دیا تھا۔ اسی لئے یہ اور اسکے جانشین شاہان شرقی کے نام سے مشہور ہوئے۔

وزیر خواجہ جہاں ملک الشرق اپنے زمانہ کا بہت بڑا مدبر تھا۔ اس نے جونپور کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اس صوبہ کی فوجی طاقت کو خوب بڑھایا۔ شروع شروع میں تو یہ بظاہر سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت کا اطاعت شعار بنا رہا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ دہلی کی حکومت دم توڑ رہی ہے۔ اور سلطان محمود شاہ تغلق بے دست و پا ہو چکا ہے تو ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

خواجہ جہاں ملک الشرق نے صرف خود مختاری کے اعلان پر ہی اکتفا نہیں کیا۔

بلکہ اس اعلان کے فوراً ہی بعد گور کھپور، بہرائچ، گنگا جمنا کا درمیانی علاقہ اور بہار کا
بہت سا علاقہ فتح کرنے کے بعد اپنی اس نئی حکومت کی سرحدوں کو دُور دُور
تک پھیلا دیا۔ غرضکہ رفتہ رفتہ ملک الشرق کی طاقت اور دبدبہ اتنا بڑھ گیا کہ ٹھٹھ
اور بنگال کے حاکم اسکی خدمت میں اسی طرح تحفے تحائف اور نذرانے بھیجنے لگے۔
جس طرح کہ وہ اس سے قبل شاہانِ دہلی کو بھیجا کرتے تھے۔ گویا خواجہ جہاں ملک الشرق
نے شاہانِ دہلی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اور اسے مشرق کا بہت بڑا بادشاہ
تسلیم کیا جانے لگا۔

حکومتِ جونپور کے خود مختار بادشاہ

خواجہ جہاں ملک الشرق جو حکومت
جونپور کا بانی تھا۔ چھ سال بڑی شان
اور دبدبہ سے حکومت کرنے کے بعد ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں فوت ہو گیا۔ اور
اپنے پیچھے ایک نہایت وسیع اور مضبوط حکومت چھوڑ گیا۔

سلطان مبارک شاہ شرقی:۔ خواجہ جہاں ملک الشرق کے مرنے کے بعد اس کا
متبنیٰ ملک قرنفل "مبارک شاہ" کے لقب کے ساتھ جونپور کے تخت پر بیٹھا۔ اسکی
تخت نشینی کے فوراً ہی بعد دہلی کا بادشاہ سلطان محمود شاہ تغلق حملہ کی غرض سے
جونپور آیا تھا۔ مگر ناکام واپس چلا گیا۔ یہ بادشاہ ایک سال اور چند ماہ حکومت
کرنے کے بعد ۸۰۴ھ (۱۴۰۲ء) میں انتقال کر گیا۔

شاہ ابراہیم شرقی:۔ مبارک شاہ کے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم
شاہ شرقی کے لقب سے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ محمود شاہ تغلق نے اس پر بھی حملہ کرنا
چاہا تھا۔ مگر اسے دوبارہ ناکام واپس جانا پڑا۔ یہ بادشاہ بہت بڑا علم دوست
تھا۔ اس کے دربار میں دُنیا کے مشہور علما کا ہجوم رہتا تھا۔ اسکے دورِ حکومت میں جونپور
دہلی کا ثانی بن گیا تھا۔ یہ بادشاہ بڑی شان کے ساتھ چالیس برس حکومت کرنیکے

بعد ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں فوت ہوگیا۔

سلطان محمود شرقی:- ابراہیم شرقی کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمود شرقی جونپور کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بڑا دیندار بادشاہ تھا۔ چنانچہ اس نے نصیر خاں حاکم کالپی پر محض اس بنا پر حملہ کر دیا تھا۔ کیونکہ نصیر خاں مرتد ہوگیا تھا اور اس نے مسلمانوں کو کالپی سے نکال دیا تھا اور مسلم عورتوں کو غیر مسلموں کے حوالے کر دیا تھا سلطان محمود نصیر خاں کی ان حرکتوں سے سخت بیزار تھا لیکن نصیر خاں کے توبہ کرنے پر سلطان نے اسے معاف کر دیا تھا اس بادشاہ نے ۸۵۶ھ میں دہلی پر حملہ کرکے سارے شہر کا محاصرہ کرلیا تھا اگرچہ کچھ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ اسے دہلی کو فتح کیئے بغیر واپس جانا پڑا۔ بہلول لودھی سے بھی اس بادشاہ کی دو لڑائیاں ہوئی تھیں۔ یہ اٹھارہ سال حکومت کرنے کے بعد ۸۶۲ھ (۱۴۵۷ء) میں انتقال کرگیا۔

سلطان محمد شاہ شرقی:- سلطان محمود کا جانشین اس کا بڑا بیٹا بھکن خاں ہوا جو سلطان محمد شاہ کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے بھائی حسن خاں کو قتل کرا دیا تھا جس کی بنا پر اسکی ماں اور بھائی اس کے جانی دشمن ہوگئے تھے یہ بادشاہ جب بہلول لودھی سے جنگ میں مصروف تھا تو اس کی ماں اور بھائیوں نے اسکے قتل کے لئے ایک زبردست سازش تیار کرلی۔ چنانچہ جب یہ میدانِ جنگ سے جونپور واپس آرہا تھا تو اسے راستہ ہی میں قتل کر دیا گیا۔ اس نے صرف پانچ مہینے حکومت کی۔

سلطان حسین شاہ شرقی:- سلطان محمد شاہ شرقی کے قتل ہونے سے قبل ہی اس کا بھائی سلطان حسین شاہ جونپور کے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ اس بادشاہ نے تخت نشین ہوتے ہی بہلول لودھی سے صلح کرلی۔ لیکن بعد میں اسکی بہلول لودھی سے کئی لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مگر بہلول لودھی کے مقابلہ پر حسین شاہ کو ہمیشہ شکستوں کا منہ

دیکھنا پڑا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حسین شاہ کو فرار ہونا پڑا۔ اور بہلول لودھی نے جونپور کی حکومت کو فتح کرنے کے بعد اسے بھی دہلی کی حکومت میں شامل کر لیا حسین شاہ نے سلطان بہلول لودھی کے جانشین سکندر لودھی سے اپنی سلطنت واپس لینے کے لئے کئی مرتبہ جنگ کی مگر اسے ناکامی ہوئی۔ غرضکہ سلطان حسین شاہ ۱۹ سال حکومت کرنے کے بعد بنگال چلا گیا۔ اور اس طرح شاہانِ شرقی کی حکومت ۸۸۱ھ (۱۴۷۶ء) میں ختم ہو گئی۔

جونپور کی خود مختار حکومت جو موجودہ زمانہ کے صوبہ یوپی پر مسلط تھی شمالی ہند کی مضبوط ترین حکومت شمار کی جاتی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر اس سلطنت کے آخری بادشاہوں کے دل و دماغ میں حکومتِ دہلی کے فتح کرنے کی ہوس نہ پیدا ہوئی ہوتی اور انھوں نے بار بار بادشاہانِ دہلی کو جنگ کیلئے نہ للکارا ہوتا تو شاید یہ حکومت بہت زمانہ تک باقی رہتی۔

شاہانِ شرقی تقریباً اسی سال تک جونپور کے علاقہ پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ ان کے زمانہ میں حکومت جونپور علمی ترقی کے اعتبار سے دوسری سلطنت بغداد بن گئی تھی۔ علوم و فنون کو ترقی دینے میں شاہانِ شرقی نے نمایاں حصہ لیا ہے

کشمیر کی خود مختار اسلامی حکومت

کشمیر ہزاروں برس تک ہندو راجاؤں کے زیر حکومت رہا ہے۔ اس خصوصیت ملک میں خود مختار اسلامی حکومت کی بنیاد ۷۴۷ھ (۱۳۴۶ء) میں شاہ میر نامی ایک ایسے پُراسرار درویش نے رکھی تھی جسکی ابتدائی زندگی کے حالات پر بڑی حد تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ شاہِ میر نے جس زمانہ میں کہ کشمیر میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تھی اسوقت کشمیر پر کوتا دیوی نامی ایک ہندو بیوہ رانی حکومت کر رہی تھی۔ مؤرخوں کا بیان ہے کہ شاہ میر اور اسکے بیٹوں نے جب لشکر کشی کر کے کوتا دیوی کو شکست دیدی تو وہ اطاعت قبول کرنے کے بعد مسلمان ہوگئی اور شاہِ میر نے اسکے ساتھ نکاح کر لیا اور وہ سلطان شمس الدین کے لقب کے ساتھ کشمیر کا با اختیار بادشاہ بن گیا۔

شاہِ میر کون تھا اور اس کا کس خاندان یا قبیلہ سے تعلق تھا اس کا کسی کو بھی کوئی علم نہیں۔ تاریخ کشمیر کے مطالعہ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے دورِ حکومت میں ۷۱۵ھ میں شاہ میر ایک درویش کی حیثیت سے پہلی مرتبہ کشمیر میں داخل ہوا تھا۔ کشمیر آنے کے بعد شاہِ میر کے اثرات نہ صرف عوام میں پھیل گئے بلکہ کشمیر کا راجہ سنہ دیو بھی اس کا معتقد ہو گیا تھا جس زمانہ میں کہ شاہِ میر کا اقتدار کشمیر میں کافی بڑھ چکا تھا اسی زمانہ میں مہاراجہ تبت کے بیٹے "رنجن" نے کشمیر پر حملہ کر کے اسے بالکل ویران کر دیا تھا اور راجہ سنہ دیو کی طاقت کو ختم کر کے رکھ دیا تھا چنانچہ جب کشمیر کا راجہ سنہ دیو مر گیا تو یہی رنجن تبتی کشمیر کے تخت پر قابض ہو گیا۔

راجہ رنجن تبتی نے کشمیر کے تخت پر قبضہ جمانے کے بعد جب یہ دیکھا کہ کشمیر میں شاہ میر کے اثرات بے حد پھیلے ہوئے ہیں تو اس نے شاہ میر کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا اور

شاہ میر کی صحبت کے اثر سے بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ راجہ رنجن کو شاہ میر پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے حکومت کے کلی اختیارات شاہ میر کو دیدئے تھے۔ یعنی حقیقت میں کشمیر پر راجہ رنجن نہیں بلکہ شاہ میر حکومت کر رہا تھا۔

راجہ رنجن تبتی جب مر گیا تو اس کا ایک رشتہ دار اون دیو قندھار سے آکر کشمیر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ راجہ اون دیو نے اگرچہ شاہ میر کو بدستور وزیر اعظم کے عہدہ پر قائم رکھا لیکن وہ شاہ میر سے خوش نہیں تھا لیکن کشمیر میں شاہ میر کے وسیع اثرات کی بنا پر انہیں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ شاہ میر کو وزارت عظمیٰ کے عہدہ سے علحدہ کر سکتا۔

راجہ اون دیو کے تخت نشین ہونے کے فوراً ہی بعد شاہ میر اور راجہ میں کشیدگی بڑھنے لگی چنانچہ راجہ نے یہ حکم دیدیا کہ شاہ میر کے بیٹے دربار میں نہ آئیں۔ شاہ میر کے چار بیٹے تھے جمشید، علی شیر، سیاتمک اور ہندال۔ ان چاروں نے راجہ کے اس ذلت آمیز حکم سے مشتعل ہو کر راجہ کے خلاف بغاوت کر دی اور کشمیر کے تقریباً تمام پرگنوں پر یہ قابض ہو گئے۔ ابھی یہ بغاوت جاری ہی تھی کہ راجہ اون دیو مر گیا اور اسکی جگہ اسکی بیوہ رانی کوتا دیوی کشمیر کے تخت پر بیٹھ گئی۔ رانی ایسی حالت میں تخت پر بیٹھی تھی جبکہ سارے کشمیر میں بغاوت کی آگ بری طرح بھڑک رہی تھی چنانچہ اس بغاوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ میر اور اسکے بیٹوں نے رانی کے خلاف فوج کشی کر کے اسے شکست دیدی اور گرفتار کر لیا۔ رانی نے اطاعت قبول کر لی اور مسلمان ہونے کے بعد شاہ میر سے نکاح کر لیا۔

کشمیر کی خود مختار اسلامی سلطنت کے بادشاہ

سلطان شمس الدین یعنی شاہ میر نے کشمیر میں خود مختار اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے بعد اس حکومت کو اچھی طرح سے مستحکم کیا۔ اس نے کشمیر کے تخت پر بیٹھتے ہی ان تمام خرابیوں کو دور کر دیا۔ جو

زمانہ دراز سے پھیلی ہوئی تھیں۔ رعایا کی سہولت کے لئے اس نے محصول گھٹا دیئے
یعنی چوتھائی حصہ کی بجائے چھٹا حصہ محصول مقرر کیا۔ اس نے قوم چک اور قوم
ماگری کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا۔ جب حکومت کی بُنیادیں اچھی
طرح مستحکم ہوگئیں تو اس نے سلطنت کا سارا کام اپنے بیٹوں یعنی جمشید اور علی شیر کے
سپرد کر دیا۔ اور خود اپنا بیشتر وقت عبادت الٰہی میں صرف کرنے لگا یہ بادشاہ
دو سال ۱۱ ماہ اور ۲۵ روز سلطنت کرنیکے بعد ۷۵۰ھ (۱۳۴۹ء) میں رحلت
کر گیا لیکن اس مختصر سے عرصہ میں اس نے کشمیر کی خودمختار اسلامی حکومت کی بُنیادیں
اتنی مضبوط کر دی تھیں کہ اس کے جانشین زمانہ دراز تک کشمیر پر بڑی شان اور
دبدبہ کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

سلطان جمشید کی چند روزہ حکومت :- شاہ میر کے مرنے کے بعد اُمرائے
سلطنت نے اس کے بڑے بیٹے امیر جمشید کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن رعیت اور
سپاہ کیونکہ امیر جمشید سے خوش نہ تھی۔ اس لئے فوج اور عوام نے اس کے چھوٹے
بھائی علی شیر کو بدنی پورہ میں بادشاہ بنا دیا اور اس طرح باپ کے مرتے ہی ان
دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی لیکن سلطان جمشید کی عمر نے وفا نہیں کی
وہ دو ماہ سلطنت کرنے کے بعد ۷۵۰ھ (۱۳۴۹ء) میں فوت ہو گیا۔

سلطان علاء الدین :- امیر جمشید کے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی علی شیر
سلطان علاء الدین کا لقب اختیار کرنے کے بعد کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے
اپنے چھوٹے بھائی سیانک کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ عطا کیا۔ یہ بادشاہ بڑا ہی
دیندار اور نیک تھا۔ چنانچہ اس نے حکم دیدیا تھا کہ آوارہ عورتوں کو شوہر یا باپ
کی میراث میں سے کوئی حصہ نہ دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں بدچلن
عورتوں نے پارسائی کی زندگی اختیار کر لی۔ سلطان علاء الدین ۱۴ سال ۸ ماہ ۱۳

روز حکومت کرنیکے بعد ۷۶۵ھ (۱۳۶۳ء) میں مر گیا۔ اس نے بخشی پور کے نزدیک اپنے نام پر شہر علا پور آباد کیا تھا۔

سلطان شہاب الدین:۔ سلطان علاء الدین کے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سیانک سلطان شہاب الدین کا لقب اختیار کرنے کے بعد کشمیر کے تخت پر بیٹھا، یہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا سپہ سالار تھا چنانچہ اسکی فتوحات کا سلسلہ دور تک پھیل گیا تھا۔ اس نے حملہ کر کے دریائے سندھ کے کنارہ تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ پشاور پر بھی حملہ آور ہوا تھا۔ قندہار اور غزنی کے حکمران اس سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے تبت کے حکمران بھی اس سے ڈرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بادشاہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا اور بہادر حکمران ہوا ہے جس کی فتوحات نہایت شاندار ہیں یہ بادشاہ بڑے دبدبہ کے ساتھ سلطنت کرنے کے بعد ۷۹۴ھ (۱۳۹۱ء) میں دنیا سے رحلت کر گیا۔ شہاب پور اسی بادشاہ نے آباد کیا تھا۔

سلطان قطب الدین:۔ سلطان شہاب الدین کے بعد اس کا بھائی ہندال قطب الدین کا لقب اختیار کرنے کے بعد بادشاہ ہوا۔ اس بادشاہ کا دور حکومت فتوحات سے خالی ہے۔ کیونکہ یہ اپنے بھائی شہاب الدین کی طرح بہادر نہیں تھا لیکن منتظم اعلیٰ درجہ کا تھا۔ یہ بادشاہ پانچ سال سلطنت کر کے ۷۹۹ھ (۱۳۹۶ء) میں فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے دو خورد سال لڑکے چھوڑے تھے جن میں سے ایک کا نام سگا تھا اور دوسرے کا نام ہیبت خاں تھا۔

سلطان سکندر:۔ سلطان قطب الدین کے مرنے کے بعد اس کا کمسن لڑکا سگا سلطان سکندر کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ سلطان سکندر کی عمر چونکہ بہت کم تھی۔ اس لئے اس کی ماں اسکی طرف سے جہانبانی کے فرائض انجام دیتی تھی۔ جب یہ بادشاہ سن شعور کو پہنچا تو اس نے حکومت کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اور بڑی قابلیت کے ساتھ حکومت کرنی شروع کی۔ اس نے تبت کو فتح کر کے اسے حکومتِ کشمیر کے ساتھ ملحق کر لیا۔ یہ بڑا فیاض دل بادشاہ تھا اور بہت بڑا علم دوست تھا چنانچہ اس کے زمانہ میں کشمیر میں علم و فضل اس قدر بڑھا کہ کشمیر عراق اور خراسان کا نمونہ بن گیا۔ بت پرستی سے اس بادشاہ کو فطری طور پر نفرت تھی۔ چنانچہ اس نے سونے چاندی کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرا کر اور گلوا کر خزانہ شاہی میں داخل کر دیا تھا۔ ستی کی ظالمانہ رسم کو اس بادشاہ نے خلافِ قانون قرار دیا تھا۔ شراب نوشی اور مے فروشی اسکی سلطنت میں بدترین جرم تھی۔ زنا کاری کو اس نے یک قلم موقوف کر دیا تھا۔ غرضکہ اس دیندار بادشاہ نے ایک طرف تو سلطنت کے انتظام کو نہایت ہی چست بنا دیا تھا۔ دوسری جانب اس نے تبلیغ اور اشاعتِ اسلام میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ سودیو بھٹ نامی نومسلم برہمن اس بادشاہ کا وزیر اعظم تھا۔ سودیو بھٹ یوں تو بہت بڑا مدبر تھا لیکن نومسلم ہونے کی بنا پر وہ سخت متعصب تھا۔ چنانچہ اس کا رویہ غیر مسلموں کے ساتھ اچھا نہ تھا جسے بادشاہ ناپسند کرتا تھا۔ جب یہ بادشاہ تپ محرقہ میں مبتلا ہوا اور زندگی کی کوئی امید نہیں رہی تو اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے میر خاں کو علی شاہ کا خطاب دیکر سلطنت اسکے حوالے کر دی تھی۔ یہ بادشاہ ۲۰ سال اور ۹ مہینے حکومت کرنے کے بعد ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ اس بادشاہ کو کشمیر کی تاریخ میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

سلطان علی شاہ: سلطان علی شاہ کو باپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے زمانہ کے وزیر سودیو بھٹ کو بدستور وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر برقرار رکھا۔ سودیو بھٹ کے مرنے کے بعد سلطان علی شاہ کا چھوٹا بھائی شاہی خاں وزیر ہوا لیکن سلطان علی شاہ اور شاہی خاں میں چند ہی روز کے بعد شکر رنجی ہو گئی۔ شاہی خاں کشمیر سے فرار ہو کر پنجاب چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جسرت گکھڑ سمرقند

سے امیر تیمور کی قید سے نکل کر پنجاب بھاگ آیا تھا اور اس نے پنجاب میں خوب تباہی مچا رکھی تھی۔ شاہی خاں پنجاب آنے کے بعد جسرت گکھڑ سے مل گیا۔ سلطان علی شاہ جب شاہی خاں کے تعاقب میں ایک بڑا لشکر لیکر پنجاب آیا تو شاہی خاں اور جسرت گکھڑ نے اس کا سخت مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں سلطان علی شاہ کو شکست ہو گئی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ شاہی خاں نے سلطان علی شاہ کو شکست کے بعد زندہ گرفتار کر لیا تھا بعض مورخوں کا بیان ہے کہ وہ فرار ہو گیا تھا اور شاہی خاں نے کشمیر کے تخت پر قبضہ جما لیا تھا۔ سلطان علی شاہ نے کشمیر پر ۶ سال اور ۹ ماہ حکومت کی۔

سلطان زین العابدین:۔ شاہی خاں جو بھائی کو شکست دینے کے بعد کشمیر کے تخت پر بیٹھا تھا۔ نہایت ہی وسیع نظر حکمران تھا۔ اسکے دربار میں ہندو مسلمانوں کو یکساں اقتدار حاصل تھا۔ جسرت گکھڑ کو اسی بادشاہ نے سب سے زیادہ مدد دی تھی چنانچہ اسی بادشاہ کی فوجی امداد کی بنا پر جسرت گکھڑ کو پنجاب میں عروج حاصل ہوا تھا۔ یہ علم و فن کا بڑا قدر دان تھا چنانچہ اسکے گرد ہر وقت علما اور ماہرینِ فن کا ہجوم رہتا تھا عمارتوں کی تعمیر اور شہر کے بنوانے کے معاملہ میں وہ کشمیر کا دوسرا شاہجہاں تھا۔ اسکی سلطنت کا نظام اسقدر چست تھا کہ کہیں چوری یا ڈکیتی کا نام تک نہ تھا۔ اگر کسی جگہ چوری ہو جاتی تھی تو علاقہ کے امرا اور حکام کو اس کا تاوان ادا کرنا پڑتا تھا۔ سیو دیو بھٹ کے تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر جو غیر مسلم کشمیر چھوڑ کر چلے گئے تھے اس نے ان کو کشمیر بلا کر دوبارہ آباد کیا۔ انھیں جاگیریں دیں۔ انکے لئے مندر بنوائے۔ جزیہ معاف کیا۔ اور اپنی قلمرو میں گاؤکشی کو خلاف قانون قرار دیدیا۔ اسکی سلطنت میں ہر شخص کو پوری آزادی حاصل تھی۔ یہ رعایا کے ساتھ اس کا سلوک بلا امتیاز مذہب و ملت مثل اولاد کے تھا۔ یہ فن موسیقی کا بھی بڑا ماہر تھا۔ اس بادشاہ میں شاہی کے مقابلہ میں درویشی شان زیادہ نمایاں تھی اسی لئے سلطان زین العابدین کو اسکی رعایا ایک ولی کامل سمجھتی تھی۔ اس بادشاہ

کو آخر عمر میں بیٹوں کی خانہ جنگی سے بیحد دُکھ پہنچا تھا سلطان زین العابدین ۵۲ سال سلطنت کرنے کے بعد ۸۷۷ھ (۱۴۷۲ء) میں اس دُنیا سے رحلت کر گیا۔ یہ کشمیر کا سب سے نیک دل اور نامور بادشاہ ہوا ہے۔

شاہ حیدر:- سلطان زین العابدین کے بعد اس کا بیٹا حاجی خاں شاہ حیدر کا لقب اختیار کرنے کے بعد کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ کے گرد زیادہ تر کمینوں اور نیچی ذات والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ شراب کا یہ اس قدر عادی تھا کہ ۲۴ گھنٹے شراب کے نشہ میں مست رہتا تھا۔ ابھی اس نے ۱۴ مہینے ہی حکومت کی تھی کہ شراب کے نشہ میں اس کا پیر پھسلا اور یہ زخمی ہونے کے بعد ۸۷۸ھ (۱۴۷۵ء) میں فوت ہو گیا۔

شاہ حسن بن شاہ حیدر:- شاہ حیدر کی موت کے بعد شاہ حسن کشمیر کا بادشاہ ہوا۔ اس کا سارا دور کشمیر کی خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے کے سلسلہ میں گذرا ہے اس بادشاہ کی خواہش تھی کہ وہ سلطان زین العابدین کے نقش قدم پر چل کر نام پیدا کرے مگر اسکی عمر نے وفا نہ کی۔ یہ بادشاہ ۸۸۳ھ (۱۴۷۸ء) میں فوت ہو گیا۔

محمد شاہ بن سلطان حسن:- شاہ حسن کے بعد اُمرائے سلطنت نے اس کے بیٹے محمد خاں کو جسکی عمر صرف سات برس تھی محمد شاہ کے خطاب کے ساتھ کشمیر کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس بادشاہ کا دورِ حکومت بھی زیادہ تر خانہ جنگیوں ہی میں گذرا ہے۔ چنانچہ فتح خاں بن آدم خاں نے اس پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور اسے محل میں نظر بند کر دیا۔ اس بادشاہ کی مدتِ حکومت دس سال اور سات ماہ ہے۔

فتح شاہ بن آدم خاں:- محمد شاہ کے معزول کئے جانے کے بعد فتح خاں ۸۹۴ھ (۱۴۹۱ء) میں فتح شاہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ محمد شاہ جسے فتح شاہ نے نظر بند کر دیا تھا۔ موقعہ ملتے ہی فرار ہو کر ہندوستان چلا گیا۔ کشمیر کے بعض اُمرائے سلطنت چونکہ فتح شاہ سے ناراض تھے۔ اس لئے انھوں نے محمد شاہ کو تسخیر کشمیر کی

ترغیب دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح شاہ اور محمد شاہ میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں فتح شاہ کو شکست ہو گئی اور وہ بھاگ کر ہندوستان چلا گیا اور اس طرح سترہ سال کے بعد اس کی حکومت ختم ہو گئی۔

محمد شاہ بن سلطان حسن باردوم: فتح شاہ کو شکست دینے کے بعد محمد شاہ سنہ ۹۱۱ھ (۱۵۰۸ء) میں دوبارہ کشمیر کے تخت پر قابض ہو گیا۔ لیکن اسے کشمیر کی حکومت سنبھالے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے تھے کہ کشمیر کے شکست خوردہ سابق بادشاہ فتح شاہ نے ایک بڑی جمعیت فراہم کر کے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا۔ وہ اس مرتبہ صرف ۹ مہینے اور ۹ دن حکومت کر سکا۔

فتح شاہ بن آدم خاں باردوم: محمد شاہ کی شکست کے بعد فتح شاہ دوبارہ کشمیر کا بادشاہ بن گیا لیکن محمد شاہ بھی چین سے نہیں بیٹھا۔ وہ شکست کھانے کے بعد ہندوستان کے بادشاہ سکندر لودھی کے پاس چلا گیا۔ اور امداد کا طالب ہوا۔ سکندر لودھی نے ایک بڑا لشکر اس کے ساتھ کر دیا۔ محمد شاہ نے اس لشکر کے ذریعہ پھر ایک بار کشمیر کو فتح کر لیا فتح شاہ فرار ہو کر ہندوستان چلا گیا۔ اور وہیں اس نے وفات پائی۔ مرنے کے بعد فتح شاہ کی لاش ہندوستان سے کشمیر لا کر دفن کی گئی۔

محمد شاہ بن سلطان حسن بارسوم: محمد شاہ فتح حاصل کرنے کے بعد تیسری بار کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے ملک کاجی چک کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ ملک کاجی چک رفتہ رفتہ اس قدر حاوی ہو گیا کہ وہ پوری حکومت پر قابض ہو گیا۔ محمد شاہ تو صرف نام کا بادشاہ رہ گیا۔ ملک کاجی جب بعض معاملات کی بنا پر محمد شاہ سے ناراض ہو گیا تو اس نے بادشاہ کو معزول کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ اور اس کے بیٹے کو کشمیر کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس مرتبہ محمد شاہ نے تقریباً بارہ سال حکومت کی۔

ابراہیم شاہ بن محمد شاہ: محمد شاہ کو معزول کرنے کے بعد وزیر اعظم ملک کاجی نے

اس کے بیٹے ابراہیم شاہ کو کشمیر کے تخت پر بٹھا دیا۔ ابراہیم شاہ تو صرف نام کا بادشاہ تھا اصل میں ساری حکومت ملک کاجی کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کاجی کی اس ابن الوقتی کی وجہ سے چونکہ اُمرائے سلطنت اور شاہی خاندان کے افراد ناراض تھے اس لئے ان میں سے بعض نے بابر بادشاہ سے امداد حاصل کرنیکے بعد ملک کاجی اور نام نہاد بادشاہ ابراہیم شاہ کے خلاف فوج کشی کر دی۔ ملک کاجی اور ابراہیم شاہ دونوں کو شکست ہوگئی اور یہ دونوں فرار ہو گئے۔ ابراہیم شاہ صرف آٹھ مہینے حکومت کر سکا۔

نازک شاہ بن ابراہیم شاہ:۔ ابراہیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا نازک شاہ کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ ابدال ماکری جس نے کہ بابر سے امداد حاصل کرنے کے بعد ملک کاجی کے اقتدار کو ختم کیا تھا۔ نازک شاہ نے اسے وزیر اعظم کا عہدہ عطا کیا۔ نازک شاہ کو تخت پر بیٹھے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے کہ اُمرائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ کشمیر کا سابق بادشاہ محمد شاہ یعنی نازک شاہ کا دادا جو ہندوستان میں پناہ گزیں ہے۔ اسے بلا کر کشمیر کی حکومت اس کے سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ محمد شاہ کو بلا لیا گیا اور نازک شاہ کی حکومت ختم ہوگئی۔

محمد شاہ چوتھی بار بادشاہ:۔ اُمرائے سلطنت کے مشورہ سے محمد شاہ چوتھی بار کشمیر کے تخت پر بیٹھا اور اس نے اپنے پوتے اور کشمیر کے سابق بادشاہ نازک شاہ کو ولیعہد مقرر کر دیا۔ اس بادشاہ کے دورِ حکومت میں برابر ملک کاجی اور ابدال ماکری میں لڑائیاں ہوتی رہیں جس سے کہ سلطنت کا سارا امن برباد ہو گیا تھا۔ محمد شاہ ۹۳۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ایسا بیمار ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس بادشاہ نے تقریباً پچاس سال حکومت کی ہے گو کئی مرتبہ یہ معزول ہوتا رہا ہے۔

سلطان شمس الدین و نازک شاہ:۔ محمد شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سلطان شمس الدین کشمیر کے تخت پر بیٹھا اس کے زمانہ میں بھی ملک کاجی چک اور ملک

ابدال ماگری میں برابر لڑائیاں ہوتی رہیں جب سلطان شمس الدین مرگیا تو نازک شاہ دوبارہ کشمیر کا بادشاہ بن گیا۔ لیکن اسکی بادشاہی کو پانچ چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ ہمایوں کی فوج کے ایک سردار مرزا حیدر ترک نے ایک مختصر سی جمعیت کے ذریعہ کشمیر پر قبضہ جمالیا اور کشمیر میں ہمایوں کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔

مرزا حیدر کی بادشاہی۔ شہنشاہ ہمایوں جب ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد فرار ہوا تو اُمرائے کشمیر نے ہمایوں کو کشمیر آکر وہاں اپنی حکومت قائم کرنے کی دعوت دی۔ ہمایوں بھی اس کیلئے تیار ہو گیا چنانچہ اس نے مرزا حیدر ترک کو ایک چھوٹی سی فوج دیکر کشمیر کی فتح کے لئے روانہ کر دیا۔ اُمرائے کشمیر چونکہ مغلوں سے ساز باز کر چکے تھے اسلئے مرزا حیدر ترک کا بغیر کسی دشواری کے کشمیر پر قبضہ ہو گیا مرزا حیدر ترک نے کشمیر فتح کرنے کے بعد وہاں ہمایوں کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ لیکن ہمایوں کشمیر آنیکی بجائے ایران چلا گیا۔ اور اس طرح مرزا حیدر ترک کشمیر کا بادشاہ بن گیا۔ مرزا حیدر ترک اگرچہ کشمیر پر قابض ہو چکا تھا لیکن کشمیری اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی غیر کشمیری ان پر حکومت کرے۔ چنانچہ مرزا حیدر ترک کے خلاف کشمیر میں بغاوتیں کھڑی ہو گئیں جن کا مرزا حیدر بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بغاوتیں اتنی بڑھیں کہ باقاعدہ کشمیریوں اور مغلوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں مرزا حیدر ترک مارا گیا اور اسکی بادشاہی ختم ہو گئی مرزا حیدر نے دس سال کشمیر پر حکومت کی۔

سلطان نازک شاہ دوسری بار:۔ کشمیر کے اس جدید انقلاب کے بعد در اصل تو اُمرائے کشمیر کشمیر کے مختلف حصوں پر قابض تھے لیکن انھوں نے نام کے لئے نازک شاہ کو دوسری بار کشمیر کے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ اس بادشاہ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ اُمرائے کشمیر کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ وہ جسکو چاہتے تھے۔ تخت پر بٹھاتے تھے اور جس کو چاہتے تھے معزول کر دیتے تھے۔ چنانچہ کچھ مدت کے بعد

نازک شاہ کو اُمرائے معزول کر دیا۔

سلطان ابراہیم شاہ تیسری مرتبہ:۔ بااثر اُمرائے کشمیر نے نازک شاہ کو معزول کرنے کے بعد ابراہیم شاہ کو تیسری مرتبہ کشمیر کے تخت پر بٹھا دیا۔ مگر یہ بادشاہ بھی صرف نام کا بادشاہ تھا۔ چنانچہ پانچ ماہ کی حکومت کے بعد اسے ۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء) میں معزول کر کے اندھا کر دیا گیا۔

اسمٰعیل شاہ برادر ابراہیم شاہ:۔ اسمٰعیل شاہ بھی صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اس کے پردہ میں اُمرائے کشمیر حکمرانی کرتے رہے۔ یہ بادشاہ ڈیڑھ سال حکومت کرنے کے بعد ۹۶۴ھ (۱۵۵۶ء) میں فوت ہو گیا۔

حبیب شاہ پسر اسمٰعیل شاہ:۔ اسمٰعیل شاہ کے بعد اس کا بیٹا حبیب شاہ جانشین ہوا لیکن اسکی حیثیت بھی ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ غازی خاں اور دیگر اُمرائے کشمیر در اصل اس کے پردہ میں حکومت کر رہے تھے۔ جب اس کی حکومت کو پانچ سال ہو گئے تو غازی خاں اسے معزول کر کے خود بادشاہ بن گیا۔

امیر غازی شاہ:۔ حبیب شاہ کو معزول کرنے کے بعد امیر غازی خاں۔ غازی شاہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد کشمیر کا بادشاہ بن گیا۔ اس بادشاہ سے خلقِ خدا کو بے حد تکلیف پہنچی۔ اس کی اُنگلیاں جذام کے مرض کی وجہ سے گل گئی تھیں۔

شاہ حسین برادر غازی شاہ:۔ غازی شاہ کے بعد اس کا چھوٹا بھائی حسین شاہ کشمیر کے تخت پر بیٹھا لیکن اُمرائے سلطنت اس کے شدید مخالف ہو گئے۔ چنانچہ اُمرائے سلطنت نے یہ طے کیا کہ حسین شاہ کی بجائے اس کے بھائی علی شاہ کو بادشاہ بنایا جائے۔ اس فیصلہ کے بعد تمام ارکانِ سلطنت نے علی شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور حسین شاہ زین پور چلا گیا اور تین مہینے کے بعد ۹۷۰ھ (۱۵۶۳ء) میں مر گیا۔

سلطان علی شاہ:۔ یوں تو سلطنتِ کشمیر مدت دراز سے زوال پذیر تھی لیکن علی شاہ

کے دورِ حکومت میں یہ سلطنت مغلوں کے زیرِ اثر آگئی چنانچہ سلطان علی شاہ کی تخت نشینی کے چند سال بعد ۹۸۰ھ (۱۵۷۳ء) میں جب شہنشاہ اکبر نے اس بادشاہ پر اطاعت کیلئے زور دیا تو اس نے مغلوں کی اطاعت قبول کرنیکے بعد اپنی بھتیجی کو شاہزادہ سلیم کے ساتھ شادی کرنے کے لئے روانہ کر دیا اور کشمیر میں اکبر کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔ یہ نام نہاد بادشاہ ۹ سال حکومت کرنے کے بعد گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

یوسف شاہ:- یہ کشمیر کا آخری بادشاہ ہوا ہے۔ اپنے باپ کی طرح یہ بھی اکبر بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرتا رہا لیکن بعض حرکتیں اس سے ایسی سرزد ہوئیں جنکی بنا پر شہنشاہ اکبر نے ناراض ہو کر اس کے خلاف فوج کشی کر دی۔ یوسف شاہ کو شکست ہو گئی۔

کشمیر کی خود مختار حکومت کا خاتمہ

کشمیر کی خود مختار اسلامی حکومت جس کی بنیاد ۷۴۷ھ میں سلطان شمس الدین عرف شاہ میر نے رکھی تھی۔ تقریباً ڈھائی سو برس تک قائم رہنے کے بعد ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں مغلوں کے حملوں کی تاب نہ لا کر ختم ہو گئی۔ شہنشاہ اکبر نے اس سلطنت کے آخری بادشاہ یوسف شاہ اور اس کے بیٹے یعقوب کو اپنے اُمرا کے زمرہ میں شامل کر لیا اور ان دونوں باپ بیٹوں کو صوبہ بہار میں بڑی بڑی جاگیریں عطا کر دیں۔

کشمیر کے خود مختار مسلمان بادشاہوں میں حکمرانی کی کس قدر صلاحیت موجود تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مسلسل ڈھائی سو سال تک کشمیر کی آزادی کو برقرار رکھا اور سخت سے سخت حملوں کے باوجود کشمیر پر کسی بیرونی طاقت کو کبھی قبضہ نہ جمانے دیا۔ کشمیر کے بادشاہوں کی بیشتر تعداد نہایت ہی دیندار تھی۔ چنانچہ انھوں نے ہمیشہ تبلیغ اور اشاعتِ اسلام میں نمایاں حصہ لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی کشمیر کے نوے فی صدی باشندے مسلمان ہیں۔ کشمیر کے باشندوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ قطرتاً نہایت جنگجو اور سخت جان واقع ہوئے ہیں۔ اسی لئے

وہ ڈھائی سو سال تک اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکے۔

کشمیریوں کی بہادری اور جرأت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں جبکہ ہندوستان میں پٹھانوں کی سلطنت دامن ہمالہ سے لیکر راس کماری تک اور گجرات سے لیکر بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس ملک کا کوئی دور دراز خطہ بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے کشمیر پر بھی بار بار حملے کئے۔ مگر بہادر کشمیریوں نے ہر حالت میں کشمیر کی آزادی کو برقرار رکھا۔ نہ خلجیوں کی طاقت ان کو ہلا سکی اور نہ تغلقوں کا زور ان کی گردنوں کو جھکا سکا۔

تاریخ کشمیر کے بغور مُطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کے آخری بادشاہوں کے زمانہ میں شیعہ سنی کا جھگڑا اس ملک میں پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس جھگڑے نے اس ملک کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے کہ اگر کشمیر کے اُمرائے سلطنت شیعہ اور سُنی کے دو گروہوں میں نہ بٹ گئے ہوتے اور اس گروہ بندی نے کشمیر کے آخری بادشاہوں کو کمزور نہ کر دیا ہوتا تو شائد نہ مغل کشمیر پر قبضہ جما سکتے اور نہ مغلوں کے جانشین انگریز ہی اس دُشوار گذار علاقہ پر حکومت کر سکتے۔ اور کشمیر ہمیشہ ہی آزاد اور خود مختار رہتا۔

مالوہ کی خود مختار اسلامی حکومت

مالوہ ہندوستان کا وہ اہم ترین علاقہ ہے جس کو ہمیشہ ہی ہندوستان کی تاریخ
میں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہی وہ خطہ ہے جسکی مردم خیز سرزمین سے بکرماجیت
جیسے لائق راجہ پیدا ہوئے اور یہی وہ تاریخی سرزمین ہے جس نے بڑے بڑے اور
نامور بہادروں کو جنم دیا۔ پرانی تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان
میں مسلمانوں کی آمد سے قبل تقریباً ۵۵ غیر مسلم راجاؤں نے اس خطہ پر دو ہزار سال
تک بڑی قابلیت کے ساتھ حکومت کی ہے۔

تاریخ مالوہ سے یہ چیز پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مسلمانوں کے باقاعدہ مالوہ
فتح کرنے سے بہت قبل مالوہ پر مسلمان حکمران زمانہ دراز تک حکومت کرتے رہے ہیں
چنانچہ چوہان قوم کے آخری راجہ دہرم دیو کے بعد شیخ شاہ نامی کوئی مسلمان ۰ ۷ سال
مالوہ کے تخت پر فرمانروائی کرتا رہا ہے لیکن اسکے بعد یہاں کی حکومت پھر ہندوؤں
کے قبضہ میں چلی گئی اور دہرم راج نامی راجہ تقریباً بیس سال تک حکومت کرتا رہا۔
لیکن دہرم راج کے بعد شیخ شاہ کا بیٹا علاء الدین پھر مالوہ کا بادشاہ بن گیا اور ۲۰
سال تک حکومت کرتا رہا اسکے بعد کمال الدین نے بارہ سال حکومت کی۔ لیکن
کمال الدین کے بعد مالوہ کی حکومت جیت مل چوہان کے قبضہ میں چلی گئی۔ جس نے
بیس برس فرمانروائی کی لیکن اس کے بعد پھر ایک مسلمان جلال الدین مالوہ کا بادشاہ
بن گیا۔ جلال الدین کے بعد عالم شاہ مالوہ کے تخت پر بیٹھا جو بیس سال تک حکومت
کرتا رہا۔ لیکن عالم شاہ کے بعد پھر ہندو راجہ مالوہ پر قابض ہو گئے اور اسوقت
تک قابض رہے جب تک کہ دہلی کے پٹھان بادشاہوں نے ان سے حکومت چھین کر

مالوہ کو دہلی کا ایک صوبہ نہیں بنا لیا۔

دہلی کے پٹھان بادشاہوں کے مالوہ فتح کرنے سے قبل تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مسلمانوں کا مالوہ کے تخت پر بیٹھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ محمد بن قاسم کے زمانہ ہی سے چند غیر معروف پٹھان حملہ آور ہندوستان کے مختلف حصوں پر برابر حملے کرتے رہے ہیں اور انھوں نے جابجا اپنی غیر معروف حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ غالباً ان ہی حملہ آوروں میں سے وہ مسلمان بادشاہ بھی تھے۔ جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مالوہ کے تخت پر فرمانروائی کرتے رہے ہیں۔

مالوہ پر مسلمانوں کے حملے

قدیم زمانہ میں چونکہ مالوہ کا ایک حصہ صوبہ سندھ میں شامل تھا۔ اس لئے اگر دیکھا جائے تو سب سے پہلے محمد بن قاسم ہی نے مالوہ کو فتح کیا تھا۔ محمد بن قاسم کے علاوہ مالوہ کے دوسرے حملہ آور وہ پٹھان تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے کس بنا پر مالوہ پر حملہ کیا۔ اور کس زمانہ میں حملہ کیا اور کیونکر مالوہ کے تخت پر قابض ہوئے اور قابض ہونے کے بعد بار بار ان کے قبضہ سے مالوہ کی حکومت کن اسباب کی بنا پر نکل گئی۔ غرضکہ ان واقعات پر بڑی حد تک پردہ پڑا ہوا ہے۔

تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کا مالوہ پر سب سے پہلا حملہ سلطان التمش کا حملہ تھا۔ جو ۶۳۲ھ (۱۲۳۴ء) میں ہوا تھا سلطان التمش نے پہلے بھلسہ کا شہر اور قلعہ فتح کیا اس کے بعد اجین پر حملہ کر کے اسے تسخیر کیا۔ اور اجین میں بکرماجیت کے زمانہ کا "مہاکال دیو" کا بت خانہ مسمار کر ڈالا۔ مالوہ میں یوں تو اور بھی بے شمار بت خانے تھے جن کو التمش نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ صرف اس بت خانہ پر ہاتھ ڈالنے کی اسے اس لئے ضرورت پیش آئی کیونکہ یہ ان فتنہ پردازوں کا سب سے بڑا سیاسی مرکز بنا ہوا تھا جو التمش کی حکومت پر برابر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ التمش چاہتا تھا کہ مالوہ کو فتح کرنے کے بعد

اُس فتنہ کا خاتمہ کر دے جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مالوہ سے اُٹھتا رہتا تھا چنانچہ التمش نے مالوہ کو وقتی طور پر فتح کر لیا لیکن وہ اور اسکے جانشین یعنی غلام خاندان کے بادشاہ مالوہ کے علاقہ کو دہلی کی حکومت کا باجگذار صوبہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

خاندان غلامان کے خاتمہ کے بعد جب خلجیوں کو اقتدار حاصل ہوا تو ۶۹۱ھ (۱۲۹۱ء) میں جلال الدین خلجی نے خود فوج لیکر مالوہ پر چڑھائی کی۔ اجین کو فتح کیا۔ مالوہ کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ چنانچہ خلجیوں کے دورِ حکومت میں مالوہ کا علاقہ مستقل طور پر دہلی کی حکومت میں شامل ہو گیا لیکن اسکے باوجود بھی مالوہ کے صوبہ میں برابر بغاوتیں برپا ہوتی رہیں۔ چنانچہ ۷۳۹ھ (۱۳۳۹ء) میں محمد تغلق کے بھانجے بہاء الدین گرشاسپ نے راجپوت راجاؤں کے ساتھ متحد ہو کر مالوہ میں ایک بہت بڑی بغاوت کھڑی کر دی تھی۔ جس کو بڑی مشکل سے دبایا جا سکا تھا۔ اسی طرح اور بھی کئی مرتبہ مالوہ صوبہ میں راجپوتوں نے سر اُٹھایا مگر ان کو ہر مرتبہ کچل دیا گیا۔ غرضکہ مالوہ کا صوبہ ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) تک تو دہلی کے بادشاہوں کا باجگذار بنا رہا لیکن ناصر الدین محمد شاہ تغلق کے مرنے کے بعد جب دہلی کی مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی تو دلاور خاں حاکمِ مالوہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے مالوہ میں ایک علحدہ مسلم حکومت قائم کر لی۔

مالوہ کا پہلا بادشاہ دلاور خاں

مالوہ کی خود مختار اسلامی حکومت کا بانی دلاور خاں سلطان شہاب الدین غوری کی اولاد میں سے تھا سلطان ناصر الدین محمد شاہ تغلق نے ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں اسے مالوہ کا حاکم مقرر کیا تھا جب تک ناصر الدین محمد شاہ تغلق زندہ رہا یہ اپنے آپکو شاہانِ دہلی کا اطاعت شعار ظاہر کرتا رہا لیکن ناصر الدین محمد شاہ تغلق کی موت اور تیمور کے حملہ کے بعد جب دہلی کی حکومت لبِ دم تھی تو دلاور خاں غوری نے دہلی کی

حکومت سے قطع تعلق کرکے ۸۰۳ھ (۱۴۰۱ء) میں اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ چلایا۔ مانڈو میں بڑی بڑی اور شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ غرضیکہ اس نے مالوہ کی جدید حکومت کو خوب ترقی دی لیکن ۸۰۸ھ (۱۴۰۶ء) میں دلاور خاں کے بیٹے الپ خاں نے اُسے زہر دیدیا جس سے کہ وہ ہلاک ہوگیا۔

دلاور خاں نہایت فیاض طبع اور نیک دل بادشاہ ہوا ہے۔

سلطان ہوشنگ: ۔ الپ خاں باپ کو زہر دینے کے بعد ۸۰۸ھ (۱۴۰۶ء) میں سلطان ہوشنگ کا لقب اختیار کرنے کے بعد مالوہ کا بادشاہ بن گیا۔ اس نے اجین کی بجائے مانڈو کو دارالسلطنت قرار دیا۔ گجرات کا بادشاہ مظفر گجراتی جو دلاور خاں کا دوست اور رشتہ دار تھا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سلطان ہوشنگ باپ کو زہر دینے کے بعد مالوہ کے تخت پر قابض ہوگیا ہے۔ تو اس نے ایک بڑا لشکر لیکر مالوہ پر حملہ کردیا سلطان ہوشنگ کو شکست ہوگئی۔ مظفر گجراتی نے اسے قید کرلیا۔ مگر وہ خوشامد درآمد کرنے کے بعد اس قید سے رہا ہوگیا۔ اور رہا ہونے کے بعد ساری عمر شاہانِ گجرات سے لڑتا رہا۔ سلطان ہوشنگ نے گوالیار اور دکن کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا لیکن کالپی کو اس نے فتح کرلیا تھا۔ یہ بڑا باحوصلہ بادشاہ تھا۔ ۳۰ سال حکومت کرنے کے بعد ۹ ذی الحجہ ۸۳۸ھ (۱۴۳۵ء) کو سلطان ہوشنگ رحلت کرگیا۔ اس کا مقبرہ جو منڈو میں ہے عجائبات عالم میں سے ہے کیونکہ بغیر پانی کے انتظام کے نامعلوم طریقہ پر برابر اس کی قبر پر پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ چنانچہ آج تک یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ یہ پانی کہاں سے آتا ہے۔ اور خود بخود کیونکر پیدا ہوجاتا ہے۔

سلطان محمد شاہ بن ہوشنگ: ۔ سلطان ہوشنگ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا غزنیں خاں ۱۱ ذی الحجہ ۸۳۸ھ (۱۴۳۵ء) کو محمد شاہ کا لقب اختیار کرتے کے بعد مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بادشاہ بڑا ہی ظالم اور سفاک تھا چنانچہ اس نے تخت پر بیٹھتے کے ساتھ

ہی اپنے بھائیوں اور عزیز و اقارب کا قتلِ عام شروع کر دیا جس سے کہ اُمرائے سلطنت اسکے دشمن ہو گئے اور اس دُشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان محمد شاہ کے سالے محمود خاں نے بادشاہ کو زہر دیکر ہلاک کر دیا۔ اس بادشاہ کی مدت سلطنت صرف ایک سال اور چند ماہ ہے۔

سلطان محمود خلجی:۔ سلطان محمود خلجی اپنے بہنوئی سلطان محمد شاہ کو ہلاک کرنے کے بعد ۸۳۹ھ (۱۴۳۶ء) میں مالوہ کا بادشاہ بن گیا۔ ابھی اسے تخت پر بیٹھے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ اس بادشاہ پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا مگر خوبیٔ قسمت سے یہ بچ گیا۔ لیکن اس کے خلاف چونکہ ناگواری بڑھ چکی تھی۔ اس لئے ملک میں جابجا بغاوتیں کھڑی ہو گئیں جن کی وجہ سے اس بادشاہ کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان احمد شاہ گجراتی نے یہ دیکھتے ہوئے کہ محمود خلجی اندرونی بغاوتوں میں اُلجھا ہوا ہے اچانک مالوہ پر حملہ کر کے مانڈو کے قلعہ کو گھیر لیا۔ لیکن جب محمود خلجی مقابلہ پر آیا تو اسے فرار ہونا پڑا۔ سلطان محمود خلجی نے ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں دہلی پر بھی حملہ کر دیا تھا لیکن صلح کے بعد واپس چلا گیا۔ ۸۴۵ھ (۱۴۴۱ء) میں چتوڑ کے راجپوتوں نے جب اس کے خلاف بغاوت کی تو اس نے چتوڑ پر حملہ کر کے شہر کو خوب لوٹا۔ بُت خانوں کو توڑا اور نصیر خاں حاکم کالپی کی تادیب کی جو ملحد ہونے کے بعد مسلمان لڑکیوں کو بالجبر گوا تا تھا اور نچواتا تھا۔ اس بادشاہ نے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) میں گجرات پر بھی حملہ کیا تھا۔ مگر اسے بُری طرح شکست ہوئی۔ سلطان محمود خلجی نے ماروار، ولایت مندسور، منڈل گڑھ، چتوڑ اور دکن میں بھی بہت سی لڑائیاں لڑی ہیں۔ یہ اپنے زمانہ کا ایک نہایت ہی انصاف پسند بادشاہ ہوا ہے فنِ سپہ گری میں اسے بلند ترین حیثیت حاصل ہے۔ یہ مالوہ پر ۳۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۹ ذیقعد ۸۷۳ھ (۱۴۶۹ء) کو اس دُنیا سے رحلت کر گیا۔

سلطان غیاث الدین:۔ محمود خلجی کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سلطان غیاث الدین مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ میں حکمرانی کی صلاحیت قطعی موجود نہ تھی۔ اسکے عہد حکومت کا سب سے دلچسپ کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عورتوں کی فوج بنائی تھی جسمیں ہزاروں خوبصورت لڑکیوں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ یہ بادشاہ عورتوں کا بے حد دلدادہ تھا مگر بدچلن نہ تھا۔ ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) میں اسکے بیٹے ناصر الدین نے اسے زہر دیکر ہلاک کر دیا۔

سلطان ناصر الدین:۔ سلطان ناصر الدین باپ کو زہر سے ہلاک کرنیکے بعد ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) میں مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کیا۔ اسکے تخت پر بیٹھتے ہی ہر طرف بغاوتیں شروع ہوگئیں جنکو اس نے دبا دیا۔ یہ بادشاہ ۱۱ سال حکومت کرنے کے بعد ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں دنیا سے رحلت کر گیا۔

سلطان محمود:۔ سلطان ناصر الدین کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا سلطان محمود تخت پر بیٹھا۔ اسکو تخت پر بیٹھتے ہی باغیوں کا سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ سلطان محمود نے مانڈو میں سلطان بہادر شاہ گجراتی کے مخالفین کو پناہ دیدی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان بہادر شاہ گجراتی نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ مانڈو پر حملہ کر کے سلطان محمود کو گرفتار کر لیا۔ اور اسے قلعہ چنپانیر میں قید کرنے کیلئے روانہ کر دیا مگر سلطان محمود راستہ میں مارا گیا۔ اور اس طرح مالوہ کے بادشاہوں کے خاندان کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا جسکی بنیاد بہادر خاں نے رکھی تھی۔ غرضکہ مالوہ کی خود مختار اسلامی سلطنت ۹۴۲ھ (۱۵۳۶ء) میں شاہانِ گجرات کے قبضہ میں چلی گئی۔ جن کا تذکرہ آگے آئیگا۔

مالوہ کے بادشاہوں کی یہ خود مختار سلطنت تقریباً ڈیڑھ سو برس قائم رہی۔ یہ سلطنت اپنے زمانے کی ایک نہایت ہی مضبوط حکومت شمار کی جاتی تھی۔ اس حکومت کے فرمانرواؤں نے جو بینظیر شاندار عمارتیں اپنے مانڈو اور مالوہ کے دوسرے شہروں میں بنوائی ہیں وہ آج بھی اس حکومت کی عظمت کا پتہ دے رہی ہیں اگر مالوہ اور گجرات کے سلطان بادشاہوں کی خانہ جنگی نے حکومت مالوہ کو تباہ اور برباد نہ کر دیا ہوتا تو شاید یہ حکومت زمانہ دراز تک باقی رہتی لیکن افسوس کہ خود مسلمانوں ہی نے اپنی اس حکومت کو دفن کر دیا۔

گجرات کی خود مختار اسلامی حکومت

مالوہ کی طرح گجرات بھی ابتداً ہندو حکومتوں کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اس صوبہ میں کئی ہزار برس تک بے شمار ہندو راجاؤں نے بڑے تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ حکومت کی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہندوستان کا نہایت ہی دولتمند صوبہ ہے۔ کیونکہ ایران۔ شام۔ عراق۔ عرب مصر اور دوسرے تمام بیرونی ممالک کے ساتھ اسی صوبہ سے تجارت ہوتی تھی۔

مسلمانوں نے گجرات پر سب سے پہلے کب حملہ کیا۔ اسکے بارے میں مورخوں میں اختلاف ہے بعض مورخوں کا تو یہ کہنا ہے کہ سب سے پہلے محمد بن قاسم نے گجرات کے اس علاقہ کو فتح کیا تھا جو سندھ سے ملا ہوا تھا۔ ان مورخوں کا خیال ہے کہ محمد بن قاسم نے جس سندھ کو فتح کیا تھا۔ اس سندھ میں گجرات کا بھی ایک بڑا حصہ شامل تھا لیکن بعض مورخوں کی یہ رائے ہے کہ سندھ کا سب سے پہلا مسلم حملہ آور محمود غزنوی تھا جس نے ۴۱۵ھ (۱۰۲۴ء) میں نہروالہ (گجرات) پر حملہ کر کے اسے فتح کیا اور اسکے بعد سومنات کے مندر پر حملہ کرنے کے بعد اس مندر سے بے اندازہ دولت لے گیا۔ محمود غزنوی کے بعد ۵۷۴ھ (۱۱۷۹ء) میں شہاب الدین غوری نے بھی محمود غزنوی کی تقلید کرتے ہوئے نہروالہ (گجرات) پر حملہ کیا تھا لیکن اس حملہ میں شہاب الدین غوری کو شکست کے علاوہ بے حد جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس شکست کا انتقام ۵۹۲ھ (۱۱۹۶ء) میں شہاب الدین غوری کے جانشین سلطان قطب الدین ایبک نے نہروالہ (گجرات) پر حملہ کر کے لیا۔ قطب الدین نے راجہ بھیم دیو والئی نہروالہ پر حملہ کے بعد اس شہر کو اچھی طرح سے لوٹا۔ راجہ سے خراج وصول کیا اور اطاعت کا اقرار لیا۔

گجرات دہلی کی حکومت کا ایک صوبہ | یوں تو گجرات قطب الدین ایبک

کے دورِ حکومت ہی میں فتح ہونیکے بعد دہلی کا ایک ماتحت صوبہ بن چکا تھا۔ لیکن فاصلہ کی زیادتی کے سبب سے شاہان دہلی گجرات کی جانب پوری توجہ نہیں کر سکے اس وجہ سے وہاں کے راجہ رفتہ رفتہ پھر خود مختار بن گئے۔ ان راجاؤں کی خود مختاری کو زمانۂ دراز کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے ختم کیا۔ سلطان نے ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) میں اپنے بھائی الغ خاں اور نصرت خاں کو ایک بڑا لشکر دیکر گجرات کی فتح کے لئے روانہ کیا ان دونوں سپہ سالاروں نے گجرات اور نہروالہ کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ اور سومنات کے بُت کو دوبارہ توڑا جو محمود غزنوی کے حملہ کے بعد نئے سرے سے رکھ لیا گیا تھا۔ انھوں نے کھمبائت کو بھی فتح کر لیا۔ گجرات کا راجہ کرن مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ گیا جب سارا گجرات فتح ہو گیا تو علاء الدین خلجی نے اپنے بھائی الغ خاں کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ اسی زمانہ سے گجرات میں سلاطین دہلی کی جانب سے حاکم مقرر ہونے شروع ہو گئے تھے اور گجرات باقاعدہ دہلی کی حکومت کا ایک ماتحت صوبہ بن گیا تھا۔ الغ خاں نے سلطان علاء الدین کی طرف سے گجرات میں بیس سال حکومت کی لیکن آخر میں اس کو معزول کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔

گجرات بغاوتوں اور سازشوں کا مرکز

گجرات دہلی کا ماتحت صوبہ بن جانے کے باوجود بھی برابر وہاں کے سابق ہندو فرمانروا خاندان کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اسلامی سپہ سالاروں نے دارالسلطنت انہل پورا ساول (احمد آباد) سورت۔ کھمبات۔ بروچ اور دوسرے گجرات کے بڑے بڑے شہروں پر تو قبضہ جمالیا تھا لیکن گجرات کے ان مضافات کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔ جہاں سابق راجاؤں کے خاندان کے لوگ جاکر آباد ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ ان سابق راجاؤں کے خاندان کے لوگوں کی حالت یہ تھی کہ جب ان پر

حملہ کیا جاتا تھا تو یہ محض دکھاوے کے لئے مطیع بن جاتے تھے۔ چنانچہ سابق راجاؤں کے خاندان کے لوگوں کی وجہ سے اس صوبہ کے مسلم گورنروں کو آئے دن اُن سے لڑائیاں لڑنی پڑتی تھیں۔

الغ خاں کے بعد دہلی کی حکومت کی جانب سے گجرات کے جو مشہور اور ممتاز گورنر ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ ملک دینار ظفر خاں۔ حسام الدین۔ ملک وجیہ الدین خسرو خاں۔ تاج الملک۔ ملک مقبل شمس الدین افغانی۔ فرحت الملک اور ظفر خاں ان سب گورنروں کو گجرات کے ہندوؤں کی بغاوتوں کا شدید مقابلہ کرنا پڑا تھا اور شمس الدین افغانی جیسے گورنر تو خود بھی باغیوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔

گجرات کی خود مختار اسلامی سلطنت کا بانی مظفر شاہ

مظفر شاہ گورنر گجرات

جس نے کہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے گجرات میں خود مختار اسلامی حکومت کی بُنیاد رکھی ۲۵ محرم ۷۴۳ھ (۱۳۴۳ء) کو دہلی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ فیروز شاہ تغلق کو شراب پلانے پر نوکر تھا۔ لیکن مظفر شاہ اپنی بے نظیر قابلیت کی بنا پر چھوٹے درجہ سے ترقی کرتے کرتے اُمرائے کبار میں شمار ہونے لگا تھا اس کا اصلی نام ظفر خاں تھا سلطان ناصر الدین محمد شاہ تغلق نے جب ۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں اسے گجرات کا گورنر بنا کر بھیجا تو اسے مظفر خاں کا خطاب دیا تھا جو بعد کو مظفر خاں سے مظفر شاہ بن گیا۔

مظفر شاہ نے بحیثیت گورنر کے گجرات میں بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں اس نے گجرات میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی سابق راجاؤں کے اس سارے خاندان کو کچل کے رکھ دیا تھا جو آئے دن بغاوتیں برپا کرتے رہتے تھے۔ اس نے ان سے کروڑوں روپیہ کا مالِ غنیمت لیکر حکومت دہلی کو بھیجا۔ نیز مظفر شاہ نے گجرات کے کئی ان

چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو بھی سخت جنگ کے بعد زیر کر لیا تھا جو رفتہ رفتہ گجرات میں طاقت پکڑتے چلے جا رہے تھے۔ مظفر شاہ کی ایک لڑائی مالوہ کے بادشاہ ہوشنگ سے بھی ہوئی تھی جس میں مظفر شاہ نے ہوشنگ کو گرفتار کر لیا تھا مگر بعد میں رہا کر دیا تھا۔ مظفر شاہ اپنے زمانہ کا مشہور سپہ سالار تھا۔ اس نے ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور اپنی بے نظیر انتظامی قابلیت کی بنا پر گجرات میں ایک نہایت ہی مضبوط اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ اور پھر اس حکومت کو خوب ترقی دی۔ مظفر شاہ جب صفر ۸۱۴ھ (۱۴۱۱ء) میں بیمار ہوا تو بیماری ہی کے زمانہ میں اس نے اپنے پوتے احمد شاہ کو ولیعہد مقرر کر دیا تھا۔ یہ بادشاہ بیس سال حکومت کرنے کے بعد ۷۱ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

سلطان احمد شاہ: مظفر شاہ کے بعد اس کا پوتا احمد شاہ گجرات کے تخت پر بیٹھا احمد شاہ بھی اپنے دادا مظفر شاہ کی طرح دہلی میں پیدا ہوا تھا۔ جب یہ تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر صرف ۲۱ سال تھی۔ احمد شاہ کو تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی سب سے پہلے تو چچا زاد بھائی فیروز خاں کی بغاوت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس کو سلاطین مالوہ سے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اسکے علاوہ اس بادشاہ کو بھی گجرات کے ہندو راجاؤں کی بغاوتوں کا شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے پہلے اندرونی بغاوتوں کو دبایا۔ اسکے بعد راجہ جونا گڈھ پر حملہ کر کے جونا گڈھ کو فتح کیا۔ جونا گڈھ کے علاوہ تھانہ اور ڈونگر پور کو بھی اس بادشاہ نے فتح کر لیا تھا۔ احمد آباد اسی نے آباد کیا تھا۔ اس بادشاہ کو جنگی بیڑا رکھنے کا بھی شوق تھا چنانچہ اس کے جنگی بیڑے میں بہت سے جہاز تھے۔ تبلیغ اسلام سے بھی اسے بے حد دلچسپی تھی اسی لئے اس کے زمانہ میں گجرات کے لاکھوں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے اسکے حرم میں متعدد راجپوت عورتیں تھیں جن سے کہ اس نے مسلمان کرنے کے بعد نکاح کر لیا تھا۔ یہ مندروں کو اور بت پرستی کو ناپسند کرتا تھا۔ یہ بادشاہ گجرات پر ۳۲ سال

حکومت کرنیکے بعد ۵۳ برس کی عمر میں ۲ ربیع الاوّل ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) کو فوت ہو گیا۔

سلطان محمد شاہ۔ سلطان احمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد شاہ ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) میں گجرات کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی بیدر فتح کرنے کے بعد اپنے خسر راے ہر رائے کو دیدیا۔ محمد شاہ نے رائے ہر رائے کی خوبصورت بیٹی کو مسلمان کر کے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ اس پر بُری طرح فریفتہ تھا۔ یہ بادشاہ ۷ محرم ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) کو زہر سے ہلاک ہو گیا۔ اس نے تقریباً دس سال حکومت کی۔

سلطان قطب الدین احمد شاہ: محمد شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا قطب الدین احمد شاہ کے لقب کے ساتھ احمد آباد میں تخت پر بیٹھا تو مالوہ کے بادشاہ سلطان محمود نے اس پر حملہ کر دیا۔ کئی دن تک جنگ ہوتی رہی مگر سلطان مالوہ کو شکست ہو گئی۔ اس کے بعد سلطان مالوہ اور قطب الدین میں صلح ہو گئی اور ان دونوں نے مل کر یہاں کے ان راناؤں کو زیر کیا جو مدّت سے گجرات اور مالوہ کی سرحدوں پر فتنے برپا کرنے میں مصروف تھے۔ اس بادشاہ کو اس کے داماد شمس خاں نے زہر دیدیا جس کے اثر سے یہ ۲۳ رجب ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) کو ہلاک ہو گیا۔ بادشاہ کے مرنے پر لوگوں نے مشتعل ہو کر شمس خاں کو قتل کر دیا۔ یہ بادشاہ شراب نوشی کا بیحد عادی تھا۔ اس نے گجرات پر تقریباً آٹھ سال حکومت کی۔

سلطان محمود بیگڑہ۔ سلطان قطب الدین احمد شاہ کے مرنے کے بعد اس کا چچا داؤد خاں احمد آباد میں تخت پر بیٹھا مگر سات ہی روز کے بعد اسے معزول کر کے سلطان قطب الدین کے بھائی فتح خاں کو گجرات کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے سلطان محمود شاہ کا لقب اختیار کیا جو سلطان محمود بیگڑہ کے نام سے مشہور ہوا۔ ۸۶۶ھ (۱۴۶۲ء) میں دکن کے بادشاہ نظام شاہ بہمنی کی خواہش پر یہ بادشاہ دکن گیا۔ اور مالوہ کے بادشاہ محمود شاہ خلجی کی سرکوبی کی جس نے کہ دکن میں طوفان مچا رکھا تھا۔ سلطان محمود بیگڑہ نے بندر جگت کے بُت خانہ پر حملہ کر کے اس کو تباہ کیا کیونکہ اس بُت خانہ کے برہمنوں نے مدّتوں سے مسلمانوں کو

لوٹنے کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ اسکے بعد سلطان محمود بیگڑہ نے رائے بینی راجپوت پر حملہ کر کے قلعہ چینپانیر فتح کیا پھر کوہ آبو کے راجہ کو زیر کیا۔ اور ایدر و اگر اور کے اجاؤ کو مطیع بنایا۔ ۹۱۳ھ (۱۵۰۷ء) میں سلطان کو اطلاع ملی کہ پرتگیز جہازوں کے ذریعے ساحل کے قریب آگئے ہیں اور ساحل پر قلعے بنانے کی فکر میں ہیں سلطان نے فوراً ان کے مقابلہ کے لئے اپنا سمندری بیڑا بھیجا جس نے پرتگیزوں کے جہازوں پر گولہ باری کر کے انکو تباہ کر دیا۔ اسی بادشاہ کے دور حکومت میں دہلی کے بادشاہ سکندر لودھی نے شاہ گجرات کو تحفے تحائف بھیج کر گجرات کی آزاد حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ ۷۰ سال کی عمر میں یہ بادشاہ ایسا بیمار رہا کہ پھر تندرست نہ ہو سکا۔ چنانچہ ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں اس نے ۵۵ سال حکومت کرنیکے بعد رحلت کی۔ اس نے اپنی زندگی میں مصطفیٰ آباد اور محمد آباد کے نام سے دو شہر تعمیر کرائے۔ یہ بادشاہ بھی گجرات کے دوسرے بادشاہوں کی طرح تبلیغ اسلام کا بے حد شائق تھا۔ چنانچہ اس کے زمانہ میں اسلام کی اشاعت خوب ہوئی۔

سلطان مظفر شاہ دوم:۔ سلطان محمود بیگڑہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مظفر شاہ ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں گجرات کے تخت پر بیٹھا سب سے پہلے اس نے ایدر کے راجہ بھیم سین کو جو باغی ہو گیا تھا زیر کیا۔ مظفر شاہ اس فتح کے بعد چمپانیر چلا گیا اور اسکی غیر موجودگی میں رانا سنگا نے بیدر، قلعہ احمد نگر، احمد آباد اور بیل نگر کو خوب لوٹا جب بادشاہ کی فوج مقابلہ کیلئے آئی تو رانا سنگا واپس جا چکا تھا۔ ۹۲۷ھ (۱۵۲۰ء) میں مظفر شاہ نے ایک بڑا لشکر رانا سنگا کی سرکوبی کیلئے روانہ کیا۔ اس لشکر نے پہلے توڈونگر پور اور بانسواڑہ کو تباہ و برباد کیا پھر چتوڑ کی جانب بڑھا لیکن رانا سنگھا نے بادشاہ کی خدمت میں قیمتی تحفے تحائف پیش کر کے صلح کر لی۔ مظفر شاہ نے ایک بڑا لشکر دہلی فتح کرنے کیلئے سلطان ابراہیم لودھی کے مقابلہ پر بھی بھیجا تھا مگر یہ لشکر ناکام واپس آ گیا تھا۔ مظفر شاہ جب کی

صحت بُری طرح گر چکی تھی۔ بیمار ہو کر ۹۳۲ھ (۱۵۲۵ء) میں بعمر ۵۶ سال رحلت کر گیا۔ اس نے تقریباً پندرہ سال حکومت کی۔ یہ بڑا دیندار بادشاہ تھا۔ بڑا خوشخط تھا ہمیشہ قرآن شریف لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا کرتا تھا۔

سلطان سکندر شاہ: مظفر شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ تخت شاہی پر بیٹھا لیکن اسکی غیر منصف مزاجی اور برے سلوک کی وجہ سے اُمرائے سلطنت اسکے دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ کئی مرتبہ اس کے قتل کی کوشش کی گئی آخر ۱۹ شعبان ۹۳۲ھ (۱۵۲۵ء) کو اُمرائے سلطنت نے اسکو قتل کر دیا۔ اس بادشاہ نے صرف دس ماہ حکومت کی۔

سلطان محمود: سکندر شاہ کے قتل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی نصیر خاں سلطان محمود کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ یہ نام کا بادشاہ تھا۔ اصل حکومت عماد الملک وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھی مظفر شاہ کے بیٹے بہادر خاں نے جب سُنا کہ اس کا بھائی سکندر شاہ قتل کر دیا گیا ہے اور عماد الملک نے اس کے چھوٹے بھائی کو کٹھ پتلی بنا رکھا ہے تو وہ دہلی سے سیدھا احمد آباد آیا۔ تمام اُمرائے سلطنت اسکے ساتھ ہو گئے چنانچہ نصیر خاں کی حکومت چار ماہ کے بعد ختم ہو گئی اور بہادر خاں نے گجرات کے تخت پر قبضہ جمالیا۔

بہادر شاہ: یکم شوال ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) کو بہادر شاہ احمد آباد میں تخت شاہی پر بیٹھا اور ان بغاوتوں کے دبانیکی جانب متوجہ ہوا جو اسکے تخت نشین ہونیکے بعد شروع ہو گئی تھیں۔ اندرونی بغاوتوں سے فارغ ہونیکے بعد بعض حالات ایسے پیدا ہوئے کہ بہادر شاہ کو مالوہ کی سلطنت پر حملہ کرنا پڑا۔ اس زمانہ میں مالوہ کا بادشاہ سلطان محمود تھا جس کو بہادر شاہ کے مقابلہ پر شکست ہو گئی۔ بہادر شاہ نے خود مختار مالوہ کی حکومت کو بھی حکومت گجرات کے ساتھ ملحق کر لیا۔

۹۳۴ھ (۱۵۲۸ء) میں سلطان بہادر شاہ جب کھمبات آیا تو اسے معلوم ہوا کہ پرتگیزوں کا ایک جہاز جو ساحل گجرات پر آ گیا تھا اس پر سے سو لہ یورپینوں کو گرفتار کیا

گیا ہے۔ جب یہ پرتگیزی بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے تو اُن میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے افسر کا نام جیمس میکوائٹ تھا۔

۹۳۹ھ (۱۵۳۲ء) میں بہادر شاہ کو اطلاع ملی کہ بندر دیو میں پرتگیزوں کی ایک بہت بڑی تعداد سمندر کے راستہ آکر جمع ہو گئی ہے۔ جب بادشاہ ان کی سرکوبی کیلئے گیا تو پرتگیز فرار ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی اور شمالی ہند میں مغلوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہمایوں فرمانروائی کر رہا تھا اور سلطان ابراہیم لودھی کی اولاد اور دہلی کے اُمرائے سلطنت مغل حکومت کے خوف سے بھاگ بھاگ کر بہادر شاہ گجراتی کی حکومت میں پناہ لے رہے تھے اور بہادر شاہ کو مغلوں کی سرکوبی کیلئے اُبھار رہے تھے بہادر شاہ جس کو کہ اپنی طاقت پر بڑا زعم تھا۔ اس نے لوگوں کے شہ دینے سے مغلوں پر حملہ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمایوں نے سارے گجرات کو تاخت و تاراج کر ڈالا جب ہمایوں گجرات سے چلا گیا تو بہادر شاہ پھر گجرات کا بادشاہ بن بیٹھا۔ کچھ دنوں کے بعد بہادر شاہ بندر دیو میں آیا۔ جہاں پرتگیزوں نے اسے اپنے ایک جہاز پر لیجا کر قتل کرنا چاہا تو وہ سمندر میں کود پڑا، اور غرق ہو گیا۔ بہادر شاہ نے ۱۵ سال حکومت کی۔ اس کو مسجدیں بنانے کا بے حد شوق تھا اس نے اپنے دورِ حکومت میں بے شمار مسجدیں تعمیر کرائیں تھیں۔ بہادر شاہ کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مالوہ کی بادشاہت کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔

گجرات کے نام نہاد بادشاہ:۔ بہادر شاہ کے مرنے کے بعد بہادر شاہ کے ایک بوڑھے فوجی افسر محمد شاہ فاروقی نے تخت پر قبضہ جما لیا لیکن وہ تخت نشینی کے ڈیڑھ ماہ بعد ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں بیمار ہو کر مر گیا۔ محمد شاہ فاروقی کے بعد مظفر شاہ کا پوتا سلطان محمود گجراتی تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ نے بڑی دانشمندی کے ساتھ حکومت کی لیکن ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) میں اپنے نوکر بُرہان کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ سلطان محمود گجراتی

کے بعد سلطان احمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ لیکن اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان مظفر بادشاہ ہوا لیکن اس بادشاہ نے ۱۳ سال حکومت کی تھی کہ شہنشاہ اکبر نے گجرات کو فتح کر کے ۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء) میں مغلوں کی حکومت میں شامل کر لیا اور اس طرح پونے دو سو سال کے بعد گجرات کی یہ خود مختار اسلامی حکومت ختم ہو گئی۔

شاہانِ گجرات نے پونے دو سو برس تک گجرات کے وسیع علاقہ پر جس شان اور دبدبہ کے ساتھ حکومت کی ہے۔ اسے ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شاہانِ گجرات نے اپنے دورِ حکومت میں تجارت کو خوب ترقی دی۔ ہندوستان کی تجارت کو سمندر پار کے ملکوں تک ان بادشاہوں نے پھیلا دیا۔ چنانچہ ہر سال کروڑوں روپیہ کا مال ہندوستان سے بیرونی ممالک کو جہازوں کے ذریعہ جاتا تھا۔

شاہانِ گجرات کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی بیشتر تعداد نہایت دیندار اور نیک تھی۔ اور یہ سب کے سب تبلیغ اور اشاعتِ اسلام کے بے حد دلدادہ تھے۔ چنانچہ ان کے دورِ حکومت میں گجرات کے وسیع علاقہ میں اسلام کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

خاندیش کی خود مختار اسلامی حکومت

بنگال - جونپور، کشمیر، مالوہ اور گجرات کی طرح خاندیش میں بھی مسلمانوں کی ایک خود مختار اسلامی سلطنت قائم تھی جس کے فرمانروا زمانۂ دراز تک بڑی شان اور دبدبے کے ساتھ حکومت کرتے رہے ہیں۔ خاندیش مالوہ اور دکن کے درمیان کا علاقہ ہے جس پر مسلمانوں کے اقتدار سے قبل ہزاروں برس تک ہندو راجاؤں کا کامل تسلط رہا ہے۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہونی شروع ہوئیں تو ابتداءً میں یہ علاقہ بھی زمانۂ دراز تک دہلی کی مرکزی اسلامی حکومت کے ماتحت رہا لیکن دہلی کی مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے بعد اس صوبہ کے گورنر ملک راجی فاروقی نے خاندیش میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے اس صوبہ کو ایک خود مختار اسلامی سلطنت کی شکل دیدی۔

خاندیش کا پہلا خود مختار بادشاہ

ملک راجی فاروقی خاندیش کا پہلا خود مختار بادشاہ ہوا ہے جس نے کہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے اس علاقہ میں اپنے خاندان کی ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ملک راجی فاروقی کے باپ کا نام خان جہاں فاروقی تھا جس کے آباء اجداد سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق کے دورِ حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ اور ممتاز اُمراء میں شمار کئے جاتے تھے۔

خان جہاں فاروقی جب تک زندہ رہا فاروقیوں کا یہ خاندان بڑی عزت کی زندگی گذارتا رہا۔ لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی یہ خاندان ایسا تباہ اور برباد ہوا کہ ملک راجی فاروقی دو دو دانے کے لئے محتاج ہو گیا۔

ملک راجی فاروقی سرگرداں اور پریشاں حال جنگلوں کی خاک اُڑاتا پھر رہا تھا کہ اتفاق سے جنگل میں اسکی سلطان فیروز شاہ تغلق سے ملاقات ہوگئی۔ سلطان فیروز شاہ شکار کھیلتا کھیلتا اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا اور بھوک کی وجہ سے بیتاب تھا۔ ملک راجی فاروقی کا مقدر سامنے تھا کہ اسے بادشاہ کی خدمت کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ اس نے جو کچھ اس کے پاس تھا بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ بادشاہ نے ملک راجی کی اس خدمت گذاری سے خوش ہو کر اسے خاندیش میں تھال نیر کی حکومت عطا کر دی۔

"تھال نیر" کی حکومت سنبھالنے کے بعد ملک راجی فاروقی نے باغیوں کی اچھی طرح سرکوبی کر کے بغاوتوں کو دبا دیا اور ان سے بے اندازہ مال غنیمت وصول کرنیکے بعد بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ ملک راجی فاروقی کی اس مستعدی کا بادشاہ کے دل ودماغ پر بہت اچھا اثر پڑا اس کا وقار اور اعتماد بادشاہ کی نظر میں بڑھ گیا۔ چنانچہ فیروز شاہ تغلق نے خوش ہو کر اسے پورے خاندیش کا گورنر بنا دیا۔

فیروز شاہ تغلق کے مرتے ہی چونکہ دہلی کی مرکزی حکومت میں ابتری پھیل گئی۔ اسلئے ملک راجی فاروقی نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی طاقت کو خوب بڑھا لیا۔ اور خود مختاری کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ ناصر الدین محمد شاہ تغلق کے مرنیکے بعد ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں یہ خاندیش کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا اور زمانہ دراز تک بڑی قابلیت کے ساتھ خاندیش پر حکومت کرتا رہا۔ ۲ شعبان ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) کو یہ بادشاہ بیمار ہونے کے بعد فوت ہو گیا اور اپنے جانشینوں کیلئے ایک آزاد اور خود مختار حکومت چھوڑ گیا۔

نصیر خاں فاروقی:۔ ملک راجی فاروقی کے بعد اس کا بیٹا نصیر خاں فاروقی خاندیش کے تخت پر بیٹھا۔ نصیر خاں کے عہدِ حکومت میں سلطنت خاندیش کو خوب ترقی ہوئی چنانچہ

خاندیش میں ہر وقت علما اور صاحبان کمال کا ہجوم رہتا تھا۔ قلعہ آسیر جس پر آسا اہیر کا قبضہ تھا اسے بادشاہ نے فتح کر لیا۔ قلعہ تھال نیر جو اسکے بھائی کے قبضہ میں تھا۔ اسے بھی اس نے تسخیر کر لیا اور بھائی کو قید کر دیا۔ اس بادشاہ نے کئی مرتبہ برار اور دکن کے دوسرے علاقوں پر بھی یورش کی تھی یہ بڑا حوصلہ مند بادشاہ ہوا ہے۔ شیخ برہان الدین جو اس زمانہ کے مشہور بزرگ تھے۔ بادشاہ ان کا بیحد معتقد تھا چنانچہ اس نے شیخ کے نام پر ہی برہان پور آباد کیا تھا جو خاندیش کا دار السلطنت بنا۔ زین پور بھی اسی بادشاہ نے آباد کیا تھا۔ چالیس سال حکومت کرنیکے بعد یہ بادشاہ ۸۴۱ھ (۱۴۳۷ء) میں رحلت کر گیا۔

میران عادل فاروقی:۔ باپ کے مرنے کے بعد خاندیش کی حکومت میران عادل فاروقی کو ملی۔ یہ بادشاہ سلطان ہوشنگ کی بہن کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس بادشاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی اس کے خلاف سازشیں شروع ہو گئی تھیں چنانچہ اسے حکومت کرتے ہوئے مشکل سے چار سال ہوئے تھے کہ ۸ ذی الحجہ ۸۴۴ھ (۱۴۴۱ء) کو اسے اس کے مخالفین نے برہان پور میں قتل کر دیا۔

مبارک خاں فاروقی:۔ مبارک خاں فاروقی باپ کے بعد جانشین قرار دیا گیا اس بادشاہ نے خاندیش پر سترہ اٹھارہ سال تک بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ حکومت کی ہے۔ اس کا دور جنگ و جدال سے بڑی حد تک پاک ہے ۱۲ رجب ۸۶۱ھ (۱۴۵۷ء) کو یہ بادشاہ فوت ہو گیا۔

عادل خاں فاروقی دوم:۔ مبارک خاں فاروقی کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا عادل خاں جانشین ہوا۔ جس دبدبہ کے ساتھ اس بادشاہ نے خاندیش پر حکومت کی ہے۔ اسکی مثال تاریخ خاندیش میں مفقود ہے۔ اس نے اطراف کے ہندو راجاؤں سے خراج وصول کیا۔ گونڈواتہ اور گڈھ منڈل کے راجاؤں کو مطیع کیا۔ جرائم پیشہ اقوام کو اس بادشاہ نے کچل کر رکھ دیا۔ قلعہ اسیر کی برابر

اس نے ایک اور مضبوط قلعہ بنایا جس کا نام مالی گڈھ رکھا۔ اس کے علاوہ شہر برہان پور کے پہلو میں دریائے تاپتی کے کنارے ایک اور قلعہ بنایا اور بہت سی نادر روزگار عمارتیں تعمیر کیں۔ شاہ گجرات نے اس بادشاہ پر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا تھا مگر صلح ہو گئی۔ یہ بادشاہ تقریباً ۱۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) میں فوت ہو گیا۔

داؤد خاں فاروقی :- عادل خاں فاروقی کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس لئے اسکے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی داؤد خاں فاروقی خاندیش کے تخت پر بیٹھا۔ داؤد خاں فاروقی اور نظام شاہ بحری میں کئی لڑائیاں ہوئی ہیں۔ داؤد خاں جب آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا تو اس کا بیٹا غزنیں خاں خاندیش کا بادشاہ ہو گیا لیکن ابھی اسے تخت نشین ہوئے دس روز ہوئے تھے کہ اسکے چچا ملک حسام الدین نے زہر دیکر اس کا کام تمام کر دیا۔

عادل شاہ فاروقی اعظم ہمایوں :- غزنیں خاں کے ہلاک ہونے کے بعد خاندیش میں ایک ابتری سی پھیل گئی۔ اس ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گجرات کے بادشاہ شاہ محمود نے اپنی فوجی طاقت اور اثر سے کام لیکر اپنے نواسے عادل شاہ فاروقی بن نصیر خاں کو خاندیش کے تخت پر بٹھا دیا۔ عادل شاہ فاروقی جو اعظم ہمایوں کے نام سے مشہور ہے جب تک تخت پر رہا اسے سخت مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بادشاہ ۱۹ سال حکومت کرتے کے بعد ۹۲۶ھ (۱۵۲۰ء) میں فوت ہو گیا۔

میراں محمد شاہ فاروقی :- عادل شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا میراں محمد شاہ خاندیش کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بہادر شاہ گجراتی کا بھانجہ تھا۔ قرب و جوار کے بادشاہوں اور راجاؤں سے یہ برابر جنگ میں مصروف رہا۔ سولہ سال حکومت کرنے کے بعد یہ بادشاہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں انتقال کر گیا۔

میراں مبارک شاہ فاروقی:۔ میراں محمد شاہ فاروقی کے بیٹے کیونکہ بہت کم عمر تھے اس لیئے امرائے سلطنت نے محمد شاہ کے بھائی میراں مبارک شاہ کو خاندیش کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس بادشاہ کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح گجرات کو فتح کیا جائے۔ چنانچہ اس نے گجرات پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہو گئی اور شکست کے بعد بکر سلطان محمود گجراتی سے صلح کرنی پڑی۔ اسی بادشاہ کے زمانہ سے خاندیش پر مغلوں کے حملے شروع ہو گئے تھے میراں مبارک شاہ ۳۲ سال حکومت کرنے کے بعد ۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء) میں فوت ہو گیا۔

میراں محمد شاہ فاروقی دوم:۔ میراں مبارک شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا میراں محمد شاہ خاندیش کا بادشاہ ہوا۔ اس کے زمانہ میں خاندیش میں خوب رونق تھی اس بادشاہ نے دکن کے حکمراں مرتضےٰ نظام شاہ بحری پر بھی فوج کشی کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام شاہ بحری کے مقابلہ میں اسے بری طرح شکست ہوئی۔ نظام شاہ بحری کی فوجیں بڑھتے بڑھتے جب خاندیش میں گھس آئیں تو محمد شاہ کو بے اندازہ زر و جواہر دیکر اس سے صلح کرنی پڑی۔ ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں یہ بادشاہ فوت ہو گیا میراں محمد شاہ کے بعد اس کا خورد سال بیٹا حسن خاں فاروقی خاندیش کے تخت پر بیٹھا جو معزول کر دیا گیا۔

راجہ میراں علی خاں:۔ جب میراں محمد شاہ مرا تو اس کا بھائی راجہ علی خاں فاروقی شہنشاہ اکبر کے پاس موجود تھا چنانچہ اس نے شہنشاہِ اکبر کی امداد سے خاندیش پر قبضہ جما لیا اور اپنے بھتیجے حسن خاں فاروقی کو معزول کر کے خود خاندیش کا بادشاہ بن گیا۔ یہ بادشاہ چونکہ اکبر کا خدمت گذار تھا۔ اور اسی کی امداد سے خاندیش کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اسلئے اس نے اپنے نام کے ساتھ راجہ کا خطاب اختیار کیا۔ یہ مغلوں کا ماتحت اور باجگذار تھا۔ یہ نام نہاد بادشاہ دکھنیوں سے جنگ کرتے

ہوئے ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں مارا گیا۔ اس نے تقریباً ۲۲ سال مغلوں کے باجگذار حکمراں کی حیثیت سے حکومت کی۔

بہادر خاں فاروقی:۔ راجہ علی خان کے مرنے کے بعد اکبر بادشاہ نے اپنے فرمان کے ذریعہ اس کے بیٹے بہادر خاں کو خاندیش کی حکومت سپرد کر دی۔ یہ نہایت ہی عیاش طبع حکمراں تھا جو ہر وقت شراب اور افیون کے نشہ میں مدہوش رہتا تھا۔ عورتوں سے اسے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ رات دن ناچ رنگ کے سوا اسے کوئی کام نہ تھا۔ یہ نام نہاد بادشاہ بھی اگرچہ اکبر بادشاہ کا باجگذار تھا لیکن بعد کو منحرف ہو گیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ اکبر نے ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں خاندیش پر فوج کشی کر کے اسے حکومت سے معزول کر دیا اور خاندیش کو حکومتِ مغلیہ میں شامل کر لیا گیا۔ بہادر خاں کو معزول کرنے کے بعد لاہور بھیجدیا گیا۔ اور اس طرح خاندیش کی خود مختار اسلامی حکومت کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔

خاندیش کی یہ خود مختار اسلامی سلطنت تقریباً دو سو سال تک باقی رہی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس سلطنت کے حکمرانوں نے بڑی شان اور دبدبہ کے ساتھ حکومت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندیش کی اس آزاد اسلامی حکومت کو ہندوستان کی تاریخ میں نہایت ہی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

پندرھواں باب

دکن کی خودمختار اسلامی حکومتیں

۷۴۸ھ تا ۱۰۱۸ھ

۱۳۴۷ء تا ۱۶۱۰ء

دکن کی خود مختار اسلامی حکومتیں

دکن میں یوں تو بہت سی خود مختار اسلامی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں لیکن ان تمام اسلامی حکومتوں کی جڑ اور بنیاد کیونکہ حکومت بہمنی ہے۔ اسلئے اس حکومت کو دکن کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

دکن کی اس خود مختار اور آزاد اسلامی حکومت کا بانی سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی تھا جس نے کہ ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں حکومت بہمنی کی بنیاد رکھی قبل اسکے کہ ہم بہمنی حکومت اور دکن کی دوسری اسلامی حکومتوں پر روشنی ڈالیں۔ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ بہمنی حکومت کے قیام سے قبل کے ان واقعات پر ہلکا سا تبصرہ کردیں جو "بہمنی حکومت" کے عالم وجود میں آنے سے پہلے دکن میں رونما ہوتے رہے ہیں۔

دکن چونکہ شمالی ہند سے کافی دور دراز فاصلہ پر واقع ہے۔ اس لئے جنوبی ہند کی حکومتیں ہمیشہ اُن حملہ آوروں سے محفوظ رہی ہیں جو وسط ایشیا سے آنیکے بعد شمالی ہند پر بار بار حملے کرکے ہندوستان کو تاخت و تاراج کرتے رہے ہیں چنانچہ دکن کی اس محفوظ پوزیشن کی بنا پر دکن کے ہندو راجہ ہزاروں برس تک بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ اس علاقہ میں حکومت کرتے رہے ہیں اور ان کو کبھی بھی ان دشوار یوں اور پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جن دشواریوں میں کہ شمالی ہند کی حکومتیں آئے دن مبتلا رہتی تھیں۔

دکن پر مسلمانوں کا سب سے پہلا حملہ

دکن پر وسط ایشیا سے آنے والے بیرونی حملہ آور تو کیا حملہ کرتے خود ہندوستان کے ان مسلمان بادشاہوں کو بھی فاصلہ کی دوری کی بنا پر دکن پر حملہ کرنے کی

زمانۂ دراز تک جرأت نہ ہو سکی جو شمالی ہند میں ایک مضبوط حکومت کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ چنانچہ شہاب الدین غوری اور قطب الدین ایبک سے لیکر جلال الدین خلجی تک کسی مسلمان بادشاہ نے دکن کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ یہ بادشاہ گجرات سے لیکر بنگال تک ہندوستان کا بیشتر حصہ فتح کرنے کے بعد دہلی کی حکومت کو کافی سے زیادہ وسعت دے چکے تھے۔ اور ان کی طاقت اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ یہ آسانی کے ساتھ دکن کو فتح کر سکتے تھے۔

ملک دکن کی جانب سب سے پہلے جس حملہ آور نے توجہ کی وہ سلطان جلال الدین خلجی کا داماد اور بھتیجہ علاء الدین خلجی تھا مگر اس نے بھی دکن کی جانب اس لئے رُخ نہیں کیا تھا کہ اس کو دکن کے ملک کی ضرورت تھی بلکہ اس کو تو ملک کی بجائے اُس بے اندازہ دولت کی ضرورت تھی جو ہزاروں برس سے دکن کے خزانہ میں جمع ہو رہی تھی تاکہ وہ اس دولت کے بل پر اپنے چچا جلال الدین خلجی سے حکومت چھین سکے۔ اسے شاید اس دولت کا علم بھی نہ ہوتا۔ اگر اس کے ہندو دوست اور گھر کے بھیدی اسے دکن کی دولت کا راز نہ بتاتے۔

ہندو دوستوں کے مشورہ پر اس نے دکن پر حملہ کی تیاری بھی اپنے چچا سے چھپ کر کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جلال الدین خلجی اس دور دراز فاصلہ کی مہم کی اسے ہرگز اجازت نہیں دیگا۔ علاء الدین خلجی نے دکن کے حملے کے ارادہ کو یہاں تک چھپایا کہ جب ۶۹۲ھ میں وہ کٹرہ سے لشکر عظیم لیکر دکن کی طرف چلا تو یہی کہتا رہا کہ وہ چندیری کی فتح کے لئے جا رہا ہے۔ اسکے اصل ارادہ کا اس وقت انکشاف ہوا جب وہ دیوگیر کے راجہ رام دیو کو دکن میں شکستوں پر شکستیں دینے کے بعد اور دکن کو لوٹ کر اتنی بڑی دولت اپنے ساتھ لیکر کٹرہ پہنچ گیا۔ جو کئی سلطنتوں کے خزانوں سے بھی دس گنی اور بیس گنی تھی چنانچہ اسی بے اندازہ دولت کے بل پر اس نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کیا اور اسی

دولت کو لٹاتا ہوا کڑہ سے دہلی پہنچا اور دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا۔ یہ تھا دکن پر مسلمانوں کا سب سے پہلا حملہ اور اس حملے کا سبب۔

دکن پر مسلمانوں کے چند دوسرے حملے

دیوگیر کی فتح کے بعد وہاں کے راجہ رام دیو نے علاء الدین سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر سال خراج کی رقم دہلی کی سلطنت کو ادا کرتا رہے گا لیکن چونکہ اس نے خراج ادا نہیں کیا تھا۔ اس لئے سلطان علاء الدین نے جو بادشاہ بن چکا تھا۔ ملک کافور کو دیوگیر کے راجہ کی سرکوبی کے لئے ایک بڑا لشکر لیکر بھیجا۔ ملک کافور دکن کو فتح کرتا ہوا دیوگیر میں آیا۔ رام دیو نے اطاعت قبول کرلی اور وہ خود دہلی جا پہنچا جہاں اس کا بڑا اعزاز و احترام ہوا سلطان علاء الدین نے اس کے ساتھ یہ فیاضی برتی کر اس سے اقرارِ اطاعت لیکر نہ صرف اس کا علاقہ اسے واپس کردیا۔ بلکہ بطور انعام گجرات کے علاقہ میں سے بھی ایک علاقہ اس کو دیدیا۔ چنانچہ یہ راجہ جب تک زندہ رہا۔ اس نے بادشاہ کی اطاعت سے کبھی منھ نہیں موڑا۔

۷۰۹ھ (۱۳۰۹ء) میں سلطان علاء الدین نے ملک کافور کو تلنگانہ کی فتح کے لئے بھیجا تھا۔ اس مہم میں ورنگل (تلنگانہ) کے راجہ پرتاب راؤ نے اطاعت قبول کرلی تھی اور اس طرح دکن کا بڑا حصہ سلطنتِ اسلامیہ میں شامل ہو گیا تھا لیکن دو سال بعد جب دیوگیر میں پھر بغاوت نمودار ہوئی تو ملک کافور نے دکن جاکر اس بغاوت کو کچل دیا اور باغیوں کو سخت سزائیں دیں۔

۷۱۷ھ (۱۳۱۷ء) میں ملک کافور کے قتل کے بعد جب سلطان مبارک شاہ خلجی دہلی کے تخت پر بیٹھا تو دیوگیر کے نئے راجہ ہرپال نے جو سابق راجہ کا داماد تھا۔ دہلی کی حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت کر کے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ مبارک شاہ ۷۱۹ھ (۱۳۱۹ء) میں خود اس بغاوت کو دبانے کے لئے

دکن گیا اور راجہ ہرپال کو گرفتار کر کے اس کی کھال کھنچوائی اور دکن کا انتظام درست کر کے دہلی واپس آ گیا۔ لیکن مبارک شاہ خلجی نے جب اپنے منظور نظر غلام خسرو خاں کو دکن کا وائسرائے بنایا تو خسرو خاں نے دکن کا خود مختار بادشاہ بننے کے لئے جوڑ توڑ شروع کر دیا تھا۔ لیکن اُمرائے دکن کی مخالفت کی بنا پر وہ اپنے اس مقصد میں ناکام رہا۔

غیاث الدین تغلق کے دورِ حکومت میں پھر دکن میں بغاوتیں رُونما ہونے لگیں۔ تلنگانہ کا راجہ خود مختار ہو گیا اور دیوگیر میں بھی بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی جونا تغلق (محمد تغلق) نے ان بغاوتوں کو جا کر دبا دیا۔ تلنگانہ کو فتح کر کے دہلی کی حکومت میں شامل کیا۔ پھر اس نے جاج نگر کو فتح کیا اور اس کے بعد کافی مدت تک دکن میں امن رہا۔

دکن میں سب سے زیادہ بدنظمی اس زمانہ میں پیدا ہوئی جب محمد تغلق نے دارالسلطنت کو دہلی سے دیوگیر (دولت آباد) منتقل کیا۔ محمد تغلق کی انتہائی کوششوں کے باوجود یہ بغاوتیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ چنانچہ ۷۴۴ھ (۱۳۴۴ء) میں تلنگانہ اور کرناٹک دہلی کی حکومت سے الگ ہو گئے۔ بیدر اور گلبرگہ میں بغاوتیں برپا ہو گئیں، اور اسی زمانہ میں حسن گانگو بہمنی جو امیرانِ صدہ میں سے تھا۔ باغی ہو گیا اور اس نے دوسرے امیران صدہ کے ساتھ مل کر دکن میں ایک خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی۔ جو بعد کو سلطنتِ بہمنی کہلائی۔

دکن میں سلطنتِ بہمنی کا قیام

حسن گانگو بہمنی جس نے کہ دکن میں سلطنتِ بہمنی کی بُنیاد رکھی۔ اس کی زندگی بڑی عجیب و غریب ہے۔ حسن گانگو ابتدا میں دہلی کے ایک منجم گانگوی برہمن کا نوکر تھا۔ اس برہمن کو کیونکہ محمد تغلق کے زمانہ شہزادگی میں اُس سے بے حد قرب حاصل تھا۔ اسلئے اس نے حسن کو بادشاہ کے ہاں ملازم کرا دیا تھا، جہاں وہ ترقی کرتے کرتے امیران صدہ کے زُمرہ میں شامل ہوگیا۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ شہزادہ تغلق حضرت نظام الدین اولیاء کی دعوت میں شرکت کے بعد جب چلا گیا اور حسن گانگو وہاں پہنچا تو حضرت نے فرمایا کہ ایک بادشاہ تو گیا اور دوسرا آیا۔ اور اسکے بعد حسن گانگو سے کہا کہ تجھ کو ایک دن دکن کی بادشاہت ملے گی۔ بس اسی دن سے حسن گانگو کے دماغ میں دکن کا بادشاہ بننے کا سودا سما گیا تھا۔

سلطان محمد تغلق نے جب امیران صدہ کا قتل عام شروع کیا۔ تو دکن کے تمام امیران صدہ نے محمد تغلق کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے حسن گانگو کو اپنا سردار بنا لیا تھا۔ حسن گانگو نے سردار بننے کے بعد ایک بہت بڑی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ اس جمعیت کے ذریعہ وہ سلطان محمد تغلق کے تمام عمال کو شکست دینے اور قتل کرنے کے بعد ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں دکن کا بادشاہ بن گیا۔ بادشاہ بننے کے بعد سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی نے گلبرگہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ محکمہ مال اپنے آقا گانگو برہمن کے سپرد کیا جو دہلی سے دکن آگیا تھا۔ اور تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی جدید فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ بہت تھوڑی مدت میں سلطان حسن گانگو دکن کے اس تمام علاقہ پر قابض ہوگیا جو شاہانِ تغلق کے پاس تھا۔

دکن کی حکومت پر قابض ہونے کے بعد سلطان حسن گانگو بہمنی کے حوصلے بے حد بڑھ گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ دہلی مالوہ گجرات اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں کو جلد سے جلد فتح کرلے لیکن اس مہم کی تیاریوں میں وہ مصروف تھا کہ بیمار ہو گیا اور پانچ ربیع الاول ۷۵۹ھ (۱۳۵۸ء) کو بعمر ۶۷ سال اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے پیچھے دکن میں مسلمانوں کی ایک ایسی خود مختار حکومت بنا کر چھوڑ گیا جو تقریباً دو سو سال تک سارے جنوبی ہند میں اسلامی سطوت کا ڈنکا بجاتی رہی۔

سلطنت بہمنی کے خود مختار بادشاہ

سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سلطان **محمد شاہ بہمنی:۔** دکن کے تخت پر بیٹھا۔ یہ نہایت ہوشمند بادشاہ تھا۔ جس نے حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے تو نظام حکومت کو اور زیادہ چست کیا اور پھر فوج میں اضافہ کرنے کے بعد اس کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ یہ دکن کا پہلا بادشاہ ہے جس نے کہ شاہی مہر کے ساتھ دکن میں سونے کے سکے رائج کئے اس بادشاہ کی پڑوسی ہندو حکومتوں سے یعنی حکومت وجیانگر اور تلنگانہ سے برابر چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ وجیانگر اور تلنگانہ کی حکومتیں اس جدید اسلامی حکومت کی بہت بڑی دشمن تھیں۔ چنانچہ سلطان محمد شاہ کے دورِ حکومت میں سلطنتِ بہمنی اور وجیانگر میں ایسی خوفناک جنگ ہوئی کہ لاکھوں انسانوں کا کام تمام ہو گیا۔ لیکن اس جنگ کے بعد ان دونوں حکومتوں میں صلح ہو گئی اس بادشاہ نے ملکی اصلاحات میں بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہ بادشاہ اگرچہ خود شراب پیتا تھا۔ لیکن اس نے شراب کی فروخت کو ممنوع قرار دیدیا تھا۔ یہ بادشاہ ۷۷۲ھ (۱۳۷۵ء) میں فوت ہو گیا۔

مجاہد شاہ:۔ سلطان محمد شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ بہمنی دکن کے تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ نے راجہ کشن والئی وجیانگر سے کچھ سرحدی قلعے طلب کئے

تھے مگر راجہ نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بنا پر دونوں حکومتوں میں خوفناک جنگ چھڑ گئی، اس جنگ میں راجہ وجیا نگر کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس لڑائی سے فارغ ہونیکے بعد جب مجاہد شاہ گلبرگہ آیا تو بادشاہ کے چچا داؤد نے ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) کو اسے قتل کرا دیا۔ اس نے تین سال حکومت کی۔ یہ بت پرستی اور بتخانوں کا بہت بڑا دشمن تھا۔

داؤد شاہ: بھتیجے کو قتل کرانے کے بعد داؤد شاہ تخت پر بیٹھا لیکن مجاہد شاہ کے قتل کی وجہ سے سارے ملک میں شورش پھیل گئی تھی۔ چنانچہ مجاہد شاہ کی بہن نے داؤد خان کو نماز پڑھتے ہوئے جامع مسجد میں قتل کرا دیا۔

محمود شاہ بہمنی: داؤد شاہ کے قتل ہونے کے بعد اس کا بھائی محمود شاہ بہمنی گلبرگہ کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بڑا علم دوست اور دیندار بادشاہ تھا۔ اس نے حافظ شیرازی کو دکن آنیکی دعوت دی تھی۔ جب حافظ شیرازی کسی وجہ سے نہ آئے تو ان کو ایک لاکھ اشرفیاں بھجوا دیں۔ ۲۱ رجب ۷۹۹ھ (۱۳۹۷ء) کو یہ بادشاہ تپ محرقہ میں مبتلا ہونے کے بعد فوت ہوگیا۔ اس نے ۲۰ سال حکومت کی۔

غیاث الدین بہمنی: سلطان محمود شاہ کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین بہمنی ۱۷ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا لیکن اس کا ترکی غلام تغلچیں جو بڑا با اثر تھا محض اس لئے اس کا دشمن ہوگیا کیونکہ غیاث الدین نے اس کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ دینا پسند نہیں کیا تھا غلام تغلچیں نے بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور اسے قلعہ ساغر میں قید کر دیا۔

شمس الدین بہمنی: تغلچیں غلام جو غیاث الدین کی ماں سے خاص رابطہ رکھتا تھا۔ اور بادشاہ گر بنا ہوا تھا۔ اس نے غیاث الدین کو اندھا کرنیکے بعد غیاث الدین کے چھوٹے بھائی شمس الدین کو ۱۵ سال کی عمر میں تخت پر بٹھا دیا۔ اور خود قلمدانِ وزارت سنبھال لیا۔ تغلچیں کی ان حرکتوں کی وجہ سے امرائے سلطنت اور تمام شاہی

خاندان میں غلام تغلچین سلطان شمس الدین اور اس کی ماں کے خلاف بُری طرح نفرت پھیل گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ داؤد شاہ کے بیٹے فیروز شاہ نے اُمرائے سلطنت سے سازباز کر کے سلطان شمس الدین اور تغلچین غلام دونوں کو محل کے اندر جا کر گرفتار کر لیا۔ شمس الدین کو اندھا کر دیا گیا۔ اور نابینا غیاث الدین کے ہاتھ سے تغلچین غلام کو قتل کرایا گیا۔

فیروز شاہ بہمنی:۔ سلطان شمس الدین کے بعد ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) میں فیروز شاہ گلبرگہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانہ میں قلعہ بنکاپور اور مملکت تلنگانہ نے سلطنت بہمنی کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ وجیانگر کے راجہ سے بھی فیروز شاہ کی کئی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ جن میں کہ فیروز شاہ کو نہ صرف فتوحات حاصل ہوئیں بلکہ رائے وجیانگر نے اپنی لڑکی کی شادی بھی فیروز شاہ سے کر دی تھی۔ اس نے ریاست گونڈوانہ کے راجہ کو بھی مطیع کر لیا تھا۔ اور اس کی بیٹی سے بھی شادی کر لی تھی۔ لیکن ۸۲۵ھ (۱۴۲۳ء) میں جبکہ فیروز شاہ ضعیف ہو گیا تو اس کے بھائی امیر احمد خاں نے حکومت پر قبضہ جما لیا۔ فیروز شاہ ۲۵ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵ شوال ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) کو رحلت کر گیا۔ یہ خود بھی عالم تھا۔ اور علما کا بے حد قدردان تھا۔ اس کے دربار میں دُور دراز کے ممالک کے علما کا ہجوم رہتا تھا۔ کبھی کبھی شراب بھی پی لیتا تھا۔ عورتوں کا بے حد دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے محل میں دُنیا کے ہر حصہ کی خوبصورت عورتیں جمع رکھی تھیں۔ اس بادشاہ کی عورتوں سے دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک دن میں آٹھ سو عورتوں سے متعہ کیا تھا۔

احمد شاہ بہمنی:۔ امیر احمد خاں (۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں دکن کے تخت پر بیٹھا تو اس نے احمد شاہ بہمنی کا لقب اختیار کیا۔ احمد شاہ کو تخت نشینی کے فوراً ہی بعد والئی وجیانگر سے جنگ کرنی پڑی تھی۔ اس جنگ میں احمد شاہ کو فتح حاصل ہوئی اور والئی وجیانگر

باجگذار بن گیا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے تلنگانہ پر حملہ کر کے اسے فتح کیا۔ والئی گجرات اور شاہِ دکن میں بھی ایک خوفناک لڑائی ہوئی جس سے کہ دونوں کو شدید نقصان پہنچا تھا علماء نے درمیان میں پڑ کر انہیں صلح کرا دی تھی۔ اس بادشاہ نے احمد آباد بیدر آباد کیا تھا یہ بارہ سال حکومت کرنے کے بعد ۸۳۸ھ (۱۴۳۵ء) میں فوت ہو گیا۔

علاء الدین بہمنی:۔ سلطان احمد شاہ کے بعد احمد آباد بیدر میں اس کا بیٹا سلطان علاء الدین تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کے خلاف سب سے پہلے اس کے بھائی شہزادہ محمد خاں نے بغاوت کی۔ بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔ اسکے بعد سلطان کے خسر نصیر خاں نے علم بغاوت بلند کیا۔ مگر اسے بھی شکست ہوئی۔ رائے وجیانگر سے اس بادشاہ کی بھی خوفناک لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں رائے وجیانگر نے مسلمانوں کی فوج بھرتی کر کے بادشاہ کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر پھر بھی رائے وجیانگر کو شکست ہوئی۔ سلطان علاء الدین ہی کے عہد حکومت میں دکھنی اور غیر دکھنی کا فتنہ کھڑا ہوا۔ اس فتنہ میں بے شمار دکھنی اور غیر دکھنی مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ سلطان علاء الدین ۲۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۸۶۲ھ (۱۴۵۸ء) میں فوت ہو گیا۔ یہ ایک علم دوست بادشاہ تھا جس کے گرد علما کا ہجوم رہتا تھا۔ عورتوں کا بے حد دلدادہ تھا۔ اس نے بھی اپنے حرم میں مختلف ممالک کی ایک ہزار خوبصورت عورتیں جمع کر رکھی تھیں۔ رائے سنگیسر کی لڑکی "زیبا چہرہ"۔ جس کو کہ مسلمان کر کے اس نے بیگم بنا لیا تھا۔ اس پر یہ بادشاہ دم و دیوانہ تھا۔ یہ خود تو شراب پیتا تھا۔ مگر رعایا کے لئے شراب نوشی کو اس نے جرم قرار دیدیا تھا۔ گداگری کی لعنت کا یہ بادشاہ سب سے بڑا مخالف تھا۔

ہمایوں بہمنی:۔ سلطان علاء الدین نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے ہمایوں کو جو "شاہ ظالم" کے نام سے مشہور تھا۔ ولیعہد بنا دیا تھا۔ بادشاہ کے مرتے ہی نظام الملک دولت آبادی وکیل سلطنت اور اس کا بیٹا اس "ظالم شاہ" کے خوف سے بھاگ گئے۔ "ہمایوں

شاہ ظالم" جب تخت پر بیٹھا تو اس نے ساری حکومت میں ردو بدل کر ڈالا۔ پرانے اُمرائے سلطنت کو یا تو قید کر دیا، یا نکال دیا۔ اس کے بعد احمد آباد بیدر میں پہنچ کر قتل عام کیا۔ اس بادشاہ کے ظلم وستم نے بہمنی حکومت سے عوام کو متنفر کر دیا تھا۔ اور اس کی بے عقلی کی وجہ سے ملک میں جا بجا بغاوتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ رعایا کی بہو، بیٹیوں کو پکڑوا کر بُلواتا تھا۔ اور انکے ساتھ بالجبر منہ کالا کرتا تھا۔ جب اسکے مظالم حد سے زیادہ بڑھے تو محل کی حبشی عورتوں نے اسے لاٹھیاں مار مار کر سنہ ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں ختم کر دیا۔ یہ کل تین سال حکومت کر سکا۔ مگر تین سال ہی میں ملک کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

نظام شاہ بہمنی "ہمایوں شاہ ظالم" کے بعد اس کا آٹھ سالہ لڑکا نظام شاہ بہمنی تخت پر بیٹھا۔ چونکہ یہ بادشاہ کم عمر تھا۔ اس لئے چاروں طرف سے مختلف ممالک نے حکومت بہمنی پر یورش کر دی اس بادشاہ کو سب سے پہلے اُڑیسہ اور تلنگانہ سے جنگ کرنی پڑی جسمیں فتح ہوئی اس کے بعد سلطان مالوہ نے دکن پر حملہ کر دیا جس سے کہ اس بادشاہ کو بے حد نقصان اُٹھانا پڑا۔ نظام شاہ صرف دو سال اور ایک ماہ حکومت کرنے کے بعد سنہ ۸۶۷ھ (۱۴۶۳ء) میں مر گیا۔

محمد شاہ بہمنی دوم:۔ نظام شاہ کے مرنے کے بعد اس کا بھائی محمد شاہ نو سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نو عمر بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی وہ تمام انتظامی خرابیاں دُور کر دیں جو اس کے باپ اور بھائی کے دور میں پیدا ہو چکی تھیں۔ اگر سچ پوچھا جائے تو محمد شاہ پر ہی حکومت بہمنی ختم ہو گئی۔ اس کی حکومت کو محمد گوان جیسے لائق وزیر کی وجہ سے بہت تقویت پہنچی۔ اس نے پڑوسی حکومتوں کو زیر کیا اور دشمنوں کو بُری طرح کچلا۔ اس کی فتوحات میں یوسف عادل شاہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ حکومت کے آخری دنوں میں یہ شراب نوشی کا بے حد عادی ہو گیا تھا۔ چنانچہ کثرت شراب نوشی

کی وجہ سے ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس بادشاہ نے بیس سال حکومت کی۔

محمود شاہ بہمنی دوم:۔ محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ بادشاہ بنا۔ اس نے نظام الملک بحری کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ یوسف عادل شاہ بھی اس کے درباریوں میں تھا لیکن جب اسکے قتل کے لئے مخالف اُمرا نے بادشاہ کو اُبھارا تو وہ بھاگ کر بیجاپور چلا گیا۔ محمود شاہ بہمنی برائے نام بادشاہ تھا۔ ساری حکومت درحقیقت امیر برید کے ہاتھ میں تھی۔ ۳۷ سال حکومت کرنے کے بعد یہ بادشاہ ۹۲۴ھ (۱۵۱۸ء) میں فوت ہو گیا۔ اس کے دور میں بہمنی حکومت میں چار فریق بن گئے تھے۔ ترکی، حبشی، دکھنی مغل یہ چاروں آپس میں کٹے مرے جاتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہمنی حکومت جو دکن کی سب سے مضبوط حکومت شمار کی جاتی تھی۔ اس کے پانچ ٹکڑے ہو گئے اور یہ حکومت پانچ مختلف خاندانوں میں تقسیم ہوگئی۔

احمد شاہ بہمنی دوم:۔ محمود شاہ کے مرنے کے بعد امیر برید نے محمود شاہ کے بیٹے احمد شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ اس نام نہاد بادشاہ کے پردہ میں امیر برید خود حکومت کرتا رہا۔ اس نے بادشاہ کو شراب نوشی کا عادی بنا دیا تھا۔ احمد شاہ کی شراب نوشی کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ جو کچھ اسے ملتا تھا۔ وہ کافی نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اس بادشاہ نے حکومت بہمنی کا تاج شراب نوشی کے لئے چار لاکھ میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے فروخت کر دیا تھا۔ یہ بادشاہ ڈھائی سال حکومت کرنے کے بعد ۹۲۷ھ (۱۵۲۱ء) میں زہر سے ہلاک کر دیا گیا۔

علاء الدین بہمنی دوم:۔ امیر برید جو بادشاہ گر بنا ہوا تھا۔ اس نے احمد شاہ کے مرنے کے بعد احمد شاہ کے بیٹے علاء الدین کو تخت پر بٹھایا۔ جب بادشاہ نے امیر برید کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہا تو اس نے بادشاہ کو معزول کر کے ۹۲۹ھ (۱۵۲۳ء)

میں قید کر دیا۔

ولی اللہ بہمنی:۔ امیر برید نے علاء الدین کو قید کرنے کے بعد سلطان محمود کے بیٹے ولی اللہ شاہ کو تخت پر بٹھایا، یہ بادشاہ تین سال تک امیر برید کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بنا رہا۔ امیر برید اسے محل میں قید رکھتا تھا۔ اس کی بیوی پر بھی اس نے قبضہ جما لیا تھا۔ آخر امیر برید نے ۹۳۱ھ (۱۵۲۶ء) میں اس بادشاہ کو بھی قتل کر دیا۔

کلیم اللہ بہمنی:۔ ولی اللہ شاہ کے بعد کلیم اللہ بہمنی تخت پر بیٹھا لیکن حکومت بہمنی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بابر نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ کلیم اللہ بہمنی نے اپنی امداد کے لئے بابر کو لکھا۔ مگر چونکہ بابر کی حکومت ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے دکن کی جانب توجہ نہ کی۔ چند سال کی برائے نام حکومت کے بعد جب کلیم اللہ بہمنی ۹۳۶ھ (۱۵۳۱ء) میں فوت ہوا تو بہمنی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ کلیم اللہ شاہ حکومت بہمنی کا برائے نام آخری بادشاہ تھا۔ بہمنی خاندان نے دکن میں پونے دو سو سال حکومت کی ہے۔ بہمنی حکومت کے تخت پر اٹھارہ بادشاہوں نے جلوس کیا ہے۔

حکومتِ بہمنی کے خاتمہ کے بعد یہ حکومت ان پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ (۱) حکومت عادل شاہیہ (۲) حکومت نظام شاہیہ (۳) حکومت قطب شاہیہ (۴) حکومت عماد شاہیہ (۵) حکومت برید شاہیہ۔

سلطنتِ عادل شاہی بیجاپور

سلطنتِ عادل شاہی کی بُنیاد ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء) میں سلطان یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں رکھی تھی۔ بیجاپور حکومتِ بہمنی کا وہ صوبہ تھا جو شمال میں احمد نگر کے مشرق میں بیدر سے اور جنوب میں ریاست وجیانگر سے ملا ہوا تھا اور مغرب میں گوا سے لیکر ڈھائی سو میل شمال تک سمندر سے ملحق تھا۔

بیجاپور کی خود مختار اسلامی حکومت کا بانی یوسف عادل شاہ ایک ترک غلام تھا جس کو سلطنتِ بہمنی کے بارھویں بادشاہ سلطان نظام شاہ نے خریدا تھا۔ یوسف عادل شاہ بادشاہ کے غلاموں کے زمرہ میں شامل ہوتے کے بعد پہلے میر آخور بنا اس کے بعد امیرانِ صدہ کا اعزاز اس کو دیا گیا۔ پھر اسے شاہی اصطبل کا داروغہ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد عادل شاہ نظام الملک کے پاس چلا گیا۔ جب نظام الملک کو برار کا انتظام سپرد کیا گیا تو اس نے یوسف عادل شاہ کو پانصدی اُمرار کا درجہ دیدیا۔ اور اسے عادل خاں کا خطاب ملا۔

نظام الملک کے جنگ میں مارے جانے کے بعد یوسف عادل شاہ نے جو بے نظیر فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے صلہ میں اسے بادشاہ نے بیجاپور کا گورنر بنا دیا بیجاپور کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی یوسف عادل شاہ نے اپنی فوجی طاقت کو خوب بڑھایا۔ اور بڑی قابلیت کے ساتھ بیجاپور کا انتظام کیا۔ سلطان محمود شاہ بہمنی دوم کے آخری دورِ حکومت میں جب کہ بہمنی حکومت کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ یوسف عادل شاہ نے مغلوں اور ترکوں کو زیادہ سے زیادہ بیجاپور کے عہدوں پر مامور کر کے اور ان کو فوج میں بھرتی کرنے کے بعد اپنی پوزیشن کو بیجاپور میں اچھی طرح

مضبوط کر لیا اور جب اس نے دیکھا کہ بہمنی حکومت لب دم ہے تو ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء)
میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، اور بیجا پور میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ غرضکہ
اس طرح اس ترکی غلام نے اپنے تدبر اور زور بازو سے بیجا پور میں ایک نئی خود مختار
اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ دی جو عادل شاہیہ حکومت کے نام سے مشہور ہوئی۔

سلطان عادل شاہ کی فتوحات

سلطان یوسف عادل شاہ نے خود مختار بادشاہ بننے کے بعد سب سے پہلے
ان اہم قلعوں کو فتح کیا جو بہمنی حکومت کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ قاسم برید ترک جو
زمانہ دراز سے بیجا پور میں اپنی بادشاہت قائم کرنے کی فکر میں تھا۔ جب اس نے
دیکھا کہ یوسف عادل شاہ وہاں کا بادشاہ بن گیا ہے تو اس نے سلطنت بہمنی کے
پرانے ہندو دشمنوں کو عادل شاہ کے خلاف ابھارا اور وجیانگر کے راجہ کو ترغیب
دیکر بیجا پور کی عادل شاہیہ حکومت پر حملہ کرا دیا۔ لیکن یوسف عادل شاہ نے لشکر کی
کمی کے باوجود محض اپنی اعلیٰ جنگی قابلیت کی بنا پر وجیانگر کی حکومت کو شکست
دیدی اور اس طرح یوسف عادل شاہ کی دھاک سارے جنوبی ہند میں قائم ہوگئی۔

وجیانگر کی فتح کے بعد عادل شاہ نے قلعہ جام کھنڈی کو فتح کیا۔ دستور دینار
حبشی کو شکست دیکر قتل کیا۔ غرضکہ یوسف عادل شاہ نے ایک ایک کر کے اپنے تمام
مخالفین پر فتح حاصل کر لی۔ جب اسے ملکی معاملات سے فرصت ہوئی تو اس نے
شیعہ مذہب اختیار کرنے کے بعد بیجا پور کے علاقہ میں شیعہ مذہب کی خوب تبلیغ
کی لیکن اس نے اپنی حکومت میں شیعہ سنی کے فتنہ کو کبھی نہ ابھرنے دیا۔ یوسف عادل شاہ
کا آخری کارنامہ یہ ہے کہ جب اسے معلوم ہوا کہ پرتگیزوں نے گوا کے قلعہ پر قبضہ جما لیا
ہے تو یہ فوراً گوا پہنچا اور ۹۱۵ھ میں پرتگیزوں کو قتل کرنیکے بعد یہ اہم قلعہ دوبارہ
فتح کر لیا۔

یوسف عادل شاہ بیس سال بیجاپور پر حکومت کرنے کے بعد ۹۱۶ھ میں فوت ہو گیا اور اپنے جانشینوں کے لئے بیجاپور کی ایک نہایت مضبوط اور خود مختار حکومت بنا کر چھوڑ گیا۔ اس کی بیوی ایک نَو مسلم مرہٹہ عورت تھی۔ ولیعہد اسمٰعیل اسی مرہٹہ عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس بادشاہ کا سلوک غیر مسلموں کے ساتھ بالکل برادرانہ تھا۔ اس نے مرہٹہ زبان کو حکومت کی زبان قرار دیدیا تھا۔

بیجاپور کے خود مختار مسلمان بادشاہ

بیجاپور کی خود مختار عادل شاہیہ حکومت پر مندرجہ ذیل بادشاہوں نے فرمانروائی کی ہے۔

(۱) سلطان یوسف عادل شاہ بانی حکومت عادل شاہیہ نے ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء) میں خود مختاری کا اعلان کیا۔

(۲) سلطان اسمٰعیل عادل شاہ بن یوسف عادل شاہ ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں تخت پر بیٹھا۔

(۳) سلطان ملّو عادل شاہ بن اسمٰعیل عادل شاہ ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں تخت پر بیٹھا۔

(۴) سلطان ابراہیم عادل شاہ برادر ملّو عادل شاہ ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں تخت پر بیٹھا۔

(۵) سلطان علی عادل شاہ بن ابراہیم عادل شاہ ۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء) میں بادشاہ بنا۔

(۶) سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی بھتیجہ علی عادل شاہ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں تخت پر بیٹھا۔ یہ سلطنت عادل شاہیہ کا آخری بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے بیجاپور پر تقریباً سو سال حکومت کی ہے۔

عادل شاہی حکومت کے چند اہم واقعات

بیجاپور کے بادشاہوں کے دورِ حکومت میں جو اہم واقعات رونما ہوئے۔ وہ یہ ہیں سلطان اسمٰعیل عادل شاہ کے زمانہ میں حبشیوں اور دکھنیوں کو شاہی ملازمت سے نکالدیا گیا۔ امیر برید نے بیجاپور پر حملہ کیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کو راجہ وجیانگر کے مقابلہ پر شکست ہوئی۔ ایران کے سفیر بیجاپور کی حکومت میں آئے۔ برہان نظام شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ میں خوفناک جنگ ہوئی۔ تلکنڈہ پر فوج کشی کی گئی۔ برہان نظام شاہ نے دوبارہ حملہ کیا۔ اور ابراہیم عادل شاہ سے اسکی جنگ ہوئی۔ ابراہیم عادل شاہ نے سنی مذہب اختیار کر لیا۔ لیکن علی عادل شاہ پھر شیعہ ہوگیا۔ نظام شاہیوں سے علی عادل شاہ کی جنگ ہوئی۔ علی عادل شاہ نے جدید فتوحات کے ذریعہ اپنی مملکت کو وسعت دی۔ علی عادل شاہ نے بنکاپور فتح کیا۔ ابراہیم عادل شاہ کے دور میں اُمرائے سلطنت میں خانہ جنگی برپا ہوئی۔ بہزاد الملک نے بیجاپور پر حملہ کیا اور ملیبار کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ ابراہیم نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ میں جنگ ہوئی۔ اِس جنگ کے بعد عادل شاہیہ خاندان کا اقتدار رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا گیا اور مغلوں نے بیجاپور پر حملے شروع کر دئیے۔ بیجاپور پر مغلوں نے سب سے پہلا حملہ ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۵ء) میں کیا تھا۔ ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۵ء) میں سیواجی کے حملوں سے بھی بیجاپور کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ ۱۰۹۶ھ (۱۶۸۵ء) میں شہنشاہ اورنگ زیب نے بیجاپور پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور بیجاپور کے بادشاہ کو قید کر لیا۔ اس کے بعد بیجاپور کی سلطنت حکومتِ مغلیہ میں شامل ہو گئی۔

سلطنت نظام شاہی احمد نگر

دکن میں احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت کا بانی ملک احمد نظام شاہ بحری ہے۔ جس نے کہ ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء) میں خود مختاری کا اعلان کر کے اپنا خطبہ پڑھوایا۔ اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اور خطبہ میں سے سلطنت بہمنی کے بادشاہ کا نام نکلوا دیا۔ سلطنت احمد نگر ۸۹۵ھ (۱۴۸۹ء) تک بہمنی حکومت کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء) میں یہ ایک خود مختار اسلامی حکومت بن گئی۔ جو شمال میں خاندیش سے ملی ہوئی تھی۔ مشرق میں اس کی سرحدیں برار اور بیدر سے ملتی تھیں۔ جنوب میں بیجاپور کی حکومت تھی اور مغرب میں سمندر کا وہ ساحلی علاقہ تھا جو آجکل صوبۂ بمبئی میں شامل ہے۔

نظام شاہی حکومت کا بانی ایک نو مسلم

نظام شاہی حکومت کا بانی احمد شاہ ایک نو مسلم برہمن تھا جس کا اصلی نام بہیما بھٹ تھا۔ بہیما بھٹ کا باپ بھیروں برہمن محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں وجیانگر میں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ بیجاپور آنے کے بعد یہ دونوں باپ بیٹے یعنی بھیروں برہمن اور بہیما بھٹ مسلمان ہو گئے تھے۔ بھیروں برہمن کا نام ملک حسین رکھا گیا۔ اور بھیروں بھٹ کا نام ملک احمد تجویز کیا گیا۔ ملک حسین بھیروں جس کا شمار شاہی غلاموں میں تھا ہندی کی نوشت و خواند میں بڑا قابل تھا۔ اس لئے سلطان محمد شاہ بہمنی نے اس کو اپنے بیٹے محمود شاہ بہمنی کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ ہندی کی نوشت و خواند کا کام اس سے لیتا رہے۔ ملک حسین بھیروں بڑا ذہین تھا۔ اس نے چند روز ہی میں شہزادہ کے ساتھ رہنے کے بعد فارسی زبان پر بھی عبور حاصل کر لیا اور یہ شہزادہ محمود شاہ بہمنی کا میر منشی بن گیا۔ شہزادہ کو چونکہ بھیروں کا

تلفظ ادا کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے وہ ملک حسین بھیروں کو ملک حسین بحری کہنے لگا اور اس کا یہی نام پڑ گیا۔

ملک حسین بحری کو رفتہ رفتہ دربار میں کافی عزت اور رسوخ حاصل ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ اس کو نظام الملک بحری کا خطاب عطا کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی تلنگانہ کی حکومت بھی اس کو دیدی گئی۔ جب خواجہ جہاں مر گیا تو اسے نائب سلطنت کا عہدہ مل گیا اور ملک نائب کا خطاب ملا۔ اس کے علاوہ اسے سپہ سالار بھی بنا دیا گیا۔

سلطان محمد شاہ کے مرنے کے بعد جب سلطان محمود بہمنی تخت پر بیٹھا۔ تو اس نے ملک نائب نظام الملک بحری یعنی ملک حسین بحری کو وکیل سلطنت کے عہدہ پر مامور کر دیا اور اس کی جاگیریں بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ نظام الملک بحری نے تمام جاگیر اپنے بیٹے ملک احمد کے حوالہ کر دی اور اسے جنیر کا حاکم بنا کر بھیجدیا۔

احمد نظام شاہ بحری کی خودمختاری

ملک احمد (احمد نظام شاہ بحری) نے جنیر کی حکومت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے ان مرہٹوں کو زیر کیا جو بہمنی حکومت کے اکثر علاقوں پر قابض تھے اس نے مرہٹوں سے بیر کا قلعہ فتح کر کے ان سے پانچ سال کا خراج وصول کیا۔ اسکے بعد قلعہ جوند، لوہ گڈھ، تونگ، کوریے، تکونہ، کندھانہ، پورندھر، بھروپ، جودھن مرنجن، گھورگ، ماہولی، پالیکو اور پوسے کا تکن پر بزورِ شمشیر قبضہ جمالیا، ان فتوحات کے بعد ملک احمد قلعہ ڈنڈ راج کی تسخیر میں مصروف تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ حکومت بہمنی کے اُمرائے سلطنت نے اس کے باپ نظام الملک بحری کو قتل کرا دیا ہے اس اطلاع کے ملتے ہی وہ حکومت بہمنی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جنیر آنے کے بعد احمد شاہ نظام الملک کا لقب اختیار کر کے ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء) میں اپنی خودمختاری اور بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ظریف الملک

افغان کو امیر الامرا کا عہدہ دیا۔ نصیر الملک گجراتی کو میر جملہ بنایا اور اپنی نو زائیدہ حکومت کو مضبوط بنانے کے کام میں مصروف ہو گیا۔

سلطان محمود بہمنی نے جب یہ سنا کہ احمد نظام شاہ سلطنت بہمنی کا علاقہ دبانے کے بعد خود مختار ہو گیا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے احمد نظام شاہ کو زیر کرنے کے لئے بار بار لشکر کشی کی لیکن بہمنی فوجوں کو ہر مرتبہ احمد نظام شاہ کے مقابلہ میں شکست اور ناکامی ہوئی۔ چنانچہ احمد نظام شاہ کے ہاتھ سے بہمنی فوج کے بڑے بڑے افسر مثلاً شیخ مودی زین الدین علی، جہانگیر خاں۔ سید الحق۔ سید لطیف اللہ۔ نظام خاں اور فتح اللہ خاں مقتول ہوئے۔ اس کے علاوہ احمد نظام شاہ جرات کر کے احمد آباد بیدر میں بھی جا گھسا اور اپنے باپ کے تمام متعلقین کو جبراً لے آیا۔ اس کے بعد احمد نظام شاہ بحری نے جدید فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ بندر اندراج پوری کو فتح کر لیا۔ اور قلعہ دولت آباد پر بھی چھاپے مارنے شروع کر دئیے۔

شہر احمد نگر کی تعمیر

شہر "احمد نگر" جس کے نام سے کہ احمد نظام شاہ کی یہ حکومت مشہور ہوئی۔ اس کی بنیاد اسی بادشاہ نے دولت آباد کے قریب سین ندی کے کنارے رکھی تھی۔ یہ شہر دو تین سال کے اندر اندر بہت بڑا شہر بن گیا۔ احمد نظام شاہ ہر سال فصل کے کاٹنے کے بعد احمد نگر سے دولت آباد پر حملہ کرتا تھا۔ اور اس نے دولت آباد کو بالکل اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے "احمد نگر" کو دولت آباد کے قریب تعمیر ہی اسی لئے کیا تھا کہ وہ یہاں سے آسانی کے ساتھ دولت آباد پر حملے کر سکے۔ غرضکہ احمد نظام شاہ نے "احمد نگر" کی حکومت کو اس قدر مستحکم بنا لیا تھا کہ بڑی بڑی حکومتیں بھی اس سے دبنے لگی تھیں۔ احمد نظام شاہ بحری ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) میں بیمار رہنے کے بعد فوت ہو گیا۔

احمد نگر میں شمشیر زنی کا شوق

احمد نظام شاہ بحری کو سب سے زیادہ شمشیر زنی کا

شوق تھا چنانچہ اس کے زمانہ میں احمد نگر کی حکومت میں عوام میں شمشیر زنی کا ایسا
شوق پھیلا کہ ہر گلی اور کوچہ میں شمشیر بازی کے اکھاڑے کھل گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
اس حکومت کی رعایا میں ذرا ذرا سی بات پر تلوار چل جاتی تھی۔ احمد نظام شاہ
مشرق کا پہلا بادشاہ ہے جس کے دورِ حکومت میں لوگوں کو "ٹکیک" کی اجازت
تھی۔ جس کے ذریعہ دو آدمی تلوار چلا کر کسی معاملہ میں بھی اپنا فیصلہ خود کر سکتے تھے
یعنی "ڈوئل" کی عام اجازت تھی اور رفتہ رفتہ ٹکیک یعنی ڈوئل کی رسم احمد نگر
کے بعد سارے دکن میں پھیل گئی اور اس کو بہادری کا جزو سمجھا جانے لگا۔ احمد نظام
شاہ نہایت نیک طینت اور پاکباز بادشاہ تھا۔ کسی غیر عورت پر نظر اٹھانا یہ بدترین
گناہ خیال کرتا تھا۔

احمد نگر کے خودمختار بادشاہ

احمد نگر کی خودمختار نظام شاہی حکومت کے تخت پر جن بادشاہوں نے فرمانروائی کی ہے۔
ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱) احمد نظام شاہ بحری بانی حکومت احمد نگر ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء) سے ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) تک۔

(۲) برہان نظام شاہ بحری بن احمد نظام شاہ ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) سے ۹۶۱ھ (۱۵۵۳ء) تک۔

(۳) حسین نظام شاہ بحری بن برہان نظام شاہ ۹۶۱ھ (۱۵۵۳ء) سے ۹۷۲ھ (۱۵۶۴ء) تک۔

(۴) مرتضیٰ نظام شاہ بحری بن حسین نظام شاہ ۹۷۲ھ (۱۵۶۴ء) سے ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) تک۔

(۵) میراں حسین نظام شاہ بحری بن مرتضیٰ نظام شاہ ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء)

سے ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) تک۔

(۶) اسمٰعیل نظام شاہ بحری بن برہان نظام شاہ ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) سے ۹۹۹ھ
(۱۵۹۱ء) تک

(۷) برہان نظام شاہ بحری دوم بن حسین نظام شاہ ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) سے
۱۰۰۳ھ (۱۵۹۵ء) تک۔

(۸) ابراہیم نظام شاہ بحری بن برہان نظام شاہ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۵ء) سے
۱۰۰۴ھ (۱۵۹۶ء) تک۔

ابراہیم نظام شاہ بحری کے بعد یوں تو اور کئی بادشاہ احمد نگر کے تخت پر بیٹھے لیکن
حقیقت یہ ہے کہ نظام شاہی حکمرانوں کا خاتمہ ابراہیم نظام شاہ بحری کے عہدِ حکومت
پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس بادشاہ کے بعد جو بادشاہ بھی تخت پر بیٹھے یا تو وہ مجہول النسب
تھے یا ان کو وقتی ضرورت کیلئے اُمرائے سلطنت نے تخت پر بٹھا دیا تھا بس اُن کی
حیثیت کٹھ پتلی بادشاہوں سے زیادہ نہ تھی۔ مثلاً احمد شاہ بن طاہر جو ابراہیم
نظام شاہ بحری کے بعد تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کون تھا اور کس
خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس بادشاہ کے ہوتے ہوئے بعض اُمرائے سلطنت
نے موتی شاہ مجہول النسب کی بادشاہی کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ ان دو بادشاہوں کے
علاوہ ایک تیسرا بادشاہ علی بن برہان شاہ بھی ستر برس کی عمر میں تخت کا دعویدار
بن گیا تھا۔ اور اُمراء سلطنت کا ایک حصہ اسی کو بادشاہ مانتا تھا۔ غرضکہ ایک ہی
وقت میں احمد شاہ، موتی شاہ، علی بن برہان شاہ تین بادشاہ اس حکومت میں موجود تھے۔
اسی زمانہ میں مغل سپاہ نے جب احمد نگر پر حملہ کر دیا تو ان تینوں نام نہاد بادشاہوں
کی بادشاہی مغلوں کے سیلاب میں ختم ہو گئی۔ مغلوں کے جانے کے بعد بہادر شاہ بن
ابراہیم شاہ اس کے بعد مرتضیٰ نظام شاہ ثانی۔ تخت پر بیٹھے مگر ان کا ہونا نہ ہونا برابر۔

تھا کیونکہ احمد نگر کی حکومت ہی ختم ہو چکی تھی۔

چاند سلطانہ کا افسوسناک قتل

احمد نگر کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کے لئے اور اسے مغلوں سے بچانے کے لئے احمد نگر کی جس شیر دل خاتون نے مردانہ شجاعت کا ثبوت دیا وہ چاند سلطانہ تھی۔ چاند سلطانہ کو جب معلوم ہوا کہ احمد نگر کے بعض غداروں نے مغلوں کو احمد نگر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی ہے اور مغلوں کی فوجیں احمد نگر کے قلعہ کو گھیرے ہوئے ہیں تو یہ مردانہ لباس زیب تن کر کے میدان میں نکل آئی اور اپنی بے نظیر شجاعت کی بنا پر اس نے مغلوں کو حکومت احمد نگر سے صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن حکومت احمد نگر کی بدقسمتی کہ مغلوں کے جاتے ہی اس سلطنت کے اُمرا میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دوبارہ احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ چاند سلطانہ پھر میدان میں آگئی اور اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح صلح کے بعد مغلوں کی غلامی سے نجات مل جائے مگر دکھنیوں نے حرم سرا میں گھس کر اس بہادر خاتون کا ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں کام تمام کر دیا۔ اس حادثہ کے بعد احمد نگر کی وہ حکومت جس پر نظام شاہی حکمراں بڑی شان کے ساتھ تقریباً سوا سو سال تک حکومت کرتے رہے تھے۔ ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں مغلوں کے قبضہ میں چلی گئی۔

نظام شاہی حکومت کے چند اہم واقعات

احمد نگر کی نظام شاہی حکومت میں سوا سو برس کے اندر جو اہم واقعات رُونما ہوئے وہ یہ ہیں۔ برہان نظام شاہ اوّل کے عہدِ حکومت میں شاہِ برار سے جنگ ہوئی۔ عماد الملک اور برہان شاہ میں لڑائی ہوئی۔ برہان نظام شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ میں خوفناک

جنگ ہوئی۔ برہان نظام شاہ نے شیعہ مذہب کی ترویج کی۔ برہان نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ میں جنگ ہوئی۔ حسین نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ میں لڑائی ہوئی۔ علی عادل شاہ اور حسین نظام شاہ میں جنگ ہوئی۔ رامے وجیا نگر نے حکومت احمد نگر پر حملہ کیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے دورِ حکومت میں قلعہ دہارور فتح ہوا۔ پرتگیزوں پر یورش کی گئی۔ حبشیوں کو وزارت کے عہدے پیش کئے گئے۔ جس سے بڑے فتنے برپا ہوئے۔ اسمٰعیل نظام شاہ کو گرفتار کر کے معزول کر دیا گیا۔ دلاور خاں حبشی سے جنگ ہوئی۔ مغلوں کو احمد نگر کی فتح کی دعوت دی گئی اور مغلوں نے حملہ کر دیا۔ چاند سلطانہ نے مغلیہ فوج کا مقابلہ کیا۔ حکومت احمد نگر پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

سلطنت قطب شاہی گولکنڈہ

حکومت بہمنی ختم ہونے کے بعد جن پانچ حصّوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ان ہی میں سے
ایک گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت بھی تھی۔ اس آزاد اور خود مختار حکومت کی بنیاد
۹۱۶ھ (۱۵۰۹ء) میں سلطان قلی قطب شاہ نے رکھی تھی جس علاقہ میں یہ حکومت
قائم کی گئی تھی۔ وہ پہلے تلنگانہ کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن قطب شاہی حکومت
کے قیام کے بعد یہ ملک گولکنڈہ کہلایا۔ اس کے شمال میں ریاست گونڈوانہ اور
برار تھا۔ مغرب میں بیدر تھا۔ جنوب میں وجیانگر کی ہندو ریاست تھی۔ اور اس کا
جنوبی حصّہ ساحل سمندر کے کنارے کنارے اڑیسہ تک پھیلا ہوا تھا۔

گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کا بانی "سلطان قلی قطب شاہ"۔ ایران کے
شاہی ترک خاندان کا ایک ہونہار فرزند تھا۔ اس کے باپ کا نام اویس قلی تھا جو
ایران کے بادشاہ امیر خلیل کا دست راست تھا۔ لیکن امیر خلیل کے مرنے کے بعد
جب ایران کے تخت پر امیر یعقوب بیٹھا تو وہ سلطان قلی اور اس کے باپ کا دشمن
بن گیا۔ سلطان قلی کے باپ نے بیٹے کی زندگی کو خطرہ میں محسوس کرتے ہوئے اسے
اپنے بھائی امیر قلی کے ساتھ دکن بھیجدیا تھا۔ امیر قلی نے دکن آنے کے بعد محمود شاہ
بہمنی کی ملازمت اختیار کر لی تھی لیکن کچھ مدت کے بعد جب امیر قلی کو معلوم ہوا کہ ایران
کا بادشاہ امیر یعقوب مر گیا ہے تو اس نے محمود شاہ بہمنی سے ایران واپس جانے کی
اجازت چاہی۔ بادشاہ نے امیر قلی کو تو واپسی کی اجازت دیدی لیکن سلطان
قلی کو اپنے ہی پاس رکھ لیا اور سلطان قلی کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔

سلطان قلی ایک نہایت ہی ہونہار نوجوان تھا۔ یہ علم الحساب کا بہت بڑا ماہر

تھا محمود شاہ بہمنی نے اس کو محلات حرم کا منتظم بنا دیا۔ جہاں اس نے بڑی پابندی کے ساتھ فرائض انجام دیئے۔ اسی زمانہ میں تلنگانہ میں شورشیں برپا ہونی شروع ہوئیں تلنگانہ میں زیادہ تر چونکہ بیگمات کی جاگیریں تھیں۔ اس لئے سلطان قلی ہی کو ان جاگیروں کے انتظام کے لئے اور شورشوں کو دبانے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے شورش پسندوں کی اچھی طرح سر کوبی کی اور کئی سال کا خراج جو رُکا ہوا تھا وصول کر کے محمود شاہ بہمنی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ محمود شاہ نے خوش ہو کر اُسے تلنگانہ کا گورنر بنا دیا۔ اور قطب الملک کا خطاب عطا کر دیا۔ سلطان قلی بڑی قابلیت کے ساتھ تلنگانہ پر حکومت کرتا رہا۔ وہ محمود شاہ بہمنی کے ساتھ تقریباً تمام لڑائیوں میں شریک رہا جن میں کہ اس نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔

سلطان قلی کی خود مختاری

سلطان محمود شاہ بہمنی کے مرنیکے بعد جب حکومت بہمنی کمزور ہو گئی اور اس حکومت کے تقریباً تمام گورنر خود مختار بن گئے تو ان ہی خود مختار گورنروں میں سے سلطان قلی بھی تھا جس نے اُمرائے تلنگانہ کے مشورہ سے ۹۱۶ھ میں صوبہ تلنگانہ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا بڑے تزک و احتشام کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ کا لقب اختیار کر کے تلنگانہ کے تخت پر بیٹھا۔ اپنے نام کا خطبہ جاری کیا اور سکہ چلایا۔

سلطان قلی نے اپنی بادشاہت کے اعلان کے بعد موضع گولکنڈہ کے قریب نئے دار السلطنت محمد نگر کی بنیاد رکھی اور وہاں اپنے دار السلطنت کو منتقل کر کے لے گیا۔ پھر سلطان نے قلعہ راج کنڈہ پر حملہ کر کے اسے فتح کیا۔ اس کے بعد اس نے قلعہ دیورکنڈہ کو تسخیر کیا جس پر کہ راؤ وجیا نگر سے اسکی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں سلطان قلی کو فتح حاصل ہوئی اور بے اندازہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ چند روز کے بعد عماد الملک سے بھی سلطان قلی کی جنگ چھڑ گئی جسمیں طرفین کا بے حد نقصان ہوا۔

اس کے بعد سلطان قلی اور وجیانگر کے راجہ میں مستقل جنگ چھڑ گئی جو کافی عرصہ تک جاری رہی۔ اسی زمانہ میں بیجاپور کے بادشاہ اسمٰعیل عادل نے وجیانگر کے راجہ کی حمایت میں سلطان قلی پر حملہ کر دیا اور دونوں میں سخت خونریزی ہوئی اور یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہی جبتک کہ اسمٰعیل عادل شاہ زندہ رہا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کے مرنیکے بعد جب ملو عادل شاہ تخت پر بیٹھا تو سلطان قلی کے ساتھ اس کی صلح ہو گئی۔ برید شاہ سے بھی سلطان قلی کی کئی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ غرضکہ سلطان قلی کی زندگی کا بیشتر حصہ میدانِ جنگ ہی میں گذرا ہے۔ اس بادشاہ کو ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں مسجد میں قاتلانہ حملہ کر کے اس کے بیٹے جمشید قلی نے قتل کر دیا جس وقت یہ شہید ہوا اس کی عمر نوّے سال کی تھی۔ سلطان قلی نے ساٹھ برس تک حکومت کی جسمیں سولہ سال تو حکومتِ بہمنی کا تلنگانہ میں گورنر رہا۔ اور ۴۴ سال اس نے خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے گولکنڈہ پر فرماں روائی کی ہے۔

قطب شاہی حکومت کے خود مختار بادشاہ

گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت جو تقریباً سو سال تک قائم رہی۔ اس پر مندرجۂ ذیل بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔

(۱) قطب شاہی حکومت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ ۹۱۶ھ (۱۵۰۹ء) سے ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) تک

(۲) سلطان جمشید قطب شاہ بن سلطان قلی ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) سے ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) تک۔

(۳) سلطان سبحان قلی قطب شاہ بن جمشید قطب ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) سے ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) تک

(۴) سلطان ابراہیم قطب شاہ برادر سبحان قلی ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) سے

۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) تک۔

(۵) سلطان محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قطب شاہ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) سے ۱۰۱۸ھ (۱۶۱۱ء) تک

محمد قلی قطب شاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی گولکنڈہ کی حکومت میں سخت بدنظمی پھیل گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد قلی قطب شاہ اور اس کا بھائی دونوں گولکنڈہ میں قید کر دئے گئے۔ اس کے بعد مغلوں کی یورشیں شروع ہو گئیں۔ غرضکہ اورنگزیب نے گولکنڈہ کے آخری برائے نام بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کو گرفتار کرنے کے بعد ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) میں گولکنڈہ کی حکومت کو حکومت مغلیہ میں شامل کر لیا۔

قطب شاہی حکومت کے چند اہم واقعات

قطب شاہی حکومت کے صد سالہ دور میں

جو اہم واقعات رُونما ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ نے مسلمانوں کی آپس کی خانہ جنگی کو روکنے کی کوشش کی۔ رائے وجیا نگر سے جنگ کی۔ اُمرائے سلطنت کی ریشہ دوانیوں سے اس حکومت کو شدید نقصان پہنچا یہاں تک کہ یہ حکومت ختم ہو گئی۔

سلطنتِ عماد شاہی برار

برار بھی حکومت بہمنی کا ایک صوبہ تھا جو احمد نگر بیجا پور اور گولکنڈہ کی طرح خود مختار ہو گیا تھا۔ اور یہاں بھی ایک نئی عماد شاہی حکومت ۸۹۰ھ (۱۴۸۴ء) میں قائم ہو گئی تھی عماد شاہی حکومت کا بانی فتح اللہ عماد الملک تھا جس نے کہ اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے برار کو حکومت بہمنی سے علحدہ کر لیا تھا۔ برار ایک چھوٹا سا صوبہ تھا جس کے شمال میں مالوہ، مغرب میں خاندیش اور احمد نگر جنوب میں بیدر اور گولکنڈہ اور مشرق میں گونڈوانہ کی ریاست تھی۔

عماد شاہی حکومت کا بانی عماد الملک

فتح اللہ عماد الملک ایک نو مسلم ہندو تھا جو وجیانگر کے کنارٹی ہندوؤں کی اولاد میں سے تھا۔ یہ وجیانگر کی لڑائی میں بچپن میں گرفتار ہونے کے بعد خان جہاں سپہ سالار برار کے غلاموں کے زمرہ میں شامل ہو گیا تھا۔ عہدِ شباب میں اُس نے ایسی قابلیت اور شجاعت دکھائی کہ معتمدوں اور مقربوں میں شامل ہو گیا۔ خان جہاں کی وفات کے بعد یہ سلاطین بہمنی کی ملازمت میں آگیا۔ اور سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہدِ حکومت میں اسے عماد الملک کا خطاب عطا ہوا۔ اس کے علاوہ برار کی سپہ سالاری کا عہدہ بھی اسے تفویض ہوا جب بہمنی حکومت کمزور ہو گئی تو اس نے ۸۹۰ھ (۱۴۸۴ء) میں اپنی خود مختاری اور بادشاہی کا اعلان کر دیا خود مختار ہونیکے بعد اس نے اپنی فوج میں اضافہ کیا۔ اور حکومت کو مضبوط بنایا۔ ۹۱۰ھ (۱۵۰۳ء) میں بیمار ہونے کے بعد یہ فوت ہو گیا۔

عماد شاہی حکومت کے خود مختار بادشاہ

فتح اللہ عماد الملک کی

قائم کردہ عماد شاہی حکومت کے مندرجۂ ذیل بادشاہوں نے برار پر فرمانروائی کی ہے :-

(۱) عماد شاہی حکومت کا بانی فتح اللہ عماد الملک سنہ ۸۸۶ھ (سنہ ۱۴۸۴ء) سے سنہ ۹۱۰ھ (سنہ ۱۵۰۳ء) تک۔

(۲) علاء الدین عماد شاہ بن فتح اللہ عماد الملک سنہ ۹۱۰ھ (سنہ ۱۵۰۳ء) سے سنہ ۹۳۶ھ (سنہ ۱۵۲۹ء) تک

(۳) دریا عماد شاہ بن علاء الدین عماد شاہ سنہ ۹۳۶ھ (سنہ ۱۵۲۹ء) سے سنہ ۹۶۸ھ (سنہ ۱۵۶۰ء) تک

(۴) برہان عماد شاہ سنہ ۹۶۸ھ (سنہ ۱۵۶۰ء) میں تخت نشین ہوا۔

(۵) پیر تفال خاں نائب سلطنت نے حکومت پر قبضہ جمالیا۔

برہان عماد شاہ کے بعد عماد شاہی حکومت ختم ہو گئی تھی کیونکہ نائب سلطنت تفال خاں نے حاکم خاندیش اور نظام شاہ کی امداد سے بادشاہ کو جو نوعمر لڑکا تھا معزول کر کے حکومت پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کے بعد شاہانِ احمد نگر نے اس حکومت کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا۔ یہ حکومت تقریباً ایک صدی قائم رہی۔

سلطنتِ بریدشاہی بیدر

بیدر کی بریدشاہی حکومت کا بانی قاسم برید ہے جس نے بیجاپور احمدنگر گولکنڈہ اور برار کی طرح بیدر کی خودمختاری کا اعلان کرکے اس صوبہ کو بہمنی حکومت سے چھین لیا تھا۔ یہ حکومت بہمنی کا ایک چھوٹا سا صوبہ تھا جس کے شمال میں برار مغرب میں بیدر جنوب میں بیجاپور اور مشرق میں گونڈوانہ کی ریاست تھی۔

بریدشاہی حکومت کا بانی قاسم برید

قاسم برید ترکی گرجی غلام تھا جس کو خواجہ شہاب الدین یزدی نے سلطان محمد شاہ بہمنی کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ قاسم برید ایک بہادر سپاہی تھا۔ اعلیٰ درجہ کا خوشنویس تھا۔ موسیقی کے سازوں کے بجانے میں اسے کمال حاصل تھا اس نے اپنی بے نظیر استعداد کی بنا پر بہت جلد حکومت بہمنی میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔ مرہٹوں پر فتح پانے کے بعد اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ قاسم برید نے مرہٹوں جیسی سرکش جماعت کو بڑی دلیری اور بہادری کے ساتھ زیر کیا۔ مرہٹوں کے سب سے بڑے سردار سمبھاجی کو اسی نے قتل کیا تھا اور اس کی بیٹی سے اپنے بڑے بیٹے امیر برید کا نکاح کردیا تھا بادشاہ نے قاسم برید کی جرأت اور بہادری سے خوش ہوکر سمبھاجی کی ساری جاگیر اسی کو دیدی تھی۔ قاسم برید نے جب یہ دیکھا کہ حکومت بہمنی کمزور ہوچکی ہے اور اس کی طاقت کافی بڑھ گئی ہے تو اس نے ۸۹۰ھ (۱۴۸۴ء) میں بیدر میں اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا۔ قاسم برید ۹۱۰ھ (۱۵۰۳ء) تک خودمختار بادشاہ کی حیثیت سے بیدر میں حکومت کرتا رہا۔ ۹۱۰ھ (۱۵۰۳ء)

میں بیمار رہنے کے بعد یہ فوت ہو گیا۔

بریدشاہی حکومت کے خودمختار بادشاہ

بریدشاہی خاندان کے جن بادشاہوں نے بیدر پر حکومت کی ہے ان کے نام یہ ہیں :-

(۱) بیدر کی بریدشاہی حکومت کا بانی امیر قاسم برید ۸۸۹ھ (۱۴۸۴ء) سے ۹۱۰ھ (۱۵۰۳ء) تک۔

(۲) امیر برید بن قاسم برید ۹۱۰ھ (۱۵۰۳ء) سے ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) تک

(۳) علی برید شاہ بن امیر برید ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) سے ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) تک

(۴) ابراہیم برید بن علی برید ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) سے ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) تک

(۵) قاسم برید ثانی ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) سے ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۲ء) تک

(۶) محمد علی قطب شاہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۲ء) سے ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) تک

(۷) مرزا علی برید (۸) امیر برید ثانی۔

بریدشاہی خاندان کے ابتدائی تین بادشاہوں کے بعد ہی اس حکومت کا زوال شروع ہو گیا تھا اور اس طرح یہ پانچویں حکومت بھی جو حکومت بہمنی کی خاک سے پیدا ہوئی تھی۔ بیجاپور میں شامل ہونے کے بعد ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۹ء) میں ختم ہو گئی۔

دکن کی دوسری خودمختار حکومتیں

بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ، برار اور بیدر کے علاوہ بھی دکن میں چند خودمختار حکومتیں تھیں جن پر ہم ہلکی سی روشنی ڈالدینا چاہتے ہیں۔

دکن کی خودمختار حکومتوں میں وجیانگر کی ہندو حکومت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ یہ جنوبی ہند کے جزیرہ نما میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کا

شمار دکن کی بڑی اور دولتمند حکومتوں میں کیا جاتا تھا۔

وجیانگر کی حکومت کی بنیاد ہری ہر اور بکا نامی دو بھائیوں نے قائم کی تھی۔ یہ دونوں بھائی ابتدا میں ورنگل کے راجہ کے ہاں ملازم تھے! ان دونوں بھائیوں نے اپنی متحدہ کوشش سے وجیانگر کی حکومت کی سرحدوں کو کرشنا ندی سے لیکر راس کماری تک پھیلا دیا تھا۔ وجیانگر کی حکومت کی دکن کی مسلمان حکومتوں سے ہمیشہ جنگ رہی ہے ۸۹۶ھ (سنہ ۱۴۹۰ء) میں وجیانگر کے بکا خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اور نرسنگھ جو وزیر تھا تخت پر بیٹھ گیا۔ ۹۱۶ھ (سنہ ۱۵۰۹ء) میں کرشن دیورائے تخت پر بیٹھا۔ اس نے سلطنت کو کافی وسعت دی۔ کرشن دیورائے کے بعد اچیوت دیو تخت پر بیٹھا۔ مگر وہ ایک کمزور راجہ تھا۔ اچیوت دیو کے بعد رام راجہ تخت پر بیٹھا جس پر دکن کی اسلامی حکومتوں نے مل کر حملہ کر دیا۔ اور ان حملوں کے بعد وجیانگر کی حکومت ۹۷۲ھ (سنہ ۱۵۶۴ء) میں ختم ہو کر اسلامی حکومتوں کا جزو بن گئی۔

وجیانگر کے علاوہ جنوبی ہند میں گنڈوانہ بھی ایک ریاست تھی جس کو شاید گونڈوں نے آباد کیا تھا۔ اس کے بعض حصوں پر مسلمان قابض تھے۔ اور بعض پر ہندو۔

سولھواں باب

حکومتِ مغلیہ کے دورِ ثانی پر ایک نظر

۹۶۲ھ تا ۱۲۷۴ھ

۱۵۵۵ء تا ۱۸۵۷ء

مغلیہ حکومت پر ایک نظر

مغلیہ حکومت کے قیام سے قبل یوں تو تقریبًا سات سو برس تک ہندوستان میں نئی نئی اسلامی حکومتیں بنتی رہی ہیں اور بگڑتی رہی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں جو عظمت اور سربلندی مغلیہ حکومت کو حاصل ہوئی ہے۔ وہ کسی بھی گذشتہ اسلامی حکومت کو میسر نہیں آسکی۔

مغلیہ حکومت کو صرف اپنی وسعت اور اعلیٰ انتظامی قابلیت کی بنا پر ہی ہندوستان کی تاریخ میں خاص عظمت حاصل نہیں ہے بلکہ اس حکومت کے لائق فرمانرواؤں نے جس رواداری اور غیر فرقہ وارانہ میل جول کی داغ بیل اس ملک میں ڈالی ہے۔ اس کی مثال مشکل ہی سے ہندوستان کی گذشتہ تاریخ میں مل سکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ چند امتیازی خصوصیات کے اعتبار سے مغلیہ حکومت کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ زمانۂ حال کی بعض جمہوری حکومتیں بھی آج سے سیکڑوں برس پہلے کی اس مغلیہ حکومت کے مقابلہ میں ماند دکھائی دیتی ہیں۔

مغلیہ حکومت کی ایک نہایت ہی مکمل اور مفصل تاریخ "ہندوستان پر مغلیہ حکومت" کے نام سے ہم علٰحدہ شائع کر چکے ہیں جو اس تاریخ کی جلد دوم ہے۔ اس شاندار مغلیہ تاریخ کے شائع کرنے کے بعد اگرچہ اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ زیر نظر تاریخ میں بھی مغلیہ حکومت پر روشنی ڈالی جائے لیکن پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ صرف چند صفحات میں آگے چل کر مغلیہ حکومت کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ ایک طرف تو اس تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کو بھی مغلیہ دور حکومت کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت ہو جائے۔ دوسری جانب یہ ہلکا سا خاکہ اس تاریخ کی جلد دوم کے مطالعہ کرنیوالوں کے لئے بھی ایک مختصر سے خلاصہ کا کام دے سکے۔

ہم کو اس چیز کا اعتراف ہے کہ مغلیہ حکومت کی تاریخ کا جو خلاصہ ہم آگے چلکر پیش کرنے والے ہیں وہ کسی طرح بھی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طبقہ کیلئے تسلی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس بات کیلئے مجبور ہیں کہ وہ تاریخ کی جلد دوم یعنی "ہندوستان پر مغلیہ حکومت" کا ضرور مطالعہ کریں لیکن پھر بھی اس خلاصہ کے ذریعہ مغلیہ حکومت کا ایک خاکہ ضرور ذہن نشین ہو جاتا ہے جس سے بڑی بڑی تاریخوں کے مطالعہ میں کافی رہنمائی ہو سکتی ہے لہذا ہم ذیل میں مغلیہ حکومت کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کئے دیتے ہیں۔

ہمایوں ہندوستان کا دوبارہ بادشاہ

اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہمایوں کو ناسازگار حالات کی بنا پر کس طرح سنہ ۹۴۷ھ (سنہ ۱۵۴۰ء) میں شیر شاہ سے شکست کھانیکے بعد ہندوستان چھوڑ کر ایران چلا جانا پڑا ہمایوں ایران جانے کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھا۔ اس نے شاہِ ایران سے فوجی امداد حاصل کرنیکے بعد پہلے تو قندھار فتح کیا۔ اسکے بعد کابل کو تسخیر کیا اور کابل کے معاملات سے فارغ ہونیکے بعد اس نے اپنی جدی ہندوستانی سلطنت کی جانب رُخ کیا۔ چنانچہ اس نے شیر شاہ کے جانشینوں سے ہندوستان کو چھین لیا اور وہ دوبارہ سنہ ۹۶۲ھ (سنہ ۱۵۵۵ء) میں ہندوستان کا بادشاہ بن گیا لیکن ابھی وہ اپنی حکومت کو مستحکم بھی نہیں کرنے پایا تھا اور پوری طرح ہندوستان کو فتح بھی نہیں کر سکا تھا کہ سنہ ۹۶۳ھ (سنہ ۱۵۵۶ء) میں وہ دہلی میں شاہی کتب خانہ کی سیڑھیوں سے گر کر اچانک فوت ہو گیا۔

جلال الدین اکبر کی تخت نشینی

ہمایوں کے مرنیکے بعد جب اس کا بیٹا جلال الدین اکبر تخت پر بیٹھا تو اسکی عمر صرف تیرہ برس اور نو مہینے کی تھی۔ ہمایوں کے مرتے ہی اور اکبر کے تخت نشین ہوتے ہی ملک میں جا بجا بغاوتیں پھوٹ پڑیں اور مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے وسیع پیمانہ پر تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ ہیمو بقال نے ایک عظیم الشان لشکر کے

ذریعہ آگرہ سے لیکر دہلی تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا اور مغلوں کی پوزیشن ہندوستان میں شدید خطرہ میں دکھائی دینے لگی۔

مغلوں کے خلاف بغاوتوں کے اس طوفان نے اکبر کے ساتھیوں کے پاؤں اُکھاڑ دیئے اور یہ ہندوستان سے فرار ہونے کی تیاریاں کرنے لگے لیکن اکبر اور اکبر کے اتالیق بیرم خاں نے یہ فیصلہ کیا کہ خواہ نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ باغیوں اور دشمنوں کا مقابلہ کیا جائیگا۔ اکبر اور بیرم خاں کے اس عزم کو دیکھتے ہوئے دوسرے اُمرائے سلطنت بھی مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ چنانچہ ۹۶۴ھ (۱۵۵۶ء) میں جب اکبر اور ہیمو بقال کا مقابلہ پانی پت کے تاریخی میدان میں ہوا تو ہیمو کو شکست ہو گئی۔ ہیمو کی شکست کے بعد اکبر اور اس کے ساتھیوں نے دہلی۔ آگرہ لکھنؤ اور بہت سے اہم علاقے فتح کر لئے۔ گویا اکبر نے نئے سرے سے پھر اسی مغلیہ حکومت کی بُنیاد رکھ دی جو ہمایوں کی موت کے بعد تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

اکبر کی ان فتوحات اور کامیابیوں میں اکبر کے اتالیق بیرم خاں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کو مغلیہ حکومت کے دوبارہ قیام میں بیرم خاں کی وجہ سے بڑی مدد ملی لیکن بیرم خاں کے مخالفین نے چند سال کے اندر اندر اکبر اور بیرم خاں میں بُری طرح شکر رنجی پیدا کرا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین کی سازشوں کی بنا پر بیرم خاں کو اکبر نے حکومت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا اور سلطنت کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بیرم خاں دل برداشتہ ہونے کے بعد حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ کھمبات میں اُسے قتل کر دیا گیا۔

بیرم خاں جیسی بلند شخصیت سے محروم ہونے کے بعد اکبر کے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا ایک بہت بڑا بوجھ پڑ گیا تھا۔ جسے اکبر نے بڑی قابلیت کے ساتھ برداشت کیا

چنانچہ اکبر نے ایک طرف نظام حکومت کو بہت بہتر بنا دیا اور دوسری جانب نئی نئی
فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ اکبر کوئی بہت بڑا فوجی جنرل نہیں تھا
لیکن وہ اعلیٰ درجہ کا سپاہی گر تھا۔ اس نے ادنیٰ ادنیٰ آدمیوں سے وہ کارہائے نمایاں
لئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ غرضکہ اس نے جب نئی فتوحات کا سلسلہ شروع
کیا تو سارے ملک میں اس کی فوجی قابلیت کی دھوم مچ گئی۔

اکبر کی فتوحات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے مختصر سے عرصہ
میں قلعہ گوالیار اور مالوہ کو فتح کر لیا۔ جونپور اور اودھ کے پٹھانوں کو زیر کر کے یہ تمام علاقہ
فتح کر لیا۔ اس کے بعد اکبر نے گجرات، بنگال اور کشمیر کو فتح کیا۔ پھر اکبر نے کابل، سندھ
اور قندھار کو زیر کیا۔ شمالی ہند کی فتوحات سے فارغ ہونیکے بعد اکبر دکن کی جانب متوجہ ہوا۔ اور
اس نے دکن کی بیشتر حکومتوں کو فتح کرنیکے بعد حکومت مغلیہ میں شامل کر لیا غرضکہ افغانستان
سے لیکر جنوبی ہندوستان تک اور گجرات سے لیکر بنگال تک کا علاقہ اکبر کی وسیع حکومت
میں شامل ہو گیا۔

اکبر ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں ایسا بیمار رہا کہ اس کی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں
رہی اکبر کے بیمار ہوتے ہی شہزادہ سلیم کے مخالفوں نے ہر چند اس بات کی کوشش کی کہ
اکبر سے شہزادہ سلیم کی بجائے سلیم کے بیٹے شہزادہ خسرو کی ولیعہدی کی منظوری حاصل
کر لیں لیکن اکبر نے ان سب کو جھڑک دیا اور صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ سلیم کے ہوتے
ہوئے ہرگز کوئی دوسرا بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اکبر نے شہزادہ سلیم کی بادشاہی کو
مضبوط بنانے کے لئے بیماری ہی کے زمانہ میں تمام امرائے سلطنت کے روبرو سلیم
کو اپنی تلوار، دستار اور خلعت شاہانہ عطا کر کے بادشاہ بنا دیا۔ بیٹے کو بادشاہ بنانیکے
بعد اکبر نے ملا صدر جہاں کو بلا کر اپنے غیر مذہبی خیالات سے توبہ کی کلمہ پڑھا اور
۶۳ سال کی عمر میں ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں اکبر کا انتقال ہو گیا۔

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد اکبر کے دادا بابر نے رکھی تھی لیکن اس حکومت کو شیر شاہ نے ہمایوں سے چھین لیا تھا۔ لیکن ہمایوں نے دوبارہ محنت کر کے جب نئے سرے سے ہندوستان کو فتح کیا تو ہمایوں کے مرتے ہی ہیمو اور دوسرے باغیوں نے اس حکومت کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اکبر کے پاس پنجاب کے برائے نام علاقہ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہا تھا لیکن خدا نے اکبر کو پانی پت کے میدان میں فتح عنایت کی جسکے بعد اکبر رفتہ رفتہ سارے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا اور اس کی حکومت افغانستان سے لیکر ہندوستان کی انتہائی سرحدوں تک پھیل گئی۔

نورالدین جہانگیر کا عہدِ حکومت

شہنشاہ اکبر کی موت کے بعد ۱۰۱۴ھ ہجری (۱۶۰۵ء) شہزادہ سلیم نورالدین جہانگیر کا لقب اختیار کرنے کے بعد ۳۸ سال کی عمر میں آگرہ میں تخت نشین ہوا جہانگیر نے بادشاہ ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شاہی قلعہ کی دیوار کے نیچے ایک سونے کی زنجیر لٹکا دی تاکہ مظلوم اور فریادی اس زنجیر کو کھینچنے کے بعد براہِ راست بادشاہ سے فریاد کر سکیں۔ اس بادشاہ نے رعایا کے فائدہ کے لئے بہت سے مفید احکامات جاری کئے تھے جن کا منشا یہ تھا کہ سرکاری حکام نہ تو رشوت لیں نہ رعایا سے تحفے اور نذرانے وصول کریں اور نہ لاوارث مرنیوالوں کے مال و جائداد پر قبضہ جمائیں صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے جہانگیر نے حکم دیا کہ بندرگاہوں کے ذریعہ جو مال ہندوستان میں آئے اس پر کوئی محصول یا چنگی نہ لی جائے چوروں اور ڈاکوؤں سے راستوں کو محفوظ کرنے کے لئے جہانگیر نے خاص احکامات جاری کئے تھے۔ جہانگیر اگرچہ خود شراب پیتا تھا لیکن اس نے عوام کو نشہ کی چیزوں سے بچانے کیلئے شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کی تجارت حکماً ممنوع قرار دیدی تھی۔

اکبر اپنے پیچھے اتنی بڑی سلطنت چھوڑ گیا تھا کہ جہانگیر کو جدید فتوحات کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ البتہ اسے بہت سی اندرونی بغاوتوں کا سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ جہانگیر کی

حکومت کے خلاف سب سے پہلی بغاوت اس کے بیٹے خسرو نے برپا کی تھی جسے جہانگیر نے دبادیا اور شہزادہ خسرو کو نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد جہانگیر کو قندہار کی بغاوت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جہانگیر کو رانا پرتاپ کے بیٹے امر سنگھ کی بغاوتوں کا بھی شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ دکن میں ملک عنبر نے جہانگیر کی حکومت کے خلاف ایک بہت بڑی بغاوت کھڑی کر دی تھی۔ جس کے دباتے میں جہانگیر کو بڑی دشواریاں پیش آئیں۔

جہانگیر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ مہر النسا یعنی نورجہاں کے ساتھ اس کا نکاح ہے۔ جہانگیر جس زمانہ میں قندہار کی بغاوت کے سلسلہ میں کابل میں تھا تو اسے اطلاع ملی کہ مہر النسا کے شوہر شیر افگن کو بردوان میں قتل کر دیا گیا۔ مہر النسا جہانگیر کی بچپن کی ساتھی تھی۔ یہ دونوں جب جوان ہوگئے تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ لیکن مہر النسا کا باپ غیاث بیگ چونکہ ایک معمولی مغل عہدہ دار تھا اور اکبر اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ ولیعہد سلطنت کی شادی کسی معمولی عہدہ دار کی بیٹی سے ہو اسلئے اکبر نے شیر افگن کے ساتھ مہر النسا کی شادی کر دی تھی۔ جب مہر النسا کا شوہر مارا گیا تو جہانگیر نے اپنی پرانی محبت کی یاد کو تازہ کرنے کیلئے مہر النسا کو شادی کا پیغام دیدیا مہر النسا شوہر کے مرنیکے فوراً ہی بعد تو جہانگیر سے شادی کرنے کیلئے تیار نہیں ہوئی لیکن کچھ زمانہ گذرنے کے بعد ان دونوں کا نکاح ہوگیا۔ نکاح کے بعد جہانگیر نے پہلے تو مہر النسا کو نور محل کا خطاب دیا۔ اس کے بعد نورجہاں کا خطاب عطا ہوا۔

نورجہاں کے ملکہ بنجانیکے بعد جہانگیر کی حکومت میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہونی شروع ہوگئیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ نورجہاں صرف ملکہ ہی نہیں تھی بلکہ وہ جہانگیر کے پردہ میں حکمرانی کر رہی تھی۔ نورجہاں نے اہم عہدوں پر اپنی مرضی کے افسروں کا تقرر شروع کر دیا تھا جس سے کہ نظام حکومت میں فرق آنے لگا تھا۔ اسکے علاوہ نورجہاں شہزادہ خرم یعنی شاہجہاں کی مخالف ہوگئی تھی۔ مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ نورجہاں کے پہلے شوہر

شیر افگن سے ایک لڑکی تھی جسکی شادی جہانگیر کے چھوٹے لڑکے شہریار سے ہوگئی تھی شہریار کے داماد بن جانے کے بعد نورجہاں کی یہ قدرتی خواہش تھی کہ شہریار آئندہ ہندوستان کا بادشاہ ہو لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ شاہجہاں باپ اور ملک کی نظروں میں محبوب بنتا چلا جارہا ہے اور اسکے داماد کے بادشاہ ہونیکے امکانات ختم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ان واقعات نے اسکے سینہ میں بغض اور حسد کی آگ کو بھڑکا دیا اور وہ اس کوشش میں مصروف رہنے لگی کہ شاہجہاں کو باپ کی نظروں سے گرا دیا جائے چنانچہ وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی تھی لیکن تھوڑی مدت کے بعد ہی جہانگیر اور شاہجہاں کے تعلقات پھر خوشگوار ہوگئے اور نورجہاں کو سخت مایوسی کا منھ دیکھنا پڑا۔

نورجہاں کی ریشہ دوانیوں اور سلطنت کے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے جہانگیر کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ جہانگیر اپنی صحت کو بحال کرنے کیلئے کشمیر گیا ہوا تھا کہ وہاں جاکر اسکی حالت اور بھی بگڑ گئی چنانچہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں وہ کشمیر سے لاہور آتے ہوئے راستہ میں فوت ہوگیا۔ اسکی لاش کو ہاتھی پر ڈالکر لاہور لایا گیا اور نورجہاں کے باغ میں دفن کردیا گیا۔ جہانگیر کے مرتے ہی تخت نشینی کیلئے نورجہاں اور اسکے بھائی آصف خاں میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ نورجہاں چاہتی تھی کہ جہانگیر کا چھوٹا بیٹا شہریار جو اس کا داماد تھا تخت پر بیٹھے اور آصف خاں اپنے داماد شاہجہاں کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں میں باقاعدہ جنگ ٹھن گئی لیکن نورجہاں ناکام رہی اور آصف خاں اپنے داماد شاہجہاں کو تخت دلانے میں کامیاب ہوگیا۔

محمد شہاب الدین شاہجہاں

جہانگیر کی موت کے بعد اس کا چہیتا بیٹا محمد شہاب الدین شاہجہاں ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ شاہجہاں کو اپنی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد دکن کے باغی

حکمرانوں کی سرکوبی کیلئے دکن جانا پڑا چنانچہ وہ مع اپنے اہل وعیال کے برہان پور میں
جاکر مقیم ہوگیا۔ شاہجہاں کو برہان پور آئے ہوئے پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اسکی
محبوب بیوی ممتاز محل بچی کی پیدائش کے دوران میں رحلت کرگئی جس سے کہ شاہجہاں
کو بیحد صدمہ پہنچا۔ بلکہ ممتاز محل کی لاش کو برہان پور سے آگرہ لایا گیا اور دفن کردیا گیا۔
شاہجہاں نے بیوی کی قبر پر وہ شاندار مقبرہ تعمیر کرایا جو تاج محل کے نام سے آج بھی
عجائباتِ عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔

شاہجہاں کو نئی نئی عمارتیں بنانے کا بڑا شوق تھا چنانچہ یہ عمارتیں آج بھی دنیا کے
سامنے مغلیہ حکومت کی عظمت کی داستان دہرا رہی ہیں۔ یہ عمارتیں صرف آگرہ، دہلی
لاہور، اجمیر ہی میں نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ میں پھیلی ہوئی ہیں تاج محل کی تعمیر
اس بادشاہ کی غیر فانی یادگار ہے۔ دہلی کو اسی بادشاہ نے دار السلطنت قرار دیا تھا اور
یہاں شاہجہاں آباد کے نام سے ایک نہایت ہی خوبصورت جدید شہر تعمیر کرایا تھا۔
تختِ طاؤس کی تیاری بھی شاہجہاں کے دورِ حکومت کا ایک مشہور کارنامہ ہے۔

۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء) میں شاہجہاں پیشاب بند ہونیکی بیماری میں ایسا مبتلا ہوا کہ
اسکی زندگی کی کوئی امید نہیں رہی۔ ولیعہد سلطنت دارا شکوہ نے یہ سمجھتے ہوئے کہ باپ لبِ دم
ہے حکومت کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ شاہی محل کی ناکہ بندی کردی کسی کو بادشاہ
کے پاس آنیکی اجازت نہیں تھی بنگال دکن اور گجرات جانیوالے تمام راستے بند کردئیے گئے
تاکہ شاہ شجاع شہزادہ اورنگزیب اور شہزادہ مراد کو مسافروں کے ذریعہ بادشاہ کی
بیماری کی اطلاع نہ مل سکے اور دارا شکوہ باپ کے مرتے ہی بے فکری کے ساتھ بادشاہ بنجائے
دارا شکوہ کی اس ناکہ بندی کا یہ نتیجہ نکلا کہ سب نے یہ سمجھ لیا کہ بادشاہ مرچکا ہے چنانچہ
بادشاہ کی موت کی افواہ جب ملک میں پھیلی تو شاہ شجاع، شہزادہ اورنگزیب اور شہزادہ
مراد اپنے لشکر لیکر آگرہ کی جانب دوڑ پڑے دارا شکوہ کو جب معلوم ہوا کہ اسکے چھوٹے بھائی

دارالسلطنت کی جانب آ رہے ہیں تو اس نے باپ کی مرضی کے بغیر بھائیوں کے خلاف فوج کشی شروع کر دی۔ شاہ شجاع تو مقابلہ کی تاب نہ لا کر اور شکست کھا کر بنگال واپس چلا گیا لیکن شہزادہ اورنگزیب اور مُراد کی مشترکہ فوجوں نے آگرہ پر قبضہ جما لیا۔ آگرہ پر قبضہ ہونا تھا کہ دارا شکوہ فرار ہو گیا

دارا شکوہ پر فتح حاصل کرنیکے بعد اورنگزیب کے سامنے اہم ترین مسئلہ باپ کا تھا اگر وہ باپ کو تخت سے محروم کرتا تھا تو اس کا دل گوارہ نہیں کرتا تھا لیکن باپ کو اگر دوبارہ تخت پر بٹھاتا تھا تو یہ سمجھتا تھا کہ باپ اپنے چہیتے بیٹے دارا شکوہ کے ہاتھ میں ساری حکومت دیدیگا اور دارا شکوہ کے ہاتھ میں حکومت آنیکے بعد بھائیوں میں سے کسی ایک کی بھی زندگی محفوظ نہیں رہیگی۔ اسکے علاوہ ملک میں پھر نئے سرے سے خانہ جنگی برپا ہو جائیگی۔ اس لئے اس نے یہ طے کیا کہ بادشاہ کو دوبارہ تخت و تاج دیکر نئی مشکلات نہ پیدا کی جائیں بلکہ بادشاہ کی آرام و آسائش کا پورا انتظام کر کے اسے آگرہ کے قلعہ میں نظربند کر دیا جائے۔

محی الدین محمد اورنگزیب عالمگیر

شاہجہاں کو آگرہ کے قلعہ میں نظربند کرنیکے بعد محی الدین محمد اورنگزیب ۱۰۶۸؁ ہجری (۱۶۵۸؁ء) میں عالمگیر کا لقب اختیار کرنیکے بعد تخت نشین ہوا تخت نشینی کی رسم کے فوراً ہی بعد اورنگزیب دارا شکوہ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ وہ آگرہ سے دہلی آیا۔ دہلی سے لاہور پہنچا اس نے ملتان تک دارا شکوہ کا تعاقب کیا۔ اسی دوران میں جب اورنگزیب کو اطلاع ملی کہ اس کا دوسرا بھائی شاہ شجاع آگرہ پر قبضہ جمانے کیلئے بنگال سے روانہ ہو چکا ہے تو وہ اسکے مقابلہ کیلئے دوڑا۔ شاہ شجاع اور اورنگزیب کی فوجوں کا شدید مقابلہ ہوا شاہ شجاع کو شکست ہو گئی۔ دارا شکوہ جو سندھ بھاگ گیا تھا اسے گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔ دہلی آنے کے بعد دہلی کے علما نے ملحدانہ خیالات کی بنا پر اس پر کفر کا فتویٰ لگایا اور وہ بے دینی کے جرم میں مع اپنے بیٹے کے قتل کر دیا گیا۔ شہزادہ مُراد جو اورنگزیب سے باغی ہو گیا تھا اور گوالیار کے قلعہ میں نظربند تھا اسے بھی ایک بے گناہ کے قصاص کے جرم میں سزائے موت دیدی گئی۔

تخت نشینی کے دو سال بعد اورنگزیب نے ملک میں بہت سی مفید اصلاحات کیں اُس نے دینیات کا محکمہ کھولا جو عوام کو دین کی باتیں بتاتا تھا۔ غیر اسلامی مراسم مسلمانوں کیلئے ممنوع قرار دیدئے گئے۔ بدکاری اور نشہ بازی کی روک تھام کیلئے اُس نے نہایت سخت قوانین جاری کئے۔ اُس نے تجارت پر سے ٹیکس بالکل اُڑا دیا۔ غلہ کے بیجوں کی تقسیم کا مُفت انتظام کیا۔ گانا بجانا ممنوع قرار دیدیا غرضکہ اورنگزیب نے بہت سی مفید اصلاحات تخت نشین ہونے کے بعد جاری کردیں۔

اورنگزیب اپنے زمانہ کا بہت بڑا سپہ سالار ہوا ہے اسکی ساری عمر ہی شمشیر زنی میں گذری ہے اس نے کوچ بہار اور آسام کے ناقابل تسخیر علاقہ کو فتح کرلیا تھا تبت ارکان اور چٹا گانگ تک کو اس نے زیر کرلیا تھا۔ اورنگزیب کو ایک طرف مرہٹہ سردار سیواجی سے شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسری جانب راجپوتوں کی بغاوت کو دبانے کے لئے بھی اسے بار بار فوج کشی کرنی پڑی۔

اورنگزیب کو شمالی ہند کی بغاوتوں کو دبانے کے بعد دکن کے مرہٹہ سرداروں اور باغی حکمرانوں کی سرکوبی کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ چنانچہ اسکی عمر کا آخری حصہ دکن ہی میں گذرا ہے۔ اُس نے دکن پہنچنے کے بعد مرہٹہ طاقت کو بالکل کچلکر رکھ دیا۔ اُس نے والئی بیجاپور کو زیر کیا۔ والئی گولکنڈہ کو اطاعت کے لئے مجبور کردیا حقیقت یہ ہے کہ اورنگزیب کو دکن کے معرکوں میں بڑی مشقت اور تکلیف اُٹھانی پڑی۔ وہ برابر ۲۶ سال تک دکن میں اپنے مخالفوں کو کچلنے میں ایسا مصروف رہا کہ اسے ایک دن کے لئے بھی چین میسر نہ آسکا۔ اس سخت محنت کے بعد ۱۱۱۷ھ (۱۷۰۷ء) میں وہ ایسا بیمار ہوا کہ جانبر ہی نہ ہوسکا۔ اورنگزیب نے پچاس سال اور تین ماہ حکومت کی۔ اورنگزیب کا دورِ حکومت اسقدر طویل ہے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہوا تھا۔

حکومت مغلیہ کا زوال اورنگزیب عالمگیر نے اپنے پیچھے جو وسیع سلطنت چھوڑی

تھی وہ اتنی بڑی تھی جو اس سے قبل ہندوستان کے کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن اتنی بڑی سلطنت کو سنبھالنے کیلئے جیسے لائق جانشینوں کی ضرورت تھی وہ اورنگزیب کو نہ مل سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگزیب کے بعد سے مغلیہ حکومت میں کمزوری پیدا ہونی شروع ہوگئی اورنگزیب کی آنکھ بند ہونی تھی کہ ملک میں ہر طرف باغیوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ راجپوت راجہ جو اورنگزیب کے خوف کی وجہ سے دب گئے تھے بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ راجپوتوں کے علاوہ شمالی ہند میں سکھوں کی بغاوت کا ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ دکن میں مغل حکام کی غداری اور نالائقی کی وجہ سے اُن مرہٹوں نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا جن کو اورنگزیب نے بالکل کچلکر رکھ دیا تھا۔ غرضکہ اورنگزیب کے مرتے ہی ملک میں ہر طرف شورشیں اور بغاوتیں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔

بہادر شاہ اول کی تخت نشینی:- اورنگزیب کی موت کے وقت چونکہ بڑا بیٹا معظم پشاور میں تھا اس لئے منجھلے بیٹے محمد اعظم نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ جب شہزادہ معظم کو بھائی کی اس شرارت کا علم ہوا تو اس نے بھی ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) میں پشاور سے لاہور آکر باقاعدہ اپنی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ تخت نشینی سے فارغ ہونیکے بعد بہادر شاہ دہلی پہنچا۔ وہاں سے آگرہ گیا اور اس نے چندروز کے اندر اندر سارے شمالی ہندوستان پر قبضہ جما لیا۔ اسکے بعد ان دونوں بھائیوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ آگرہ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر دونوں کے لشکروں کا مقابلہ ہوا اس جنگ میں بہادر شاہ فتحیاب ہوا اور شہزادہ اعظم مارا گیا۔ اسی زمانہ میں بادشاہ کے چھوٹے بھائی کام بخش نے دکن میں بغاوت برپا کر دی تھی بہادر شاہ کو اس سے بھی جنگ کرنی پڑی۔ کام بخش اس جنگ میں بری طرح زخمی ہونیکے بعد فوت ہو گیا۔

راجپوتوں اور سکھوں سے بھی اس بادشاہ کو کئی لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں۔ بہادر شاہ

جس وقت تخت نشین ہوا تھا اس کی عمر ۶۸ سال تھی تخت پر بیٹھنے کے بعد چونکہ اسے سخت پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اسلئے اسکی صحت گرتی چلی گئی چنانچہ ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۲ء) میں جب وہ لاہور میں تھا تو مختصر سی علالت کے بعد فوت ہو گیا۔

جہاندار شاہ:۔ بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے۔ جہاندار شاہ عظیم الشان، رفیع الشان اور جہاں شاہ۔ بادشاہ کے مرتے کے ساتھ ہی ان چاروں بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی میں جہاندار شاہ کے علاوہ باقی تینوں بیٹے مارے گئے تینوں بھائیوں کے ختم ہونیکے بعد جہاندار شاہ ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۲ء) میں دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بادشاہ نہایت بیوقوف اور عیاش تھا چنانچہ اسکے زمانہ میں طوائفوں ڈوموں اور میراثیوں کی خوب سرپرستی ہوئی ہے۔

فرخ سیر:۔ جہاندار شاہ نے اپنے تمام بھائیوں اور بھتیجوں کو تو ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن ایک بھتیجہ فرخ سیر جو بنگال کا گورنر تھا ابھی تک باقی تھا فرخ سیر نے گورنر بہار سید حسن علی اور اسکے بھائی سید عبد اللہ خاں گورنر الہ آباد کو اپنے ساتھ ملا کر جہاندار شاہ کے خلاف فوج کشی کر دی جہاندار شاہ جسکی فوج میں پہلے ہی بد دلی پھیلی ہوئی تھی اسے شکست ہو گئی۔ جہاندار شاہ کی شکست کے بعد فرخ سیر ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۳ء) میں تخت نشین ہو گیا لیکن تخت نشینی کے فوراً ہی بعد سے فرخ سیر اور سیدوں میں یعنی سید حسن علی اور سید عبد اللہ میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔ چنانچہ ان سید بھائیوں نے پہلے تو راجپوتوں کو بادشاہ کے خلاف ابھارا اور پھر مرہٹوں کے ساتھ ساز باز کر کے اس کی حکومت کا تختہ ہی الٹ دیا انھوں نے پہلے تو فرخ سیر کو پکڑ کر قید خانہ میں ڈال دیا پھر اسے اندھا کر کے قتل کر دیا۔

سیدوں نے فرخ سیر کے بعد پہلے تو شمس الدین ابو البرکات کو دہلی کے تخت پر بٹھایا۔ ابو البرکات دق کے مرض میں مبتلا تھا۔ جب اسکی حالت نازک ہو گئی تو سیدوں نے اسکے دوسرے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ رفیع الدولہ کی تخت نشینی کے تیسرے روز سابق بادشاہ شمس الدین تین ماہ کی حکومت کے بعد اس دنیا سے رحلت کر گیا۔ تین مہینے

کے بعد نیا بادشاہ رفیع الدولہ بھی مر گیا۔ اور اب سیدوں کو نئے کٹھ پتلی بادشاہ کی تلاش ہوئی۔

روشن اختر محمد شاہ:۔ رفیع الدولہ کے مرنیکے دس دن بعد روشن اختر محمد شاہ کی تخت نشینی کی رسم ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں انجام دی گئی۔ روشن اختر محمد شاہ بہادر شاہ اول کا پوتا تھا جو مدت سے قلعہ سلیم گڑھ میں قید تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس بادشاہ کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

سیدوں نے روشن اختر محمد شاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا کر حکومت کے کامل اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے محمد شاہ تو صرف نام کا بادشاہ تھا لیکن رفتہ رفتہ سیدوں کا اقتدار ختم ہونے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ کے آدمیوں نے سید حسین علی کو تو قتل کر دیا اور سید عبد اللہ کو گرفتار کر کے قید میں ڈالدیا گیا اور وہ قید خانہ ہی میں مر گیا۔ سیدوں کے پنجہ سے بادشاہ کو آزاد کرانے میں نظام الملک آصف جاہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا لیکن بعد کو نظام الملک آصف جاہ بھی دوسرا سید ثابت ہوا کیونکہ اس نے مرہٹوں سے سازباز کر کے دکن میں خود مختار حکومت قائم کر لی اور مرہٹوں کو شہ دیکر شاہی علاقوں کو بُری طرح لُٹوایا۔ نظام الملک آصف جاہ کی عنایت سے مرہٹوں کا زور اتنا بڑھا کہ وہ دہلی کے قرب وجوار پر بھی چھا گئے۔

سیدوں کی عنایت۔ نظام الملک کی ابن الوقتی اور مرہٹوں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے دہلی کی مرکزی حکومت پہلے ہی لب دم تھی کہ اسی زمانہ میں شاہِ ایران نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے اس حکومت کی بنیادوں کو بالکل ہی ہلا ڈالا۔ نادر شاہ سارے شمالی ہند کو لوٹتا ہوا دہلی آیا اور اس نے دہلی میں بُری طرح سے دہلی کے باشندوں کا قتل عام کیا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ اس قتل عام میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب دہلی کے باشندے مارے گئے۔ نادر شاہ نے دہلی پر قبضہ جمانیکے بعد دہلی کی جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ یہ دہلی میں ۵۸ دن رہا اور جب دہلی سے روانہ ہوا تو پندرہ بیس کروڑ روپیہ کے جواہرات، سونے چاندی کے ظروف، اشرفیاں نقد روپیہ اور شاہجہاں کا بنایا ہوا کروڑوں روپیہ کی لاگت کا تخت طاؤس اپنے ساتھ لے گیا

ہندوستان نادر شاہ کے حملے سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۵ء) میں نادر شاہ کی تقلید کرتے ہوئے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس نے صوبہ سرحد اور پنجاب کو خوب لوٹا جب یہ دہلی کی جانب بڑھا تو مغل لشکر نے اسے شکست دیدی اور یہ واپس چلا گیا۔ اسی زمانہ میں یعنی ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں محمد شاہ مختصر سی علالت کے بعد فوت ہو گیا۔ یہ بادشاہ بڑا عشرت پسند اور آرام طلب تھا اس بادشاہ کی نا اہلیت کی بنا پر مغلیہ حکومت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

احمد شاہ:۔ محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا! اس کا دورِ حکومت محمد شاہ سے بھی بدتر تھا۔ احمد شاہ ابدالی کا دوسرا حملہ اسی بادشاہ کے دورِ حکومت میں ہوا تھا۔ امرائے سلطنت کیونکہ بادشاہ سے ناراض تھے اسلئے انھوں نے بادشاہ کو معزول کر کے اندھا کر دیا اور مرہٹوں کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ وہ دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی قابض ہو گئے۔ ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار اسی بادشاہ کے زمانہ سے شروع ہوا تھا۔

عالمگیر ثانی:۔ احمد شاہ کے بعد جب عالمگیر ثانی ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں دہلی کے تخت پر بیٹھا تو مغلیہ حکومت تقریباً ختم ہو چکی تھی نظام الملک آصف جاہ کے بیٹے غازی الدین نے محض ذاتی اغراض کے پورا کرنے کیلئے اس بادشاہ کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ اسی بادشاہ کے دورِ حکومت میں احمد شاہ ابدالی کا تیسرا حملہ ہندوستان پر ہوا تھا اس نام نہاد بادشاہ کے زمانے میں دہلی کی حکومت مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے جب دیکھا کہ مرہٹے سارے ہندوستان پر چھاتے چلے جا رہے ہیں تو اس نے پھر ایک بار ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹوں کو بُری طرح کچلا مرہٹوں کے دوست غازی الدین کو چونکہ یہ شبہ ہو گیا تھا۔ کہ بادشاہ نے احمد شاہ ابدالی کو بُلایا ہے اسلئے اُس نے بادشاہ کو قتل کرا کے اسکی لاش کو جنگل میں پھنکوا دیا۔

شاہ عالم: جسوقت دہلی میں عالمگیر ثانی کو قتل کیا گیا تو اسکا بیٹا عالی گوہر بہار میں تھا۔ اس نے باپ کی موت کی خبر سنکر بہار ہی میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور شاہ عالم کا لقب اختیار کیا یہ بادشاہ بھی اپنے باپ کی طرح صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اسی بادشاہ نے انگریزوں کو ہندوستان

پر حکومت کرنیکے اختیارات عطا کئے تھے۔ سنہ ۱۱۹۴ھ (سنہ ۱۷۸۱ء) میں مرہٹوں نے اس بادشاہ کو
اپنی مٹھی میں لے لیا تھا گویا اس بادشاہ کے پردہ میں مرہٹے حکومت کرتے تھے۔ بادشاہ کی
اس مرہٹہ نوازی کی وجہ سے روہیلے بادشاہ کے بُری طرح دشمن ہو گئے تھے چنانچہ انھوں نے
دہلی پر حملہ کر کے ایک طرف مرہٹوں کے اقتدار کو ختم کر دیا دوسری جانب بادشاہ اور بیگمات
کی اچھی طرح سے مٹی پلید کی اسی ہنگامہ میں روہیلہ سردار غلام قادر نے بادشاہ کی آنکھیں
نکال کر اسے اندھا کر دیا تھا۔ یہ بادشاہ ۴۵ برس برائے نام حکومت کرنیکے بعد سنہ ۱۲۲۱ھ
(سنہ ۱۸۰۶ء) میں مر گیا۔

معین الدین اکبر ثانی: معین الدین اکبر ثانی جب سنہ ۱۲۲۱ھ (سنہ ۱۸۰۶ء) میں دہلی کے تخت
پر بیٹھا ہے تو انگریز دہلی کی مرکزی حکومت پر قابض ہو چکے تھے کیونکہ انھوں نے معین الدین
اکبر ثانی کے باپ شاہ عالم کو مرہٹوں کے پنجہ سے نکال کر اسے قبضہ میں لے لیا تھا چنانچہ معین الدین اکبر
ثانی کو انگریزوں ہی نے تخت پر بٹھایا تھا۔ یہ بادشاہ اکتیس برس تک انگریزوں کے پنشن یافتہ
کی حیثیت سے دہلی کے تخت پر رہا۔ انگریز اس بادشاہ کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ دیتے تھے۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر: سنہ ۱۲۵۳ھ (سنہ ۱۸۳۷ء) میں اکبر شاہ ثانی کے مرنیکے
بعد انگریزوں نے محمد سراج الدین بہادر شاہ کو اس کا جانشین مقرر کر دیا۔ یہ بادشاہ بڑا
علم دوست اور بہت اچھا شاعر تھا ظفر تخلص کرتا تھا۔

ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ اسی بادشاہ کے دور میں
لڑی گئی تھی جو غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگِ آزادی میں چونکہ ہندوستانیوں
کو ناکامی ہوئی۔ اسلئے انگریزوں نے انتقامی جذبہ کے ماتحت ہندوستانیوں پر بے پناہ
مظالم کئے۔ بہادر شاہ کے بیٹوں کو اسکی آنکھوں کے سامنے بے دردی کے ساتھ
قتل کیا گیا اور اس بادشاہ کو تخت و تاج سے محروم کر کے رنگون جلاوطن کر دیا گیا۔ اور اس طرح
مغلیہ حکومت کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔ یہ بادشاہ رنگون ہی میں فوت ہو گیا تھا +

اس تاریخ کی تیاری کے لئے اہتمام

اس تاریخ کی ترتیب اور تصنیف میں جو محنت شاقہ برداشت کرنی پڑی ہے اس کا اندازہ ناظرین مشکل ہی سے کر سکتے ہیں اس تاریخ کی تیاری میں سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ اکثر و بیشتر مستند تاریخیں تلاش و جستجو کے بعد بھی نہ مل سکیں اور مجھ کو مستند تاریخوں کے اقتباسات اور حوالہ جات کیلئے بیحد پریشانی اٹھانی پڑی یہ امر واقعہ ہے کہ اگر میں نے کئی سال پہلے سے اس تاریخ کی تیاری کیلئے مواد کی فراہمی کا کام شروع کر دیا ہوتا تو شاید یہ تاریخ ابھی زمانہ دراز تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتی۔ ان تمام دشواریوں اور دقتوں کے باوجود میں نے اس تاریخ کی تصنیف میں اس بات کی ہر امکانی کوشش کی ہے کہ اسے صرف ان مستند و معتبر تاریخوں کے حوالہ جات سے مرتب کیا جائے جو ہر طبقہ میں معتبر خیال کی جاتی ہیں لہذا ذیل میں ان تاریخوں کے نام درج کئے جاتے ہیں جنکے حوالجات کی امداد سے یہ مختصر مگر جامع تاریخ مرتب کیگئی ہے

تاریخ فرشتہ، تاریخ روضۃ الصفا حبیب السیر۔ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء الدین برنی سفر نامۂ ابن بطوطہ تاریخ سلاطین افاغنہ مصنفہ احمد یار مخزن افغانی تاریخ خانجہاں لودھی مصنفہ نعمت اللہ۔ تاریخ داؤدی مصنفہ عبداللہ تاریخ خافی خاں۔ توزک بابری، تاریخ ہمایونی ہمایوں نامہ خوند میر تاریخ شیر شاہی مصنفہ عباس خاں سروانی۔ تاریخ رشیدی حیدر مرزا منتخب التواریخ بدایونی۔ ظفر نامہ ملا یزدی۔ تاریخ مبارک شاہی میر معصوم کی تاریخ سندھ۔ تاریخ سلاطین بہمنیہ دکن۔ تاریخ مراۃ سکندری دکن۔ تاریخ قطب شاہیہ مصنفہ شاہ خور شاہ ایرانی۔ توزک جہانگیری کلاں۔ توزک جہانگیری خورد۔ تاریخ سلطنت اسلامیہ مولوی ذکاء اللہ۔ تاریخ سر جادو ناتھ سرکار۔

مندرجہ بالا تاریخوں کے علاوہ اور بھی دوسری مستند تاریخوں کو دیکھنے کے بعد یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس تاریخ میں جتنے بھی واقعات پیش کئے جائیں وہ بالکل صحیح اور درست ہوں، امید ہے کہ میری اس کوشش اور محنت کو ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔

شوکت علی فہمی

هندوستان پر اسلامی حکومت

کی جلد دوم

ہندوستان پر مغلیہ حکومت

مغلیہ حکومت کے قیام سے لیکر زوال تک

اور

مغلیہ حکومت کے زوال سے لیکر انگریزی دورِ حکومت تک

از

مفتی شوکت علی فہمی

شائع کردہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی جامع مسجد دہلی

ہندوستان پر اسلامی حکومت کی جلد دوم

ہندوستان پر مغلیہ حکومت

(از مفتی شوکت علی فہمی)

"ہندوستان پر اسلامی حکومت" کی پہلی جلد میں ہم زمانۂ قدیم سے لیکر مغلیہ حکومت کے قیام تک کے واقعات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس طویل زمانہ میں ہندوستان میں کون کون سی اسلامی حکومتیں بن بن کر مٹیں اور مٹ مٹ کر بنیں۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جلد تاریخی اعتبار سے اور ملکی انقلابات کے لحاظ سے بیحد اہم ہے لیکن اس تاریخ کی دوسری جلد پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو پہلی جلد سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔

"ہندوستان پر اسلامی حکومت" کی دوسری جلد جو حکومتِ مغلیہ کے زمانۂ عروج سے شروع ہو کر انگریزی دورِ حکومت پر ختم ہوتی ہے اسمیں وہ نایاب تاریخی ذخیرہ پیش کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ شہنشاہ بابر شہنشاہ ہمایوں شہنشاہ اکبر شہنشاہ جہانگیر شہنشاہ شاہجہان اور شہنشاہ اورنگزیب اور انکے جانشینوں نے ہندوستان پر کس رواداری کے ساتھ حکومت کی ہے حقیقت یہ ہے کہ دوسری جلد اس اسلامی تاریخ کی جان ہے جس کا مطالعہ موجودہ حالات میں نہایت اہم اور ضروری ہے۔

اس دوسری جلد میں مغلیہ حکومت کے عروج کے بعد اس حکومت کے زوال پر بھی بڑی قابلیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور ان سربستہ اسباب کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے جنکی بنا پر انگریزوں جیسی عیار قوم کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ کی یہ دوسری جلد اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد وہ سربستہ واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن سے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے تعلیمیافتہ بھی ناواقف ہیں۔

ہندوستان پر مغلیہ حکومت کی تاریخ کی فہرستِ مضامین

"ہندوستان پر مغلیہ حکومت" کی اس تاریخ کو چار ابواب میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ پہلے دو ابواب میں تو مغلیہ حکومت کے قیام اور عروج کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں مغلیہ حکومت کے زوال پر تبصرہ کیا گیا ہے اور چوتھے باب میں انگریزی حکومت کے اس ظالمانہ دور پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم کئے گئے ہیں "ہندوستان پر مغلیہ حکومت" کی یہ تاریخ کس قدر اہم ہے اس پر مزید تبصرہ کرنے کی بجائے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسکی فہرستِ مضامین درج کر دی جائے تاکہ تاریخ دلچسپی رکھنے والے حضرات خود ہی اندازہ لگا لیں کہ اس جلد میں کیسا نایاب تاریخی مواد پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں مغلیہ حکومت کی اس تاریخ کی فہرستِ مضامین پیش کرتے ہیں۔

پہلا باب

مغلیہ حکومت کا قیام

دوسرا باب

مغلیہ حکومت کا عروج

تیسرا باب

حکومت مغلیہ کا زوال

چوتھا باب

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت

مغلیہ دورِ حکومت کا شاندار مُرقّع

مغلیہ حکومت کی تاریخ کی مندرجۂ بالا فہرستِ مضامین سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ یہ تاریخ مغلیہ حکومت کا کس قدر شاندار مُرقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے اندر ایسی مکمل اور اس پائے کی کوئی بھی تاریخ شائع نہیں ہو سکی ہے۔

متعصب مورخوں کو دنداں شکن جواب

یہ تاریخ ان متعصب مورخوں کی تحریروں کا دنداں شکن جواب ہے، جو مسلمان بادشاہوں کو عموماً اور شہنشاہِ اورنگزیب جیسے مغل بادشاہوں کو خصوصاً سالہا سال سے بدنام کرتے رہے ہیں۔ اس تاریخ کے مطالعہ سے یہ چیز صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ مغل بادشاہوں نے ہندوستان پر کس شان اور رواداری کے ساتھ حکومت کی ہے۔ چنانچہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مغلوں کا دورِ حکومت موجودہ جمہوری حکومتوں سے بھی بہتر تھا۔

طباعت نہایت اعلیٰ ٹائیٹل رنگین اور خوشنما

اس تاریخ کی کتابت اور طباعت نہایت اعلیٰ ہے۔ ٹائیٹل رنگین اور نہایت ہی نظر فریب ہے۔ قیمت:۔ فی جلد مجلد مع خوشنما ڈسٹ کور پانچ روپے آٹھ آنے (پھ)

(ملنے کا پتہ)

دین دنیا پبلشنگ کمپنی۔ جامع مسجد۔ دہلی

انگریز قوم کی مکاری اور عیاری کی تاریخی داستان

انگریز کا شرمناک دور حکومت

(از مفتی شوکت علی فہمی)

انگریز نے مسلمانوں کو کچل کر اور مغلیہ حکومت کو مٹا کر جس مکاری کے ساتھ ہندوستان کے برّ عظیم پر قبضہ جمایا تھا۔ اس سے بہت کم حضرات واقف ہیں۔ انگریز تاجروں کے بھیس میں ہندوستان آئے اور انھوں نے بڑی عیاری کے ساتھ سارے ملک پر قبضہ جما لیا۔ یہ کتاب انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت کی ایک ایسی مکمل اور جامع تاریخ ہے جسمیں کہ انگریزوں کی تمام عیاریوں اور مکاریوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا گیا۔

مسلمانوں پر انگریز کے مظالم کا دردناک مرقع

یہ تاریخ ہندوستان کے مایۂ ناز مورخ شوکت علی فہمی کا بہت بڑا تاریخی شاہکار ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے ابتداءً کرناٹک اور بنگال پر قبضہ جمانے کے بعد پھر رفتہ رفتہ کس مکاری کے ساتھ سارے ہندوستان کو ہضم کر لیا کس طرح مسلمانوں کو کچلا اور کس طرح ہندوستان کے مغل بادشاہ کی توہین و تذلیل کی اور اسکی اولاد کو منظر عام پر گولیوں کا نشانہ بنایا۔ اسکے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے کس مکاری کے ساتھ ہندوستان کی مختلف طاقتوں کو آپس میں لڑوانے کے بعد ہندوستانیوں کو غلام بنایا۔

یہ تاریخ ۱۵۹۸ء کے اس منحوس سال سے شروع ہوتی ہے جبکہ سفید رنگ کے پہلے شخص نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور مختلف دوروں سے گذرتی ہوئی ۱۹۴۷ء کے اس تاریخی سال پر ختم ہوتی ہے جب ہندوستان انگریزی غلامی سے آزاد ہوا اور اس برّ عظیم میں مملکت ہند اور پاکستان کے نام سے دو آزاد خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں اس تاریخ میں انگریزوں کی عیاری کے واقعات کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی بیداری کی تاریخ بھی شامل ہے۔ کتابت اور طباعت نہایت اعلیٰ ٹائیٹل رنگین اور نہایت خوشنما۔ قیمت:- فی جلد مجلد مع خوشنما ڈسٹ کور تین روپے چار آنے۔

ملنے کا پتہ

دینی دنیا پبلشنگ کمپنی جامع مسجد دہلی

مفتی شوکت علی فہمی کی تاریخی کتابیں
مکمل تاریخ اسلام
یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ ایک ہزار صفحات کی اس عظیم الشان تاریخ میں رسول اللہ صلعم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسنؓ کی خلافتوں کے مفصل حالات ہیں۔ شاہان بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس کی پوری تاریخ
عراق، شام، فلسطین، مصر، افریقہ، اسپین، روم، ترکستان، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی سینکڑوں اسلامی
کا مکمل تذکرہ موجود ہے۔ قیمت: مکمل تاریخ مجلد آٹھ روپے آٹھ آنے۔
ہندوستان پر اسلامی حکومت
ہندوستان پر مسلمانوں کے گیارہ سو سالہ دور حکومت کی یہ نہایت شاندار اور مکمل تاریخ ہے جس میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی، محمد غوری، شاہان غلامان، شاہان خلجی، شاہان تغلق، شاہان سادات، شاہان لودھی، شاہان سوری
بادشاہوں کے مکمل حالات درج ہیں اور اس کے ساتھ ہی بنگال، جونپور، کشمیر، مالوہ، گجرات، خاندیش اور دکن کی اسلامی حکومتوں کی مختصر تاریخیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ قیمت: مجلد چھ روپے بارہ آنے۔
ہندوستان پر مغلیہ حکومت
ہندوستان پر مغلیہ حکومت کی یہ سب سے مستند اور مکمل تاریخ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مغلوں نے چار سو برس تک ہندوستان پر کیسی رواداری اور دبدبہ کے ساتھ حکومت کی ہے۔ شہنشاہ بابر،
اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب عالمگیر اور دوسرے تمام مغل بادشاہوں کی فتوحات اور زندگی کے حالات
تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ نہایت دلچسپ اور بے نظیر تاریخ ہے۔ قیمت: مجلد پانچ روپے آٹھ آنے۔
انگریز کا شرمناک دور حکومت
یہ ہندوستان پر انگریزوں کے ہولناک دور حکومت کی مکمل تاریخ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے کس عیاری کے ساتھ مسلم حکمرانوں اور عام مسلمانوں کو ذبح کر کے ہندوستان پر اپنی
حکومت قائم کی۔ یہ ولولہ انگیز تاریخ ۱۴۹۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء پر ختم ہوئی ہے۔ قیمت: مجلد تین روپے چار آنے۔
انقلاب کی خونیں تاریخ
یہ ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ممالک کے انقلابات کی خون میں ڈوبی ہوئی تاریخ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جن مسلمانوں کو آج شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے انھوں نے ملک و وطن کیلئے کیسی
مسلسل دو سو برس تک دی ہیں۔ یہ تاریخ متعصبوں اور فرقہ پرستوں کیلئے دندان شکن جواب ہے۔ قیمت: مجلد چار روپے۔
ہند اور پاکستان کے اولیاء
اولیائے کرام کے سات سو سالہ تبلیغی کارناموں کی یہ نہایت شاندار تاریخ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اولیائے کرام نے سرزمین ہند میں اسلام کیونکر پھیلایا۔ کروڑوں ہندوستانی کس طرح حلقہ بگوش اسلام
حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے لے کر دور آخر تک کے تمام مشہور اولیائے کرام کے حالات زندگی اور کرامات اس تاریخ میں درج ہیں۔ قیمت: مجلد تین روپے آٹھ آنے۔
دین دنیا پبلشنگ کمپنی جامع مسجد دہلی
Marfat.com